مشعلِ راہ

''۲۰۱۰ء — ۲۰۱۴ء میں ''شمع فروزاں'' کے کالم کے تحت لکھے جانے والے ان مضامین کا مجموعہ جن کا تعلق اسوۂ نبویؐ، عبادات، اصلاح معاشرہ، تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ اور مختلف ملکوں کے اسفار کے دوران وہاں کے تجربات، حالات اور مسلمانوں کے لئے ان میں عبرت و موعظت کے پہلوؤں سے ہے، زبان آسان، سادہ اور عام فہم''

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

شعبۂ نشر و اشاعت: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

طبع اول ۲۰۱۵ء — ۱۴۳۷ھ

نام کتاب	:	مشعلِ راہ
تالیف	:	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات	:	۴۰۸
قیمت	:	
ناشر	:	المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

ملنے کے پتے:

- ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد (تلنگانہ)
- مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، سہارنپور (یوپی)

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

عناوین

پیش لفظ

اردو کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' (حیدرآباد) میں ۱۹۹۹ء ہی سے ذمہ داری کے خواہش پر یہ حقیر ''شمع فروزاں'' کے نام سے ایک کالم لکھتا آیا ہے، کچھ عرصہ بعد اس مضمون کو ہندوستان کے مختلف اخبارات شائع کرنے لگے، خاص کر روزنامہ ''انقلاب'' نے اس کی پہنچ کو بہت بڑھا دیا جو اس وقت ممبئی، دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ، گورکھپور، پٹنہ، مظفر پور اور بھاگلپور وغیرہ سے شائع ہوا کرتا ہے، اور پورے شمالی ہند میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اخبار ہے۔ انقلاب کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، کانپور، پٹنہ کے بعض اور اخبارات میں اسے شائع کرتے ہیں، نیز اورنگ آباد، کوہ کن، کلکتہ، بنگلور وغیرہ کے بھی متعدد اخبارات ہمیشہ تو نہیں لیکن اکثر اپنے صفحات میں جگہ دیتے ہیں۔ جب میرا سفر ٹورنٹو (کینیڈا) کا ہوا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہاں سے نکلنے والا ایک اردو ہفت روزہ بھی پابندی کے ساتھ اس کی اشاعت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان بھر میں مختلف مقامات سے نکلنے والے اردو ماہناموں میں مضامین کو خصوصی اہمیت کے ساتھ شریک اشاعت رکھا جاتا ہے۔ اس پذیرائی کو یہ حقیر اللہ کا انعام تصور کرتا ہے، جس کے ذریعہ دین کی کچھ باتیں، اللہ کے لاکھوں بندوں تک پہنچ جاتی ہیں، اگر ان میں سے دو چار افراد کے لئے یہ سطریں درست راستے پر لانے کا ذریعہ بن جائیں تو شاید یہی آخرت میں اس گنہگار کے لئے نجات کا ذریعہ بن جائے، جس کا دامن عمل سے خالی ہے اور جس کے گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے ستاری کا پردہ ڈال رکھا ہے۔

۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۳ء تک جو مضامین لکھے گئے ان کا مجموعہ پانچ حصوں میں فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئے، ان پانچ حصوں کے نام اس طرح تھے:

(۱) نقوشِ موعظت (دعوتی و اصلاحی مضامین)

(۲) حقائق اور غلط فہمیاں (اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کا جواب)

(۳) نئے مسائل اسلامی نقطۂ نظر (موجودہ دور کے کچھ فکری اور عملی مسائل پر شرعی، عقلی اور

دعوتی پہلو سے گفتگو)

(۴) عصر حاضر کے سماجی مسائل (سماج میں پیدا ہونے والے مسائل کا تجزیہ اور ان کا حل)

(۵) دینی وعصری تعلیم اور درسگاہیں — مسائل اور حل (مدارس اور عصری درسگاہوں کے نصاب ونظام اور تعلیمی مسائل پر اظہار خیال)

مضامین کے پانچ مجموعوں کو زمزم بک ڈپو کراچی (پاکستان) نے دو ضخیم جلدوں میں ''راہِ عمل'' کے نام سے شائع کیا، پھر اسی مجموعے کو تین حصوں میں:

(۱) راہِ عمل (۲) جدید فکری مسائل (۳) دینی وعصری تعلیم — مسائل اور حل

کے نام سے ہدیٰ بک ڈپو حیدرآباد نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔

پھر ۲۰۰۷ء میں' ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۶ء میں طبع ہونے والے مضامین کی دو جلدیں شمع فروزاں کے نام سے کتب خانہ نعیمیہ دیوبند نے شائع کی، پھر ۲۰۰۷ء تا ۲۰۰۹ء کے مضامین شمع فروزاں کے نام ہی سے دو جلدوں میں کتب خانہ نعیمیہ ہی سے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی تھی، اس طرح شمع فروزاں کے نام سے چار جلدیں ہوگئیں۔ راقم الحروف کو یہ سعادت بھی حاصل ہوتی رہی کہ وقتاً فوقتاً سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کچھ کالم لکھے، چنانچہ سیرت کے ان مضامین کا مجموعہ پہلی بار ۲۰۰۸ء میں دکن ٹریڈرس حیدرآباد سے اور بعض مضامین کے اضافہ کے ساتھ ۲۰۱۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا، اس طرح بحیثیت مجموعی ان مضامین کی دس جلدیں ہوگئیں۔

۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۴ء تک جو مضامین لکھے گئے، بعض دوستوں اور عزیزوں کی خواہش پر کہ ان کی اشاعت ہوجائے اور مجھے بھی یہ رائے اس لئے پسند آئی کہ اگر مزید تاخیر ہوتی تو اندیشہ تھا کہ بہت سارے مضامین ضائع ہوجائیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیزی گرامی مولانا مبین احمد فلاحی سلمہ اللہ تعالیٰ (مرتب: جمعہ ایڈیشن ''مینارۂ نور'' روزنامہ منصف حیدرآباد) کو کہ انہوں نے اس عرصہ میں شائع ہونے والے تمام مضامین کے پرنٹ نکا کر دی، پھر عزیزان مولوی محمد عمران فلاحی سلمہ اللہ تعالیٰ (فاضل دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر، گجرات) اور عزیزی مولوی محمد اکرم رشید رحمانی سلمہ اللہ تعالیٰ (فاضل دارالعلوم لونا وارہ، گجرات) کو، ان حضرات نے بڑی محنت اور دقت نظر کے ساتھ مکرر طبع ہونے والے مضامین کو الگ کیا۔ راقم نے بعض اسفار کے دوران مسودہ کا پروف دیکھا، پھر مختلف

مرکزی عناوین کے تحت ان مضامین کو شائع کیا گیا، اس طرح اس کی دو جلدیں قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ المعہد العالی الاسلامی کی طرف سے ان کی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔

تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ سے متعلق مضامین شریک اشاعت ہے، ان میں بہت سے مضامین وہ ہیں جو پیش آنے والے واقعات اور وقتی حالات کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں، لیکن ان میں جو پیغام ہے مسلمانوں کے لئے، ان کی اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی، اسی نقطۂ نظر سے ان مضامین کو پڑھنا چاہیے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کی گذشتہ کتابوں کی طرح اسے بھی قبولیت عطا فرمائیں اور اس کو مسلمانوں کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے۔ وَاللّٰہُ ھُوَ الْمُسْتَعَانِ۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۸؍محرم الحرام ۱۴۳۷ھ
۱۱؍نومبر ۲۰۱۵ء

نقوشِ جاوداں

غیر مسلموں کے ساتھ نبی رحمت ﷺ کا سلوک

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام ﷺ کی صورت میں جو رحمت کی گھٹائیں کائنات پر اتاری ہیں، اس نے مسلمان ہو یا غیر مسلم اور انسان ہو یا حیوان، سبھوں کو آبیار کیا ہے اور ظلم و جور کو مٹا کر عدل وانصاف اور انسانی بھائی چارہ کو تقویت پہنچائی ہے، آپ ﷺ نے تمام انسانیت کو حضرت آدم علیہ السلام سے جوڑا، اخوت و بھائی چارگی کے رشتہ میں ان سب کو ایک دوسرے سے منسلک فرمایا اور پوری انسانیت کے ساتھ رحم دلی کی تعلیم دی، فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا، یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم اہلِ زمین پر رحم کرو تو تم پر وہ رحم فرمائے گا جو آسمان میں ہے، ارشاد ہوا کہ تم میں سے کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک وہ لوگوں کے لئے اسی سلوک اور رویہ کو پسند نہ کرے جو اپنے آپ کے لئے پسند کرتا ہے: ''**لا يؤمن أحدكم حتى يحب للناس ما يحب لنفسه**'' آپ ﷺ نے مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر فرمایا کہ وہ مؤمن نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو، ایک روایت میں ہے کہ وہ شخص مؤمن نہیں جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو، قرآن مجید میں پڑوسی کے لئے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں: ''وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى، وَالْجَارِ الْجُنُبِ'' یہاں بعض مفسرین کے نزدیک ''جار جنب'' سے غیر مسلم پڑوسی مراد ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے بکری ذبح کروائی اور پڑوسیوں کو بھیجنے کی ہدایت کی، واپسی پر دریافت فرمایا یہودی ہمسایہ کو اس میں سے حصہ بھیجا گیا؟ جواب نفی میں ملا تو آپ ﷺ نے خاص طور پر اس پڑوسی کے یہاں بکری کا گوشت بھیجا۔

اگر کوئی رشتہ دار غیر مسلم ہو تو بحیثیت رشتہ دار جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہی سلوک اس غیر مسلم کے ساتھ بھی کیا جائے گا، چنانچہ قرآن مجید نے والدین کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾ (لقمان: ۱۵) گویا والدین اگر غیر مسلم بھی ہوں تو ان کے ساتھ حسن سلوک میں

کوئی فرق نہ آنے دیا جائے، اسلام میں اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی اور بحیثیت بیوی اس کے وہی حقوق رکھے گئے جو ایک مسلمان بیوی کے ہیں، اسی طرح دوسرے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ بھی برتاؤ اور بہتر اخلاق کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ثابت ہے کہ انہوں نے ایک مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، امام مجاہدؒ فرمایا کرتے تھے کہ مشرک رشتہ داروں کا قرض معاف کرنا باعثِ اجر وثواب ہے، ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے یہودی رشتہ داروں میں تیس ہزار درہم تقسیم فرمایا تھا، پس قرابت داری اور رشتوں کے لحاظ سے اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے۔

عام غیر مسلموں کے ساتھ بھی انسانی بنیادوں پر بہتر اخلاق اور برادرانہ سلوک کی تلقین فرمائی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ایک یہودی نوجوان کی عیادت فرمائی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا اور اخیر وقت میں اس پر اسلام پیش فرمایا، نوجوان نے اپنے والد کی طرف بہ نگاہ استفسار دیکھا اور والد کے اشارہ پر اسلام قبول کرلیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منافق کی عیادت اور رأس المنافقین عبداللہ بن ابی کی آخری رسومات کے موقع سے تشریف لانا بھی ثابت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے محسن چچا ابو طالب کی بھی عیادت فرمائی ہے اور اخیر وقت تک ان کو قبولِ اسلام کی دعوت بھی دی ہے۔

انسانی احترام اور تکریم کے تقاضہ کے تحت ایک یہودی کا جنازہ گذرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو انسان تھا: ''إن فيه لنفسا'' غزوۂ خندق کے موقع سے ایک مشرک فوجی خندق عبور کر کے مسلمانوں کی طرف آ گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا، کفار مکہ نے قیمت ادا کر کے لاش حاصل کرنی چاہی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ قیمت نہیں لی اور یوں ہی ان کی لاش ان کے حوالہ کردی، نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ ان کو مسجد میں ٹھہرایا، ایک صاحب جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں مہمان ہوئے اور گھر میں جو کچھ تھا سب کچھ کھا گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ خانہ کو فاقہ کرنا پڑا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ برا نہیں مانا۔

یہودیوں کی عادت تھی کہ وہ موقع بہ موقع آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور مسلمانوں کو اذیت پہنچاتے تھے،

لیکن آپ ﷺ ہمیشہ صبر وتحمل کے ساتھ ایسی باتوں کو سہہ جاتے، ایک یہودی نے مسلمان سے درمیانِ گفتگو کہا: اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام عالم پر فضیلت عطا فرمائی، مسلمان نے پوچھا: محمد ﷺ پر بھی؟ اس نے کہا: ہاں، مسلمان اس پر برہم ہوگیا اور تھپڑ رسید کر دیا؛ حالاں کہ مسلمان اس تنبیہ میں حق بجانب تھا، کیوں کہ آپ ﷺ کا تمام رسولوں سے افضل ہونا بائبل سے بھی ثابت ہے؛ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے مسلمان صحابی کو تنبیہ کی اور فرمایا کہ قیامت میں موسیٰ علیہ السلام سب سے پہلے ہوش میں آئیں گے، ایک یہودی خاتون نے آپ ﷺ کی دعوت کی اور زہر کھلا دیا، اللہ نے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائی؛ لیکن اتنے بڑے جرم کے باوجود آپ ﷺ نے اس سے درگذر فرمایا، البتہ جب اس زہر خورانی کے واقعہ میں ایک دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کی موت ہوگئی تو بطورِ قصاص ان کو قتل کیا گیا، بعض یہودی اپنی بدبختی کی بناء پر آپ ﷺ کو ''السام علیکم'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے، جو ایک بددعائیہ لفظ تھا، صحابہ کو اس طرح کی بات سن کر طیش آجاتا، لیکن آپ کبھی خوش اخلاقی کا دامن نہیں چھوڑتے اور جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہنے پر اکتفاء کرتے۔

غرباء اور محتاجوں کی مالی امداد کے معاملہ میں بھی پیغمبر اسلام ﷺ نے غیر مسلموں کو نظر انداز نہیں فرمایا، جب مکہ میں قحط پڑا اور لوگ بھوکوں مرنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کے لئے ابوسفیان کی وساطت سے پانچ سو دینار کی خطیر رقم بھجوائی کہ وہ اس رقم کو اہل مکہ پر خرچ کریں، قرآن وحدیث میں جابجا اسیروں یعنی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان پر خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ قیدی غیر مسلم ہی ہوا کرتے تھے، خود آنحضور ﷺ سے ایک غیر مسلم گھرانہ پر صدقہ کرنا ثابت ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور بہت سے فقہاء کے نزدیک غیر مسلموں کو صدقۃ الفطر دیا جاسکتا ہے، بعض مشہور اہل علم جیسے: میسرہ، عمرو بن میمون اور عمرو بن شرحبیل کے بارے میں منقول ہے کہ وہ صدقۃ الفطر سے عیسائی راہبوں کی مدد فرمایا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا اور وجہ دریافت کی، بھکاری نے کہا: جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے بھیک مانگ رہا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو اپنے ساتھ لائے، بیت المال سے بہت سارا تعاون فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ انصاف کی بات نہیں کہ جوانی میں ہم ان کی کمائی سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ دیں، اسی طرح قربانی اور دوسرے

صدقات سے بھی (سوائے زکوۃ کے) غیر مسلم بھائیوں کی مدد کی جاسکتی ہے۔

جو غیر مسلم مسلمانوں سے آمادۂ پیکار اور برسرِ جنگ نہ ہوں، ان کی جان اور خون کی اسلام کی نگاہ میں وہی قیمت ہے جو مسلمانوں کی جان کی ہے، قرآن نے بلاتفریق مذہب حکم دیا ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰي﴾ (البقرۃ: ۱۷۸) یعنی قاتل کو مقتول کے عوض قتل کیا جائے؛ تاکہ انسانیت کے تحفظ کا سروسامان ہوسکے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ (المائدۃ: ۴۵) یعنی ایک انسانی جان کے بدلہ قتل پر دوسری انسانی جان جو قاتل کی ہو قتل کردیئے جانے کے لائق ہے، ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کردیا تو آپ ﷺ نے بطور قصاص اس مسلمان کو قتل کرایا اور فرمایا: جو غیر مسلم اپنے عہد کو پورا کرے میں اس کے عہد کا احترام کروں گا: ''أنا أكرم من وفى بذمته'' حضرت عمر رضی اللہ کے عہد میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک غیر مسلم کو قتل کردیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر مقتول کے اولیاء راضی نہ ہو تو اس کو قتل کردیا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بھی اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا تو آپ نے قاتل کو قتل کردینے کا حکم فرمایا، یہ تو دنیوی مؤاخذہ ہے، مسلمان ہر معاملہ کو آخرت کی نظر سے دیکھتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی ذمی یعنی مسلم ملک میں آباد غیر مسلم کو قتل کردے، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پاسکے گا: ''**من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة**''۔

آج کے جمہوری دور میں بھی خون کی قیمت میں فرق کیا جاتا ہے، ہمارے ملک ہندوستان کا حال یہ ہے کہ اگر پنجاب اور کشمیر میں کسی ہندو کی جان جائے تو اس کے خون کی قیمت زیادہ ہے اور اگر مسلمان فساد میں مارا جائے تو اس کی قیمت کم ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسی کوئی تفریق نہیں فرمائی اور اصول مقرر کردیا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جانوں کی اہمیت یکساں ہے: ''**دماء هم كدمائنا**'' چنانچہ آپ ﷺ نے خود جو خون بہا مسلمانوں کا تھا وہی خون بہا ایک غیر مسلم کا ادا فرمایا، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آزاد مسلمان کی جو دیت ہے وہی دیت آپ ﷺ نے معاہد کی رکھی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ سے منقول ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے ادوار میں مسلمان اور یہودی وعیسائی کی دیت ایک ہی رہی، ان

وضاحتوں سے اندازا کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں بلاتفریق مذہب انسانی جان اور زندگی کی کیا اہمیت ہے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی نگاہ میں جو حرمت اور اہمیت ایک مسلمان کے مال کی ہے، وہی اہمیت غیر مسلم بھائیوں کے مال وجائداد کی بھی ہے، فرمایا: "**ألا لا يحل أموال المعاهدين إلا بحقها**" کہ کسی غیر مسلم کا مال ناحق طور پر حاصل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، یہ بات آپ ﷺ نے اس موقع پر بیان فرمائی جب جنگِ خیبر میں صلح ہوجانے کے بعد بھی بعض پرجوش لوگوں نے دست درازی سے کام لیا، جیسے ایک مسلمان کا مال چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو وہ بھی اسی سزا کا مستحق ہوگا، حضرت ابن حدرد رضی اللہ عنہ کے یہاں ایک یہودی کا قرض باقی تھا، اس نے مطالبہ کیا اور کسی قدر شدت کے ساتھ تقاضہ کیا اور آپ ﷺ سے شکایت کی، آپ ﷺ نے صحابی مذکور کو اداءِ قرض کا حکم دیا، ابن حدرد رضی اللہ عنہ نے معذرت کی اور عرض کیا کہ سوائے ان دو چادروں کے میرے پاس اور کچھ نہیں ہے؛ لیکن جب آپ ﷺ نے سہ بارہ تاکید فرمائی تو بازار تشریف لے گئے اور ایک چادر کو تہبند بنالیا اور ایک چادر فروخت کرکے قرض ادا کردیا، اس سے آپ ﷺ کا مقصود اس بات کی تعلیم دینا تھا کہ غیر مسلموں کے قرض سے بے اعتنائی اختیار نہیں کی جاسکتی۔

بعض اموال شریعت کی نگاہ میں حرام ہیں جیسے شراب اور خنزیر، اگر خدانہ خواستہ کوئی مسلمان اپنے پاس شراب اور خنزیر رکھے اور دوسرا شخص اسے ضائع کردے تو اس پر کچھ مؤاخذہ نہیں ہے؛ لیکن اگر مسلمان ہی کسی ایسے شخص کی شراب اور خنزیر کو ضائع کردے جس کے مذہب میں اس کو حلال سمجھا جاتا ہے تو اس شخص کو اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے مال اور مالی حقوق کی حفاظت کو یکساں اہمیت دی ہے۔

سب سے اہم مسئلہ کسی مذہب کے دوسرے مذاہب اور اہلِ مذاہب کے ساتھ رواداری اور دوسرے مذاہب کے تئیں احترام کا ہے، اسلام کی نگاہ میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ دوسری قوموں کے ساتھ مذہبی امور میں "لو اور دو" کا معاملہ کیا جائے، مسلمان اپنے عقیدہ، مذہبی اعمال، اور تہذیب وثقافت کے معاملہ میں اس طرح کی سودا بازی کو قبول نہیں کرسکتے، یہ رواداری نہیں؛ بلکہ

ضمیر فروشی اور ایمان فروشی ہے، رواداری سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کے مذہبی جذبات کا پاس ولحاظ رکھے اور ان کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کرے، اس معنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے انسانیت کو حددرجہ مذہبی رواداری، تحمل، اور باہمی احترام کی تعلیم دی ہے، اور بقاءِ باہم کے اصول پر زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا ہے، قرآن مجید نے صاف اعلان کردیا کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) مذہبی رواداری کی بہترین مثال وہ معاہدہ ہے جو آپ ﷺ نے مدینہ آنے کے بعد مسلمانوں، یہودیوں، اور مشرکین کے درمیان کرایا تھا، اور اس معاہدہ کے تحت ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی پوری پوری آزادی دی تھی، قرآن مجید نے ان معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا جن کی دوسری قومیں پرستش کرتی ہوں، قرآن نے یہ بھی کہا کہ اللہ نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں، اور ان پر خود اس قوم کی زبان میں اللہ کا کلام نازل ہوا ہے، یہ عقیدہ اور ہدایتِ قرآنی مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسرے پیشوایانِ مذاہب اور مصلحین عالم کے ساتھ احترام اور توقیر کا رویہ اختیار کریں اور ان کے بارے میں اپنی زبان؛ بلکہ اپنے ذہن وخیال کی بھی حفاظت کریں، کیوں کہ عجب نہیں کہ آج جن شخصیتوں کی پرستش کی جارہی ہے وہ اپنے وقت کے رسول اور دعوتِ توحید کے علمبردار ہوں۔

آپ ﷺ کی ان ہی تعلیمات کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلم کے اس حق کو تسلیم کیا کہ اگر وہ کسی مسلم ملک میں رعایا کے طور پر زندگی بسر کررہے ہوں تو ان کو اپنے شخصی اور سماجی معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر چلنے کی آزادی ہوگی، مشہور حنفی فقیہ صاحبِ ہدایہ نے لکھا ہے کہ اگر آتش پرستوں کے یہاں اپنی ماں یا بہن سے نکاح کی گنجائش ہو اور مسلم ملک میں کوئی آتش پرست ان محرم رشتہ داروں سے نکاح کرلے تب بھی مسلمان حکومت کو اس کی نجی زندگی کے مسائل میں دخل دینے کی گنجائش نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اگر کوئی ایک فریق اپنے معاملات ہماری عدالت میں لائے تب بھی ہم ایسے معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتے جب تک کہ دونوں فریق اسلامی عدالت سے رجوع نہ ہوجائیں، اسی لئے اسلامی عہد میں اور خود ہمارے ملک کی مسلم بادشاہتوں میں ہمیشہ ''اقلیتی پرسنل لاء'' کا تحفظ کیا گیا ہے۔

یہی فراخ دلی کا برتاؤ پیغمبر اسلام ﷺ نے عبادت گاہوں کے بارے میں کیا ہے، آپ

ﷺ نے جنگ کے موقع سے عبادت گاہوں سے متعلق مذہبی شخصیتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے گورنروں کو ہدایت فرمائی کہ کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس کے موقع سے تشریف لے گئے اور کلیسا کے متولی کی اجازت؛ بلکہ خواہش پر ایک چرچ میں نماز ادا کی تو پھر اس چرچ کے لئے ایک خصوصی دستاویز مرحمت فرمائی کہ کہیں مسلمان اپنے امیر کے نماز ادا کرنے کی وجہ سے جبراً اس کو اپنی عبادت گاہ بنانے کی کوشش نہ کریں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب دمشق کی جامع مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل ایک چھوٹا سا چرچ تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں سے پیش کش کی کہ یہ منہ مانگی قیمت لے کر مسجد کو دے دیں، تاکہ مسجد کے صحن کو وسعت دی جا سکے، مگر عیسائیوں نے نہیں مانا، عبدالملک نے بھی اپنے زمانۂ حکومت میں اسی طرح کیا، عیسائیوں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا، پھر مروان نے اپنے زمانۂ حکومت میں عیسائیوں کو آمادہ کرنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر مصر رہے، مروان نے جوش میں آکر خود اپنے ہاتھ میں کدال لی اور گرجا کو منہدم کرنا شروع کیا، اور بالآخر جامع مسجد دمشق میں شامل کر دیا، جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سریر آرائے خلافت ہوئے اور عہد اموی کے گذشتہ مظالم اور ستم اندازیوں کی تلافی شروع کی تو دمشق کے یہ عیسائی بھی فریاد لے کر پہنچے کہ ان کے چرچ جبراً گروائے گئے تھے، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے گورنر شام کو خط لکھ کر ہدایت فرمائی کہ مسجد کا وہ حصہ جس میں چرچ تھا، عیسائیوں کو واپس کر دیا جائے، بالآخر مسلمانوں نے کسی طرح اپنے عیسائی بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس حصہ سے دست بردار ہو جائیں اور اس طرح مسجد منہدم کئے جانے سے بچ گئی۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی انہیں تعلیمات اور خلفائے راشدین کے عملی نمونوں کو سامنے رکھ کر فقہاء نے غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی رواداری اور مذہبی آزادی کے احکام دیئے ہیں، اور مسلمانوں کے لئے اس بات کو ناجائز قرار دیا گیا ہے کہ غصب کی ہوئی زمین پر نماز پڑھیں یا مسجد تعمیر کریں، اس لئے جو لوگ مسلمانوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں کہتے ہیں کہ انہوں نے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں پر جبراً قبضے کر لئے ہیں، اور مسجدیں تعمیر کی ہیں، وہ محض غلط فہمی اور غلط بیانی پر مبنی ہے۔

❁

اظہارِ محبت کے آداب

ربیع الاول کا مہینہ شروع ہو چکا ہے، اسی مہینے میں آقا ومولانا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی، اسی ماہ میں آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور اسی ماہ میں آپ ﷺ نے عالم آخرت کی طرف کوچ فرمایا، اس طرح اس ماہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے ایک خاص مناسبت ہے، یوں تو آپ ﷺ سے محبت اور آپ کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی دن اور کوئی لمحہ ایسا نہ ہو، جب اس کے دل کی دنیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے آباد نہ ہو؛ لیکن حیات محمدی ﷺ سے اس ماہ کی خصوصی نسبت کی وجہ سے عام طور پر اس موقع پر زیادہ جلسے کئے جاتے ہیں، اخبارات ورسائل کے نمبرات نکلتے ہیں اور مختلف طریقوں پر سیرت طیبہ کے تذکرہ کو تازہ کیا جاتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ﷺ پر نہ صرف ایمان لانا ضروری ہے؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی بے انتہاء عظمت اور تمام چیزوں سے بڑھ کر محبت ہمارے دلوں میں ہو، یہ محبت ہمارے ایمان کا جزو اور ہمارے دین کی اساس ہے اور یہ حضور ﷺ کا معجزہ ہے کہ اس امت کے دل میں آپ ﷺ کی محبت کا جو غیر معمولی جذبہ کارفرما ہے، دوسرے مذاہب کے متبعین میں اپنے پیشواؤں سے متعلق اس کا سوواں حصہ بھی نہیں ملتا، اور کیوں نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے بعد ہر مسلمان کے لئے آپ ﷺ ہی کی ذات سب سے محبوب ترین ہستی ہے، اس کو اپنے وجود سے بھی بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت ہے اور اگر اس کا سینہ اس جذبہ سے خالی ہو تو وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہے گا۔

محبت کے تقاضوں میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ انسان محبت کا اظہار کرے، اللہ اور رسول کی محبت تو مؤمن کے لئے معراج ہے؛ لیکن انسان تو دنیا میں بھی جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اسے اظہار محبت کے بغیر چین نہیں ملتا؛ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا فطری تقاضہ آپ سے محبت کا اظہار بھی ہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اظہار محبت کا طریقہ کیا ہو؟ ----محبوب کے لحاظ سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے، انسان کو اپنے والدین سے بھی محبت ہوتی ہے اور اولاد سے بھی، استاذ اور شیخ سے بھی

محبت ہوتی ہے اور شاگرد و مرید سے بھی، شوہر و بیوی بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اور دوستوں میں بھی باہم محبت کا تعلق ہوتا ہے؛ لیکن ہر جگہ اظہار محبت کا ایک ہی انداز نہیں ہوتا، اظہارِ محبت میں دو باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے، محبوب کا مقام و مرتبہ اور محبوب کی پسند، مقام و مرتبہ کا لحاظ بے حد ضروری ہے، ایک شخص اپنے بچوں سے پیار کرتے ہوئے محبت کے جو بول بولتا ہے اور جو طریقہ کار اختیار کرتا ہے، اگر وہی الفاظ اپنے ماں باپ سے کہے اور وہی طریقہ ان کے ساتھ اختیار کرے تو یہ محبت کی بجائے بے ادبی اور گستاخی ہوجائے گی، اسی طرح کسی شخص کو جو شئی پسند نہ ہو، آپ اس کی پسند و ناپسند کی پرواہ کئے بغیر اس کی ناپسندیدہ شئی بطور اظہار محبت کے اس کے سامنے پیش کر دیں تو یا تو اسے بے وقوفی سمجھا جائے گا یا تمسخر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے اظہار میں بھی ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے، ہمارے بعض شعراء نعتیہ اشعار کچھ اس طرح کہتے اور پڑھتے ہیں کہ جیسے اپنی محبوبہ کے گیسو و عارض کی تعریف کر رہے ہوں اور اس کے سراپا کا نقشہ کھینچ رہے ہوں، ظاہر ہے کہ یہ اظہار محبت کا ناشائستہ طریقہ ہے، اخبارات میں ایک طرف ایسا اشتہار ہوتا ہے، جس کا تعلق ملبوسات کی دکان سے ہے اور جس میں نیم عریاں شکل میں آنچل لہراتی ہوئی ایک عورت کھڑی ہوئی ہے اور ٹھیک اسی کی پشت پر یا اوپر نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ذکر ہے، سوچئے، کیا یہ بے ادبی نہیں ہے؟ کاغذ کی ایسی جھنڈیاں تیار کی جائیں، جن پر کلمہ طیبہ ہو اور جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک نام ہو اور یہی جھنڈیاں چند دنوں کے بعد زمین میں قدموں سے پامال کی جائیں، کیا یہ بے احترامی نہیں ہے؟ اظہار محبت کے نام پر کتنی ہی ایسی حرکتیں کی جاتی ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کے خلاف ہیں۔

بہت سی باتیں جو اختیار کی جاتیں ہیں، وہ ایسی ہیں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے، آپ ﷺ نے کسی بھی انسان کو تکلیف پہنچانے کے عمل سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے درخت کو کاٹنے سے منع فرمایا؛ کیوں کہ اس کی وجہ سے انسان سایہ سے محروم ہوتا ہے اور ماحولیاتی توازن متأثر ہوتا ہے، آپ ﷺ نے گھر کی نالی راستے پر نکالنے سے روکا؛ تاکہ تعفن پیدا نہ ہو، آپ ﷺ نے راستہ میں کچرا اور تکلیف دہ چیزیں ڈالنے سے منع فرمایا، یہاں تک کہ ارشاد ہوا کہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا بھی ایمان میں داخل ہے: ’’**وأدناها إماطة الأذى عن الطريق**‘‘ (صحیح مسلم، باب شعب الایمان،

حدیث نمبر: ۱۶۲) تکلیف دہ چیزوں میں راستہ کی رکاوٹ بھی ہے، راستہ میں ایسی چیزیں رکھ دینا کہ ٹریفک کا بہاؤ متأثر ہوجائے، اس طرح کھڑا ہوجانا کہ چلنے والوں کے لئے رکاوٹ پیدا ہوجائے اس اذی (تکلیف دہ چیز) میں داخل ہے، جس کے ہٹانے کا آپ ﷺ نے حکم فرمایا ہے۔

ایسی رکارڈنگ لگانا کہ محلہ کے لوگوں کے لئے سونا دشوار ہوجائے یا بیماروں کو تکلیف ہونے لگے، ایذا ہی کی ایک شکل ہے، حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت کسی جگہ جاتے تو ایسی آواز میں سلام فرماتے کہ جو لوگ بیدار ہوں وہ سن لیں اور جو لوگ سوئے ہوئے ہوں، ان کی نیند میں خلل واقع نہ ہو: "۔۔۔ **فیجیئ من اللیل فیسلم تسلیما لا یوقظ نائما ویُسمع یقظان**" (مسلم، حدیث نمبر: ۲۰۵۵) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید بھی بہت اونچی آواز میں پڑھنے کو پسند نہیں فرمایا، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے، آپ ﷺ نے صحابہ کو زور زور سے قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا تو پردہ ہٹایا اور فرمایا کہ تم سب اپنے پروردگار سے سرگوشی کررہے ہو؛ لہٰذا ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچاؤ اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے سے آواز بلند نہ کرو: "**ألا إن کلکم مناج ربکم فلا یؤذین بعضکم بعضا، ولا یرفع بعضکم علی بعض في القراءة**" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۳۳۲) آپ ﷺ نے تکبیر کہنے میں بھی بہت بلند آواز کو پسند نہیں فرمایا، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، جب ہم بلندی پر چڑھتے تھے تو تکبیر کہتے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ اپنے آپ پر نرمی سے کام لو، تم کسی ایسی ذات کو نہیں بلا رہے ہو، جو سنتا نہ ہو یا موجود نہ ہو؛ بلکہ اس خدا کو پکار رہے ہو، جو خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا اور تم سے قریب ہے: "**لا تدعون أصم ولا غائبا تدعون سمیعا بصیرا قریبا**" (بخاری، حدیث نمبر: ۸۳۸۶، مسلم، حدیث نمبر: ۲۷۰۴) اس سے معلوم ہوا کہ ایسے ریکارڈ بجانا کہ جس کی آواز لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہو اور جلسوں کے اسپیکر اتنی دور دور تک پھیلا دینا کہ لوگوں کی نیند میں خلل ہوجائے، ایسے طریقے ہیں جو ہمارے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فضول خرچی نہایت ناپسند تھی، قرآن مجید میں تقریباً بیس آیتوں میں فضول خرچی کو منع کیا گیا ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کھانے اور

کپڑے ہی میں نہیں؛ بلکہ صدقہ کرنے میں بھی اسراف نہ ہونا چاہئے: ''کلوا وتصدقوا والبسوا في غير إسراف'' (نسائی عن عبداللہ بن عمرو ؓ، حدیث نمبر: ۲۳۹۹) ----صدقہ میں اسراف کا مطلب یہ ہے کہ کسی خیر کے کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کردیا جائے، یا اتنا خرچ کردیا جائے کہ خود دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے حالات پیدا ہوجائیں،فضول خرچی کی دو صورتیں ہیں: کسی جائز کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے یا کسی بے جا کام میں خرچ کیا جائے-----اب غور کریں تو ربیع الاول میں اظہار مسرت کے لئے جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں،ان میں بعض صورتیں یقیناً فضول خرچی کے دائرے میں آجاتی ہیں،یہ اللہ اوراس کے رسول کو ناراض کرنے والی بات ہے نہ کہ ان کو خوش کرنے والی۔

ایک بات جو آپ ﷺ کو بہت ہی ناپسند تھی، وہ ہے غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کرنا، یوں تو آپ ﷺ لباس و پوشاک اور تہذیب وتمدن میں بھی غیر مسلموں کی مماثلت کو ناپسند فرماتے تھے؛لیکن خاص کردینی امور میں تو آپ ﷺ کو یہ بات حددرجہ ناپسند تھی؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: جو شخص کسی اورقوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ ان ہی میں شامل ہے: ''من تشبه بقوم فهو منهم'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۰۳۱) آپ ﷺ نے سورج کے نکلنے،سورج کے نصف آسمان پر رہنے اورسورج کے ڈوبنے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا؛اس لئے کہ جو قومیں آفتاب کی پرستار تھیں، وہ ان ہی اوقات میں آفتاب کی پوجا کیا کرتی تھیں، یہودی دیر سے روزہ افطار کرتے تھے تو آپ ﷺ نے اپنی امت کو افطار میں عجلت کا حکم دیا، یہودی دس محرم کو روزہ رکھتے تھے،تو آپ ﷺ نے اس کے ساتھ مزید ایک روزہ ملاکر روزہ رکھنے کا حکم فرمایا، (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۷۶۰) اگر اس پس منظر میں دیکھیں تو دیپ جلانا، چراغاں کرنا ہمارے ہندو بھائیوں کا شعار ہے، وہ چراغ جلاکر دیوالی مناتے ہیں اوراس سے ان کا ایک مذہبی تصور متعلق ہے،عیسائی حضرات کرسمس کے موقع پر پنج پہلو ستاروں کی شکل میں روشنی کا اہتمام کرتے ہیں اوران کے یہاں بھی اس سے ایک مذہبی تصور متعلق ہے؛لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ نے کسی اسلامی تقریب کے لئے اس کی دعوت نہیں دی یا اس طرح کا عمل نہیں کیا، اسی طرح رنگ پھینکنا ہمارے برادران وطن کا طریقہ رہا ہے اور وہ اس کے لئے مستقل طور پر ہولی کا تہوار مناتے ہیں، اسلام میں ایک دوسرے پر رنگ پھینکنے کا کوئی تصور نہیں ہے،غور کیجئے کہ کہیں ہم

غیر مسلم بھائیوں کے مذہبی اور تہذیبی شعائر کی طرف تو قدم بڑھاتے نہیں جارہے ہیں؟

غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات چھپی ہوئی نہیں ہے؛ بلکہ وہ روشن آفتاب کی طرح ہم سب کے سامنے ہیں، ہم ان کو پڑھ کر آپ ﷺ کی پسند و ناپسند کو جان سکتے ہیں، اور اس کی ترازو میں اظہار محبت کے ان طریقوں کا تجزیہ کر سکتے ہیں، جن کو آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔

ہم اس ماہ میں ضرور اپنی خوشی کا اظہار کریں؛ لیکن طریقہ ایسا ہو کہ وہ شریعت کی میزان میں بھی درست ہو اور اس سے دینی نفع بھی ہو۔

اظہار مسرت کا ایک بہتر طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم لوگ اس یادگار مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے پڑھنے اور اپنی نئی نسل تک اس کو پہنچانے کا اہتمام کریں، اللہ کا شکر ہے کہ ہر زبان میں سیرت کا لٹریچر موجود ہے، یہ کتابیں مختصر بھی ہیں، متوسط ضخامت کی بھی ہیں اور ضخیم بھی ہم خود ان کا مطالعہ کریں اور اپنے مطالعہ کو نئی نسل تک پہنچائیں، خواتین اور بچوں کو سنائیں، آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمان نوجوانوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اولاد اور پاک بیویوں کے نام تک یاد نہیں، اگر ان سے آپ کے صحابہ کا نام دریافت کیا جائے تو چاروں خلفاء کے بعد کم لوگ ہوں گے جو کسی پانچویں صحابی کا نام بتاسکیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دس بیس واقعات بھی ان کو معلوم نہیں ہیں، کیا یہ بات محبت کے تقاضے میں داخل نہیں ہے کہ انسان اپنے محبوب کو جانے، پہچانے اور دوسروں سے اس کا تعارف کرائے؟ پس آیئے کہ اس مہینے کو ہم لوگ سیرت کے پڑھنے اور اپنی نئی نسل تک سیرت نبوی کو پہنچانے کا مہینہ بنائیں، اس کے لئے ایک منصوبہ بنائیں، کوئز پروگرام منعقد کریں اور بچوں کو انعام دے کر انہیں سیرت نبوی سے واقف کرائیں۔

اظہار محبت کا دوسرا مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہم برادران وطن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ ﷺ کی انسانیت نواز تعلیمات کو پہنچائیں، اس وقت مغرب کی جانب سے ایک منظم کوشش کی جارہی ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی جائیں، آپ ﷺ کی توہین کے لئے مختلف حربے استعمال کئے جارہے ہیں، جب اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں تو ہم لوگ احتجاج کرتے ہیں اور ہم اس احتجاج میں حق بجانب بھی ہیں؛ لیکن یہ اس مسئلہ

کا پائیدار اور مستقل حل نہیں ہے، اس کا اصل حل یہ ہے کہ غیر مسلم بھائیوں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پہنچائی جائے، خاص کر آپ ﷺ کی بلند اخلاقی کے واقعات اور انسانیت نواز تعلیمات کو عام کیا جائے، مقامی زبانوں میں سیرت کا لٹریچر زیادہ سے زیادہ مقدار میں شائع کیا جائے اور ایک ایک غیر مسلم بھائی تک اس کو پہنچانے کی کوشش کی جائے، اگر ہر صاحب استطاعت مسلمان یہ طے کر لے کہ وہ انگریزی، ہندی یا ہندوستان کی کسی مقامی زبان میں موجود سیرت کی کتاب کے ایک سو تا ایک ہزار نسخے اپنے برادران وطن تک پہنچائے گا، ہاسپٹل جا کر مریضوں میں، ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹینڈوں پر جا کر مسافروں میں، اسکولوں اور کالجوں میں جا کر اساتذہ اور طالبات میں تقسیم کرے گا، تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا حقیقی اظہار ہوگا، اس طرح غلط فہمیوں کے بادل چھٹیں گے، لوگ آپ ﷺ کی ہستی کو پہچانیں گے اور آپ ﷺ کی محبت وعظمت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوگی۔

اظہار محبت کا تیسرا طریقہ --- جس کی خود آپ ﷺ نے ترغیب دی ہے --- درود شریف کی کثرت ہے، گھروں میں ایسا ماحول بنایئے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھیں، ہر مسلمان خاندان طے کریں کہ کم سے کم اس ماہ میں ہم سب مل کر ایک لاکھ دفعہ درود شریف پڑھیں گے اور آئندہ بھی سہولت کے لحاظ سے اس کا سلسلہ جاری رکھیں گے، تو آپ کی احسان شناسی کا مناسب اظہار ہوگا؛ کیوں کہ امت کا درود شریف رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور درود کی یہ کثرت ان شاء اللہ آخرت میں بھی حضور ﷺ کی شفاعت میں حصہ دار بنائے گی۔

اگر ہم سیرت کا پیغام مسلمانوں تک پہنچا کر، غیر مسلموں کو آپ ﷺ کی ذات سے واقف کرا کر اور درود شریف کی کثرت کے ذریعہ آپ سے محبت وتعلق کا اظہار کریں تو یہ اظہار محبت کی کتنی بہتر، مفید اور ثمر آور صورت ہوگی، کاش! ہم ٹھنڈے دل سے اور دینی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر غور کریں۔

اُن سے اے بادِ صبا! حال ہمارا کہیو

(سفر حرمین شریفین میں دعاء کی ضرورت)

اس وقت پوری دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالئے تو مغرب سے مشرق تک ہر جگہ مسلمان سخت آزمائش اور امتحان کے مرحلہ سے گذر رہے ہیں، امریکہ کا حال یہ ہے کہ اس کی معیشت عرب ممالک کی بیساکھی پر کھڑی ہے، کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ امریکہ عرب ملکوں سے بڑی مقدار میں پٹرول حاصل کرتا ہے، قیمت میں بھی خصوصی رعایت ہوتی ہے اور ان ملکوں پر پابندی بھی ہے کہ وہ اپنی رقم کی بہت معمولی مقدار ہی امریکی بینکوں سے نکال سکتے ہیں، پڑوسی ملک کے ایک ماہر معاشیات کا تجزیہ میں نے پڑھا تھا کہ ایک بڑے عرب ملک کو صرف چھ فیصد اپنی رقم نکالنے کی اجازت ہے، پھر رقم کی ادائیگی بھی اس طرح ہوتی ہے کہ ان ملکوں کو از کار رفتہ اور اَن چاہا ہتھیار بیچا جاتا ہے اور اس میں بھی یہ شرط ہوتی ہے کہ امریکی ماہرین ہی ان اسلحہ کا استعمال کریں گے اور اسرائیل کے خلاف ہتھیار استعمال کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی، پہلے تو امریکہ اور یورپ کے ممالک اسرائیل اور فلسطین کے معاملہ میں کم سے کم زبان ہی سے سہی کسی قدر توازن کا خیال رکھتے تھے؛ لیکن اب کھلے طور پر صہیونی مملکت کی حمایت کی جاتی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گرد ٹھہرایا جاتا ہے۔

یورپ کے متعدد ممالک میں رسول اللہ ﷺ کی شان مبارک پر شب و روز گستاخی و بے احترامی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں؛ لیکن اسے اظہار خیال کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے، دوسری طرف ہولوکاسٹ اور سلطنت عثمانی کے ہاتھوں اَرمینیائی باشندوں کے قتل کا انکار کیا جائے تو اسے جرم قرار دیا جاتا ہے، فرانس جس میں مسلمان سب سے بڑی اقلیت ہیں، وہاں مذہبی تعصب اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے، کئی مغربی ممالک کی صورت حال یہ ہے کہ وہاں انسان کو بے لباس رہنے کی اجازت ہے؛ لیکن برقع یا اسکارف استعمال کرنے کی اجازت نہیں، جرمنی میں کھلے عام ترک اقلیت کے خلاف زہر افشانی کی جاتی ہے اور ان کی توہین وتحقیر کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔

مشرقی ممالک کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں، بوسنیا، کوسووو میں جو روح فرسا مظالم ڈھائے گئے، تاریخ میں اسی کی مثالیں کم ہی مل سکیں گی، روس میں چیچنیا اور چین کے مسلم اکثریت علاقہ میں جو جور وظلم ڈھائے جارہے ہیں، ان کو الفاظ کا پیکر عطا کرنا مشکل ہے، برما کے اراکانی مسلمان لاکھوں کی تعداد میں زیر آسمان پڑے ہوئے ہیں، ان کے خون اور عزت وآبرو کی ارزانی ساری دنیا کے سامنے ہے؛ لیکن ان کی مصیبت پر کوئی آنسو بہانے والی آنکھ بھی موجود نہیں، عیسائی طاقتیں مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کو تو الگ کراسکتی ہیں؛ لیکن اراکان کے بارے میں وہ کچھ سوچنے کو بھی تیار نہیں ہیں، یہ حال تو ان لوگوں کا ہے جنہیں بیگانہ سمجھا جاتا ہے، خود عالم اسلام کی صورت حال یہ ہے کہ افغانستان میں روز مقتل سجتے ہیں، ایران کی معیشت کا حال یہ ہے کہ لوگ عام ضروریات زندگی خریدنے کے لئے بھی ایک ایک تھیلا روپیہ لے کر جاتے ہیں، عراق میں مغربی طاقتیں شیعوں کو اہل سنت کے خلاف آلۂ کار بنا رہی ہیں، حالاں کہ عرب اور کرد اہل سنت مل کر اکثریت ہیں، مگر نوبت یہاں تک آچکی ہے کہ ملک کے برسر اقتدار سنی نائب صدر کو حکومت جیل اور پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لئے بے چین ہے، جو مظالم کبھی صدام حسین کیا کرتے تھے، اب کئی گنا اضافہ کے ساتھ عراق کی موجودہ حکومت کر رہی ہے، شام میں دس فیصد سے بھی کم نصیریہ فرقہ کے لوگ نوے فیصد سے زیادہ اہلسنت پر جور وستم کے پہاڑ ڈھا رکھے ہیں، بشار الاسد کے مظالم نے حجاج بن یوسف کی تاریخ کو بھی شرمندہ کر دیا ہے، بحرین میں بھی مسلکی اختلافات کو ہوا دے کر عدم استحکام پیدا کیا جارہا ہے، پاکستان کی صورت حال تو نہایت ہی ابتر ہے، اور اس وقت وہ ایک ایسا ملک ہے جس کی کوئی منزل متعین نہیں، غرض کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے قتل وخون، ان کی رسوائی و بدنامی، ان کے وسائل کو لوٹنے اور ان کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھنے کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

کوئی قوم چاہے تعداد کے اعتبار سے کم ہو؛ لیکن اس کی قوت فکر یہ زندہ ہو اور وہ علم کے میدان میں سرخ رو ہو تو وہ ہر طوفان کا مقابلہ کرسکتی ہے؛ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس وقت مسلمان دونوں جہتوں سے بھی اچھی حالت میں نہیں ہیں، ہوش پر جوش کا غلبہ ہے، وہ پتھر سے ٹکرا جانے کو بہادری سمجھتے ہیں اور حکمت ومصلحت کی بجائے جذبات کے ذریعہ میدان جیتنا چاہتے ہیں، جن باتوں کا اختیار شریعت نے حکمراں اور ولی امر کو دیا ہے، مسلمان عوام انہیں اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، ہر شخص دشمن

سے اپنے راز کو چھپاتا ہے؛ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ اپنی صلاحیت سے کئی گنا زیادہ ہم اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں، ہم اس بات سے بھی قاصر ہیں کہ دار الاسلام اور دار الکفر کے احکام کے فرق کو سمجھ سکیں، یہ جذباتیت مسلمانوں کو بدنام کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کر رہی ہے، اور اس سے اسلام کی تصویر مسخ ہو رہی ہے، دوسری طرف مسلم ممالک ٹکنالوجی کے اعتبار سے پسماندہ ترین ممالک ہیں اور چند کو چھوڑ کر اکثر ملکوں کا حال یہ ہے کہ وہاں سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ایک ایک چیز درآمد کی جاتی ہے، جو قوم علم و تحقیق کے میدان میں پیچھے رہ جائے، اس کے لئے میدان جنگ میں بھی پیچھے رہنا مقدر ہے اور جو ملت سائنس اور ٹکنالوجی کے معاملہ میں دوسروں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو، اس کے لئے اپنی معیشت اور اپنی عزت وآبرو کے تحفظ کے لئے بھی دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

اس صورت حال کا مقابلہ کس طرح ہو؟ اس کے لئے دو ہی راستے ہیں: ایک جہد مسلسل، دوسرے: اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانا، ہمارا اس بات پر یقین ہے کہ اللہ کی ذات قادر مطلق ہے، وہ ذرہ کو آفتاب بنا سکتا ہے اور وہ مصیبتوں اور آزمائشوں کے آتش فشاں کو خاکستر کر سکتا ہے، جس نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو ان کی تمام تر شوکت وقوت کے باوجود ملیا میٹ کر دیا اور بلند قامت پہاڑوں کی چوٹیاں بھی ان کے کام نہیں آسکیں، جس نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے لئے آگ کے سمندر کو امن وسلامتی اور راحت بخش ٹھنڈک کی جگہ بنا دیا، جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لئے سمندر سے راستے نکال دئے اور فرعون اپنی تمام تر طاقت اور قوت کے باوجود اپنی قوم کے ساتھ نیست و نابود کر دیا گیا۔

یقیناً خدا کی یہ طاقت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اس کی قوت کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو ایک لمحہ گذرے بغیر وہ چیز وجود میں آجاتی ہے اور اس کی رحمت ایسی بے پایاں ہے کہ ہر مانگنے والے کی سنتا ہے اور وہ کسی سے دور نہیں: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرۃ:۱۸۶) جب مصیبتیں ہر چہار طرف سے گھیر لیتی ہیں اور انسان سمجھتا ہے کہ اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تو خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے بچاؤ کا فیصلہ فرماتے ہیں (یونس:۲۲) عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے

تھے، وہ بھی کم سے کم مصیبت کے وقت خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے: ﴿وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ﴾ (فصلت: ۵۱)؛ لیکن افسوس کہ ہمارا حال اس سے بھی گیا گذرا ہے، خدا کے سوا ہم مدد کا ہاتھ چاہے امریکہ و یورپ کے سامنے پھیلائیں یا روس اور چین کے سامنے، اس کا کوئی فائدہ نہیں؛ بلکہ خدا کے دربار سے ہی کامیابی وناکامی کے فیصلے بھی ہوتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۹۷)

دعاء کی تاثیر کچھ ایسی ہے کہ اس سے تقدیر کے فیصلے بھی بدل جاتے ہیں: ''**ادعوا فإن الدعاء يرد القضاء**'' (مسند احمد: ۳/ ۱۵۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے عاجز انسان وہ ہے جو دعاء کی توفیق سے بھی محروم ہو: ''**إن أعجز الناس من عجز عن الدعاء**'' (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۱۴۶) اور جب کوئی فرد مظلوم ہو تو اس کی دعاء تو خاص طور پر قبول کی جاتی ہے، کئی حدیثوں میں اس کا ذکر آیا ہے، (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۱۵۳۶)۔

یوں تو دعاء ایسی عبادت ہے جس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، دعاء اور ذکر و تلاوت کے علاوہ جتنی عبادتیں ہیں، ان کے اوقات مقرر ہیں؛ لیکن کچھ اوقات ایسے ضرور ہیں جن میں خاص طور پر دعائیں قبول ہوتی ہیں، ان میں حج کا موقع بھی ہے، حج میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں جن کو حدیث میں ''مستجاب'' یعنی دعاء کی قبولیت کا وقت قرار دیا گیا ہے، اس وقت حجاج جوق در جوق سوئے حرم رواں دواں ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کے دربار میں شادان و فرحاں پہنچ رہے ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کی صورت حال کو دیکھ کر دل بھر آتا ہے، اور ان شعراء کی یاد آتی ہے، جنھوں نے بارگاہ رسالت مآب میں امت کے غم والم کا آنسو بہایا، مولانا الطاف حسین حالی فرماتے ہیں:

اے خاصۂ خاصاں رسل! وقت دعاء ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے
وہ دین ہوئی بزم جس سے چراغاں
آج اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہبان
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

اور عصر حاضر کے ایک دردمند شاعر پروفیسر کلیم عاجز نے بھی حضور ختم مرتبت کے دربار میں اپنی عرضداشت یوں پیش کی ہے:

اُن سے اے باد صبا! حال ہمارا کہیو
کہہ کے ایک بار نہ چپ رہیو دو بارہ کہیو
کل بھی ہم کون سا سرخاب کا پر رکھتے تھے
آج کیوں ہم سے کرے ہیں، وہ کنارا کہیو
کل بھی تھا، آج بھی ہے، کل بھی رہے گا عاجزؔ
نام ان کا ہمیں جی جان سے پیارا کہیو

بظاہر مولانا الطاف حسین حالیؔ اور پروفیسر کلیم عاجز کے ان اشعار میں حضور اقدس ﷺ سے خطاب ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ آپ کے واسطہ سے خدائے کائنات کے دربار میں اس کے ایک غم زدہ بندہ کی عرضداشت ہے، عازمین حج کو مکہ مکرمہ کی حاضری اور مدینہ منورہ کی زیارت صد ہزار بار مبارک ہو، وہ قدم بھی مبارک ہیں، جو اس مبارک زمین میں خاک آلود ہوں، وہ آنکھیں بھی مبارک ہیں، جو ان شعائر اللہ کا دیدار کریں، وہ زبانیں بھی مبارک ہیں جن کو دربار خداوندی اور بارگاہ نبوی میں پہنچ کر مدعا پیش کرنے کا موقع ملے، وہ ہاتھ بھی مبارک ہیں جو اللہ کے سامنے پھیلائے جائیں؛ لیکن ایسا نہ ہو کہ بڑھتی ہوئی مادیت کے نتیجہ میں وہاں سے متاع ایمان خریدنے کی بجائے دنیا کا سروسامان خریدا جائے، اپنی ذاتی ضروریات اور مادی حاجات تو خدا سے مانگی جائے اور امت کی سربلندی، سرفرازی کی التجاء نہ کی جائے، حق یہ ہے کہ زائران حرم قدم قدم پر اس امت کی بے سروسامانی، اس کی بے سہارگی اور اس کی مغلوبیت و مظلومیت سے فتح و نصرت کی طرف سفر کی دعائیں کریں، اور جیسے ایک مظلوم بصد الحاح اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے، اسی طرح اس امت کے مقدمہ کو خدا کے دربار میں پیش کریں اور ہر موقع پر پوری امت اسلامیہ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ **و باللہ التوفیق و ھو المستعان**

اہانت رسول کی سزا

دُنیا کی معلوم تاریخ میں ہمیشہ ہی انسان کی غالب اکثریت مذہب پر یقین رکھتی رہی ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اسلام اور خدا کے سامنے خود سپردگی انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے: ﴿فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (الروم: ۳۰) یہ اور بات ہے کہ آدمی اللہ تعالی کی بھیجی ہوئی کتابِ ہدایت سے محرومی کی بنا پر جذبۂ بندگی کا غلط استعمال کرے اور اس کا سر خالق کی بجائے مخلوق کے سامنے خم ہو نے لگے؛ لیکن بہر حال مذہب سے وابستگی انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہب اور اپنے مذہبی پیشوا سے وابستگی کا مسئلہ انسان کے لئے شاید سب سے زیادہ جذباتی اور حساس مسئلہ ہوتا ہے، جاں نثاری وفدا کاری اور قربانی کی جو مثالیں مذہب کی نسبت سے ملیں گی، شاید ہی کہیں اور مل پائے، اس راہ میں کتنے ہی لوگوں نے آگ پر چلنا، شعلوں میں جلنا، سمندر میں غرقاب ہونا اور زندہ پیوندِ خاک کیا جانا تو قبول کیا ہے؛ لیکن اپنے فکر و عقیدہ سے انحراف کسی طور پر گوارا نہیں کیا؛ اس لئے ہر عہد میں عدل وانصاف کی راہ چلنے والوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلتے ہوئے دوسرے مذاہب کے متبعین کے جذبات کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے اور یہ تو درست ہے کہ آدمی کسی فکر اور عقیدہ پر سنجیدہ علمی تنقید کرے؛ لیکن کسی مذہب اور مذہبی پیشوا کے ساتھ تنقیص وتمسخر اور سب وشتم کرنا کوئی بھی مذہب اور قانون روا نہیں رکھ سکتا۔

اسلام دینِ فطرت ہے، جس نے انسانی جذبات کی تکریم کا قدم قدم پر لحاظ رکھا ہے، وہ اس پہلو سے بھی ایک مکمل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ دین ہے، گزشتہ انبیاء کی نسبت قرآن مجید کو ''مصدِّق'' قرار دیا گیا (البقرۃ: ۸۹) یعنی یہ کتاب گزرے ہوئے پیغمبروں کی تصدیق کرتی ہے اور دنیا کی بدنصیب قوموں نے ان برگزیدہ ہستیوں کی پاک زندگیوں پر تہمت اور بدگمانیوں کا جو غبار رکھ دیا تھا، یہ کتاب انہیں صاف کرتی ہے، بائبل نے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت

یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے یہودا، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام وعزیر علیہ السلام پر ناشائستہ الزامات لگائے ہیں، قرآن اور حامل قرآن نے حضراتِ انبیاء کی پاکیزہ زندگیوں پر چڑھائی گئی بدگمانی اور تہمت اندازی کی ان دبیز چادروں کو چاک کیا اور ان کو برگزیدہ، خدا کے یہاں مقبول اور انسانوں کے لئے اسوۂ ونمونہ کی حیثیت سے پیش کیا؛ اسی لئے ہر مسلمان پر اپنے پیغمبر کی طرح ہر پیغمبر پر ایمان لانا اور ان کے احترام کو برقرار رکھنا واجب ہے، ایک مسلمان محمد عربی ﷺ پر کتنا بھی یقین رکھتا ہو اور شریعتِ اسلامی پر عمل کرنے میں کتنا ہی پابند نظر آتا ہو، اگر اس نے ایک بھی رسول کا انکار کیا یا ان کی ہتکِ شان کی، تو وہ مسلمان باقی نہیں رہ سکتا۔

پھر قرآن مجید نے ایک اُصولی بات کہی ہے، جو ہر مسلمان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اسلام سے پہلے کے تمام مذہبی پیشواؤں کا احترام کریں اور ان کے بارے میں محتاط لب ولہجہ اختیار کریں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بے شمار انبیاء بھیجے ہیں، ہر قوم میں اپنا پیغمبر مبعوث کیا ہے (فاطر: ۲۴) اور ہر زبان میں اپنا صحیفۂ ہدایت نازل فرمایا ہے، (ابراہیم: ۴) یہ عقیدہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ مختلف اقوام جن مذہبی پیشواؤں پر ایمان رکھتی ہیں، عجب نہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اللہ کے رسول رہے ہوں اور ان کی تعلیمات میں انسانی تحریف اور ملاوٹ نے ان کو توحید سے دور کر دیا ہو، رام جی ہوں یا کرشن جی، بودھ جی ہوں یا کنفیوشس، مسلمان ان کے بارے میں بدگوئی نہیں کر سکتے، حضرت مسیح اور پیغمبر اسلام ﷺ کے درمیان صرف پانچ سوستر سال کا فاصلہ ہے، اس کے باوجود بائبل (عہد جدید) میں کیا کچھ تحریف نہیں ہوئی، خود عیسائی علماء اور محققین کو اس کا اعتراف ہے، تو ان بزرگوں کا عہد تو اسلام سے بہت پہلے کا ہے، ان کی تعلیمات میں انحراف وتبدیلی کا پایا جانا بالکل عجیب نہیں!

یہ تو ان برگزیدہ ہستیوں کا ذکر ہے، جو مقامِ نبوت پر فائز ہیں، یا جن کے بارے میں اس کا احتمال موجود ہے کہ وہ اپنے عہد کے پیغمبر رہے ہوں، قرآن نے تو معبودانِ باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا کہ اس سے انسانی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور ردِ عمل کی نفسیات جاگ اُٹھتی ہے، (الانعام: ۱۰۸) قرآن کا مطالعہ کیجئے اور احادیث پر نظر ڈالئے! عقیدۂ توحید کا اثبات اور شرک کی تردید قرآن و حدیث کی تمام تعلیمات کا لب لباب اور خلاصہ ہے؛ لیکن انبیاء ورسل کے احترام میں کہیں کوئی کمی نہیں، نہ مخالفین کی دل آزاری ہے اور نہ جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی زبان اور بیان۔

اسلام جو رویہ دوسرے مذاہب کی بابت اختیار کرتا ہے، چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ بھی اسی سلوک کو روا رکھا جائے، نظریاتی تنقید نے کبھی مسلمان علماء یا عوام کو مشتعل نہیں کیا، مسلمانوں نے بلند حوصلگی اور علمی بلند نگاہی کے ساتھ ان کا سامنا کیا، اسلامی تھیالوجی جو ''علم کلام'' کے نام سے علومِ اسلامی کا ایک اہم شعبہ مانا جاتا ہے، کا موضوع ہی یہی ہے کہ اعتقادات کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر پیش کیا جائے اور اسلامی معتقدات پر کئے جانے والے شبہات کا جواب دیا جائے، خود ہندوستان میں اسلام کے خلاف ایسی کتابیں لکھی گئیں، جن کی سرحد دل آزاری اور دریدہ دہنی سے جاملتی تھی، جیسے پنڈت دیانند سرسوتی جی کی ''ستیارتھ پرکاش''، لیکن مسلمانوں نے ایسی تحریروں پر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور اس کا دندان شکن اور مسکت علمی جواب دیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بھی مذہب اور اس مذہب کے متبعین کے لئے یہ بات گوارا نہیں ہوسکتی کہ اس کے بارے میں سب وشتم اور یاوہ گوئی کا طریقہ اختیار کیا جائے؛ بلکہ کوئی بھی معقول قانون ایسے طرزِ عمل کو برداشت نہیں کرسکتا، جس سے لاکھوں انسانوں کے جذبات مجروح اور احساسات زخمی ہوں، آج منشیات کی اسمگلنگ کی سزا قتل ہے، کسی ملک کے جھنڈے کی توہین کی جائے تو یہ سخت قابل مؤاخذہ ہے، تو کیا مذہبی پیشواؤں کی توہین اس درجہ کا جرم بھی نہیں؟ اسی لئے اسلام میں رسولوں اور پیغمبروں کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی سزا قتل ہے، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس سنگین جرم کی یہی سزا منقول ہے، (فتح القدیر: ٦ / ٦٢) حقیقت یہ ہے کہ اگر اس سے بڑی بھی کوئی سزا ہوسکتی اور ایک مجرم کو ایک سے زیادہ دفعہ قتل کیا جانا ممکن ہوتا تو ایسا شخص اس کا بھی سزاوار تھا؛ کیوں کہ ایک عام انسان کے قتل کی سزا قتل ہے؛ حالاں کہ اس سے ایک خاندان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، ایک ملک سے بغاوت کی سزا قتل ہے؛ حالاں کہ اس سے بھی ایک محدود گروہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو ایک ایسی شخصیت کی بے احترامی، جس سے کروڑوں انسانوں کے احساسات مجروح ہوتے ہوں، کا مجرم یقیناً اس سے بڑی سرزنش کا مستحق ہے۔

فقہاء کے یہاں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، فقہ کے چاروں دبستان -- حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ -- اس بابت متفق ہیں، (دیکھئے: ردالمحتار: ۲۹۰۳، المغنی: ۹ : ۳۳۹) اور علامہ ابن تیمیہؒ نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب ''سیف اللہ المسلول علی شاتم الرسول'' کے نام سے لکھی ہے، بلکہ

بعض حنفی فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رسول کے ساتھ گستاخی کرنے والے شخص کی دُنیا کے احکام کے اعتبار سے توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی، چاہے آخرت میں اس کی توبہ قبول ہو جائے، اگرچہ اس رائے کو بجا طور پر نامعتبر سمجھا گیا ہے، علامہ عبدالرشید طاہر بخاریؒ ممتاز فقہاء میں ہیں، لکھتے ہیں:

''جس نے رسول ﷺ کو برا کہا، آپ ﷺ کی اہانت کی، آپ ﷺ کے دین، آپ ﷺ کی شخصیت یا آپ ﷺ کے اوصاف کی نسبت سے بدگوئی کی، تو چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہودی، عیسائی ہو یا مشرک، مسلم ملک کا مسلم باشندہ ہو یا دارالحرب کا، اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔'' (خلاصۃ الفتاویٰ: ۴/ ۳۸۶)

شاید یہ اس لئے کہ اگر اس معاملہ میں ایسی سختی کو روا نہ رکھا جائے تو اندیشہ ہے کہ بدقماش اور بدذہن قسم کے لوگوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ بدگوئی کریں اور پھر سزا سے بچنے کے لئے اپنے تائب ہونے کا اظہار کر دیں---اس طرح حضرات انبیاء کرام، جو انسانیت کے لئے چراغِ راہ اور خضرِ طریق تھے، کی حیاتِ طیبہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

پاکستان کے صوبۂ پنجاب کے وزیر اعلی سلمان تاثیر توہین رسالت قانون کی مخالفت کی وجہ سے ہلاک کئے جا چکے ہیں، اگر انہوں نے اس قانون کے بقا اور ناموس رسالت کی حفاظت کے لئے جان دی ہوتی تو یقیناً یہ ان کے لئے وجہِ اعزاز اور باعث افتخار ہوتا اور دنیا سے آخرت تک ان کے لئے سرفرازی وسرخروئی کا سبب بنتا؛ مگر افسوس کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی توہین کو قابل سرزنش جرم قرار دینے کو تیار نہیں تھے، آخر ایک غیرت منداور باحمیت مسلمان اس کی تاب نہ لا سکا، اس سے قطع نظر کہ ممتاز قادری کا یہ قدم درست ہے یا غلط؟ یہ بات سوچنے کی ہے کہ جب آپ انسان کے جذبات کا قتل کرتے ہیں تو اس پر ردعمل ایک فطری بات ہے، مسلمان اپنی جان و مال، عزت وآبرو اور آل واولاد کی قربانی کو گوارہ کر سکتا ہے؛ لیکن وہ اپنے رسول ﷺ کی ذات پر ادنیٰ حرف گیری کو برداشت نہیں کر سکتا؛ کیوں کہ یہی اس کے دین وایمان کی بنیاد ہے، اور یہ محبت واحترام اس کو صحابہ کرام سے آج تک میراث میں ملی ہے، کوئی شخص عاشقانِ رسول کے جذبات سے کھیلے اور محبان رسول ﷺ کے احساسات کا قتل کرے اور یہ امید رکھے کہ اسے خاموشی سے برداشت کر لیا جائے گا، نادانی ہی کی بات ہوگی، مغرب زدہ مسلمانوں کو بار بار اس پر متنبہ کیا جاتا ہے، مگر ان کی بے ضمیری ان کی آنکھوں پر پردہ

ڈالے ہوئی ہے اور شاید ان کے کانوں اور دلوں پر مہر لگ چکی ہے۔

یہ بھی یک طرفہ تماشہ ہے کہ امریکہ و برطانیہ میں عیسائیت اور حضرت مسیح کی اہانت قابل سرزنش جرم ہو تو یہ غیر منصفانہ نہیں، یورپ میں اگر کوئی شخص یہودیوں کے ہولوکاسٹ کے واقع ہونے کی تاریخی حقائق کی روشنی میں تردید کرے تو یہ قابل سرزنش جرم ٹھہرے اور اس پر تحقیق کی اجازت بھی نہ ہو، مصر والجزائر میں مغرب نواز حکومتیں کسی معقول سبب کے بغیر سیکڑوں علماء کو آئے دن پھانسی دیتی رہیں، تو مغرب کے کانوں پر جوں نہ رینگے، بوسنیا میں انسانوں کو اتنی بے دردی سے ذبح کیا جائے کہ لوگ سانپ اور درندہ جانوروں کے ساتھ بھی شاید ایسا رویہ نہیں برتتے ہوں، تو اس ''عیسائی دہشت گردی'' پر زبانی جمع خرچ سے آگے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، اسرائیل میں جبراً عربوں سے ان کا مکان خالی کرالیا جائے اور عین مسجد میں مسلمانوں کا قتل عام ہو تو مغربی اقوام کو خوابِ خرگوش سے فرصت نہ ہو؛ لیکن کروڑوں انسانوں کے جذبات کو مجروح کرنے والے ایک مجرم کے حق میں انسانیت اور تہذیب کے نام نہاد علمبردار ایک زباں ہو کر کھڑے ہو جائیں، افسوس کہ مغرب نے اپنے جسم سے حیا کا لباس تو اُتار ہی پھینکا تھا، انصاف وغیر جانبداری کا جو مصنوعی غازہ اپنے چہرہ پر مل رکھا ہے، یہ بھی معمولی واقعات ہی سے اُتر جاتا ہے اور اندر کا مکروہ چہرہ دیکھنے میں ذرا مشکل پیش نہیں آتی!

اہل بیت اور اصحابِ رسول

کچھ مرتبے وہ ہیں جو بنیادی طور پر ''اکتساب''یعنی جد و جہد اور محنت کے ذریعہ حاصل کئے جاتے ہیں، جیسے ایک شخص محنت کر کے عالم بن سکتا ہے یا سنتوں کی پیروی اور اللہ اور اس کے رسول کی منع کی ہوئی باتوں سے بچ کر ولایت کے مقام کو پہنچ سکتا ہے،بعض مراتب وہ ہیں جو انتخاب اور قرآن مجید کی زبان میں ''اجتباء'' کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں،یعنی اللہ اپنے کسی بندے کو اپنے کسی خاص کام کے لئے چن لیتے ہیں،نبوت ایسا ہی درجہ ومقام ہے،ایسا نہیں ہے کہ انسان محنت اور تگ ودو کرے، خوب عبادت وریاضت میں مشغول رہے،تو وہ نبی ہو جائے،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو نبوت ختم ہو چکی؛لیکن آپ سے پہلے جب نبوت جاری تھی،تب بھی اپنی کوشش سے کوئی نبی نہیں بن سکتا تھا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو منتخب کرتے ، وہی نبوت سے سرفراز فرمایا جاتا؛اسی لئے قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے''اجتباء'' کا لفظ آیا ہے (آل عمران:۱۷۹) غرض کہ اللہ تعالیٰ نے خود آپ کو نبوت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نبوت کے لئے آپ کا انتخاب کیا گیا ہے،اسی طرح آپ کے متعلقین بھی اللہ کی طرف سے منتخب ہیں، یہ اتفاقی طور پر آپ کے اہل بیت میں داخل نہیں ہو گئے یا کوئی خاتون ازواج مطہرات میں شامل نہیں ہو گئیں، یا کسی صحابی کو صحابیت کا شرف حاصل نہیں ہو گیا؛ بلکہ یہ سب من جانب اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ونصرت، تائید وتقویت اور آپ کے مشن کی تبلیغ واشاعت کے لئے منتخب کئے گئے ہیں ؛ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے قلوب میں جھانک کر دیکھا،سب سے بہترین قلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پایا تو آپ کو اپنی نبوت ورسالت کے لئے منتخب فرمالیا، پھر بقیہ لوگوں کے قلوب کو دیکھا تو صحابہ کے دلوں کو سب سے بہتر پایا،لہٰذا ان کو اپنے نبی کا وزیر ومعاون بنایا: ''۔۔۔۔ فوجد قلوب أصحابه خير قلوب العباد فجعله وزراء نبيه الخ'' (مسند احمد،حدیث نمبر:۳٦۰۰) حضرت عبد

اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کا ایک اور قول ہے کہ اگر تم کو کسی کی پیروی کرنی ہے تو صحابہ کی پیروی کرو، جن کے دل بہت پاکیزہ تھے، جن کا علم بہت عمیق تھا اور جن کی زندگی میں کوئی تکلف نہیں تھا، خود اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کے لئے منتخب فرمایا تھا: "**اختارهم الله لصحبة نبيه**" (مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۱۲۳۹۸)

صحابہ میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جنہوں نے بحالت ایمان آپ کا دیدار کیا اور پھر ایمان کی حالت میں ہی ان کی وفات ہوئی؛ اس لئے اس میں اہل بیت بھی شامل ہیں، ازواج مطہرات بھی اور دوسرے صحابہ بھی، ان حضرات کی شان وہی تھی جس کو خود قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کافروں کے معاملے میں سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحم دل: ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ۲۹)؛ چنانچہ اہل بیت اور صحابہ کے درمیان بہت ہی خوشگوار اور محبت کے تعلقات تھے۔

اہل بیت میں بنیادی حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت دل اور خواتین جنت کی سردار حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو حاصل تھی؛ کیوں کہ ان ہی کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسلِ مبارک چلی اور پوری دنیا میں پھیلی اور قیامت تک پھیلتی جائے گی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تعریف اور منقبت میں زیادہ روایتیں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے افضل کسی کو نہیں دیکھا، سوائے ان کے والد ماجد یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے: "**ما رأيت قط أحدا أفضل من فاطمة غير أبيها**" (المرتضیٰ: ۸۵، بحوالہ طبرانی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ گفتگو اور بات چیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی اور میں نہیں پائی جاتی تھی (الاستیعاب: ۴/ ۳۷۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک اور روایت منقول ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو وہ ٹھیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح چل رہی تھیں: "**كان مشيها مشي رسول الله صلى الله عليه وسلم**" (الاصابۃ: ۴/ ۳۷۸)۔

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے تعلقات بڑی ہی محبت و مودت اور احترام واکرام پر مبنی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وفات ہی سے حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کی ہدایت پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے لگے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بہ پابندی آپ رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھتے رہے، مشہور مؤرخ علامہ ابن کثیر کے بیان کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد پہلے ہی دوسرے دن آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی؛ البتہ چھ ماہ کے بعد دوبارہ بیعت کی تجدید فرمائی تھی، (البدایہ والنہایۃ: ۵/۲۴۹) بلکہ بعض راویوں نے نقل کیا ہے کہ ایک صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہی اور عرض کیا کہ یہ کیا ہے کہ خلافت قریش کے سب سے کم تر اور کم تعداد قبیلہ کے حصہ میں چلی گئی؟ اگر آپ چاہیں تو میں گھوڑوں اور فوجیوں سے مدینہ کو بھر دوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تو عہدۂ خلافت ان کے حوالہ نہیں کیا ہوتا (کنزالعمال: ۳/۱۴۱)۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ''ذوالقصہ'' نامی علاقہ کی مہم کے لئے مدینہ سے نکلنا اور محاذ جنگ پر جانا چاہتے تھے، نیز اپنی سواری پر بیٹھ چکے تھے تو اسی وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اونٹنی کی مہار تھام لی اور کہا کہ آپ مدینہ سے باہر جا کر ہم لوگوں کو صدمہ سے دوچار نہ کیجئے کہ اس طرح اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لئے بکھر جائے گا، ظاہر ہے یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو مخلص ہو اور محبت کرنے والا ہو، ورنہ جو لوگ بدخواہ ہوتے ہیں، وہ تو ایسے موقع کو غنیمت جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو خطرہ کے مقام پر بھیج دیا جائے؛ تاکہ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو راستہ صاف ہو جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جوں ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع ملی تو آپ عجلت کے ساتھ روتے ہوئے تشریف لائے اور کہا: ''اے ابوبکر! آپ پر اللہ کی رحمت ہو، خدا کی قسم! آپ سب سے پہلے مسلمان ہوئے، آپ کا ایمان سب سے زیادہ کامل درجہ کا تھا، آپ کا یقین پختہ تھا، آپ اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ تھے، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ قابل اعتماد اور قابل احترام تھے، اللہ تعالیٰ آپ کو اسلام کی طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے''، یہ کہتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی توصیف میں طویل گفتگو فرمائی۔ (دیکھئے: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی: المرتضیٰ، ص: ۹۳، عربی نسخہ)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کوبھی اہل بیت سے بے حد محبت تھی، ایک بار عصر کی نماز کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نکلے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا اور کہنے لگے کہ حسن رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہیں علی رضی اللہ عنہ کے مشابہ نہیں ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو سن کر ہنستے رہے۔(بخاری، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

یہی تعاون وتناصر اور محبت وچاہت حضرت عمر اور حضرت علی کے درمیان بھی تھی، ایک بار صدقہ کے جانوروں کے حساب کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سایہ میں بیٹھ گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک ایک اونٹ کا رنگ اور اس کے دانت وغیرہ کی تفصیل بولتے جاتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ املاء کراتے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ لکھتے جاتے، سخت گرمی کا موسم تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ دھوپ میں تھے اور یہ دونوں حضرت سایہ میں تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوتے ہوئے قرآن کی آیت پڑھی: ﴿إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ﴾ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ قوی وامین شخص ہیں: ''هذا القوي الأمين'' (الکامل لابن اثیر: ۳/ ۵۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ کوئی اہم کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے بغیر نہیں کرتے اور جب لوگوں کی رائے میں اختلاف ہوتا تو اکثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کی طرف آپ کا جھکاؤ ہوتا۔

جنگ فارس میں ایک مرحلہ ایسا آیا، جب ایرانیوں نے اپنی پوری طاقت جھونک دی، اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کی فوج کے ساتھ وہ خود آگے بڑھیں اور محاذ جنگ سے قریب قیام کریں، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور ان سے مشورہ طلب کیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کسی کو اپنا نائب بنادیں، خود نہ جائیں؛ کیوں کہ اگر آپ پر کوئی افتاد آ گئی تو اسلام اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا اور اس کا تدارک نہیں ہو سکے گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کی تعریف کی اور فرمایا: یہی رائے قابل عمل ہے: ''هذا هو الرأي'' (المرتضیٰ، ص: ۱۰۵) اسی طرح شام کے محاذ پر جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی

اللہ عنہ کو اطلاع بھیجی کہ رومیوں کا ٹھاٹیں مارتا ہوا لشکر چلا آرہا ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے مشورہ کیا، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود فوج کی کمان سنبھالیں اور محاذ جنگ پر جائیں؛ تا کہ مسلمانوں کا حوصلہ بلند رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر بھی اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ امیر المؤمنین کا خود نکلنا مناسب نہیں؛ کیوں کہ اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آجائے تو مسلمانوں کے لئے کوئی مرجع وماویٰ باقی نہیں رہے گا، (المرتضیٰ: ۱۰۶-۱۰۷) ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کوئی کدورت ہوتی تو وہ اس طرح کا مشورہ نہیں دیتے؛ بلکہ اس بات کو پسند کرتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک خطرہ کی جگہ پر جائیں۔

اس کے برخلاف جب فتح بیت المقدس کے موقع سے عیسائیوں نے مطالبہ کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بیت المقدس آئیں اور اپنے ہاتھ سے صلح نامہ تحریر کریں، اس پس منظر میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وہاں آنے کی درخواست کی، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود نہ جائیں؛ تا کہ رومیوں کی ناک نیچی ہو؛ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ یہ ایک تاریخی شرف کی بات ہے اور اس طرح مسلمانوں کو جنگ سے بچایا جا سکتا ہے؛ اس لئے امیر المؤمنین کو سفر کرنا چاہئے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب بنا کر تشریف لے گئے اور اس طرح بیت المقدس فتح ہوا۔

دوسری طرف خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں اہل بیت کی بڑی عظمت ومحبت تھی، ایک بار یمن سے کپڑے آئے، جن کو عرب ''حلہ'' کہتے تھے، آپ نے سبھوں کو تقسیم کیا، لوگ نئے نئے لباس پہن کر مسجد نبوی میں آئے، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتے اور ان کا شکریہ ادا کرتے، اتنے میں حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما مکان سے نکلے، ان کے جسم پر حلہ نہیں تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اداس بیٹھے ہوئے تھے، لوگ اس اداسی کا سبب پوچھنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان دونوں بچوں کو حلہ نہیں مل سکا؛ کیوں کہ یہ حلے ان کے قد سے بڑے تھے، پھر آپ نے یمن کے گورنر کو خط لکھا کہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے لئے جلد سے جلد دو حلے بھیجے جائیں، جب یہ حلے آئے

اور آپ نے انہیں پہنایا، تب جا کر آپ کو اطمینان ہوا۔ (الاصابۃ:۱/۱۰۶)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب مالی فراوانی ہوئی تو آپ نے لوگوں کے لئے وظیفہ مقرر کرنا چاہا، اور ترتیب کیا ہو؟ اس کے لئے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ امیر المؤمنین آپ اپنے آپ سے شروع کیجئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، میں اس شخص سے شروع کروں گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی رشتہ دار ہوگا، ان کے بعد بنو ہاشم کے دوسرے لوگوں کا حصہ مقرر کروں گا؛ چنانچہ سب سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حصہ مقرر کیا، حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما حالاں کہ اس وقت بچے تھے؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کی وجہ سے ان کا بھی حصہ مقرر فرمایا، (کتاب الخراج لابی یوسف، ص: ۲۴) اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی وجہ سے بدری صحابہ کے برابر ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ (المرتضیٰ، ص:۱۱۰)

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے خواہش کی کہ وہ ان کے پاس آیا کریں، میں ایک دن گیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ خلوت میں تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے داخل ہونا چاہتے تھے، مگر ان کو اجازت نہیں ملی؛ اس لئے میں واپس آ گیا، پھر ملاقات کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنے کے بارے میں یاد دلایا، تو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس موقع کا ذکر کیا اور کہا کہ جب میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ انہیں واپس ہونا پڑا تو میں بھی واپس ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ اجازت کے مستحق تھے، پھر اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ اِس میں ایمان کا جو پودا لگا ہے، وہ اللہ کے فضل سے اور پھر تم لوگوں یعنی خانوادۂ نبوت کے ذریعہ سے ہے۔ (الاصابۃ:۱/۱۳۵)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خانوادۂ نبوی سے ایسی عقیدت تھی کہ آپ نے عمر کے تفاوت کے باوجود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح کی خواہش کی اور فرمایا کہ یہ رشتہ میں صرف خانوادۂ نبوت سے نسبت کے لئے چاہتا ہوں؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام خاندانی نسبتیں قیامت میں منقطع ہو جائیں گی سوائے میری نسبت کے؛ اسی لئے میں اس رشتہ کا متمنی ہوں؛ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی اس خواہش کو قبول کرتے ہوئے اپنی صاحبزادی کو ان کے نکاح میں دے دیا اور ان ہی سے زید بن عمر بن خطاب پیدا ہوئے، جو فخر کرتے تھے کہ میں دو خلفاء کی اولاد میں ہوں، ایک: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے: حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اکثر فیصلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے پر ہوتے تھے، عراق کی مفتوحہ زمین مجاہدین میں تقسیم کی جائیں یا بیت المال کی ملکیت ہو؟ اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے تھی کہ بیت المال کی ملکیت ہو اور اسی پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فیصلہ کیا، اسلامی کیلنڈر کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے تھی کہ اس کا نقطۂ آغاز واقعہ ہجرت کو بنایا جائے اور اسی پر فیصلہ ہو؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعض مواقع پر فرمایا کہ اگر علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نہ ہوتے تو عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہلاک ہو جاتا: **''لو لا علي لھلک عمر''** (**الاستیعاب**)

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوئی اور ان کی لاش کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی، تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے، چہرے سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا: اے ابوحفص! آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں کہ جس کے نامۂ اعمال کے ساتھ مجھے اللہ کے یہاں جانا پسند ہو: **''فو اللہ ما بقي بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أحد أحب إليّ أن القی اللہ بصحیفتہ منک''** (مسند احمد) --- حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ زار و قطار رو رہے تھے، جب ان کے گریہ وزاری کو دیکھ کر لوگوں نے سوال کیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ بات کہی، جو ان کی دور رس نظر کی دلیل اور گہری بصیرت کی آئینہ دار ہے، آپ نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موت سے ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو قیامت تک پُر نہ ہو سکے گا۔ (دیکھئے: المرتضیٰ، ص: ۱۴۴)، غرض کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان گہری محبت اور باہمی ہمدردی کا تعلق تھا، وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ اور قدر شناس تھے، ان کی دلوں میں نہ کوئی کینہ تھا، نہ کدورت، وہ **''أشداء علی الکفار''**

اور ''رحماء بینھم'' کے بہترین مصداق تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کے درمیان دوسری خاندانی نسبتوں سے تو قرابت تھی ہی، ساتھ ہی ساتھ دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا شرف بھی حاصل تھا، گویا ان حضرات کی حیثیت ایک گھر کے دو افراد کی سی تھی؛ اسی لئے دونوں میں بڑی محبت اور ایک دوسرے کا پاس ولحاظ تھا، جب فتنہ پرداز سبائیوں نے خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کرلیا تو مہاجرین وانصار کی بڑی جماعت - جن کی تعداد سات سو کے قریب تھی - حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تحفظ کے لئے ان کے گھر میں فروکش ہوگئی، ان میں حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما بھی تھے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہتر اصرار کے ساتھ اپنی مدد کو آئے ہوئے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں، یہاں تک کہ اپنے غلاموں سے فرمایا کہ جو اپنی تلوار نیام میں رکھ لے، وہ آزاد ہے، بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بار بار کے اصرار پر یہ حضرات وہاں سے واپس ہوئے؛ لیکن سب سے آخر میں جس نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کو چھوڑا، وہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما تھے، (البدایہ والنہایۃ لابن کثیر: ۷/۱۸۱) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دو بار اجازت طلب کی کہ وہ ان کے دفاع کے لئے جنگ کریں؛ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر عرض کیا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس پر حق ہے اور جس کو اقرار ہو کہ اس پر میرا کوئی حق ہے تو وہ میری خاطر پچھنہ لگانے کے بہ قدر بھی خون نہ بہائے، جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دو دو بار اجازت طلب کرنے کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو قبول نہیں کیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھنے چلے گئے، باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے گذارش کی کہ آپ نماز پڑھائیں، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں کو اس حال میں نماز نہیں پڑھا سکتا کہ امام المسلمین محصور ہوں؛ بلکہ میں تنہا نماز پڑھوں گا؛ چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تنہا نماز ادا فرمائی اور گھر واپس ہوگئے۔ (المرتضیٰ، ص: ۱۳۴)

جب محاصرہ سخت ہوگیا، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پانی ختم ہوگیا اور آپ نے مسلمانوں سے فریاد کی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ باغیوں کے علی الرغم ایک مشکیزہ پانی لے کر بہ

مشقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچے اور انہیں پانی مہیا کیا؛ حالاں کہ باغیوں نے انہیں سخت سست بھی کہا اوران کی سواری کو بھگا دیا۔(البدایہ والنہایہ: ۷ / ۱۸۷)

اہل بیت اور دوسرے صحابہ کے درمیان خوشگوار تعلق کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں کثرت سے رشتہ داریاں تھیں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں یکے بعد دیگرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں رہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتی کا نکاح حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض روایات کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا، اہل بیت کی ایک اہم ترین شخصیت امام محمد باقر کا نکاح حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے قاسم ابن محمد کی صاحبزادی ام فروہ سے ہوا، اسی سے امام جعفر صادق جیسے فقیہ اور صاحب علم پیدا ہوئے، جن سے امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء اہل سنت کو تلمذ رہا ہے، امام جعفر صادق کی والدہ ام فروہ ہیں، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے قاسم کی صاحبزادی ہیں اور ان کی نانی اسماء بنت عبدالرحمن ہیں، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتی ہیں، اسی لئے امام جعفر صادق کہتے تھے:''ولدني أبو بكر مرتين'' یعنی: ''میں دو جہت سے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد ہوں''۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں گذر چکا ہے کہ حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ان کا نکاح ہوا، جن سے زید بن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدا ہوئے، وہ اس بات پر ناز کرتے تھے کہ میں دو خلفاء راشدین کا بیٹا ہوں، یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیٹا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نواسہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آل کے ساتھ آل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شادی بیاہ کے رشتہ کثرت سے ہوئے ہیں؛ کیوں کہ زمانہ جاہلیت میں بھی بنوامیہ اور بنو ہاشم کے درمیان کثرت سے رشتہ داری تھی، اس سلسلہ میں ''**آل البيت والصحابة - صحبة وقرابة**'' (جس کا ترجمہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ سے شائع ہو چکا ہے) میں اس پہلو پر چارٹ کے ساتھ بڑی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، خاص کر یہ بات بہت اہم ہے کہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی جو نسلیں معروف ہیں، وہ زیادہ تر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتیوں، نواسیوں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے ہوئی ہیں۔

انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے، اس کے نام پر لوگ اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں، اس

نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اہل بیت کے حسنی اور حسینی خانوادہ میں کثرت سے ابوبکر، عمر، عثمان اور عائشہ کے نام ملتے ہیں، خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک صاحبزادے کا نام ابوبکر تھا، جو میدان کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شہید ہوئے تھے، حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ایک صاحبزادے کا نام بھی ابوبکر تھا، جنہوں نے کربلا میں اپنے چچا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شہادت پائی، حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک صاحبزادے علی زین العابدین ہیں، جن سے آپ کی نسل مبارک چلی، ان کی بھی کنیت ابوبکر تھی، امام جعفر صادق کے پوتے امام علی رضا کے ایک صاحبزادے کا نام بھی ابوبکر تھا، حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے بھی ابوبکر سے موسوم تھے، جنہوں نے کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک صاحبزادے ''عمر الأطلف'' تھے، جن کی والدہ کا نام تھا ''أم حبیب صهباء التغلبی''، حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک صاحبزادے کا نام عمر تھا جو کربلا میں شہید ہوئے، حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے حضرت علی زین العابدین کے ایک صاحبزادے کا نام تھا ''عمر الأشرف''، امام موسیٰ کاظم کے بھی ایک صاحبزادے عمر نام کے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادوں میں ایک کا نام عثمان بھی تھا جو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شہید ہوئے، حضرت عقیل بن ابی طالب کے بھی ایک صاحبزادے کا نام عثمان تھا ---- اسی طرح اہل بیت اطہار میں بہت سی خواتین عائشہ نام کی ملتی ہیں، جیسے امام موسی کاظم کی صاحبزادی کا نام عائشہ تھا، موسیٰ کاظم کے صاحبزادے جعفر کی بھی ایک بیٹی عائشہ تھیں، علی رضا کی ایک صاحبزادی بھی عائشہ تھیں، علی رضا کے پوتے علی ہادی کی صاحبزادی کا نام بھی عائشہ تھا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے سید ابراہیم بن احمد الکتانی کو کہ انہوں نے ''**الأسماء والمصاهرات بین أهل البیت والصحابة**'' کے نام سے اس موضوع پر ایک بڑا عمدہ اور چشم کشا رسالہ مرتب کیا ہے، جس کا اردو ترجمہ معروف محقق مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کے زیر اہتمام طبع ہو چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان ایسے افراد کے نام پر اپنے بچوں کے نام نہیں رکھتا جن کی شخصیتیں اس کو

محبوب نہ ہوں، یا جن سے اسے نفرت ہو؛ لہٰذا ان باہمی رشتہ داریوں اور ایک دوسرے کے نام پر اپنی اولاد کے نام رکھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے درمیان بے حد محبت وخلوص کا تعلق تھا، وہ ایک دوسرے کی عزت کرنے والے اور ایک دوسرے سے محبت رکھنے والے تھے، دنیا میں بھی ان کے قلوب کینہ وکدورت سے خالی تھے اور آخرت میں بدرجہ اولیٰ رہیں گے، ہمارا بھی رویہ یہی ہونا چاہئے کہ ہم اہل بیت اطہار، ازواج مطہرات اور تمام صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے محبت کریں اور اپنے دل ان کی طرف سے صاف رکھیں: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الحشر:۱۰)

ہائے، اس امت کیلئے کوئی حسن بن علیؓ نہیں!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں امتحان اور آزمائش کے لئے پیدا کیا ہے؛ اسی لئے جہاں اس میں خیر اور نیکی کے جذبات رکھے گئے ہیں، انہیں کے پہلو بہ پہلو اس میں کچھ اخلاقی کمزوریاں بھی رکھی گئی ہیں، ان میں بعض کمزوریاں وہ ہیں جو انسان کو جھگڑے لڑائی اور نزاع وجدال کی طرف لے جاتی ہیں، جیسے قرآن مجید نے انسان کی نفسیات یہ بتائی ہے کہ اس کے اندر مال ومتاع کی غیر معمولی محبت رکھی گئی ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ (العادیات:۸) حب مال کی سرحد بخل اور تنگ دلی سے ملتی ہے جو شخص مال کا پرستار ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس صرف دولت آنے کا راستہ ہو، جانے کا راستہ نہ ہو، اس کی آمدنی تو خوب ہو؛ لیکن خرچ کم سے کم ہو، یہ وصف بھی انسان میں موجود ہے: ﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (النساء:۱۲۸) جو انسان صرف لینا جانتا ہو، دینا نہ جانتا ہو، اس میں ناشکری اور احسان ناشناسی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنے محسن کے احسان کو بھی بھول جاتا ہے، یہ ناشکری واحسان ناشناسی بھی انسان کے اندر پائی جاتی ہے: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ﴾ (العادیات:٦) جب انسان دوسرے کا مال بے جا طریقہ پر حاصل کرنا چاہتا ہے، دوسرے کا حق دینا نہیں چاہتا، خود فائدہ اٹھانے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا خواہاں ہوتا ہے تو یہی چیز باہمی اختلاف وجدال کا باعث ہوتی ہے؛ چنانچہ انسان کے اندر جنگ وجدال کا مادہ ہر مخلوق سے بڑھ کر ہے، خود اللہ نے انسان کی اس فطری کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے: ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الکہف:۵۴)۔

اسی لئے افراد، جماعتوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان نزاع واختلاف کی تاریخ قریب قریب اتنی ہی قدیم ہے، جتنی خود انسان کی، خود حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان نزاع اتنی بڑھی کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کردیا، (المائدۃ:۳۰) ملکوں اور قوموں کے درمیان اتنی جنگیں ہوئی ہیں کہ اگر معلوم ومحفوظ تاریخ سے ان واقعات کو نکال دیا جائے تو شاید اس کا حجم دس

فیصد ہی باقی رہ جائے، یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے درمیان ایسی خونریز جنگ ہوئی ہے کہ اس کے تذکرہ سے بھی کلیجہ لرز جاتا ہے، مہا بھارت میں لکھی گئی داستانیں اگر حقیقی واقعات ہوں تو کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان جنگ میں اتنے سارے لوگ مارے گئے کہ اگر ہندوستان کے طول وعرض پر ان کی لاشیں بچھادی جاتی تو شاید ایک گز زمین بھی خالی نہ رہتی، عیسائی دنیا میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان جو نزاع برپا ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو کافر قرار دیا، اس کے نتیجہ میں لاکھوں افراد زندہ جلا دئے گئے؛ کیوں کہ ان کے یہاں ارتداد کی سزا ہی یہی تھی، مذہبی بنیاد پر لڑائی کے علاوہ جغرافیائی سرحدوں کی توسیع اور نسلی برتری کے جذبہ سے جو جنگیں ہوئی ہیں، وہ بھی کچھ کم ہولناک نہیں تھیں؛ چنانچہ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم میں شامل بیشتر عوام کا تعلق عیسائیت سے تھا؛ بلکہ جاپان اور ترکی کو چھوڑ کر جنگ کے تقریباً سبھی فریق عیسائی تھے۔

عالم اسلام میں اقتدار کے لئے تو خونریزیاں ہوتی رہی ہیں، ایک خاندان نے دوسرے خاندان سے، ایک رنگ ونسل کے لوگوں نے دوسرے رنگ ونسل کے لوگوں سے؛ یہاں تک کہ بعض اوقات ایک بھائی نے دوسرے بھائی سے اقتدار کو چھیننے کے لئے طاقت کا استعمال کیا ہے؛ لیکن اکثر مذہبی اختلاف کی بنیاد پر اس وقت تک جنگ کی نوبت نہیں آئی، جب تک برسر اقتدار گروہ کے خلاف دوسرے گروہ نے ہتھیار نہیں اٹھایا، مسلمانوں کا عام رویہ یہ رہا ہے کہ وہ باہمی اختلاف کے باوجود اعداء اسلام کے مقابلہ میں ایک طاقت بن کر رہے ہیں، مگر افسوس کہ موجودہ حالات میں صورت حال بالکل برعکس ہے، جو قومیں آپسی جنگ وجدال میں ضرب المثل تھیں، انہوں نے ایک دوسرے سے خاموش صلح کر لی ہے اور مسلمانوں کی صورت حال یہ ہے کہ مشترک دشمن کا خوف بھی انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانے سے قاصر ہے۔

عام طور پر ہم لوگ اس کے لئے صہیونی اور صلیبی طاقتوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور یہ بات بعید از حقیقت بھی نہیں، یورپ نے نظام خلافت کو ختم ہی اسی لئے کیا کہ مسلمان اس طرح بکھر جائیں کہ پھر کبھی متحد ہو کر مغرب کو چیلنج کرنے والی طاقت نہ بن سکیں؛ لیکن جب تک انسان اندر سے کمزور نہیں ہوتا باہر کی طاقت اسے کمزور نہیں کرسکتی، جب جسم کی قوتِ مدافعت کمزور ہوجاتی ہے، تب باہر سے بیماریاں حملہ آور ہوتی ہیں؛ اس لئے مسلمانوں کو خود اپنی صورت حال کا جائزہ لینا چاہئے، اس حقیر

کے خیال میں دو ایسی کمزوریاں ہیں جو ہمارے اختلاف و انتشار کو بڑھاتی جارہی ہیں، ایک بے برداشت ہونا، اختلاف رائے کا تحمل نہ ہونا اور تھوڑے سے اختلاف میں بھی مشتعل ہوجانا، یہ ایک نفسیاتی کمزوری ہے، جو اہل مغرب کی زیادتی کی وجہ سے مسلمانوں میں پیدا ہوگئی ہے؛ کیوں کہ فطری طور پر مظلومیت کا احساس انسان کو بے برداشت کردیتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں ایسے لوگوں کی بڑی کمی ہے جو آپس میں لڑنے والے مسلمان افراد، گروہوں، جماعتوں اور تنظیموں کے درمیان مصالحت کرانے کا کردار ادا کرسکیں، یہ کمی خاندان سے لے کر ملکوں کی سطح تک ہے، جھگڑنے والے موجود ہیں؛ لیکن صلح کرانے والے موجود نہیں، اختلاف کی کھائیاں بڑھتی جارہی ہیں؛ لیکن اختلاف کو پاٹنے والے لوگ موجود نہیں، لڑائی جھگڑے کی چنگاری کو شعلۂ آتش بنادینے والے موجود ہیں؛ لیکن چنگاری کو بجھانے اور اس کو خاکستر کردینے والی صلاحیتیں موجود نہیں ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ اختلاف کی کوئی معمولی بنیاد پڑ جاتی ہے تو وہ بڑھتی ہی جاتی ہے، ختم ہونے کا نام نہیں لیتی؛ حالاں کہ اسلام کی نظر میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا ایسا اہم عمل ہے کہ اسے عبادت پر بھی فوقیت دی گئی ہے، قرآن مجید نے کم سے کم آٹھ مواقع پر صلح کرانے کی اہمیت کو بیان کیا ہے، نکاح پر چوں کہ خاندان کی بنیاد اور اساس ہے؛ اس لئے قرآن مجید میں کم سے کم تین تین مواقع پر میاں بیوی کے درمیان باہمی کوششوں سے یا خاندان کے بزرگوں کی مداخلت سے صلح جوئی کی تاکید کی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ صلح کرانے کی کوشش کی جائے گی تو یہ کوشش نتیجہ خیز اور ثمر آور ہوگی: ﴿اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾ (النساء: ۳۵) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خاص طور پر حکم دیا کہ تم لوگ باہمی اختلافات اور کدورتوں کو دور کرو: ﴿وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ (الانفال: ۱) یہ بھی ارشاد ہوا کہ اکثر و بیشتر جو سرگوشیاں ہوتی ہیں اور خفیہ میٹنگیں کی جاتی ہیں، ان میں خیر کا پہلو نہیں ہوتا؛ لیکن اس سے تین صورتیں مستثنیٰ ہیں: ایک یہ کہ اس کا مقصد خیر کے کام میں خرچ کرنا ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ نیکی کے کام کی دعوت دی جائے اور تیسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان صلح کرائی جائے: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ﴾

(النساء: ۱۱۴) افراد کے درمیان صلح کرانے کی تو اہمیت ہے ہی؛ لیکن اگر مسلمانوں کے دو گروہوں کے

درمیان نزاع پیدا ہوجائے اور یہ نزاع قتل وقتال تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ان کے درمیان صلح کرائیں: ﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾ (الحجرات:۹) پھر اس پس منظر میں یہ بات بھی فرمائی گئی کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اگر تم ان کے درمیان صلح کرا دو تو یہ گویا دو بھائیوں کے درمیان صلح کرانا ہے: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (الحجرات:۱۰)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے دریافت کیا کہ کیا میں تم کو روزہ، نماز اور صدقہ سے بھی افضل اعمال نہیں بتلاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا: ضرور، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: باہمی اختلاف کو دور کرنا اور صلح کرانا؛ کیوں کہ یہ اختلافات دین کو برباد کر دینے والے ہیں: ''۔۔۔قال: صلاح ذات البين فإن فساد ذات البين هي الحالقة'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۹۱۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک عہد نامہ لکھا یا اور اس میں یہ بات لکھی کہ تین امور میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے: اول: دیت ادا کرنے میں، دوسرے: قیدیوں کا فدیہ دے کر ان کو رہا کرانے میں، تیسرے: مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے میں، (مسند احمد، حدیث نمبر: ۶۹۰۳، عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ہر ایسے شخص کی مغفرت کر دی جاتی ہے، جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا سوائے ان دو آدمیوں کے جن کو ایک دوسرے سے کینہ و کدورت ہو، اللہ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ دونوں صلح نہ کرلیں، ان کی مغفرت کو ملتوی رکھو (مسلم عن ابی ہریرۃ، حدیث نمبر: ۲۵۶۵) ----- جھوٹ بولنا حالاں کہ گناہ کبیرہ ہے؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصلاح بین المسلمین کے لئے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسا شخص جھوٹا نہیں، یعنی اس پر جھوٹ بولنے کا گناہ نہیں: ''ليس الكذاب الذي يصلح بين الناس'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۹۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اس بات پر توجہ دیتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف ہو تو فوراً اس اختلاف کو باہمی صلح سے ختم کر دیا جائے، ایک بار اہل قبا کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کے درمیان لڑائی ہوگئی ہے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے پر سنگ باری کر رہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: ہمیں لے چلو تا کہ ہم ان کے درمیان صلح کرادیں: ''**اذهبوا بنا نصلح بينهنم**'' (**بخاری**، حدیث نمبر: ۲۶۹۳) ایک بار آپ ﷺ اپنے حجرہ اقدس میں تھے کہ حضرت کعب بن مالک اور ابن ابی حدرد کے درمیان قرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں کچھ کہا سنی ہوگئی اور آواز اتنی اونچی ہوگئی کہ آپ ﷺ تک پہنچ گئی، حضرت کعب کا قرض ابن ابی حداد کے ذمہ باقی تھا، آپ ﷺ نے حجرہ مبارک کا پردہ ہٹایا اور حضرت کعب کو ہاتھ کے اشارہ سے فرمایا کہ تم آدھا قرض معاف کردو، حضرت کعب نے قبول فرمالیا، اب آپ ﷺ نے دوسرے فریق سے فرمایا کہ تم کھڑے ہو اور ابھی اس کا قرض ادا کردو: ''قم فاقضه'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۱۰)۔

مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی اہمیت آپ ﷺ کی نظر میں اس درجہ تھی کہ آپ ﷺ ایک بار قبیلہ بنو عمرو بن عوف میں کچھ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے تشریف لے گئے، اچھی خاصی تاخیر ہوگئی، نماز شروع ہونے کے بعد آپ تشریف لائے اور پہلی صف میں کھڑے ہوگئے، لوگ حضرت ابوبکر کی ہاتھ کی پشت تھپ تھپا کر متوجہ کرنے لگے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نماز میں اتنا خشوع ہوتا تھا کہ گرد و پیش سے بے خبر ہوجاتے تھے؛ لیکن بالآخر جب لوگوں نے زیادہ تھپتھپایا تو متوجہ ہوئے اور دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ شریک نماز ہیں، حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر کو اشارہ کیا کہ وہ نماز پوری کرلیں؛ لیکن حضرت ابوبکر کو یہ گوارہ نہیں ہوا، انہوں نے اس عنایت پر ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور پیچھے آگئے، پھر حضور ﷺ نے آگے بڑھ کر نماز پوری فرمائی۔ (بخاری عن سہل بن سعد، حدیث نمبر: ۲۶۹۰) — قابل توجہ بات یہ ہے کہ صحت اور امن کی حالت میں یہی ایک موقع ہے جس میں آپ ﷺ شروع سے شریک نماز نہیں رہے اور یہ نوبت مسلمانوں کے دو خاندانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے پیش آئی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کا عمل رسول اللہ ﷺ کی نظر میں کتنا اہم تھا؟

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عہد صحابہ میں دو ایسے واقعات پیش آئے کہ اگر ان میں بعض صحابہ ایثار اور صلح بین المسلمین کے جذبہ سے کام نہ لیتے تو ایک ایسی لڑائی بھڑک اٹھتی کہ مسلمان آپسی اختلافات ہی میں الجھ کر رہ جاتے اور امن وامان کی فضا قائم ہونے کے بعد اسلامی فتوحات، اسلامی مملکت کی توسیع، دعوت دین، علوم اسلام کی نقل وروایت اور تدوین وحفاظت کا جو کام انجام پایا،

بظاہر اس کا انجام پانا دشوار ہوتا، ایک اختلاف حضرت عمر کی شہادت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت چھ ایسی شخصیتوں کو نامزد کیا تھا، جو آسمانی علم وفضل کے کواکب ونجم تھے اور جو سب کے سب ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جن کے بارے میں آپ ﷺ نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی تھی اور ان کے حق میں بڑے اونچے تعریفی کلمات بھی ارشاد فرمائے تھے، یہ تھے: حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر - رضی اللہ عنہم - ایسی عظیم ہستیوں کے درمیان ترجیحات مقرر کرنا اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آسان نہیں تھا؛ چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے مشورہ دیا کہ تین افراد تین ساتھیوں کے حق میں دست بردار ہوجائیں؛ تا کہ یہ چھ سے کم ہو کر تین ہوجائیں؛ چنانچہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا، مگر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنا نام واپس لے لیا، اب صرف دو نام رہ گئے، حضرت عبدالرحمن بن عوف کو ان دونوں حضرت نے انتخاب کا مجاز گردانا، انہوں نے زیادہ سے زیادہ اہل مدینہ سے رائے لینے کی کوشش کی یہاں تک کہ پردہ نشیں خواتین سے بھی رائے لی اور پھر کثرت رائے کی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا گیا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، اس موقع پر حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جو طریقہ کار اختیار کیا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے علم وفضل، اسلام کے لئے غیر معمولی خدمات، حضور ﷺ سے نسبی قرابت اور خواص صحابہ کی جانب سے ان کی تائید کے باوجود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، ان دونوں نے مسلمانوں کو ایک بڑے اختلاف سے بچالیا، ورنہ جو اختلاف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد پیدا ہوا وہ ابھی ہی پیدا ہو گیا ہوتا۔

دوسرا واقعہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا ہے، حضرت حسن رسول اللہ ﷺ کے دو محبوب نواسوں میں سے ایک تھے، وہ صرف نسبتی شرافت ہی کے حامل نہ تھے؛ بلکہ علم وفضل، ورع و تقوی میں بھی امتیازی شان رکھتے تھے اور اسی لئے تمام صحابہ اور مسلمان انہیں بے حد عزت وتوقیر اور عظمت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، صورت حال یہ ہوئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے

بعد حجاز وعراق کے مسلمان اور اکابر صحابہ نے حضرت حسن کے ہاتھ پر بیعت کی، وہ سب ان کو بجا طور پر خلیفہ برحق تصور کرتے تھے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد تیس سال تک ’خلافت علی منہاج النبوۃ‘ کی پیشن گوئی فرمائی تھی اور یہ مدت ٹھیک حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری پر مکمل ہوتی ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں اہل شام تھے، جن کی قیادت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں دو بار شامیوں کا حملہ ہو چکا تھا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کے بعد پھر شامی فوجیں بڑھیں، ادھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فوج بھی معرکہ کے لئے تیار تھی، جو بقول حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پہاڑوں کی طرح تھی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح جو، رحم دل طبیعت اور امت محمدیہ کے ساتھ غیر معمولی شفقت نے اس بات پر آمادہ نہیں ہونے دیا کہ ڈھیر سارے مسلمانوں کا خون بہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ایک خوش تدبیر اور حلیم و بردبار حکمراں تھے اور ان کو بھی جنگ وجدال پسند نہیں تھا۔

اگرچہ حضرت امیر معاویہ کو بعض بنوامیہ نے جنگ پر اکسانے کی کوشش کی؛ لیکن انہوں نے فرمایا کہ آخر خون تو مسلمانوں ہی کا بہے گا اور ایسے ایسے لوگ جب قتل ہو جائیں گے تو ہم کام کن سے لیں گے؟ اور اتنی ساری مسلمان بیوہ خواتین اور یتیم بچوں کی نگاہ داشت کیسے ہو سکے گی؛ چنانچہ حضرت معاویہ نے صلح کا پیغام لے کر بھیجا اور بعض تاریخی روایتوں کے مطابق اپنی دستخط کے ساتھ سادہ کاغذ بھیج دیا کہ اگر حسن خلافت سے دست بردار ہو جائیں تو اس پر وہ جو بھی شرطیں لکھ دیں، مجھے منظور ہیں، جب قاصد خط لے کر آیا تو حالاں کہ ابھی خط حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیش بھی نہیں کیا گیا تھا، مگر انہوں نے خود ہی اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مسلمانوں میں انتشار بڑھے اور خون ریزی ہو، جب قاصدوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تحریر پیش کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے کسی ردوکد کے بغیر اس کو قبول فرما لیا، بعض لوگوں نے بزدلی کے طعنے بھی دئے، عراق کے جو خوارج فوج میں شامل تھے، انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دینے میں کوئی تاخیر نہیں کی؛ لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے ان سب کی پرواہ کئے بغیر صلح نامہ پر دستخط کر دیا اور خلافت سے دست بردار ہو گئے، اس طرح پھر پورا عالم اسلام ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گیا، اور رسول اللہ ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی، جس کو حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ

منبر پر تشریف فرما ہیں اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بازو میں ہیں، آپ ﷺ ایک دفعہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور دوسری دفعہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہ کے درمیان صلح کرائیں گے: ''**إن ابني هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين**'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۰۴) — یقیناً حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے ایثار اور صلح جوئی نے ایک ایسی خوشگوار تاریخی صلح کو وجود بخشا، جس نے اسلامی فتح مندی میں بنیادی کردار ادا کیا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں ابن سبا کی طرف سے جو فتنہ سامانی کی گئی، اس کے بعد سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ رک گیا تھا، مسلمان باہمی جنگوں میں الجھ گئے تھے؛ لیکن جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو آپسی اختلاف سے اطمینان ہوگیا تو پھر انہوں نے اعداء اسلام کی طرف توجہ کی اور اسلامی مملکت کی سرحدوں کی وسعت بڑھنے لگی، ان فتوحات میں یقیناً حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ایثار کا حصہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خوش تدبیری سے کچھ کم نہیں تھا۔

اِس وقت کی صورت حال یہ ہے کہ عالم اسلام میں ہر جگہ انتشار اور بکھراؤ کی کیفیت ہے، شام کی ظالم حکومت اہلسنت پر جور وستم ڈھا رہی ہے، مصر میں کچھ بد دین اور خدا بیزار لوگوں نے یہود ونصاریٰ کے ساتھ مل کر سازش کر کے ایک جائز اور منتخب حکومت کا تختہ پلٹ دیا ہے اور اہل دین پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے، ترکی اور تیونس میں منتخب حکومت کو گرانے کی سازش جاری ہے، لیبیا میں اخوان پر زیادتی ہو رہی ہے اور بحرین میں شیعہ اقلیت کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا گیا ہے، افغانستان اور پاکستان میں طالبان اپنے ہی بھائیوں کے درمیان قتل وقتال کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں، بنگلہ دیش میں ایک دین بے زار باپ کی دین بے زار بیٹی نے دینداروں کے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے؛ یہاں تک کہ انہیں تختۂ دار پر چڑھایا جا رہا ہے، اس کے علاوہ برصغیر میں اس وقت مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان جو کشاکش ہے، ایک دوسرے کو کافر وفاسق قرار دینے کی مہم ہے، اپنے آپ کے سوا ہر ایک کو باطل پر ٹھہرانے کی کوشش ہے، یہ اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، پڑوسی ملک میں تو اس کی وجہ سے مذہبی قائدین کو قتل کرنے کے واقعات بھی آئے دن بڑھتے جا رہے ہیں، ہندوستان میں اگرچہ نوبت یہاں تک نہیں آئی ہے؛ لیکن نفرتیں یہاں بھی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔

ان حالات میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کچھ سمجھ دار افراد اٹھیں، آپس کی خلیج کو پاٹنے اور مسلمانوں کو متفق کرنے کی کوشش کریں اور اگر اتفاق نہ ہوسکے تو مشترکہ امور پر اشتراک وتعاون کا ماحول پیدا کریں، اس حقیر کا احساس ہے کہ اگر سعودی عرب اور ایران مل کر عدل وانصاف اور خلوص کے ساتھ شرق اوسط کے مسلم ممالک کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں اور طرفداری کی بجائے عدل کا راستہ اختیار کریں، نیز رائے عامہ کا احترام کریں تو ان ممالک کے درمیان صلح کی فضاء قائم ہوسکتی ہے، امن وامان بحال ہوسکتا ہے اور ان کی جو طاقت باہمی خون ریزی میں ختم ہورہی ہے، وہ اسرائیل جیسے دشمن کے غاصبانہ قبضہ کو ختم کرنے میں استعمال ہوسکتی ہے، اسی طرح پاکستان، افغانستان، یمن، لیبیا، ترکی، تیونس، بنگلہ دیش جیسے ممالک میں اگر سعودی عرب حکومت اور عوام کے درمیان صلح کرانا چاہے تو اسے کامیابی حاصل ہوسکتی ہے اور ایک بڑا فتنہ ٹل سکتا ہے، عالم اسلام کی طاقت آپس میں ضائع ہونے سے بچ سکتی ہے، اسرائیل سے بیت المقدس کو آزاد کرانے کی کوشش ہوسکتی ہے، اور ملک کے وسائل کو علمی وسائنسی ترقی اور عوام کی خوشحالی وبہبودی میں خرچ کیا جاسکتا ہے، افریقہ کے وہ ممالک جہاں مسلمان فاقہ اور افلاس کی وجہ سے عیسائیت قبول کررہے ہیں، ان کے ایمان کو بچایا جاسکتا ہے اور دعوت دین کی زبردست اور کامیاب کوشش کی جاسکتی ہے، مگر افسوس کہ اس کی بجائے وہ مسلم ممالک جو ایسے معاملات میں مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں، خود ہی حریفانہ کشمکش میں مبتلا ہیں، کاش مسلم ممالک اس سمت میں غور کریں اور وہ وقتی وجزوی سیاسی مفادات سے اوپر اٹھ کر پوری امت مسلمہ کے بارے میں سوچیں۔

اسی طرح ہندوستان اور پڑوسی ملکوں میں مسلکی اختلاف کی بنیاد پر جو شدت پسندی پیدا ہورہی ہے؛ یہاں تک کہ ہر حلقہ کی مسجدیں الگ ہیں، امام الگ ہیں، مفتی وقاضی الگ ہیں، مدارس ودینی تنظیمیں الگ ہیں، ایک مسلک سے تعلق رکھنے والا دوسرے مسلک کی مسجد میں یا تو جاتا نہیں ہے، یا جائے تو سہما سہما رہتا ہے، یہاں تک کہ آج ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ نکاح کو بھی منع کیا جاتا ہے، طلاقیں دلوائی جاتی ہیں، ایک دوسرے پر نماز جنازہ پڑھنے سے روکا جاتا ہے، بعض معاملات میں ایسی شدت برتی جاتی ہے کہ شریعت نے کسی بھی انسان کے ساتھ ایسے سلوک کی اجازت نہیں دی ہے، مثلاً: اسی کو دیکھئے کہ قرآن مجید نے غیر مسلموں کے معبودان باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے (الانعام:

۱۰۸)؛ کیوں کہ اس سے غیر مسلم بھائیوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، پھر کیا مسلمانوں کے لئے اس بات کی اجازت ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے مخالف لوگوں پر سب وشتم کریں، تنابز بالالقاب کریں، جو باتیں انہوں نے نہیں لکھی ہیں ان کو بھی ان کی طرف منسوب کردیں، ان کے کلام کی ایسی تشریح کریں، جس سے خود ان کو انکار ہے، اگر کسی بات سے انہوں نے رجوع کرلیا ہو تو اس کو بھی قبول نہ کریں، اگر کوئی بات مخالف حلقہ کے کسی ایک شخص نے کہی ہو تو اس کو اس پورے حلقہ کی طرف منسوب کردیں، لوگوں کی ذاتیات پر حملہ کریں، اور ان کی نجی زندگی کو طشت ازبام کریں، ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں قرآن مجید کی اس ہدایت کے خلاف ہے کہ کسی گروہ کی برائی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کردے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ (المائدۃ: ۸) ناانصافی میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کسی کی برائی کو تو ذکر کیا جائے؛ لیکن اس کی خوبیوں کے بارے میں چپ سادھ لی جائے، یا مخالف کی کسی بات کو ہدف تنقید تو بنایا جائے؛ لیکن وہی بات جب اپنے حلقہ سے سامنے آئے تو اس کی تاویل وتوجیہ کی جائے، یہ ساری باتیں ناانصافی کی اور اختلاف وانتشار کو بڑھاوا دینے کی ہیں اور اخلاص وللّٰہیت کے مغائر ہیں۔

موجودہ حالات میں جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوئے ہیں اور صرف مسلمانوں کی دشمنی نے ایسے لوگوں کو متحد کردیا ہے، جن کو دریا کے دو کنارے سمجھا جاتا تھا، کیا مسلمانوں کا فریضہ نہیں ہے کہ وہ اختلاف میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کریں کہ جو حلقہ کتاب وسنت کی دلیل کی بنیاد پر جس بات کو حق سمجھتا ہے، وہ اس پر قائم رہے اور اس کے دلائل بھی پیش کرے؛ لیکن اظہار اختلاف میں مخالفین کی بے احترامی، تنقیص اور ناانصافی سے بچے، علمی مجالس میں اعتدال کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرے؛ لیکن عوام میں نفرت کا صور نہ پھونکے اور انہیں جدل واختلاف پر نہ اکسائے — دوسرے: اختلاف کے باوجود اتحاد کا طریقہ اختیار کرے، ہمارے بیشتر سیاسی وسماجی مسائل مشترک ہیں، ان مسائل کے بارے میں اشتراک کا مظاہرہ کرے اور ایک آواز بن کر حکومت اور جمہور کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرے؛ تاکہ خاص کر ہندوستان میں مسلمان کے مسائل حل ہوسکیں۔

لیکن اعتدال واشتراک کی اس ڈگر پر مختلف مسلک ومذہب کے لوگوں کو لے آنا کوئی معمولی

بات نہیں ہے، خاص کر ان مقررین کو جن کا مزاج مناظرانہ ہے اور جو اختلاف اور انتشار کی باتوں کو اپنی مقبولیت کا ہتھیار اور کسب معاش کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اس کے لئے ضرورت ہے کہ ملت کے کچھ دردمند، بہی خواہ اور مخلص حضرات اٹھیں، وہ خاموشی کے ساتھ کسی خلوت کدہ میں مختلف مسالک اور تنظیموں سے تعلق رکھنے والی نمائندہ شخصیتوں کو جمع کریں اور جمع کرنے والے حضرات ان نمائندوں کی خوشامد کریں، ان کی ٹھوڑیوں کو ہاتھ لگا کر اور ان کے پاؤں پکڑ پکڑ کر اتحاد ملت کے لئے فریاد و التجا کریں، نیز ان کے درمیان معاہدہ کرانے کی کوشش کریں کہ سب اپنے مسلک پر رہتے ہوئے اظہارِ اختلاف میں اعتدال سے کام لیں گے اور مشترک مسائل کے لئے مل جل کر کوشش کریں گے، بہتر ہوگا کہ یہ جمع کرنے والے حضرات کسی خاص مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد نہ ہوں، یا عصری تعلیم یافتہ حلقہ سے تعلق رکھتے ہوں؛ تاکہ ان کی آواز پر لوگوں کا جمع ہونا آسان ہو، اس ملاقات کی اخباری تشہیر اور ذرائع ابلاغ پر اس کا اظہار بھی مناسب نظر نہیں آتا؛ کیوں کہ ہوسکتا ہے یہ بات بعض مذہبی رہنماؤں کے لئے قابل قبول نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ موجودہ دور کا بولہبی میڈیا فاصلوں کو پاٹنے کے بجائے اختلاف کو بڑھانے کا کردار ادا کرے، مگر اس کام کے لئے دل دردمند اور فکر ارجمند کی ضرورت ہے، نیز مسلکی اور مذہبی رہنماؤں میں امت کے آفاقی تصور کا یقین اور خشیت الٰہی کا ہونا ضروری ہے، مگر افسوس کہ دو دور تک نظر ڈالئے، ایسا لگتا ہے کہ ملت میں کوئی حسن بن علی رضی اللہ عنہما نہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بکھری ہوئی امت کو جوڑنے اور ان کی ٹوٹی ہوئی صفوں کو بنیان مرصوص بنانے کا کام کرے، کاش! کچھ مردانِ غیب ظاہر ہوں اور اس حسنی کردار کو تازہ کریں۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

❁

آثارِ مبارکہ کا تحفظ

عربی زبان میں کسی چیز کے باقی رہ جانے والے ایسے وصف یا جزو کو ''اثر'' کہتے ہیں جس سے اس کی شناخت کی جاسکتی ہے، جیسے کپڑے پر رنگ لگ گیا ہو، اسے دھویا جائے؛ لیکن رنگت ختم نہ ہو، اس کو رنگ کا بچا ہوا اثر کہتے ہیں، اسی طرح خوشبو کا اثر، بدبو کا اثر وغیرہ تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں، کسی قوم کی تہذیب وثقافت یا کسی مذہبی گروہ کے مذہبی تصورات کی جو نشانیاں باقی رہ جاتی ہیں، ان کو بھی اثر کہتے ہیں، جس کی جمع ''آثار'' ہے، اسی کو اہل لغت نے ''مخلفات ثقافية لقوم'' سے تعبیر کیا ہے، آج پوری دنیا میں تاریخی آثار کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے، اور اس کو کسی بھی ملک یا قوم کے لئے باعث انتخاب سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے ہر مذہبی اور تہذیبی گروہ اپنے تاریخی آثار کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے، اور بعض تاریخی یادگاریں تو ایسی ہیں کہ ان کو عالمی ورثہ (World haritage) قرار دے دیا گیا ہے، جہاں یہ آثار موجود ہیں، وہاں کی حکومتیں ان کو محفوظ رکھنے کی پابند ہیں؛ بلکہ بعض مقامات پر تو حقیقی تاریخی ورثہ کو مصنوعی آثار کے ذریعہ زندہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے، جیسے یہودیوں نے ہولوکاسٹ کے مصنوعی میوزیم بنائے ہیں، یا جاپان میں ایٹم بم کی ہلاکتوں کے لیے علامتی شناخت بنائی گئی ہے۔

اسلام میں بھی تاریخی آثار کو اہمیت دی گئی ہے، ان میں بعض آثار وہ ہیں جن سے عبرت وموعظت متعلق ہے، ان کا تعلق ان قوموں سے ہے جن پر عذاب نازل ہوا، جیسے قوم عاد وثمود کے پہاڑوں سے تراشے ہوئے پرشکوہ محلات حجاز سے قریب ہی تھے، مشرکین مکہ کو متوجہ کیا گیا کہ وہ ان آثار سے عبرت حاصل کریں کہ کیسی کیسی طاقتور، علم وفن سے آگاہ اور اپنے عہد کی غالب وفاتح قومیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کے ساتھ سرتابی وسرکشی کی وجہ سے نیست ونابود کردی گئیں، صفحۂ ہستی سے ان کا نام ونشان مٹ گیا، اسی طرح قوم لوط پر ایسا عذاب نازل ہوا کہ سطح زمین ان پر پلٹ کر رکھ دی گئی، اور اس وقت ان کی بستی پر بے حد نمکین پانی کا ایک ایسا بحیرہ موجود ہے، جس کو بحر میت کہا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بارے میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بعد

والوں کے لئے ایک نشانی بنادیا ہے،نشانی سے مراد عزت وسر بلندی کی نشانی نہیں ہے،عبرت وموعظت کی نشانی ہے،غرض کہ وہ آثار جن سے عظمت وتقدیس متعلق ہےان کی اہمیت تو ہے ہی؛لیکن جو آثار عبرت ہیں،ان کو بھی اسلام نے اہمیت دی ہے،اور تلقین کی ہے کہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔

جو مقامات روحانی اعتبار سے مقدس اور قابل احترام ہیں، ان کی اہمیت تو ظاہر ہے،قرآن وحدیث میں اس کی واضح بنیادیں موجود ہیں،مقدس آثار میں اولین ورثہ ’کعبۂ مشرفہ‘ ہے،اللہ تعالیٰ نے اس کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخی قدامت اور قدیم ترین تاریخی ورثہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کائنات ارضی میں پہلا گھر ہے، جو مکہ مکرمہ میں انسان کو عبادت کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا، اور یہ بڑی برکتوں والا ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (آل عمران:۹۶)اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی آثار برکت وعظمت کے حامل ہیں،اور یہاں اپنے روحانی جذبہ کو فروغ دینے کے لئے لوگوں کا آنا جانا اور ان کو محبت واعتقاد کی نظر سے دیکھنا کوئی خلاف شریعت عمل نہیں۔

اگر چہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبۃ اللہ کی پہلی تعمیر فرشتوں کے ہاتھوں یا حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھ ہوئی؛لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بعد اس عمارت کی تعمیر نو حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے ذریعہ ہوئی،قرآن مجید نے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے: ﴿وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ﴾ (البقرہ:۱۲۷)اس زمانے میں آج کل کی طرح نہ کرین تھی،اور نہ غالباً ایسی سیڑھیاں تھیں، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی منتقل کی جائیں،اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام وحضرت اسماعیل علیہ السلام کو ایک معجزہ عطا فرمایا گیا کہ انہوں نے دیوار کعبہ کی تعمیر میں مدد کے لئے ایک چبوترہ بنایا، یہ چبوترہ تعمیری ضرورت کے لحاظ سے بڑھتا اور گھٹتا رہتا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پائے مبارک کا نقش اس پر ثبت ہوگیا تھا،یہی نقش ’’مقام ابراہیم‘‘ کہلایا،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے تین سو سال پہلے تک لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین صحیح پر قائم تھے،اور اس کو ’’دین حنیف‘‘ کہا کرتے تھے،اس کے بعد عمرو بن لحی کے ذریعہ جزیرۃ العرب میں بت پرستی کا رواج ہوا اور آہستہ آہستہ پورے عرب پر یہ تصور ایک سیاہ گھٹا کی طرح چھا گیا؛لیکن شرک سے آلودہ ہونے کے باوجود اہل عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے محبت وعقیدت رکھتے تھے،اور جو مقامات وواقعات ان کی

حیات طیبہ سے متعلق تھے، ان کو اپنے لئے سرمۂ چشم بنایا کرتے تھے؛ اس لئے انہوں نے مقام ابراہیم کی حفاظت کی، اور جب پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ حجاز مقدس میں توحید کا آوازہ بلند ہوا تو مسلمانوں کی خواہش ہوئی کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے معلم توحید کے نقشِ پا کو خصوصی اہمیت دی جائے اور اسے اپنی نماز گاہ بنایا جائے؛ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ کیا ہم اپنے باپ ابراہیم کی اس جگہ کو مصلی (نماز گاہ) نہ بنالیں؟ آپ ﷺ کا چوں کہ ہر عمل حکم الٰہی کے تحت ہوا کرتا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو ابھی اس کا حکم نہیں دیا گیا، چنانچہ دن گذرا نہیں اور سورج نے اپنا منہ چھپایا نہیں کہ حکمِ خداوندی نازل ہوا: ﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ (البقرۃ:۱۲۵) یعنی مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ (مفاتیح الغیب: ۴/۱۴۴) ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم حضرت ابراہیم کی یادگار کو زندہ رکھنے اور اس سے شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے برکت حاصل کرنے کا حکم ہے: البتہ یہ ضروری ہے کہ جذباتِ محبت احکام الٰہی کے پابند ہوں، اسی لیے علامہ ابن کثیرؒ نے قتادہؒ سے نقل کیا ہے کہ ہمیں مقام ابراہیم کے پاس صرف نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس پر ہاتھ پھیرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، مگر یہ امت بعض ایسے تکلفات میں مبتلا ہوگئی، گذشتہ امتوں نے بھی جس کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔'' **ولقد تکلفت ھذہ الامۃ شیئا ماتکلفتہ الامم قبلھا** (ابن کثیر: ۱/۴۱۷)۔

آثار مبارکہ میں سے ایک حجر اسود ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ پتھر جنت سے اتارا گیا ہے، یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا؛ لیکن بنی آدم کے گناہوں کو جذب کرتے کرتے سیاہ ہوگیا، (ترمذی: باب جاء فی فضل ذکر الحجر الاسود: ۸۷۷، نیز دیکھئے: نسائی: ۲۹۳۵، مسند احمد: ۲۷۹۶) حجر اسود کی تقبیل یا اس کے چھونے یا اس کی طرف اشارہ کرنے کو طواف جیسی عبادت کا جزو بنادیا گیا۔

آثار مبارکہ ہی میں صفا اور مروہ کو شامل کیا جاسکتا ہے، یہ دو پہاڑیاں ہیں، حضرت ہاجرہ علیہا الصلوٰۃ والسلام اپنے شیر خوار اور پیارے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے پانی کی تلاش میں صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا کی طرف جاتیں کہ کہیں کوئی قافلہ نظر آجائے اور پانی کی چند بوند میسر آجائیں، جن سے فرزند دلبند کا حلق تر کرسکیں، نیز جب نشیب میں آجاتیں اور حضرت اسماعیل نظر سے اوجھل ہوجاتے تو ماں کی ممتا اور بے قرار ہوجاتی اور اس حصہ سے دوڑ کر گذرتیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ کی اس ادا کو اور جن مقامات سے ان کا یہ عمل متعلق تھا، ان مقامات کو کچھ اس طرح یادگار بنایا کہ ہر حاجی

اور ہر عمرہ کرنے والے پر صفا اور مروہ کی سعی کو واجب قرار دے دیا گیا، اور اس نشیبی حصہ میں جو سبز روشنی کی علامت لگا دیے جانے کی وجہ سے ''میلین اخضرین'' کہلاتا ہے، تیز چلنے کو مسنون قرار دے دیا گیا، نیز ان مقامات کو اللہ تعالیٰ کے شعائر میں شمار کیا گیا۔ ﴿اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (البقرۃ:۱۵۸)

اللہ کی قدرت یوں ظاہر ہوئی کہ جو اسماعیل پانی کے ایک قطرے کے لئے بے قرار تھے، ان کی ایڑیوں کے نیچے سے اللہ کے حکم سے ایسا چشمہ جاری ہوا، جس سے نکلنے والا آبِ حیات پوری دنیا کو سیراب کر رہا ہے، اور آج مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں اس کا فیض نہ پہنچتا ہو اور لوگ محبت وعقیدت کے جذبات کے ساتھ اسے سر آنکھوں پر نہ رکھتے ہوں، یعنی آبِ زم زم، یہ بھی یقیناً اللہ کے برگزیدہ بندوں کے آثار میں سے ہے-- روئے ارض کی مقدس مسجدوں میں مسجد حرام مکہ مکرمہ کے بعد مسجد نبوی ہے، مسجد حرام کے بعد اس میں نماز پڑھنے کا اجر بہ مقابلہ دوسری تمام مسجدوں کے زیادہ ہے، بہ ظاہر اس کی وجہ یہی ہے کہ خود آپ ﷺ نے اس کی تعمیر میں شرکت فرمائی اور یہ آپ کے آثار میں سے ہے، اسی طرح تیسری افضل ترین مسجد مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) ہے، جس کو ہیکل سلیمانی پر تعمیر کیا گیا ہے، یعنی سب سے پہلے اللہ کے نبی حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس مسجد کی تعمیر فرمائی، یہ مسجد مختلف انقلابات کی نذر ہوتی رہی، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب بیت المقدس فتح ہوا، اس وقت مسلمانوں نے اس کی تعمیر نو کی، رسول اللہ ﷺ نے جن تین مسجدوں کی طرف خصوصی طور پر سفر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، ان میں ایک یہ مسجد بھی ہے، یہ اللہ کے نبی حضرت سلیمانؑ کے آثار مبارکہ میں سے ہے۔

قرآنِ مجید میں دو اور آثار کا ذکر ملتا ہے، ایک اس تابوت کا جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی بچی ہوئی اشیاء تھیں، بنی اسرائیل ہمیشہ جنگ میں تبرکاً اس تابوت کو اپنے آگے رکھتے اور فتح یاب ہوتے، مگر پھر ان کی شامت اعمال کی وجہ سے ایک وقت ایسا آیا کہ دشمنوں نے اس تابوت پر بھی قبضہ کر لیا، آخر جب حضرت طالوت کو اللہ کی طرف سے فرماں روائی پر مامور کیا گیا، اور بنی اسرائیل ان کی حکمرانی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے تو اللہ کی طرف سے تابوت کی واپسی کو ان کے عادل وصادق حکمراں مقرر کئے جانے کی علامت قرار دیا گیا، اور پھر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ دشمنوں نے خود

اس تابوت کو ایک سواری پر رکھ کر اسے بنی اسرائیل کی طرف ہنکا دیا (البقرۃ:۲۴۸) ظاہر ہے یہ انبیاء بنی اسرائیل کے تبرکات وآثار ہی تھے، جس کو بنی اسرائیل حصول برکت کا ذریعہ بناتے تھے، قرآن مجید کا اس واقعہ کو ذکر کرنا متبرک آثار کی اہمیت کی واضح دلیل ہے!

قرآن میں دوسرا واقعہ 'اصحاب کہف' کا ملتا ہے، ثابت قدم مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ایمان کو بچانے کے لئے ایک غار میں چھپ گیا، اللہ تعالی کی طرف سے انہیں نیند کی آغوش میں پہنچا دیا گیا، اور وہ تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک سوتے رہے، پھر جب وہ بیدار ہوئے اور شہر کی طرف گئے تو جو سکّے ان کے پاس موجود تھے، ان کی قدامت کی وجہ سے پہچان لیے گئے اب صورت حال بدل چلی تھی، اور اہل کفر کی بجائے اصحاب ایمان کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا؛ لیکن مخلص مسلمانوں کا یہ گروہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کے سامنے ان کی نیکیوں کا اظہار ہو اور ان کے اخلاص میں ریا اور دکھاوے کی کوئی آمیزش ہو جائے، اسی لئے وہ دوبارہ غار میں چھپ گئے، لوگ ان کو تلاش کرتے رہے اور انہوں نے طئے کیا کہ اس مقام پر مسجد تعمیر کریں گے، جہاں یہ نیک و برگزیدہ حضرات غائب ہو گئے سورہ کہف میں تفصیل سے اس کا ذکر آیا ہے، علامہ رازی نے سورۂ کہف کی آیت نمبر ۲۱ رکی تفسیر میں لکھا ہے کہ شہر کے ذمہ داروں نے کہا کہ ہم ان کی جائے قیام پر ایک مسجد تعمیر کریں گے؛ تا کہ اس میں اللہ کی عبادت کریں اور اس مسجد کے ذریعہ اصحاب کہف کے آثار کو محفوظ رکھیں گے:۔۔۔ **ولنستبقی آثار أصحاب الکهف بسبب ذلک المسجد** (مفاتیح الغیب:۲۱ر ۴۴۷)

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور سیرت مبارکہ میں کئی آثار کا ذکر ملتا ہے، ان میں سے ایک اسطوانۂ حنانہ کا واقعہ ہے، اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آپ ﷺ مسجد میں نصب کئے ہوئے ایک کھجور کے تنے سے پشت لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، یہ تنا چھپّر سے بنی ہوئی مسجد میں ستون کا کام دیتا تھا، پھر رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے بعض صحابہؓ نے آپ کے لئے منبر بنایا، جب منبر رکھا گیا اور آپ اس پر خطبہ دینے کے لئے آگے بڑھے تو ایک معجزہ ظاہر ہوا کہ درخت کے اس تنے سے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز آنے لگی، جیسے کوئی گرفتار محبت اپنے محبوب کے فراق پر روتا ہے، رسول اللہ ﷺ یہ آواز سن کر منبر سے اتر آئے اور اس تنے پر ہاتھ پھیرا، یہاں تک کہ وہ پُرسکون ہو گیا، پھر آپ ﷺ منبر پر واپس آ گئے، اس لیے معمولِ مبارک تھا کہ جب نماز ادا فرماتے تو

اسی تنے کے سامنے نماز ادا فرماتے، پھر جب تعمیرِ نو کے لئے مسجد کا ڈھانچہ شہید کیا گیا اور اسے بدلا گیا تو حضرت ابی بن کعبؓ نے اسے حاصل کر لیا، اور تبرکاً اس کو اپنے گھر میں رکھا، یہاں تک کہ وہ بوسیدہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ زمین اس کو کھا گئی (ابن ماجہ: حدیث نمبر: ۱۴۱۴) ظاہر ہے حضرت ابی بن کعبؓ کا درخت کے اس ڈھانچے کو اپنے پاس رکھنا بطور تبرکاً تھا اور اسی حیثیت سے جب تک وہ محفوظ رہ سکا، آپؓ نے اس کی حفاظت فرمائی۔

اس سلسلہ کی دوسری مثال ''شجرۂ رضوان'' ہے، یعنی جب صلح حدیبیہ کے موقع سے آپ ﷺ ۶ھ میں چودہ سو رفقاء کے ساتھ مدینہ سے مکہ تشریف لائے تو مشرکین مکہ رکاوٹ بن گئے، آپ ﷺ نے کوشش فرمائی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور اسی کوشش کے ایک حصہ کے طور پر آپ نے حضرت عثمان غنیؓ کو سردار مکہ سے گفتگو کے لئے اپنا سفیر بنا کر مکہ کو بھیجا، ادھر یہ بات مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمان غنیؓ کو شہید کر دیا گیا، آپ ﷺ نے اس موقع پر صحابہ سے ایک درخت کے نیچے بیعت لی کہ اگر حضرت عثمان شہید کیے گئے ہوں تو وہ ضرور اس کا انتقام لیں گے؛ گویا یہ اس بات کی بیعت تھی کہ اگر نوبت آ گئی تو ہم اپنی جانیں قربان کر دیں گے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس جذبۂ جاں نثاری کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ جو اہل ایمان درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، اللہ ان سے راضی ہو گیا (فتح: ۱۸) اسی لئے اس درخت کو ''شجرۃ الرضوان'' کہا جانے لگا، لوگ یہاں آتے اور نمازیں ادا کرتے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس پر ناراضگی ظاہر فرمائی اور آپ کے حکم پر یہ درخت کاٹ دیے گئے (طبقات ابن سعد: ۲/۷۶) اگرچہ حضرت عمرؓ نے اسے اس لیے کٹوادیا کہ اس کی وجہ سے لوگوں میں غلو نہ پیدا ہو جائے اور جس مقام پر عبادت کرنے کی خصوصی اہمیت رسول اللہ ﷺ نے نہیں بتائی ہے، کہیں لوگ اس کو مقدس نہ سمجھنے لگیں؛ لیکن دوسرے صحابہ اس مقام پر تبرکاً نماز بھی پڑھا کرتے تھے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ بزرگوں کے آثار سے تبرکاً استفادہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ حضرت عمرؓ از راہِ احتیاط ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے تھے؛ لیکن تمام صحابہ کا نقطۂ نظر یہ نہیں تھا، بہت سے صحابہ آثار سے برکت حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، خود حضرت عمرؓ کے صاحبزادے اور جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا موقف غالباً اپنے والد سے مختلف تھا، چنانچہ بخاری شریف میں ایک طویل روایت آئی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر جب مدینہ منورہ

سے مکہ مکرمہ کا سفر کرتے تو خاص طور پر ان مقامات کو نظر میں رکھتے، جہاں آپ ﷺ اترے تھے اور آپ ﷺ نے نمازیں ادا فرمائی تھیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان تمام مقامات پر اترنے اور نماز ادا کرنے کا اہتمام فرمایا۔

آپ ﷺ کے آثارِ مبارکہ میں ایک وہ ہے جس کا براہِ راست آپ کے جسم اقدس سے تعلق ہے اور اس لئے یقیناً ہر مسلمان کے لئے چشم محبت کا سرمہ ہے، اور وہ ہیں آپ ﷺ کے موئے مبارک، آپ ﷺ نے ایک موقع پر اپنے مبارک بال منڈائے، بال مونڈنے کا شرف حضرتِ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حاصل کیا، آپ نے اپنے سر مبارک کے نصف بال حضرت ابوطلحہ کو عطا فرمادیے اور بقیہ نصف دوسرے صحابہ کے درمیان تقسیم کردیے — صحابۂ کرام کس محبت اور عظمت کے ساتھ آپ کے موئے مبارک کو دیکھتے تھے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ اپنی ٹوپی میں تبرکاً یہ بال رکھتے تھے، اور جب بھی میدانِ جہاد میں داخل ہوتے تو اس بال کے ساتھ ٹوپی پہن کر معرکہ کارزار میں نکلتے اور فتح یاب ہوتے، غزوۂ یمامہ کے موقع سے جو مسیلمہ کذاب اور اس کے متبعین کے ساتھ ہوا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یہ ٹوپی گر گئی، اس ٹوپی کو حاصل کرنے میں ایسا معرکہ گرم ہوا کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے جام شہادت نوش کیا، اس وجہ سے بعض صحابہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا تو آپ نے یہی عذر کیا کہ میں نے اس وجہ سے ایسا کیا کہ کہیں یہ ٹوپی حضور کے موئے مبارک کے ساتھ مشرکین کے ہاتھ میں نہ چلی جائے، یعنی ان کو موئے مبارک کی اہانت کا اندیشہ ہوا۔ (**شرح ابن بطال علی صحیح البخاری: باب الماء الذی یغسل به شعر الانسان: ۱/ ۲۶۵**)

جن صحابہ یا ان کے بعد کے عزیزوں کو حضور ﷺ کا کوئی موئے مبارک حاصل ہوگیا، انہوں نے اس کو دنیا و مافیہا سے قیمتی سمجھا، حضرت ام سلمہؓ کے پاس کچھ موئے مبارک تھے جو سرخ رنگ کے تھے، جب کسی کی آنکھ میں تکلیف ہوتی، یا کسی کو شدید بیماری لاحق ہوتی تو حضرت ام سلمہؓ کے پاس پانی کا برتن بھیجتے، وہ اس میں آپ کے موئے مبارک کو ڈبو دیتیں اور اس کا دھوون عنایت کرتیں جس سے مریض شفایاب ہوتے، (**بخاری: باب یذکر فی الشیب**، حدیث نمبر ۵۸۹۶، نیز دیکھئے: مسند اسحاق بن راہویہ: ۴/ ۱۴۱)

ابن سیرین حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں تھے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن

مسعود رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ عبیدہ سے عرض کیا کہ ہمیں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک حاصل ہوا، عبیدہ نے کہا کہ اگر میرے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بال بھی ہوتا تو دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہوتا (بخاری حدیث نمبر:۱۷۰) امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد کو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک لے کر اپنے منہ پر رکھتے اور بوسہ دیتے اور یہ بھی دیکھا کہ اپنی آنکھوں سے لگاتے اور پانی میں ڈبو کر اس پانی کو نوش فرماتے۔(مسند احمد:۱/۸۲)

غرض کہ اسلام میں مقدس اور متبرک آثار کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے، اور یہ محبت وعظمت کے لازمی تقاضوں میں سے ہے؛ اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی آثار کا تحفظ کریں، اوران کو ضائع ہونے سے بچائیں، ان آثار کو دیکھ کر حقیقت یہ ہے کہ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے غیب اس کے لئے شہود بن گیا ہے، مسلم عہد حکومت میں جو بھی حکمراں ہوئے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس آثار کو جان و دل سے زیادہ عزیز رکھا، عباسیوں کے بعد یہ آثار فاطمیوں کی تحویل میں آئے اور فاطمیوں سے یہ امانت عثمانی ترکوں کو منتقل ہوئی، ترکوں نے نہایت ہی عظمت اوراحترام واعزاز کے ساتھ ان آثار کی حفاظت کی، اس حقیر کو دوبار استنبول جانے کا موقع ملا، جہاں ''توپ کاپی'' نامی میوزیم میں یہ آثار محفوظ ہیں، ان آثار میں آپ کے موئے مبارک بھی ہیں، دندان مبارک بھی، عمامہ مبارک اور جبۂ مبارک بھی ہے، تلوار اور عصا بھی ہے، نیز خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے تبرکات بھی ہیں، اس کے علاوہ بعض ایسے تبرکات اور آثار بھی ہیں جو گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں، ان آثار کو جتنا دیکھئے اور جتنی بار دیکھئے، لوحِ دل پر محبت کے نئے نقوش ثبت ہوتے ہیں، آنکھیں اشکِ محبت سے وضوء کرتی ہیں اور قلب کو ایک سکون کا احساس ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مقدس آثار کے احترام میں بعض دفعہ لوگ غلو بھی کرتے ہیں اور ایسی جگہوں پر بدعات کا ارتکاب بھی ہونے لگتا ہے، ظاہر ہے کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ آپ انہیں سجدہ کرنے کی اجازت دیں اور ظاہر ہے کہ جو صحابہ شب وروز ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ سے اپنی نمازوں کی ابتدا کرتے تھے، وہ کیسے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدۂ عبادت کی اجازت مانگتے، یقیناً انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدۂ تعظیمی ہی کی اجازت طلب کی ہوگی؛ لیکن آپ نے اس سے منع فرمادیا اور فرمایا کہ اگر اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا روا ہوتا تو بیویوں کو اجازت دی جاتی کہ وہ شوہروں کو سجدہ کریں، پس ضروری ہے کہ تعظیم واحترام شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہو؛ اسی لئے حضرت عمرؓ نے اس درخت کو اکھڑوا دیا، جس کے نیچے صحابہ سے بیعت لی تھی، اور جب عراق میں حضرت دانیال کی طرف منسوب قبر دستیاب ہوئی تو آپؓ نے اسے چھپا دینے کا حکم دیا (تفسیر ابن کثیر: ۵/۷ ۱۴) — لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آثار مبارکہ کی محبت وعظمت دلوں سے نکل جائے اور ہم خود اسے مٹاڈالیں، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں موجود یہودیوں کے بعض آثار کو ایک سازش کے تحت مغربی طاقتوں کی جانب سے عالمی ورثہ میں شامل کیا گیا ہے، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ عراق وشام میں منصوبہ بند طریقہ پر اسلامی آثار کو مٹایا جارہا ہے، ان کو بچانا ضروری ہے، خود سعودی عرب میں سیرت نبوی سے متعلق مقامات وآثار کا خصوصی حیثیت میں تحفظ ہونا چاہئے اور لوگوں کو بدعت وغلو سے روکتے ہوئے ان کی شناخت باقی رکھنی چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی تاریخی میراث سے محروم ہوجائیں اور اعداءِ اسلام کے تاریخی آثار باقی رہیں، یہاں تک کہ کل ہو کر مسلمانوں سے کہا جائے کہ یہ خطہ تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کا نہیں؛ بلکہ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کی میراث ہے، مسلم ملکوں کو خاص طور پر اس پہلو پر نظر رکھنی چاہئے کہ خلاف شرع باتوں کو روکنا بھی ضروری ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے مقدس آثار کی حفاظت سے غافل نہ ہوں اور اپنی تاریخی شہادتوں کو مٹنے نہیں دیں۔

یہ بات کس قدر قابل افسوس ہوگی کہ مغرب تو مسلمانوں کے تاریخی آثار اور مذہبی یادگاروں کو چرا چرا کر لے جائے، آج بھی برٹش لائبریری یا برٹش میوزم میں ہندوستان کی بہت سے تاریخی مآثر کو دیکھا جاسکتا ہے، خود ''کوہِ نور ہیرا'' غصب کرلیا گیا، عراق کی ماضی قریب کی جنگ میں امریکی قزاقوں نے کتنے ہی میوزم لوٹ لیے، بیش قیمت تاریخی چیزیں چوری کرلیں، اور پورے پورے کتب خانے کو بمباری کرکے نذرِ آتش کردیا؛ لیکن دوسری طرف مسلمانوں کی سادہ لوحی ہے کہ ہمیں خود اپنے متبرک آثار اور اپنی تاریخی یادگاروں کے تحفظ کا خیال نہیں۔

سلیقۂ بندگی

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی!

(دل کی اصلاح)

شریعت نے انسان کے لئے زندگی کا جو نظام مقرر کیا ہے، وہ اس کے پورے وجود کا احاطہ کرتا ہے، سر سے لے کر پاؤں تک جسم کا کوئی عضو نہیں جس کے لئے شریعت کی کوئی ہدایت موجود نہیں ہو؛ کیوں کہ انسان کو خدا سے بندگی کی نسبت حاصل ہے، اللہ معبود ہیں اور انسان عبد، اللہ خالق ہیں اور انسان مخلوق ہے، اللہ مالک ہیں اور ہم سب اس کے مملوک، آقا کا حق ہے کہ غلام کی ہر حس و حرکت اس کے منشا کے مطابق ہو اور مالک کو حق ہے کہ اپنی ملکیت میں ایک ایک ذرہ پر اس کا تصرف جاری رہے؛ اس لئے انسان کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا پورا وجود احکام الٰہی کے تابع ہو اور اسی لئے شریعت کے احکام انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔

جیسے شریعت نے انسان کے ظاہر کے لئے احکام دیئے ہیں، اسی طرح اس کے باطن کے لئے بھی بہت سے احکام دیئے ہیں، مثلاً جب کوئی شخص نماز پڑھے تو وہ کھڑا ہو، رکوع کرے، سجدہ کرے، قیام میں قرآن مجید کی تلاوت اور رکوع و سجدہ میں تسبیحات کا اہتمام کرے، رمضان المبارک میں صبح کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کھانے پینے سے رکا رہے، یہ اور اس طرح کے ہزاروں احکام ہیں، جن کا تعلق ظاہری افعال سے ہے، اس کے ساتھ ساتھ بہت سے باطنی افعال بھی ہیں، جن کا حکم دیا گیا ہے، نماز کے وقت انسان کے اندر خشوع کی کیفیت ہو، ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾ (المؤمنون: ۲) نماز پڑھنے کی وجہ سے یہ کیفیت حاصل ہو کہ اللہ کی یاد اس کے دل میں بس جائے، ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ: ۱۴)، انسان کے اخلاق بہتر ہوں، اس میں نرم خوئی ہو، مخلوق کے ساتھ ایثار و شفقت ہو، تواضع اور کسر نفسی ہو، ریا اور دکھاوے کا جذبہ نہ ہو، خدا کا خوف بھی ہو اور خدا کی محبت بھی، گناہ پر شرمندگی اور ندامت کا احساس ہو، اللہ کی توفیق سے کوئی نیک کام کرے تو خوشی کا احساس ہو اور کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو رنج و ملال ہو، یہ اور اس طرح کے بہت

سے افعال ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے۔

ظاہری افعال کا صدور جسم کے مختلف ظاہری اعضاء — زبان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ — سے ہوتا ہے اور باطنی افعال کا سرچشمہ انسان کا دل ہے؛ اسی لئے قرآن مجید میں اس انسان کو کامیاب و بامراد بتایا گیا ہے، جو اللہ کے دربار میں اللہ کی طرف جھکنے اور اللہ کی مرضیات کو بجالانے والا دل لے کر آئے؛ کیوں کہ جس دل میں انابت ہوگی، اسی میں اللہ کی خشیت بھی ہوگی: ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ﴾ (ق: ٣٣)، قیامت کے دن ایسا ہی پاکیزہ دل انسان کے کام آئے گا: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ (الشعراء: ٨٨۔٨٩) جو لوگ ہدایت سے محروم ہیں، ان کا سب سے بڑا مرض یہ ہے کہ ان کے دلوں میں قبولیت کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا﴾ (الاعراف: ١٧٩) یہاں تک کہ بعض دفعہ تو انسان اپنی اس بے توفیقی پر اترانے لگتا ہے اور اس کے دل کے دروازے اس طرح بند ہوجاتے ہیں کہ وہ جذبۂ خیر سے بالکلیہ محروم ہوجاتا ہے: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ (البقرۃ: ٨٨) قلب انسانی کی اسی اہمیت اور اعمال و اخلاق میں اس کے غیر معمولی کردار کی وجہ سے قرآن مجید میں بار بار اس بات کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے احوال سے واقف ہیں: ﴿وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (الحدید: ٦)۔

انسان کے لئے ایک بہت بڑی ضرورت دل کے اصلاح کی ہے؛ کیوں کہ تمام اچھے اور برے اعمال کا اصل سرچشمہ انسان کا دل ہے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب اس کا رخ درست ہوجاتا ہے تو انسان کی ساری زندگی درست ہوجاتی ہے اور اگر وہ درست نہ رہا تو انسان کا پورا وجود بگاڑ میں مبتلا ہوجاتا ہے: "**إن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح كله وإذا فسدت فسد كله ألا وهي القلب**" (**السنن الكبرى للبيهقى،** حدیث نمبر: ١٠١٨٠)۔

اس وقت دنیا میں شاید سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ انسان کے دل بدلے جائیں، صنعت و ٹکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ زمین کی گہرائیوں سے لے کر فضاء کی اتھاہ بلندیوں تک ہر جگہ انسان رسائی حاصل کر چکا ہے اور مسلسل اس کی ترقی کا سفر جاری ہے، راحت و آسائش کے ایسے ایسے

سامان اس نے کر لئے ہیں کہ گویا وہ جنت کا مقابلہ کرنے کے لئے کوشاں ہے؛ لیکن دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ اس کی یہ علمی ترقی انتہائی غلط مقاصد کی طرف بڑھتی جارہی ہے، اس نے انسان کی زندگی بچانے کے لئے جتنی دوائیں ایجاد کی ہیں، اس سے زیادہ انسان کو ہلاک کرنے والے ہتھیار بنالئے ہیں، میڈیکل سائنس ترقی کے اوجِ کمال پر پہنچ چکی ہے، اس نے علاج کے نت نئے طریقے دریافت کر لئے ہیں؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علاج کو تجارت بنا لیا گیا ہے، تعلیمی اداروں کی بہتات ہے اور شرح تعلیم میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تعلیم جیسے مقدس پیشہ کو خالصتاً کسب زر کا ذریعہ بنالیا گیا ہے اور تعلیم نے زبردست کاروبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے، پھر ان اداروں سے سند فراغت حاصل کر کے جو لوگ میدانِ عمل میں اترتے ہیں، دن ورات وہ سنگین قسم کے الزامات میں ماخوذ ہوتے رہتے ہیں۔

حد تو یہ ہے کہ جو لوگ دین کے مختلف شعبوں سے جڑے ہوئے ہیں، مال کی طمع اور عہدہ و جاہ کی حرص نے انہیں بھی اپنی زلفوں کا اسیر بنا رکھا ہے، بڑی بڑی دینی جامعات میں اس بات کی لڑائی ہے کہ ناظم اور صدر مدرس کون بنے گا؟ تنظیموں میں صدر اور جنرل سکریٹری بننے کے لئے جنگ وجدال کا ایسا بازار گرم ہے کہ عام مسلمان اس کا حال سن کر انگشت بدنداں ہیں، دینی جماعتوں میں جھگڑا ہے کہ امیر کون ہوگا اور شوریٰ میں کس کی حصہ داری ہوگی؟ بخاری شریف کا آغاز ایک ایسی حدیث سے ہوتا ہے، جس میں اخلاص نیت کی تعلیم دی گئی ہے؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ جن لوگون نے پوری پوری عمر قرآن وحدیث کی تدریس میں گذاری ہے، وہ اس بات پر لڑتے ہیں کہ بخاری شریف کا درس تجھ سے متعلق ہو یا مجھ سے؟ کیوں کہ مدارس کے اندر بخاری شریف کے درس سے لوگوں نے عزت و وقار کو متعلق کر لیا ہے، انتہاء یہ ہے کہ دینی جامعات اور دینی تنظیموں کے مقدمات سرکاری عدالتوں میں چل رہے ہیں، جو لوگ عام مسلمانوں کو سرکاری عدالتوں میں جانے سے روکتے ہیں، وہ خود عدالتوں کی چوکھٹ پر کھڑے ہیں، خانقاہیں تزکیۂ قلوب کا مرجع تھیں؛ لیکن یہاں تولیت کے جھگڑے ہیں اور اوقاف پر قبضہ وتصرف کی لڑائی ہے۔

آخر یہ سب کچھ کیوں؟ ۔ کیا اس کا سبب علم کی کمی ہے؟ کیا اس کا باعث معاشی پسماندگی ہے؟ کیا اس کی وجہ تعلیم کا پچھڑا پن ہے؟ ؟ نہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے در و دیوار کو سجانے کی کوشش

کی، جسم وتن کو آراستہ کیا، علوم وفنون کے چراغ روشن کئے، ایجادات واختراعات پر اپنی بہترین صلاحتیں صرف کیں، عیش وعشرت کے نقشے سجائے؛ لیکن دل کی دنیا کو سجانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہ دنیا اندھیری کی اندھیری رہ گئی، اور اس دنیا کی تیاریکیاں بڑھتی چلی گئیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مثال اس ظاہر بیں کاشت کار اور باغبان کی ہوگئی ہے، جو پودوں کے تنوں اور درختوں کی ٹہنیوں پر تو پانی کا ایک دریا بہادے؛ لیکن جڑوں کو پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پہنچائے؛ حالاں کہ جب تک جڑوں میں تراوٹ وتازگی نہ پیدا ہوگی، اس وقت تک تنوں اور شاخوں کو پانی دینا کچھ کام نہ آئے گا۔

اسی لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی اصلاح کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا؛ کہ جب دل کی دنیا روشن ہوگی تو دین کے تمام شعبوں میں روشنی آئے گی، اسی کو قرآن مجید میں تزکیہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ ذمہ داری قرار دیا گیا ہے کہ وہ انسان کے باطن کو گناہ کی آلائشوں سے پاک کریں ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آل عمران: ۱۶۴) اور اسی کو حدیث میں ''احسان'' فرمایا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، یا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہو تو اس بات کا استحضار ہو کہ اللہ ہمیں دیکھ رہے ہیں: ''**أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك**'' (بخاری، حدیث نمبر: ۴۸)، عبادت، نماز و روزہ ہی تک محدود نہیں ہے، یہ تو عبادت کے اعلیٰ ترین مظاہر ہیں؛ لیکن اصل یہ ہے کہ عبد کے ہر عمل میں عبادت کا رنگ ہو اور بندہ کا ہر لمحۂ زندگی بندگی کے نور سے روشن ہو، خاندانی زندگی ہو، لوگوں کے ساتھ معاملات ہوں، یا انسان کے اخلاق، ہر جگہ اور ہر موقع پر خدا کا استحضار ہو، جیسے انسان کتنی بھی تیز سواری چلا رہا ہو، اگر سواری کو کنٹرول کرنے والا کیمرہ آجائے تو آدمی اپنی رفتار پر فوراً کنٹرول کرتا ہے؛ حالاں کہ سامنے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، ٹوکنے والی کوئی زبان نہیں ہوتی اور بظاہر ایکسیڈنٹ کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا؛ لیکن اس کے باوجود گاڑی چلانے والا احتیاط کا دامن تھام لیتا ہے، اس کے بڑھتے قدم تھم جاتے ہیں، دل کی اصلاح سے انسان کے رویہ میں یہی مثبت تبدیلی آتی ہے۔

دل میں صالح تبدیلی ہی کا نام تقوی ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''**التقوى ههنا وأشار إلى الصدر**'' رمضان المبارک تقوی کا مہینہ ہے اور روزے اسی

لئے فرض کئے گئے ہیں کہ انسان کے اندر تقوی پیدا ہو: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۸۳) تقوی کی تربیت کے اس مہینے میں ہر مسلمان کو اپنا جائزہ لینا چاہئے اور دل کی دنیا روشن کرنے کی فکر ہونی چاہئے، ہر عہد میں اللہ کے جو نیک بندے گذرے ہیں، معروف کرخی اور بشر حافی، شقیق بلخی اور بایزید بسطامی، جنید بغدادی اور ابوبکر شبلی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ محمد رفاعی، شیخ ابوالحسن شاذلی اور خواجہ عثمان ہارونی، خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ بہاؤالدین نقشبندی، خواجہ باقی باللہ اور شیخ احمد سرہندی، اور پھر ان کے بعد آنے والے علماء ومشائخ، یہ سب دل کی دوا بیچنے والے، باطن کے معالج اور روحانیت کے سوداگر تھے، جن کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہوئی اور بے شمار افراد ہدایت سے سرفراز ہوئے، آج بھی انسان کو حقیقی انسان اور مسلمان کو سچا مسلمان بنانے کے لئے اسی علاج کی ضرورت ہے، اور اسی کی کمی ہے کہ ظاہری کمالات میں ترقی کے باوجود متاع انسانیت گم ہوتی جارہی ہے، انسان اگر اپنے من میں ڈوب جائے، اپنی حقیقت کو اچھی طرح سمجھے اور قلب وروح کی تروتازگی کا سامان کرے تو اس کے لئے سراغِ زندگی کو پانا چنداں دشوار نہیں:

تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن
اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی

❁

درِ میخانہ وا ہے سب کے لئے!

(شب قدر -- فضائل و اعمال)

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کو یکسانیت کے اصول پر پیدا نہیں فرمایا ہے؛ بلکہ مختلف جہتوں سے ان میں تفاوت اور ایک دوسرے پر فضیلت قائم رکھی ہے، جیسے مادی دنیا میں ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک طرف شیر اور ہاتھی جیسے طاقتور جانور ہیں اور دوسری طرف ہرن اور بکری جیسے نازک و ناتواں حیوانات، یا ایک طرف پہاڑ کی صلابت ہے اور دوسری طرف زمین کا بچھاؤ اور اس کی چاک دامانی کی صلاحیت، اللہ تعالیٰ نے روحانی نظام بھی اسی انداز پر رکھا ہے، کہ ان میں بھی ایک دوسرے پر فضیلت و برتری قائم رکھی گئی ہے، یہ فضیلت شخصیات میں بھی ہے، انسانیت کا سب سے مقدس گروہ انبیاء کرام ہیں؛ لیکن انبیاء کے درمیان بھی تفاوتِ درجات موجود ہے: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ (البقرۃ: ۲۵۳)، یہ فرق اعمال میں بھی ہے، عبادتیں بہت سی ہیں، مگر ان سب میں اجر وثواب برابر نہیں، یہ فرق مقامات میں بھی ہے کہ یوں تو روایتوں میں زمین کا سب سے بہتر ٹکڑا اس حصہ کو قرار دیا گیا جس پر مسجدیں تعمیر کی گئی ہوں: **''خیر بقاع الأرض المساجد''** (**مصنف عبد الرزاق**، حدیث نمبر: ۹۱۱۹) لیکن مسجدوں میں مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کو جو درجہ ومقام حاصل ہے، وہ دوسری مسجدوں کو حاصل نہیں۔

مقام و مرتبہ کا یہ فرق زمانہ و اوقات میں بھی ہے، رمضان المبارک کا مہینہ تمام مہینوں میں افضل ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے اس مہینہ کو عظیم اور مبارک مہینہ قرار دیا ہے: **''شهر عظيم شهر مبارک''** (**شعب الإيمان للبيهقي**، حدیث نمبر: ۳۶۰۸، **صحيح ابن خزيمه**، حدیث نمبر: ۱۸۸۷) پھر ہفتہ کے دنوں میں جمعہ کے دن کو خاص فضیلت حاصل ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کو تمام دنوں کا سردار قرار دیا ہے: **''سيد الأيام يوم الجمعة''** (**مسند أحمد**، حدیث نمبر: ۱۵۵۸۷) اور سال بھر کے دنوں میں سب سے افضل یوم عرفہ (۹ / ذوالحجہ) کو قرار دیا گیا ہے کہ یہ دن

حج کے رکن اعظم کے ادا کرنے کا اور دعاء کی قبولیت کا ہے، اسی طرح راتوں میں بھی کچھ راتوں کو خصوصی فضیلت حاصل ہے، معتبر حدیثوں سے پانچ راتوں کا خصوصی مقام ومرتبہ معلوم ہوتا ہے، شب عرفہ یعنی نو ذی الحجہ کی رات، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی رات، شب براءت یعنی پندرہویں شعبان کی رات اور شب قدر؛ تاہم اس میں اختلاف نہیں کہ ان راتوں میں بھی شب قدر کو خصوصی فضیلت حاصل ہے اور کیوں نہ ہو کہ جس کتاب سے قیامت تک انسانیت کی فلاح ونجات متعلق ہے اور جو اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب ہدایت کا سب سے آخری اور مکمل ایڈیشن ہے یعنی قرآن مجید، وہ اسی رات میں انسانیت کی طرف بھیجی گئی: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر:۱)۔

اس رات کی فضیلت وعظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک پوری سورت خاص اس رات کے بارے میں نازل فرمائی، ارشاد نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو انبیاء پر وحی لے کر اترا کرتے تھے وہ فرشتوں کے جلو میں اسی شب زمین پر تشریف لاتے ہیں اور اللہ کے جو بندے کھڑے ہو کر خدا کی بارگاہ میں مشغول عبادت ہوتے ہیں، اور اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، ان کے لئے دعائے رحمت فرماتے ہیں: ''۔۔۔ **يصلون على كل عبد قائم أو قاعد يذكر الله عز وجل**'' (**شعب الإيمان للبيهقي**: ۳؍۳۴۳، حدیث نمبر: ۳۷۱۷) بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ فرشتے ذکر کرنے اور نماز پڑھنے والوں کو سلام بھی فرماتے ہیں، مصافحہ بھی کرتے ہیں اور ان کی دعاؤں پر آمین کہتے جاتے ہیں۔(**فضائل الأوقات للبيهقي**، ص:۲۵۱)۔

خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ رات ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے: ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ﴾ (القدر: ۳) یعنی اس رات میں جو عبادت کی جائے گی، وہ اجر وثواب کے اعتبار سے ہزار مہینوں کی عبادت وریاضت سے بھی بڑھ کر ہوگی، ہزار مہینے سے مراد بے حساب اجر وثواب ہے، عربی زبان میں چوں کہ زیادہ سے زیادہ ہزار ہی کا عدد ہے، غالباً اسی لئے قرآن مجید میں ہزار کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ورنہ اس سے بھی بڑھ کر اس رات کا درجہ ہے؛ چنانچہ فرمادیا گیا کہ ہزار مہینوں سے اس رات کی عبادت کا اجر بڑھا ہوا ہے، کس قدر بڑھا ہوا ہوگا، یہ پروردگار عالم کی عطاء وبخشش پر ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص شب قدر میں ایمان اور اخلاص کے ساتھ عبادت کے لئے کھڑا ہوگا اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں گے: ''**من قام ليلة القدر ايماناً و احتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه**''

(صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب قيام ليلة القدر من الإيمان، حديث نمبر: ۳۴)۔

جہاں اس رات میں عبادت کا اجر بڑھ جاتا ہے، وہیں یہ رات دعا کی قبولیت اور استجابت کی بھی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس رات پروردگار عالم خود اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے: کیا تم میں سے کوئی مغفرت کا طلب گار ہے کہ میں اس کی خطاؤں کو معاف کردوں؟: "هل من مستغفر أنا أغفر له؟" ہے کوئی روزی کا طلب گار کہ میں اس کو روزی عطا کروں: "هل من مسترزق أن أرزقه؟" ہے کوئی کسی مصیبت میں مبتلا شخص کہ میں اس کی اس مصیبت کو دور فرمادوں؟ "هل من مبتل أنا أقضي حاجته؟" اللہ کی طرف سے یہ ندائے رحمت صبح تک ہوتی رہتی ہے، جو اس آواز پر لبیک کہتا ہے، اس کی دعا مقبول ہوجاتی ہے؛ اس لئے یہ راتیں خاص طور پر اپنے پروردگار سے مانگنے اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ہیں۔

اسی لئے جب ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر شب قدر مل جائے تو ہمیں کیا پڑھنا چاہئے؟ آپ ﷺ نے ایک مختصر مگر جامع دعا سکھائی: "اللهم إنك عفو تحب العفو فاعف عني" (مسند أحمد، حدیث نمبر: ۲۵۴۲۳) یعنی: "خداوندا! بے شک آپ بہت معاف فرمانے والے ہیں، نیز آپ معاف کرنے کو پسند فرماتے ہیں؛ اس لئے میری خطائیں بھی معاف فرمادیجئے، اگرچہ اس دعا کے الفاظ مختصر ہیں؛ لیکن اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ نہایت اہم دعاء ہے؛ کیوں کہ ایک خطا کار غلام کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی اور عافیت کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کا آقا اسے معاف کردے؛ اس لئے یوں تو ماہ مبارک اور اس کے اخیر عشرہ میں ہر طرح کی دعاء کا اہتمام کرنا چاہئے؛ لیکن یہ دعاء خاص طور پر کرنی چاہئے۔

نعمت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، یہ اسی کے لئے کارآمد ہے، جو اس سے فائدہ اٹھا سکے، اس سے زیادہ محروم اور کم نصیب کون ہوسکتا ہے جس پر نعمتوں کی بارش ہو اور اس کا دامن خالی رہ جائے؛ اسی لئے آپ ﷺ نے رمضان المبارک کی آمد پر اپنے رفقاء سے فرمایا کہ ایک ایسا مہینہ تم پر آچکا ہے جس میں ایک ایسی رات بھی ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے، جو اس کی برکتوں سے محروم رہ گیا، وہ گویا تمام ہی بھلائیوں سے محروم ہے اور جو شخص حقیقتاً محروم ہو، وہی اس رات کے خیر سے محروم رہ سکتا ہے: "... ولا يحرم خيرها إلا محروم" (سنن ابن ماجة، كتاب الصيام، باب ما جاء في فضل

شہر رمضان، حدیث نمبر: ۳۶۴۳)۔

ان محروموں میں یقیناً وہ لوگ شامل ہیں، جو ان مبارک اوقات کو اللہ کی بندگی اور ذکر میں لگانے کی بجائے خرید وفروخت، ہوٹلوں میں ذائقہ چشی، بازاروں میں ادھر سے ادھر کی دوڑ دھوپ اور بے فائدہ کاموں میں گذار دیتے ہیں، اور اس میں وہ بدنصیب بھی شامل ہیں جن کے لئے آج کی اس رات میں بھی دعاء کی قبولیت اور مغفرت کا دروازہ بند رہتا ہے، آپ ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''چار افراد وہ ہیں جن کی دعا اس مبارک ومسعود شب میں بھی دروازۂ رحمت سے واپس کردی جاتی ہے اور خدائے رحیم وکریم کا قلم عفو اُن کو اپنے سائے سے محروم رکھتا ہے، ایک وہ شخص جو عادتاً شراب پیتا ہو، دوسرے: اپنے والدین کا نافرمان، تیسرے: رشتوں کو توڑ دینے والا اور چوتھے: کینہ پرور'' (**فضائل الاوقات للبیھقی**، ص:۲۹۱) — آہ! کیسے کم نصیب اور بدقسمت ہیں یہ لوگ کہ خدا کی نعمت بے کراں کا سمندر موجیں مار رہا ہے، مگر اس کا قطرہ قطرہ ان گناہ گاروں اور نافرمانوں سے گریزاں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رحمت ربانی کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ہر بادہ خوار قدر شناس کے لئے موقع ہے کہ وہ داخل ہو، جام عشق کے گھونٹ پیئے اور صہبائے محبت کا لطف اٹھائے؛ لیکن ضروری ہے کہ ہاتھ میں وفا کا دامن ہو، محبوب کی محبت اور ساقی رحیم کی الفت سے اس کا دل معمور ہو اور عمل سے اس کی تصدیق ہو، ایک صوفی شاعر کے بہ قول:

درِ مے خانہ وا ہے سب کے لئے
شرط لیکن وفا ہے سب کے لئے

آداب - زکوٰۃ دینے اور لینے کے!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں ایک اہم نعمت مال و دولت بھی ہے، دنیا کے اکثر مذاہب میں دولت اور کسب دولت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے اور اسے خدا کی قربت میں رکاوٹ سمجھا گیا ہے، ہندو، عیسائی، بدھ، ان سبھوں کے یہاں مذہبی پیشواؤں کو معاشی مصروفیات اختیار کرنے کی ممانعت ہے، ان کا گزارہ عوام کی نذر و نیاز پر ہوتا ہے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ جو شریعت لے کر آئے، وہ پوری طرح فطرت انسانی سے مطابقت رکھتی ہے، انسان کی ایک اہم ضرورت مال و دولت بھی ہے؛ کیوں کہ انسان کے زندہ رہنے کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں، ان میں سوائے ''ہوا'' کے تمام چیزیں یا تو خود مال ہیں یا مال کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہیں، کھانا پینا، دوا، لباس اور مکان لازمی ضرورتیں ہیں اور پیسوں ہی کی رہین منت ہیں؛ اسی لئے اسلام نے مال کو مطلقاً ناپسند نہیں کیا ہے، قرآن مجید میں مال کو ''خیر'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ (البقرۃ: ۲۷۲) — خیر کے اصل معنی بھلی بات یا بھلی چیز کے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مال بھی ایک اچھی چیز ہے، قرآن میں مال کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (الجمعۃ: ۱۰) — ایک تو فضل کا لفظ خود ہی بہت اونچا ہے، جس میں فضیلت و بزرگی کے معنی موجود ہیں اور مزید اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کر دی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، مال و دولت کے لئے کسی مذہب میں اس طرح کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے۔

پھر قرآن مجید میں بعض ان پیغمبروں کا ذکر خیر بھی آیا، جو اپنے وقت کے فرماں روا اور متمول ترین لوگ تھے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، خود رسول اللہ ﷺ کا شمار بھی نبوت سے پہلے مکہ کے اصحاب ثروت میں ہوتا تھا، نبی بنائے جانے کے بعد یقیناً آپ ﷺ پر فقر و فاقہ بھی گزرا؛ لیکن یہ اختیاری فقر تھا، آپ ﷺ کے پاس جب پیسے آتے تو آپ ﷺ اسے راہِ حق میں خرچ کرنے کے لئے بے چین ہو جاتے اور جلد سے جلد تقسیم فرما دیتے، صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی بڑے

متمول حضرات گزرے ہیں، حضرت ابوبکر ﷛، حضرت عمر ﷛، حضرت عثمان غنی ﷛، حضرت عبد الرحمن بن عوف ﷛ وغیرہ کا شمار اس زمانہ کے دولت مند لوگوں میں ہوتا تھا اور وہ اپنی دولت اسلام کے راستہ میں بے تحاشہ خرچ بھی کرتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ فرض نمازوں کے بعد اہم ترین فریضہ کسب حلال ہے:

''طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة''(شعب الإيمان للبيهقي، حدیث نمبر: ۸۷۴۱، سنن البيهقي كتاب الإجارة، باب كسب الرجل وعمله بيديه، حدیث نمبر: ۱۱۴۷۵)

کوئی بھی نعمت ہو، وہ انسان کے لئے اس وقت مفید ہوتی ہے، جب اس کے حاصل کرنے، اس کے استعمال کرنے اور اس کے خرچ کرنے میں شریعت کے احکام کو ملحوظ رکھا جائے اور قانون فطرت سے بغاوت نہ کی جائے، کھانا اللہ کی نعمت ہے؛ لیکن کوئی دوسرے کا کھانا چھین کر کھالے یا اتنا کھالے کہ اس کے معدہ کے لئے ناقابل برداشت ہو یا کھانا خرید کر اسے نالیوں میں ڈال دے تو یقیناً یہ نعمت اس کے حق میں زحمت ہے اور یہ حرکت اسے پولیس اسٹیشن یا پاگل خانہ تک بھی پہنچا سکتی ہے، اسی طرح بہ حیثیت مسلمان ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مال میں کچھ حقوق بھی رکھے ہیں، ایک حق تو زکوۃ کا ہے، جو صرف ڈھائی فی صد ہے، اس کے علاوہ بھی اگر کوئی سوالی یا نادار شخص سامنے آجائے اور اپنی ضرورت رکھے تو اس کا بھی حق ہے کہ وقت پر اس کی مدد کی جائے: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (الذاریات:١٩) — یہ بات قابل لحاظ ہے کہ قرآن نے ''حق'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی یہ تعاون کوئی احسان نہیں ہے؛ بلکہ یہ ان پر واجب ہے، اگر وہ غرباء کی مدد کر رہے ہیں تو ان کا حق ادا کر رہے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمان اہل دولت میں غریبوں کے حق کا احساس ختم ہو گیا ہے، یہاں تک کہ وہ زکوۃ دینے کو بھی اپنا احسان سمجھنے لگے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اس رویہ سے ہوتا ہے، جو انہوں نے زکوۃ کے مستحقین اور دینی مدارس کے نمائندوں کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے، سیٹھ صاحب کے گھر پر یا دکان پر مانگنے والے مردوں اور عورتوں کی قطار لگی ہوئی ہے، لوگ آہ وزاری کر رہے ہیں، ان کا الحاح جتنا بڑھتا جاتا ہے، سیٹھ صاحب کے غصہ کی آگ بھی اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے، ڈانٹ

ڈپٹ کے ساتھ گالی گلوج کی بھی نوبت آجاتی ہے، مدارس کے نمائندے تو شاید اس طرح لائن میں نہ لگتے ہوں اور اس نوبت سے نہیں گزرے ہوں؛ لیکن ان کو دوسرے طریقہ پر ایذاء پہنچائی جاتی ہے، موجود ہونے کے باوجود کہلا دیا جاتا ہے کہ موجود نہیں ہیں، بار بار بلایا جاتا ہے، کبھی صبح، کبھی دوپہر، کبھی شام اور کبھی رات، اس کے علاوہ جھڑکیاں بھی دی جاتی ہیں۔

یہ ساری باتیں خدا کو ناراض کرنے والی اور انفاق کے اجر کو ضائع کرنے والی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ وصول کرنے والوں سے بہتر سلوک کا حکم دیا ہے، حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب تمہارے پاس زکوۃ وصول کرنے والے آئیں تو وہ تمہارے پاس سے اس حال میں جائیں کہ وہ تم سے راضی ہوں: ''**إذا أتاكم المصدق فليصدر عنكم وهو عنكم راض**'' (**صحیح مسلم**، حدیث نمبر: ۹۸۹) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری زکوۃ اس وقت مکمل ہوگی، جب یہ لوگ تم سے راضی رہیں اور تمہارے حق میں دعا کریں: ''**فإن تمام زكاتكم رضاهم وليدعوا لكم**'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۵۸۸)۔

عام طور پر لوگ محصلین زکوۃ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس غلط فکر کے تدارک کے لئے فرمایا کہ حق کے ساتھ زکوۃ وصول کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہوتا ہے، جب تک وہ اپنے گھر واپس نہ آجائے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۹۳۶) رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں خود محصلین زکوۃ کے لئے بھی سبق ہے کہ ان کا زکوۃ وصول کرنا شریعت کے دائرہ میں ہو، کام اللہ کی رضا کے لئے کیا جائے، دین کی ایک اہم خدمت سمجھ کر کیا جائے، اجرت لی جاسکتی ہے، مگر صرف اجرت ہی پیش نظر نہ ہو، اجرت اتنی غیر متوازن نہ ہو کہ زکوۃ کا اچھا خاصا حصہ محصل کو چلا جائے اور جس چیز کے لئے زکوۃ دینا مقصود ہے، وہ نظر انداز ہوجائے، کمیشن پر زکوۃ وصول کرنے کا سلسلہ نہ ہو، پوری دیانت کے ساتھ رقم مدرسہ تک پہنچائی جائے اور زکوۃ وصول کرنے میں الحاح اور اپنی تحقیر کا رویہ بھی اختیار نہ کیا جائے؛ کیوں کہ آپ کا زکوۃ وصول کرنا اپنی ذات کے لئے نہیں، سوال میں الحاح کو ناپسند کیا گیا ہے، خواہ سوال اپنے لئے ہو یا دوسروں کے لئے، اگر کوئی شخص دینے سے انکار کردے تو اصرار نہ کیا جائے، اسی طرح اگر کوئی شخص ناشائستہ بات کہے تو اس کا تعاون قبول نہیں کرنا چاہئے، ادارے اللہ کی مدد سے چلتے ہیں، نہ کہ اصحاب ثروت کی اعانت سے، پھر ان کی خوشامد کیوں کی

جائے؟محصلین کا خوشامدانہ اور اپنی تحقیر کو گوارا کر لینے کا رویہ ایسے خدا ناترس لوگوں کا حوصلہ بڑھا دیتا ہے،غرض کہ اس حدیث میں ایک طرف زکوۃ دینے والوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ محصلین کو نیچی نظر سے نہ دیکھیں اور خود محصلین کے لئے یہ سبق ہے کہ وہ باوقار طریقہ پر اپنا کام کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ لینے اور دینے کے آداب کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ بھی فرمائی ہے کہ جب زکوۃ دو تو اس کے اجر کو بھولو نہیں؛ بلکہ ذہن میں اس کا استحضار رکھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اس کو ہمارے لئے نعمت میں اضافہ کا سبب بنا دے، اس کو ہمارے حق میں جرمانہ و تاوان نہ بنا دے: ''اَللّٰھَمَّ اجْعَلْھَا مَغْنَمًا وَ لاَ تَجْعَلْھَا مَغْرَمًا'' (ابن ماجۃ، حدیث نمبر: ۱۷۹۷)— انسان کی نفسیات یہ ہے کہ اگر کسی شئ کا نفع اس کے ذہن میں مستحضر ہو، وہ سمجھے کہ یہ اس کے لئے خدا کی نعمت میں اضافہ کا باعث ہوگا تو اسے خوشی ہوتی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے کھو نہیں رہا ہوں؛ بلکہ خرچ کر کے پا رہا ہوں؛ اس لئے وہ خوش دلی کے ساتھ خرچ کرتا ہے، کسان کھیت میں بیج ڈال کر اور تاجر مارکٹ سے سامان خرید کر مسرور ہوتا ہے کہ یہ چیز کہیں زیادہ نفع کے ساتھ اس کی طرف واپس آنے والی ہے، اور اگر اس کے ذہن میں ہو کہ جو مال وہ خرچ کر رہا ہے، وہ ضائع ہو جائے گا، اس کے عوض اسے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا تو وہ اسے بے جا تاوان اور جرمانہ سمجھ کر گوارا کرتا ہے، دیتے وقت اس کا رویہ بھی بہتر نہیں ہوتا؛ کیوں کہ دل کا یقین انسان کے عمل، اس کے سلوک، اس کے طریقۂ کار اور اس کے رویہ پر اثر انداز ہوتا ہے؛ اس لئے اصل چیز یہ ہے کہ انسان کے اندر اللہ سے اجر و ثواب کا یقین پیدا ہو جائے، یہ یقین جتنا مضبوط ہوگا، خیر کے کاموں میں خرچ کرنا اتنا ہی آسان ہوگا اور یہ یقین جتنا کمزور ہوگا، انسان کی طبیعت پر انفاق اتنا ہی بوجھ محسوس ہوگا۔

اہل ثروت اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ اللہ کے راستے میں جو کچھ وہ خرچ کر رہے ہیں، دراصل اپنی ہی آخرت کے لئے محفوظ کر رہے ہیں، اس میں جہاں اخروی زندگی کا اجر و ثواب ہے، وہیں رسول اللہ ﷺ کی زبان حق ترجمان کے مطابق دنیا میں بھی منجانب اللہ ان کی حفاظت کا سرو سامان ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اگر انکم ٹیکس کا آفیسر آپ کے گھر پہنچ جائے تو آپ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوں، رشوتیں دیں اور خوشامدیں کریں، اگر محلہ کا کوئی پہلوان آپ کی دکان پر آ دھمکے تو منت سماجت کر کے لوٹائیں، اگر وزراء اور سیاسی جماعتوں کے قائدین چندہ کے طلب گار ہوں تو لجاجت

کے ساتھ بڑی بڑی رقمیں ادا کریں؛ لیکن اگر کچھ لوگ اللہ کا نام لے کر اپنی ضرورت آپ کے سامنے رکھیں، رسول اللہ ﷺ کا حوالہ دے کر آپ سے بات کریں تو آپ کی گردنیں اکڑ جائیں، آپ کا سینہ تن جائے، آپ کی آنکھیں چڑھ جائیں، آپ کی زبان بے قابو ہوجائے اور آپ ڈانٹ ڈپٹ کر ان کا استقبال کریں، کیا کسی مسلمان کو یہ بات زیب دیتی ہے؟ کیا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا رشتہ سرکاری عہدہ داروں، پہلوانوں، سیاسی لیڈروں سے بھی گیا گزرا ہے، اگر قیامت میں رسول اللہ ﷺ دامن تھام لیں کہ تم میری محبت اور تعلق کے بارے میں شیخیاں بگھاڑتے تھے اور اپنے آپ کو سچا عاشق رسول کہتے تھے؛ لیکن تمہارے نزدیک اس تعلق کی اتنی وقعت بھی نہیں تھی، جو دنیا کے معمولی حکمرانوں کی ہوتی ہے تو اس وقت ہمارا کیا جواب ہوگا؟؟

عمرہ — ایک اہم عبادت!

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ارضی کے بچھانے کا آغاز مکہ مکرمہ سے ہوا ہے؛ اسی لئے یہ خشکی کے علاقہ کے اعتبار سے عین وسط کائنات میں واقع ہے، یہاں تک کہ بعض اہل تحقیق کا بیان ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے عین وسط میں ہونے کی وجہ سے وہاں کشش صفر ہوجاتی ہے اور قطب نما کے کانٹے میں حرکت نہیں ہوتی، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو انسانوں سے بسایا تو اس دنیا میں پہلا گھر جو بنایا گیا، وہ 'کعبۃ اللہ' ہے، اس طرح کعبۃ اللہ پوری دنیا کے انسانوں کے لئے مرجع و ماوی کی حیثیت رکھتا ہے، اگر انسان یہاں پہنچ کر ایک قلبی سکون اور روحانی مسرت محسوس کرے تو یہ وہی فطری احساس ہوگا، جو سفر سے اپنے گھر لوٹنے والے انسان کو ہوتی ہے؛ اسی لئے اسلام میں دو فرض عبادتیں ایسی ہیں جو کعبۃ اللہ سے جڑی ہوئی ہیں، مسلمان جہاں کہیں بھی نماز پڑھے، اس کا رخ کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور حج سوائے مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات کے کہیں اور ادا کیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔

حج کے علاوہ دوسری عبادت جس میں انسان کو زیارت حرم شریف کی سعادت حاصل ہوتی ہے، عمرہ ہے؛ بلکہ عمرہ کے اصل معنی ہی زیارت و ملاقات کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں ''مخصوص طریقہ پر بیت اللہ شریف کی زیارت کو کہتے ہیں'' (النہایۃ: ۳/ ۷) چوں کہ بیت اللہ شریف کی زیارت ایمان کو تازہ کرتی ہے؛ اس لئے عمرہ کی بڑی فضیلتیں منقول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بیت اللہ شریف کو آئے اور کوئی شہوانی کام اور گناہ نہ کرے تو وہ اس طرح لوٹتا ہے کہ جس طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے دن تھا، (**مسلم، باب في فضل الحج والعمرۃ ویوم العرفۃ**، حدیث نمبر: ۱۳۵۰) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی ایک اور روایت نقل کی گئی ہے، اس میں حج اور عمرہ دونوں کی صراحت موجود ہے کہ جو کسی شہوانی حرکت اور گناہ سے بچتے ہوئے حج کرے گا، وہ اپنے گھر اس طرح لوٹے گا کہ گویا وہ آج ہی پیدا ہوا ہے، (سنن دارقطنی: ۱/ ۲۴۹، حدیث نمبر: ۲۶۸۸) ایک اور روایت میں ہے کہ جو بیت اللہ شریف کو آئے اور اس کا مقصد

اسی گھر کی زیارت ہو اور طواف کرے تو وہ اپنے گناہ سے اس طرح پاک ہو جائے گا، جیسا کہ اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔(القری لقاصد أم القری، ص:۲۹)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایک عمرہ کے بعد جب انسان دوسرا عمرہ کرتا ہے تو یہ دوسرا عمرہ درمیان کے گناہوں کے لئے کفارہ بن جاتا ہے: ''**العمرة إلى العمرة كفارة لما بينهما**'' (**بخاری، باب وجوب العمرة وفضلها، حدیث نمبر: ۱۷۷۳**)؛ البتہ اس حدیث میں گناہ سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جن باتوں سے تم کو منع کیا گیا ہے، اگر تم ان میں سے بڑی بڑی باتوں سے بچ جاؤ تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ دور کردیں گے: ﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ (النساء:۳۱) — حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حج وعمرہ روحانی فائدہ کا باعث ہے، اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے، وہیں یہ فقر ومحتاجی کو بھی دور کرتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حج وعمرہ پے در پے کرتے رہو، یہ فقر و محتاجی کو اس طرح دور کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے کے میل وکچیل کو دور کر دیتی ہے (**مجمع الزوائد، باب المتابعة بين الحج والعمرة، حدیث نمبر: ۵۶۵۷**)۔

حج وعمرہ کے روحانی اور مادی فوائد میں یکسانیت کی وجہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف سے متعلق طواف وسعی اور تلبیہ واحرام کا جو عمل حج میں ہوتا ہے، وہ عمرہ میں بھی ہوتا ہے؛ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کو حج اصغر قرار دیا ہے: ''... **وأن العمرة الحج الأصغر**'' (**الدارقطنی، کتاب الحج، حدیث نمبر: ۲۶۹۷**)۔

یہ تو عمرہ کی عمومی فضیلت ہے؛ لیکن رمضان المبارک میں چوں کہ ہر عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے؛ اس لئے اس ماہ مبارک میں عمرہ کرنے کا اجر بھی زیادہ ہے، مدینہ میں ایک انصاری خاتون ام سنان رضی اللہ عنہا نام کی تھیں، وہ حجۃ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک نہیں ہوسکیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سبب پوچھا، انہوں نے عرض کیا کہ میرے پاس دو ہی اونٹ ہیں، ایک اونٹ میرے شوہر اور لڑکے لے کر چلے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی اور دوسرا اونٹ پانی لانے اور دوسرے کاموں میں استعمال ہوتا ہے، تو آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب رمضان آئے تو عمرہ کر لینا؛ کیوں کہ رمضان کا عمرہ بھی حج کے برابر ہے: ''**فإذا جاء رمضان فاعتمري، فإن عمرة فيه تعدل حجة**'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۵۶، **باب فضل العمرة في رمضان**)، بعض روایتوں میں اس سے بھی بڑھ کر بشارت آئی ہے کہ رمضان میں عمرہ کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرنے کے درجہ میں ہے، (دیکھئے: سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۱۹۹۰) — غالباً یہ بات آپ نے ان لوگوں کی تسلی کے لئے فرمائی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تشریف نہ لے جاسکے، حالاں کہ وہ اس کے آرزومند تھے، یہ شریک نہ ہونا مختلف اعذار کی بناء پر ہوا ہوگا، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مدینہ بالکل خالی نہ ہوجائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد رمضان المبارک میں عمرہ کا موقع نہیں ملا اور اہل مکہ سے ناخوش گوار تعلقات کی وجہ سے مدنی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کا بار بار عمرہ کرنا ممکن نہیں تھا؛ لیکن پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ حدیبیہ کو لے کر چار عمرے فرمائے ہیں، پہلا ۶ ھ میں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ تشریف لائے اور وہاں صلح طے پائی، یہ عمرہ نامکمل رہا؛ کیوں کہ مشرکین مکہ کی رکاوٹ کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ نہ کر پائے، دوسرا عمرہ آئندہ سال اس عمرہ کی قضاء کے طور پر، اس کو ''عمرۃ القضاء'' کہا جاتا ہے، تیسرا عمرہ فتح مکہ کے موقع سے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع سے حج قِران کا احرام باندھا تھا، جس میں حج و عمرہ دونوں جمع ہوتا ہے اور یہ تمام ہی عمرے ماہ ذوالقعدہ میں کئے گئے (**بخاری، كتاب العمرة، باب كم اعتمر النبي؟** حدیث نمبر: ۱۷۷۸، **صحيح مسلم، كتاب كتاب الحج، باب بيان عدد عمر النبي وزمانهن**، حدیث نمبر: ۳۰۹۲، **سنن أبي داؤد، كتاب المناسك، باب العمرة**، حدیث نمبر: ۱۹۹۵)۔

عمرہ کی اسی اہمیت کی وجہ سے بعض فقہاء نے عمرہ کو واجب قرار دیا ہے، حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک اگرچہ عمرہ سنت مؤکدہ ہے، (المغنی: ۸۹/۳) لیکن بعض مشائخ احناف نے عمرہ کو واجب بھی قرار دیا ہے، اور مشہور حنفی فقیہ علامہ کاسانی کا رجحان بھی اسی طرف ہے (بدائع الصنائع: ۲۲۶/۲)۔

اس لئے جو مسلمان اصحاب استطاعت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مالی گنجائش دی ہے، انہیں شادی بیاہ اور لہو ولعب میں پیسے ضائع کرنے کی بجائے عمرہ کی سعادت حاصل کرنی چاہئے، البتہ یہ بھی

ضروری ہے کہ عمرہ کو عبادت کا سفر بنایا جائے، نہ کہ تفریح کا، آج کل عمرہ کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس طرح عمرہ کرتی ہے کہ گویا وہ کسی سیاحتی سفر پر جارہے ہوں، نہ عبادت کا اہتمام، نہ خشوع و خضوع، نہ زندگی میں کوئی تبدیلی، نہ اخلاق و کردار میں کوئی انقلاب، عمرہ کے باوجود نماز کی پابندی نہیں، داڑھی رکھنے کی توفیق نہیں، زمینوں پر ناجائز قبضہ سے اجتناب نہیں، لوگوں کے ساتھ بدخلقی کے رویہ میں کوئی فرق نہیں، غرض کہ عمرہ ان کے قلب و روح کے لئے کوئی انقلاب انگیز عمل نہیں ہوتا؛ بلکہ ایک تفریح ہوتی ہے، جیسے آگ کی تصویر سے حرارت حاصل نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ایسے بے روح عمرہ اور بے کیف عبادت سے انسان کی زندگی میں مطلوبہ تبدیلی نہیں آتی۔

شریعت کے تمام احکام حالات سے مربوط ہیں، ضرورت کے اعتبار سے عمل کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں، اگر جہاد کا موقع ہو تو روزہ رکھنے سے نہ رکھنا افضل ہے، اگر گھر میں ایک شخص مریض ہو جس کو ہر لمحہ خدمت اور تیمارداری کی ضرورت ہو تو نفل عبادتوں سے زیادہ اہم اس مریض کی دیکھ ریکھ ہے، اسی طرح اگر کسی سے رشتہ داروں کے مالی حقوق وابستہ ہوں، کسی کی یتیم بھانجی کی پیسوں کی وجہ سے شادی نہ ہو پارہی ہو، کسی کا غریب بھتیجا پیسوں کی وجہ سے تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہو، کسی کا غریب بھائی اپنے علاج کے لئے پیسہ نہ پاتا ہو، کسی کے قرب و جوار میں مسلمانوں کی غربت و پسماندگی کی وجہ سے ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا ہو تو ایسے موقع پر نفل عمرہ کرنے سے افضل ان ضرورتوں کو پورا کرنا ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ اگر کوئی شخص مکرر عمرہ کرنے کی بجائے اس رقم کو ان کاموں میں صرف کرے گا تو وہ زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔

عبادت میں تجارت

(عبادتوں سے تجارتی فوائد اٹھانا)

ایک انسان کی اپنے خالق و مالک سے جو نسبت ہے، اس میں سب سے اہم نسبت عبدیت اور بندگی کی ہے، انسان عبد ہے اور اللہ تعالیٰ معبود ہیں، انسان بندہ ہے اور اللہ کی ذات بندگی کی مستحق ہے، انسان غلام ہے اور اللہ اس کے آقا ہیں، یہ غلامی کی نسبت انسان کے لئے تحقیر نہیں ہے؛ بلکہ اِس میں اُس کی توقیر اور اعزاز واکرام ہے، اسی لئے واقعہ معراج کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر اپنے بندے کے لفظ سے کیا ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ (بنی اسرائیل:۱) جیسے بیٹے کو اس سے زیادہ اور کوئی خطاب محبوب نہیں ہوسکتا کہ اس کا باپ اس کو بیٹا کہہ کر مخاطب کرے اسی طرح کسی بندے کے لئے اس سے بڑھ کر اعزاز نہیں ہوسکتا کہ خود کائنات کا خالق و مالک ''بندہ'' کہہ کر اپنے آپ سے اس کی نسبت کو ظاہر کرے۔

انسان اپنی بندگی کا اپنے عمل کے ذریعہ اقرار کرے، اسی کو ''عبادت'' کہتے ہیں اور اللہ نے انسان وجنات کی یہ بستی اس لئے بسائی ہے کہ یہ سب خدا کی عبادت کریں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات:۵۶) — ہر نبی نے اپنی تعلیمات میں انسانیت کو اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی ہے اور اس کے طریقے بتائے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے عبدیت کو اس کے اوجِ کمال پر پہنچادیا، عبادت کی مقدار بھی بڑھائی گئی اور عبادت کی کیفیت میں بھی اضافہ کیا گیا، نیز جس تفصیل سے عبادت کا طریقہ وسلیقہ اور اس کے آداب واحکام شریعت محمدی میں بتائے گئے، کسی دوسرے مذہب میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، ہر عبادت بندگی اور نیازمندی کا مظہر، جھکاؤ اور بچھاؤ کی کیفیت سے معمور، اللہ سے مانگنے اور ہاتھ پھیلانے کی کوشش اور انسانی زندگی کے لئے دروسِ عبرت سے معمور!

عبادت کے اصل معنی اللہ کے سامنے اپنی ذلت اور کمتری کے اظہار کے ساتھ بے حد جھکاؤ

اور آخری درجہ تواضع اختیار کرنے کے ہیں؛اس لئے عام طور پر عربی لغت کے ماہرین نے اس کا ترجمہ خضوع اور ذلّ سے کیا ہے(مفردات القرآن: ۳۱۸،صحاح للجوہری: ۲/ ۵۰۲، لسان العرب: ۳/ ۲۷۰۴)ایک بڑے صاحب علم علامہ مناوی نے لکھا ہے کہ عبادت ایسے افعال کا نام ہے کہ جس سے آخری درجہ معبود کے سامنے اپنی کمتری، عاجزی، جھکاؤ اور نیازمندی کا اظہار ہو کہ اس عمل سے بڑھ کر کسی اور عمل سے اس جذبہ کا اظہار ممکن نہ ہو(التوقیف علی مہمات التعریف للمناوی:ص ۲۳۴) عبادت میں جہاں اللہ کے سامنے عجز کا اظہار ضروری ہے، وہیں اللہ سے حد درجہ محبت اور دل میں اللہ کی غیر معمولی چاہت کا احساس بھی ضروری ہے؛اسی لئے علامہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ عبادت ایسے عمل کا نام ہے،جس میں آخری درجہ کی محبت بھی ہو اور آخری درجہ کا جھکاؤ بھی: **"العبادة تجمع اصلين: غاية الحُبّ و غاية الذل و الخضوع"** (مدارج السالکین: ۸۶-۸۵)

لہٰذا وہ اعمال عبادت میں شامل ہیں جو خالصۃً اللہ کے لئے ہی کئے جاتے ہیں،جس عمل کو کسی بندے کے لئے نہیں کیا جاسکتا، جیسے: نماز، روزہ، زکاۃ، حج، قربانی، سجدہ، تلاوت، دعاء، نذر وغیرہ، جو افعال اللہ کے لئے بھی کئے جاسکتے ہیں اور انسانوں کے لئے بھی، اگر ان کو بہتر نیت سے کیا جائے، اللہ کی رضا اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع مقصود ہو تو انشاء اللہ وہ بھی اجر وثواب کا باعث ہوگا؛لیکن وہ اصل میں طاعت ہے، حقیقی معنوں میں وہ عبادت نہیں ہے،عربی زبان کے ایک ماہر علامہ ابو ہلال عسکری نے لکھا ہے کہ عبادت اور طاعت کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی کی جاسکتی ہے؛لیکن طاعت اللہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔(الفروق فی اللغۃ: ۱۸۲)

عبادت کا ایک نبیادی حکم یہ ہے کہ وہ اجر کے لئے کی جاتی ہے نہ کہ اجرت کے لئے،اس کا بدلہ آخرت ہی میں دیا جاسکتا ہے، دنیا کے بدلے کے لئے اس عمل کو نہیں کیا جاسکتا، انبیاء کرام اپنی خاص حیثیت کے اعتبار سے ہر کام اللہ کے لئے کرتے تھے اور اللہ کے حکم سے ہی کرتے تھے؛اسی لئے قرآن نے مختلف انبیاء کی زبان سے کہلایا: ﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللهِ﴾ (ہود: ۲۹) میرا اجر صرف اللہ ہی پر ہے، جب کوئی کام دنیا میں بدلے کے لئے کیا جائے تو پھر وہ تجارت بن جاتا ہے، اور عبادت وتجارت کے مقاصد بالکل الگ ہیں؛اسی لئے عبادت کے لئے مخصوص جگہ پر تجارت سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، مسجدیں اللہ کا گھر ہیں اور اللہ کی عبادت کے لئے ہی بنائی گئی ہیں؛ چنانچہ مسجد میں

خرید وفروخت اور کاروباری گفتگو سے منع کیا گیا ہے؛ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اس کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ کسی کی کوئی چیز گم ہوئی ہوتو وہ مسجد میں اس کا اعلان کرے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس طرح کا اعلان مسجد میں کرے تو کہہ دو کہ تمہاری چیز نہ ملے۔

اسی لئے فقہاء کا عمومی نقطہ نظر یہ ہے کہ جو افعال مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں، جیسے: نماز، روزہ، حج، تلاوت قرآن، جہاد، ان پر اجرت لینا جائز نہیں؛ کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے جو آخری وعدہ لیا، وہ یہ کہ اگر میں مؤذن مقرر کیا جاؤں تو اذان پر اجرت نہیں لوں (ترمذی بہ تحقیق احمد محمد شاکر ۱/۴۳۱۰)، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اہل صفہ میں سے کچھ لوگوں کو قرآن پڑھنا اور لکھنا سکھایا، مجھے پڑھنے والوں میں سے ایک نے ایک کمان تحفہ میں دی، میں نے سوچا کہ یہ خاص مال تو ہے نہیں، میں اسے جہاد میں استعمال کروں گا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہیں یہ بات پسند آتی ہو کہ اللہ تمہیں آگ کی کمان پہنائے تب قبول کرلو۔ (ابوداؤد مع عون المعبود: ۳/۲۷۶۲) صحابی رسول حضرت عبدالرحمن بن بشر انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن مجید پڑھو، مگر اس میں غلو نہ کرو اور نہ اس کو کھانے اور دولت میں اضافے کا ذریعہ بناؤ "و لا تاکلوا به و لا تستکثروا به" (فیض القدیر: ۲/۶۴ بہ حوالہ مسند احمد)

یہ اور بات ہے کہ عبادت سے متعلق بعض افعال ایسے ہیں، جن میں عمل کے ساتھ ساتھ وقت کی بھی ضرورت ہے، جیسے نماز کہیں بھی پڑھی جاسکتی ہے، اتفاق سے اگر کسی نے کہیں نماز کی امامت کردی اور ایک جماعت نے اس کے پیچھے نماز ادا کرلی تو اس میں کچھ زیادہ وقت کی ضرورت نہیں؛ لیکن اگر کسی کو خاص مسجد میں امام مقرر کیا جائے تو وہ اس وقت کا پابند ہوجاتا ہے؛ بلکہ بعض اوقات پانچ وقت کی امامت میں انسان کا پورا وقت گھر جاتا ہے، اسی طرح ایک صورت تو یہ ہے کہ اتفاقاً کوئی آئے اور آپ کے پاس قرآن کی کوئی آیت پڑھ لے، یا اپنے پڑوسی کو چند آیات پڑھادیں اور قرآن کی تصحیح کردیں تو اس میں انسان کا وقت اس طرح گھر نہیں جاتا کہ وہ کسب معاش کا کوئی اور ذریعہ اختیار نہ کرسکے؛ اس لئے ایسے اعمال پر اجرت لینا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص مستقل طور پر ایک مدرس کی حیثیت سے قرآن اور اسلامی علوم کی تعلیم دے، اور مقررہ وقت اس میں لگایا کرے، جس کی

پابندی اس پر لازم ہوتو پھر اس کا وقت اس عمل کی وجہ سے مشغول ہوجاتا ہے، اس لئے ایسی صورت میں علماء اہل سنت میں سے امام مالکؒ وامام شافعیؒ نے اجرت لینے کی اجازت دی ہے اور جب حکومتوں کی طرف سے ائمہ اور معلّمین کا انتظام باقی نہ رہا اور صورتِ حال یہ ہوگئی کہ ہر وقت امامت کی صلاحیت کے حامل ائمہ کا ملنا دشوار ہوگیا، مسلمان بچے اور بڑے قرآن کی تعلیم سے محروم ہونے لگے تو فقہاء احناف اور حنابلہ میں سے بعد کے لوگوں نے ان کاموں پر اجرت لینے کی اجازت دے دی؛ کیوں کہ یہ کام کی اجرت نہیں ہے، وقت کی اجرت ہے، اور وقت کی اجرت لینا جائز ہے۔

اسی طرح فقہاء نے حج پر اجرت لینے یا جہاد پر اجرت لینے کو منع کیا ہے؛ کیوں کہ یہ سب عبادت ہے اور عبادت خالصۃً لوجہ اللہ ہونی چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہجرت بھی اہم عبادت تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف اعلان کردیا کہ جو اللہ اور رسول کے لئے ہجرت کرے گا، اس کا یہ عمل باعث اجر بنے گا اور جو کسی اور مقصد کے لئے ترکِ وطن کرے گا، وہ ہجرت کے ثواب سے محروم رہے گا؛ کیوں کہ اس کا یہ وطن چھوڑنا اللہ اور رسول کے لئے نہیں ہے، مشہور محدث امام بخاریؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب بخاری شریف کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے، غرض کہ عبادت پر عبادت کا رنگ باقی رہنا چاہیے، خود عبادت کرنے والوں کا بھی یہی رویہ ہونا چاہیے اور دوسرے مسلمانوں کا بھی۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ایک خاص رجحان عبادتوں سے تجارتی فوائد اٹھانے کا بنتا جارہا ہے، ایصال ثواب کا درست ہونا حدیث سے ثابت ہے اور سوائے بعض اہل علم کے علماء اہل سنت کا اتفاق ہے کہ تلاوتِ قرآن کے ذریعہ بھی ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے، مگر اس پر اجرت کا لینا جائز نہیں، مشہور حنفی عالم علامہ شامیؒ نے خوب لکھا ہے کہ اگر تلاوتِ قرآن اجرت کے عوض ہوتو اس عمل میں اخلاص باقی نہیں رہا اور جو عمل اخلاص سے خالی ہو وہ کارِ ثواب نہیں ہوسکتا، تو جب یہ عمل خود لائق ثواب نہیں رہا تو دوسروں کو اس کا ثواب پہنچایا کس طرح جاسکتا ہے؟ اس لئے ایصال ثواب کے لئے تلاوتِ قرآن پر اجرت لینا جائز نہیں؛ مگر صورت حال یہ ہے کہ آج کل مسلم معاشرہ میں اس کی اجرت متعین کی جاتی ہے اور کہیں کہیں تو اس کے لئے گروپ بنے ہوئے ہیں اور وہ باضابطہ بھاؤ تاؤ کرتے ہیں، یہ واضح طور پر عبادت کو تجارت کی شکل دینا ہے۔

تراویح کی نماز میں قرآن مجید کا ختم کرنا واجب نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ سنت ہے، اب

بحمد اللہ حفاظ کرام کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ بڑی آسانی سے شہر سے گاؤں تک حفاظ میسر آجاتے ہیں، اگر تراویح پڑھانے والے کی طرف سے اجرت کا مطالبہ نہ ہو؛ بلکہ انکار رہا اور اس کی نیت ایسی خالص ہو کر اگر اس کو کوئی اجرت نہیں ملے، تب بھی وہ نماز پڑھائے گا، اس کے باوجود لوگ اپنی طرف سے ایک حافظ قرآن کی خدمت کی نیت سے ہدیہ پیش کردیں تو پیش کرنے والوں کے لے سعادت اور اس حافظ کا قبول کرنا جائز ہے؛ لیکن حافظ کی طرف سے اس کا مطالبہ کرنا اور دونوں فریقوں کا مل کر اجرتِ تراویح طے کرنا یہ یقیناً عبادت کو تجارت کے درجے میں لے آنا ہے اور قرآن مجید کے احترام کے مغائر ہے۔

رمضان المبارک میں عام طور پر فروٹ کا استعمال بڑھ جاتا ہے اور فروٹ کے تاجروں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے، ان کا روزہ داروں کے ہاتھ فروٹ بیچنا اور اس پر مناسب منافع لینا جائز ہے؛ لیکن عملی صورتِ حال یہ ہے کہ اس میں روزہ داروں کا استحصال کیا جاتا ہے، مثلاً ایک تربوز اگر ۲۵ر شعبان کو ۳۰ر روپئے کا ہو تو پہلی رمضان سے اس کی قیمت ۱۰۰ر روپئے کردی جاتی ہے اور عید ختم ہوتے ہی پچھلی قیمت بحال ہوجاتی ہے، یہی حال بقرعید کا ہے، جانوروں کے مسلمان تاجر عید الاضحیٰ کے کچھ پہلے سے قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کردیتے ہیں، قصاب حضرات قربانی کے دنوں میں دوگنا اور تین گنا پیسہ وصول کرتے ہیں، ۱۲ر ذی الحجہ کے بعد پھر قیمت اور اجرت معمول پر آجاتی ہے، بعض حضرات نے تو اجر وثواب کے اس موسم کو تجارت اور انویسٹمنٹ کا سنہرا موقع بنالیا ہے دو ہفتہ کے لئے سرمایہ لگاتے ہیں اور کئی گنا نفع حاصل کرتے ہیں۔

حج کے معاملے میں مسلم ٹورس اور ٹراویلس کا رویہ سب سے زیادہ خراب ہے، انہیں اس نیت سے کام کرنا چاہیے تھا کہ حاجیوں کو راحت پہنچائیں اور تھوڑا بہت نفع ان کو مل جائے؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ اولاً تو حاجیوں سے ایسے وعدے کئے جاتے ہیں، جو حرمین شریفین پہنچنے کے بعد دن کا خواب معلوم ہوتا ہے، جو سہولتیں نہیں پہنچا سکتے، ان کا اعلان کرتے ہیں، خود حجاج عبادت میں مشقت اٹھانے اور اللہ کا مہمان ہونے کے جذبہ کے بجائے ٹورس کے مہمان ہونے کا احساس پیدا ہوجاتا ہے، اور وہ سہولت پسندی کے جذبہ کے ساتھ پہنچتے ہیں، جب وہاں شکایتیں پیدا ہوتی ہیں تو لے جانے والوں کا رویہ نہایت تیز اور بہت کڑوا ہوتا ہے، یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے؛ تاکہ سبز باغ دکھا کر عازمین

سے زیادہ سے زیادہ پیسے وصول کئے جائیں۔

افسوس بالائے افسوس یہ ہے کہ اب حج میں رشوت کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا ہے، سعودی حکومت حج وعمرہ کے ویزے فروخت نہیں کرتی ہے؛ لیکن نہ معلوم کہاں سے اس میں کرپشن داخل ہوگیا ہے، لوگ رشوت دے کر حج کے ویزے خریدتے ہیں، جو قطعاً ناجائز ہے، اسی طرح بعض ٹورس ان ویزوں کو فروخت کرتے ہیں، جو انہیں الاٹ ہوا ہے؛ حالاں کہ یہ بالکل ناجائز اور حرام ہے۔

ان سب کی بنیاد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں مال ومتاع کی حرص اور مادیت اس قدر پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہر کام میں اور ہر قیمت پر زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے عبادتوں کے انجام دینے اور اس کے وسائل فراہم کرنے میں اجر وثواب کے جذبہ کو بالکل پسِ پشت ڈال دیا ہے اور ایسے مقدس کاموں کو بھی خالصۃً تجارتی مقصد کے تحت انجام دیتے ہیں، نیز لوگوں کے سامنے اپنی تصویر کچھ اس طرح کی پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ دین کے خدمت گذار اور اپنے مسلمان بھائیوں کے پکے بہی خواہ ہیں، اس سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے، ضرورت تو یہ تھی کہ ہم اپنی تجارت کو عبادت بنا لیتے، یعنی اس میں اللہ کی رضا کا جذبہ شامل رکھتے، کم نفع لیتے، لوگوں کو سہولت بہم پہنچاتے، کچھ اجرت حاصل کرتے اور کچھ اجر کے امیدوار رہتے، نہ یہ کہ ہم عبادت کو تجارت کا رنگ دیدیں اور حصولِ اجر وثواب کے مواقع کو کسبِ معاد کے بجائے خالص کسب معاش کا ذریعہ بنالیں۔ وباللہ التوفیق۔

بارش کی کمی
خود احتسابی اور اللہ سے رجوع کرنے کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے، وہ بے شمار ہیں، ان میں کچھ نعمتیں روحانی ہیں اور کچھ مادی ہیں، یہ مادی نعمتیں انسانوں کی اس بستی میں جینے اور رہنے کے لئے ناگزیر ہیں، ان ضرورتوں میں سب سے اہم ہوا اور ہوا کے بعد پانی ہے، ہوا اور پانی اس فراوانی کے ساتھ مہیا ہیں کہ ہمیں کبھی ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں سوچنے کا خیال بھی نہیں گذرتا، غور کیجئے کہ ایک لیٹر صاف وشفاف پانی ہم بازار سے دس تا بارہ روپے میں خرید کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے پانی کی بے حساب مقدار کھیت اور باغات کی آبیاری، انسان کی سیرابی اور انسان سے متعلق چیزوں کی صفائی اور دھلائی کے لئے پیدا فرمائی ہے، اگر اس پانی کی قیمت بارہ کے بجائے پانچ یا دو ہی روپے لیٹر کے حساب سے انسان سے وصول کی جاتی تو یہ انسان کے لئے کس قدر گراں بار ہو جاتا؟ اگر آکسیجن کا ایک سلنڈر حاصل کیا جائے تو سینکڑوں روپے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، انسان کو سانس لینے کے لئے ہر وقت آکسیجن مطلوب ہے، اگر اسے اس آکسیجن کی قیمت ادا کرنی پڑتی تو کتنا دشوار ہوتا! یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت ہے، کہ کائنات کے اس چھوٹے سے محلہ میں جسے زمینی دنیا کہا جاتا ہے، پانی اور ہوا کی نہایت ہی وافر مقدار موجود ہے، جب کہ فضاء میں اس سے بڑے سیارے موجود ہیں؛ لیکن وہاں نہ پانی کا کوئی قطرہ دستیاب ہے اور نہ ہوا کا کوئی جھونکا، اس سے اندازہ کیجئے کہ حضرت انسان کی ضیافت و مہمان نوازی اور راحت رسانی کا کس خوبی سے انتظام کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کا بار بار ذکر کیا ہے، ان میں ایک پانی بھی ہے؛ بلکہ فرمایا گیا کہ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (الانبیاء: ۳۰) انسان کی زندگی کا مدار تو پانی پر ہی ہے، جتنے بھی ذی روح جانور ہیں، ان کی زندگی کی بقاء بھی پانی ہی پر منحصر ہے؛ چوں کہ مادۂ تخلیق میں بھی پانی کا ایک جزء موجود ہوتا ہے، اسی لئے قرآن

نے انسانی نطفہ کو بھی ''ماء دافق'' یعنی اچھلتے ہوئے پانی سے تعبیر کیا ہے، (الطارق:٦) اور یہ بھی فرمایا گیا کہ تمام جاندار کی تخلیق اصل میں پانی ہی سے ہوئی ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ﴾ (النور:۴۵) نباتات کا تو وجود ہی پانی پر موقوف ہے، کہ اسی سے زمین سے کونپلیں نکلتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ سایہ دار درختوں اور لہلہاتے ہوئے سرسبز پودوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں: ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ﴾ (لقمان:۱۰) جو جمادات ہیں، وہ بھی پانی سے بے نیاز نہیں، چاہے زمین ہو یا نمو پذیر زندہ پتھر ہوں، سب کو پانی کی ضرورت ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین جب مردہ ہوجاتی ہے تو آسمان سے آبِ حیات بن کر بارش اس سے ہم آغوش ہوتی ہے اور اس طرح اس کے لئے زندگی کا ایک نیا سروسامان مہیا کرتی ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (النحل:۶۵)

پھر خدا کی قدرت دیکھئے کہ انسان کے لئے کس طرح پانی کا انتظام کیا جاتا ہے، دنیا بھر کا استعمال شدہ گندہ اور آلودہ پانی دریاؤں، نہروں اور ندیوں کے ذریعہ اپنی تمام غلاظتوں کے ساتھ سمندر تک پہنچتا ہے، سمندر کا نمکین پانی اس آلودگی کو جذب کرلیتا ہے، اگر سمندر کے کھارے پانی میں آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو انسان کے لئے اس کرۂ ارض پر جینا دوبھر ہوجاتا، پھر ایک طرف سمندر کی تہہ میں گندھک کی بچھی ہوئی چادر پانی کو گھلاتی ہے اور دوسری طرف سورج اپنے جگر کو بھون بھون کر سمندر کی اوپری سطح کو گرم کرتا ہے، یہاں تک کہ سمندر سے بھاپ اُٹھتی ہے اور ہوائیں اسے گود لے کر اڑن کھٹولا بن کر فضاؤں میں گھومتی پھرتی ہیں اور ایک ایسی سطح پر لے جاتی ہیں، کہ اسی بھاپ میں کثافت پیدا ہوتی ہے اور اب یہ ابرِ رحمت بن کر ہوا کے دوش پر سوار فضاء کی سیر کرتا رہتا ہے اور جہاں اللہ چاہے برس جاتا ہے۔

پھر اس میں بھی خدا کا نظامِ قدرت یہ ہے کہ صحراؤں اور ریگستانوں کو چوں کہ اپنے بقاء کے لئے پانی کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے وہاں کم سے کم بارش ہوتی ہے، جہاں سرسبز و شاداب کھیت ہوں، درخت اور جنگلات ہوں، وہاں پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، کہ ان کی بقاء پانی ہی پر موقوف ہے، اس لئے یہاں بادل کی نگاہ التفات بھی بڑھ جاتی ہے، غالباً اللہ تعالیٰ کے اسی نظام ربوبیت کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ پودوں اور جانوروں کی وجہ

سے اللہ بارش نازل فرماتے ہیں؛ چوں کہ جہاں درخت اور جنگلات ہوتے ہیں، وہیں پالتو اور جنگلی، چلنے والے اور رینگنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہوتی ہے۔

یہ پانی کا ظاہری اور نظر آنے والا نظام ہے؛ لیکن اصل قوت خدا کی قوت ہے، جس کے اشارے اور حکم سے ہی انسان کو کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے اور وہ کسی نعمت سے محروم کیا جاتا ہے، اب یہی دیکھئے کہ سمندر کے پانی کی حرارت اور سورج کی تپش کم وبیش ہمیشہ رہتی ہے، ہوائیں بھی ایک طرف سے دوسری طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہیں، بادل بھی فضاء میں جگہ جگہ اپنے گھروندے بنائے رہتا ہے، سوکھی ہوئی زمین اور نیم مردہ درخت ہر سال موسم گرما میں آسمان کی طرف دست سوال پھیلائے رہتے ہیں؛ لیکن کسی سال معتدل بارش ہوتی ہے، کسی سال ضرورت سے زیادہ اور کسی سال خشک سالی اور قحط کی وجہ سے زمین قطرہ قطرہ کو ترس جاتی ہے، یہ وہی مشیت خداوندی کا کرشمہ ہے، کہ جب اس کی مشیت نہیں ہوتی تو ظاہری اسباب کے موجود ہونے کے باوجود مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

اس وقت ہندوستان کا بڑا حصہ قحط کی جس کیفیت سے دوچار ہے اور کسان کی آنکھوں میں دوپہر کی دھوپ میں بھی جس طرح اندھیرا چھایا ہوا ہے، یہ بہت ہی تشویشناک ہے، اس سلسلہ میں ایک طرف تو ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے، کہ کہیں ہماری بداعمالیاں تو اللہ کی اس پکڑ کا باعث نہیں ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اس سے بارش روک لی جاتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرنے والوں کا تناسب کم ہے، اگر تمام صاحب نصاب مسلمان اپنی پوری زکوٰۃ ادا کریں تو اس ملک میں کوئی بھوکا مسلمان نہ رہے حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی گروہ آمادۂ ظلم و جور ہوجاتا ہے تو اس پر آسمانی آزمائشیں مسلط کر دی جاتی ہیں، جیسا کہ اہل مکہ پر قحط نازل کیا گیا تھا، ظاہر ہے ہمارے ملک میں جس بے دردی کے ساتھ انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے، بوڑھوں کو تہہ تیغ کیا جاتا ہے، عورتوں اور معصوم بچوں کو زندہ جلایا جاتا ہے، برسرعام خواتین کی بے آبروئی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ پیٹ میں پلنے والے بچے کو بھی نہیں بخشا جاتا، ایسی قوم پر اللہ کے عذاب کے لئے کسی اور حجت کی ضرورت ہے؟ یہ تو ایسے واقعات ہیں کہ اگر آسمان کی آنکھیں خون کے آنسو برسائیں تب بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

یہ تو اپنے احتساب کا پہلو ہے، دوسرا پہلو خدا سے مانگنے اور رب کائنات سے رجوع کرنے کا

ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز اور صبر کو اللہ سے مدد مانگنے کا ذریعہ و وسیلہ قرار دیا ہے، ''اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' (البقرۃ: ۱۵۳) رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عملی تطبیق فرمائی ہے کہ ہر ضرورت کے لئے آپ ﷺ نے نماز رکھی، کوئی خوشی کی بات پیش آئے تو نمازِ شکر، کسی مسلمان کی موت ہوجائے تو استغفار کے لئے نمازِ جنازہ، کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو نماز توبہ، کسی معاملہ میں خیر وشر اور نفع و نقصان سمجھ میں نہ آتا ہو، تو نمازِ استخارہ، سورج گہن ہو تو نمازِ کسوف، چاند گہن ہو تو نمازِ خسوف، کوئی ضرورت درپیش ہو تو نمازِ حاجت، اسی طرح اگر بارش رُک جائے تو نمازِ استسقاء۔

رسول اللہ ﷺ نے استسقاء یعنی اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے نماز بھی پڑھی ہے اور صرف دُعاء پر بھی اکتفا فرمایا ہے، ایک بار آپ ﷺ خطبۂ جمعہ ارشاد فرمارہے تھے، کہ ایک دیہاتی آیا، اس نے عرض کیا کہ مویشی ہلاک ہو رہے ہیں اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے دُعاء مانگئے، آپ ﷺ نے تین بار دُعاء کی، کہ اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما، بعض روایات میں: ''اللھم اسقنا'' کے الفاظ ہیں اور بعض میں ''أغثنا'' کے، اس وقت آسمان بالکل صاف تھا؛ لیکن آپ ﷺ کی دُعاء ایسی قبول ہوئی کہ فوراً بادل ظاہر ہوا اور چھ دن تک بارش ہوتی رہی، اگلے جمعہ جب آپ ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، تو پھر وہی دیہاتی یا کوئی اور شخص عرض کناں ہوا کہ اللہ کے رسول! گھر گر رہے ہیں اور جانور غرقاب ہو رہے ہیں، آپ دُعاء فرمائیے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دُعاء فرمائی کہ ہمارے گرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو: ''اللھم حوالینا ولا علینا'' چنانچہ مدینہ پر بارش تھم گئی اور گرد و پیش بارش کا سلسلہ ایک ماہ کے قریب جاری رہا، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۳۳) حضور ﷺ نے ہاتھ اُٹھا کر بارش کے لئے دُعاء فرمائی تھی اور آپ ﷺ کے ساتھ تمام لوگوں نے ہاتھ اُٹھا کر دُعاء کی؛ حالاں کہ خطبہ میں ہاتھ اُٹھا کر دُعاء مانگنے کا معمول نہیں تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دستِ مبارک اتنا اونچے اُٹھائے کہ بغل کی سفیدی نظر آتی تھی، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۳۱، ۱۰۳۰، ۱۰۲۹) حضور ﷺ کے اسی عمل کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک استسقاء کے لئے نماز پڑھنا ہی ضروری نہیں، دُعاء پر بھی اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ (رد المحتار: ۳/۷۱)

بہتر یہ ہے کہ دُعاء کرنے کے ساتھ ساتھ نماز استسقاء بھی پڑھی جائے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت نماز بھی خاص اس مقصد کے لئے ادا فرمائی ہے، متعدد حدیثوں میں اس کا ذکر موجود ہے،

اکثر فقہاء اور حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مستحب ہے، نماز استسقاء دو رکعت ہے، جس میں زور سے قرأت کی جائے گی، عباد بن تمیم نے اپنے چچا کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل نقل کیا ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۲۴) بہتر ہے کہ: ''**سبح اسم ربک الاعلیٰ** اور **ھل أتک حدیث الغاشیہ**'' کی سورت پڑھی جائے۔ (**الفقہ الاسلامی وادلۃ: ۲/۴۱۵**)

نماز کے بعد زمین پر کھڑے ہوکر اور عصا کا سہارا لے کر عید کی طرح دو خطبے دیئے جائیں، یہ رائے فقہاء حنفیہ میں امام محمدؒ کی ہے اور اسی کے قائل مالکیہ اور شوافع ہیں، (**رد المحتار: ۱/۱۷، الفقہ الاسلامی وادلۃ: ۲/۴۲۰**) کیوں کہ متعدد حدیثوں میں خاص کر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے نمازِ عید کی طرح نمازِ استسقاء ادا فرمائی ہے، اس خطبہ میں زیادہ تر استغفار کے کلمات کہے جائیں اور جیسے خطبۂ عیدین میں کلماتِ تکبیر بار بار کہے جاتے ہیں، اس میں استغفار کیا جائے؛ کیوں کہ یہ موقع ہی اللہ تعالیٰ سے استغفار کا ہے، یہ رائے حنفیہ میں حضرات صاحبینؒ کی ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۲۰) اور امام شافعیؒ کے نزدیک تو جیسے خطباتِ عیدین میں تکبیرات تشریق کہی جاتی ہیں، اسی طرح استسقاء کے خطبہ اولیٰ میں نو بار اور خطبہ ثانیہ میں سات بار کلمہ استغفار کہنا مستحب ہے۔ (حوالۂ سابق: ۲/۴۲۱)

خطبہ شروع کرنے کے بعد جب کچھ حصہ گذر جائے، تو امام اپنی چادر کی ہیئت بدل دے، اگر کپڑا چوکور ہو، تو اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کردے اور گول ہو تو دائیں طرف کا حصہ بائیں اور بائیں طرف کا حصہ دائیں کردے؛ لیکن یہ صرف امام کرے، مقتدیوں کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے، عبداللہ بن زید ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی رداء مبارک کی ہیئت اسی طرح تبدیل فرمائی ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۱۱) یہ چادر کا پلٹنا گویا زبان حال سے اللہ کے سامنے اپنی عرض داشت پیش کرنا ہے، کہ قحط کی حالت کو اسی طرح بدل دیجئے۔

نماز کے لئے جاتے ہوئے بہتر ہے کہ ننگے پاؤں ہوں، جسم پر نئے کپڑے نہ ہوں؛ بلکہ پرانے دھلے ہوئے، یا پیوند لگائے ہوئے کپڑے ہوں، جبین ندامت سے جھکی ہوئی ہو، دل میں خشیت ہو اور ظاہر میں بھی اللہ کے سامنے تذلل اور درماندگی کا اظہار ہو، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ جہاں کہیں ہو، تو بہتر ہے کہ نماز استسقاء آبادی سے نکل کر میدان میں کھلی جگہ ادا کی

جائے،(الدرالمختارمع الرد: ۳/ ۷۲) یہ بھی مستحب ہے کہ نمازِ استسقاء کے موقع سے بوڑھوں اور بچوں کو بھی ساتھ رکھا جائے؛ بلکہ یہ بھی کہ بے زبان جانور بھی ساتھ ہوں (ردالمحتار: ۳/ ۷۲) کہ ان کمزوریوں کو دیکھ کر اللہ کا دریائے رحمت جوش میں آجائے۔

اگر بارش نہ ہوتو مسلسل تین دن نماز ادا کی جائے، یہ بھی بہتر ہے کہ نمازِ استسقاء پڑھنے سے پہلے تین دنوں تک لوگ روزہ رکھیں اور توبہ کا خوب اہتمام کریں، نیز اگر کسی کا حق غصب کئے ہوئے ہوں، تو حق ادا کردینے کی کوشش کریں، (درمختار وردالمحتار: ۲/ ۷۲) اس نماز کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں؛ لیکن امام ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ سے جو روایت نقل کی ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورج نکلتے وقت نمازِ استسقاء کے لئے تشریف لے گئے (ابوداؤد، باب **رفع اليدين في الاستسقاء**) اس لئے ظاہر ہے کہ اس وقت نمازِ استسقاء ادا کرنی زیادہ بہتر ہے، اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے کہ نماز میں سماج کے دیندار لوگوں کو شامل رکھا جائے، حضرت عمرؓ نے خاص طور پر حضرت عباسؓ کو اور حضرت معاویہؓ نے یزید بن اسودؓ کو نمازِ استسقاء میں شامل رکھا تھا اور انھیں سے دُعاء کرائی تھی۔

امام خطبہ کے درمیان بارش کے لئے دُعاء کرے گا اور دُعاء کے وقت اپنا رُخ قبلہ کی طرف کر لے گا، جیسا کہ گذرا ہاتھ اُٹھا کر دُعاء کرے گا اور لوگ اس کی دُعاء پر آمین کہتے جائیں گے، استسقاء کے لئے رسول اللہ ﷺ کی مختلف دُعائیں منقول ہیں، غالباً سب سے مختصر دُعاء وہ ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، تین بار: ''**اللهم أغثنا**'' کے الفاظ، یہاں ایک تفصیلی دُعاء کا نقل کردینا بھی مناسب ہوگا، جسے امام ابوداؤدؒ نے نقل فرمایا ہے:

اللهم اسقنا غيثاً مغيثاً مرئياً مريعاً نافعاً غير ضار عاجلاً غير أجل، اللهم اسق عبادک وبهائمک وانشر رحمتک وأحی بلدک الميت۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۱۶۹، ۱۱۷۶)

اے اللہ! ہمیں بارش سے سیراب فرما، ایسی بارش جو ہماری فریاد کو پوری کرے، ہلکی پھواریں، غلہ اگانے والی ہوں، نفع دینے والی، نہ کہ نقصان پہنچانے والی، جلد آنے والی نہ کہ دیر لگانے والی، خداوندا! اپنے بندوں اور جانوروں کو سیراب کر، اپنی رحمت کو پھیلا اور اپنے مردہ شہروں کو زندہ کردے۔

اصلاحِ معاشرہ

مذہبی جلسے —آداب واحکام

اللہ نے پوری انسانیت کو؛ بلکہ جنوں کو بھی اپنی عبادت کرنے کے لئے پیدا فرمایا ہے؛ لیکن اس امت کے لئے صرف عبادت کافی نہیں، اسے یہ امتیاز بخشا گیا ہے کہ وہ سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے کے بعد کارِنبوت انجام دے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو نیکی کی طرف بلائے اور بُرائی سے منع کرے، اسی کو قرآن مجید میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' سے تعبیر کیا گیا ہے —''معروف'' کے اصل معنی مشہور اور جانی پہچانی چیز کے ہیں، مقصد یہ ہے کہ نیکی کی طرف اس قدر دعوت دو کہ سماج میں اس کا عام چلن ہو جائے، وہ عرف ورواج کا درجہ حاصل کر لے اور ہر عام وخاص اس کے مطابق عمل کیا کرے، ''منکر'' ایسی چیز کو کہتے ہیں جو اَن جانی اور اَن پہچانی ہو، جو مشہور نہ ہو، اور جو عادت ورواج کے خلاف ہو، قرآن مجید نے بُرائی کو ''منکر'' سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بُرائی سے اس قدر روکا جائے کہ وہ معاشرہ میں ایک اَن پہچانی چیز بن جائے، جو عام رواج ومعمول کے خلاف ہو۔

یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے، جب معاشرہ میں معروف کی دعوت اور برائی سے روکنے کی مہم پوری اہمیت اور سنجیدگی کے ساتھ انجام دی جائے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''بے شک نیکی کی دعوت اور بُرائی سے روکنا دین کا سب سے بڑا استون (قطب اعظم) ہے، یہ وہ اہم ترین کام ہے جس کے لئے اللہ نے تمام انبیاء کو مبعوث فرمایا، اگر اس کی بساط لپیٹ دی گئی، اس کے علم اور اس پر عمل سے غفلت برتی گئی تو کارِ نبوت معطل ہو جائے گا، دین داری میں اضمحلال آجائے گا، انحطاط چھا جائے گا، گمراہی پھیل جائے گی، جہالت کی کثرت ہوگی، فساد بڑھ جائے گا، تباہی عام ہو جائے گی، شہر ویران ہو جائیں گے، اللہ کے بندے ہلاک کر دئے جائیں گے اور انہیں اپنی ہلاکت کا احساس بھی قیامت سے پہلے نہیں ہو سکے گا۔۔۔ الخ''

(احیاءعلوم الدین:۲/۳۰۶)۔

امام غزالیؒ جیسے شریعت کے رمز شناس نے جب دعوت دین کی اہمیت پر قلم اٹھایا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ لہو میں قلم ڈبوکر اور محبت کی انگیٹھی سے دل کو جلا کر یہ تحریر لکھی ہے؛ کیوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی انسانیت کی فلاح و کامیابی کی کلید ہے، اگر معروف کی طرف بلانے والے اور منکر سے روکنے والے لوگ باقی نہ رہیں گے تو دنیا شر وفساد کی آماج گاہ بن جائے گی اور فرشتوں کو نسل انسانی سے جس فساد اور خون ریزی کا اندیشہ تھا، وہ ایک حقیقت بن کر سامنے آجائے گا؛ اسی لئے امت کے علماء اور صلحاء نے ہمیشہ دین کے اس شعبہ کو بے حد اہمیت دی ہے، امام الحرمین نے لکھا ہے کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ صرف حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے؛ بلکہ اپنی اپنی صلاحیت کے لحاظ سے پوری امت کی ذمہ داری ہے۔(شرح نووی علی مسلم:۲/۲۳)۔

لیکن دعوتِ دین کا کوئی خاص طریقہ قرآن و حدیث میں متعین نہیں کیا گیا ہے، داعی کی صلاحیت، مدعو کے مزاج اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق مختلف طریقوں پر دعوت دین کا فریضہ انجام دیا جاتا رہا ہے، مسلم حکومتوں کا فریضہ ہے کہ وہ طاقت کی لاٹھی استعمال کر کے معاشرہ میں نیکیوں کو رواج دیں اور برائیوں کو روکیں، شریعت سراپا رحمت ہے، شارع تعالیٰ رحمن ورحیم ہیں اور جن پر شریعت نازل کی گئی ہے، وہ رحمۃ العالمین ہیں، اس کے باوجود جرائم پر سرزنش کرنے کا حکم دیا گیا اور بعض جرائم پر نہایت سخت سزائیں مقرر کی گئیں، یہ اسی لئے کہ بعض دفعہ نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے کے لئے طاقت وقوت کا استعمال بھی مطلوب ہوتا ہے، مساجد میں جمعہ وعیدین کے خطبوں کا اہتمام اور وقتاً فوقتاً لوگوں سے اصلاح وتربیت کی گفتگو کا مقصد بھی دعوت دین ہی ہے، خانقاہیں اور مدارس شب وروز جس کام میں مشغول ہیں، وہ بھی دعوت ہے، اس کے علاوہ انفرادی اور اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ لوگوں کو متوجہ کرنا بھی دعوت کا ایک مؤثر طریقہ ہے اور یہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

غیر مسلموں یا مسلمانوں کے ایک گروہ کو جمع کر کے انہیں دین کی طرف بلانا بھی ایک ایسا طریقۂ دعوت ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے اور آپ سے پہلے آنے والے پیغمبروں کے عمل سے بھی، قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ کے دعوتی خطابات نقل کئے گئے ہیں، جن میں ''یَا قَوْمِ'' (اے میری قوم!) سے خطاب کیا

گیا ہے، اس کا صاف مطلب ہے کہ جس وقت اللہ کے ان برگزیدہ رسولوں نے دعوت پیش فرمائی، اس وقت ان کے سامنے بہت سارے لوگ موجود تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصر کے فرعون سے، فرعون کے جمع کئے ہوئے جادوگروں سے اور خود اپنی قوم بنی اسرائیل سے بار بار خطاب فرمانے کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے حواریوں سے خطاب کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے اور بائبل میں بھی، اور بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہودیوں اور خاص کر یہودی علماء سے بھی اصلاحی خطابات فرمائے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز ہی اسی انداز پر فرمایا، جب حکم دیا گیا کہ آپ اپنے خاندان کے لوگوں پر حق کی دعوت پیش فرمائیں: ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (الشعراء: ۲۱۴) تو آپ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو جمع فرمایا، ان کے لئے کھانے کا بھی نظم کیا اور پھر ان پر توحید کی دعوت پیش فرمائی؛ بلکہ بعض سیرت نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دو دفعہ ایسا اجتماع منعقد کیا، پھر جب آپ کو عمومی طور پر دعوت دین کا حکم دیا گیا تو آپ نے صفا کی چوٹی پر چڑھ کر تمام اہل مکہ کو اس پہاڑ کے دامن میں جمع فرمایا اور ان سے خطاب کیا، فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع سے آپ نے جو اثر انگیز خطبات دئے ہیں وہ حدیث وسیرت کی کتابوں میں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کو، کہ انہوں نے نہایت تحقیق اور حسنِ ترتیب کے ساتھ ''حیات الصحابہ'' میں ان مضامین کو جمع فرما دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعوت کا ایک مسنون اور ماثور طریقہ لوگوں کے ایک گروہ کو جمع کر کے ان کے سامنے اپنی باتیں رکھنا بھی ہے، موجودہ دور کے عرف میں اس کو جلسہ، اجتماع یا کانفرنس وغیرہ کہتے ہیں، ماشاء اللہ مذہبی جماعتیں، تنظیمیں، ادارے، دینی مدارس، انجمنیں، نیز عام مسلمان ایسے اجتماعات اور جلسوں کا اہتمام کرتے ہیں، یہ ایک خوش آئند بات ہے، اور یقیناً معاشرہ پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے؛ بہ شرطیکہ مقررین تعمیری گفتگو کریں اور مسلمانوں میں نفرت پھیلانے والی باتوں سے اجتناب کریں؛ چنانچہ دوسرے مذاہب کے متبعین میں ایسے اجتماعات کا تصور نہیں تھا؛ لیکن اب وہ بھی مسلمانوں کا دیکھا دیکھی ایسے پروگرام منعقد کرنے لگے ہیں۔

مگر کوئی بھی کام اس وقت بہتر اور اجر وثواب کا حامل ہوتا ہے، جب کہ وہ اللہ اور اس کے

رسول کے حکم کے مطابق اور دین و شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہو، کوئی کام بہ ظاہر بہت بھلا معلوم ہو اور اس پر اللہ اور اس کے رسول کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو تو وہ کام نامقبول ہے اور عام طور پر ایسا کام مؤثر اور نتیجہ خیز بھی نہیں ہوا کرتا، مثلاً: نماز کو دین کا ستون قرار دیا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا ہے؛ لیکن وہی نماز اگر سورج نکلنے کے وقت، سورج کے نصف آسمان پر ہونے کے وقت اور سورج کے ڈوبنے کے وقت پڑھی جائے تو کارِ ثواب نہیں؛ بلکہ باعث گناہ ہے؛ کیوں کہ یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت کے خلاف ہے، اور کیوں کہ اس میں سورج کی پرستار قوموں سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

اسی اصول پر ہمیں اجتماعات اور جلسوں کا بھی جائزہ لینا چاہئے، افسوس کہ آج کل ہمارے مذہبی جلسوں اور دینی اجتماعات میں بھی کئی غیر شرعی امور شامل ہو گئے ہیں، جیسے بہت سی دفعہ بلا اجازت الکٹرک کے ستونوں پر تار ڈال دیا جاتا ہے، نہ محکمۂ بجلی سے اجازت لی جاتی ہے اور نہ اسے اجرت ادا کی جاتی ہے، سڑکوں کو گھیر کر جلسے کئے جاتے ہیں، حالاں کہ اس جگہ سے عام لوگوں کا اور خاص کر راہ گیروں کا حق متعلق ہے، حکومت سے بھی اجازت نہیں لی جاتی، یقیناً یہ صورت بجلی اور جگہ کی چوری یا غصب میں شامل ہے، اگر چہ بعض برادران وطن بھی ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں؛ لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے لئے ان کا عمل حجت نہیں ہے، ہمارے لئے تو قرآن و حدیث اور صحابۂ کرام ﷺ کا طریقہ دلیل ہے۔

بعض دفعہ جلسوں میں اسراف اور فضول خرچی بھی حد سے گذر جاتی ہے، ضرورت سے زیادہ روشنی، قمقمے، پھول، پتی، استقبالیہ گیٹ، ڈائس کا ڈیکوریشن، حالاں کہ دین کی بات پہنچانے کے لئے ان چیزوں کی ضرورت نہیں، ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو استنجاء، وضوء اور غسل میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی کے استعمال کو پسند نہیں فرمایا، اگر چہ کوئی شخص نہر کے کنارے پر کیوں نہ ہو؟ آپ نے سوتے وقت چراغ کو بجھا دینے کا حکم دیا، قرآن و حدیث میں کثرت سے فضول خرچی یعنی بے ضرورت خرچ اور ضرورت سے زیادہ خرچ کو منع فرمایا گیا ہے، — کیا دینی پروگراموں کے لئے اس فضول خرچی کی اجازت ہو سکتی ہے؟

ہمارے یہ پروگرام بعض اوقات عام لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں، خاص کر

پورے محلہ میں پروگرام کونشر کرنا، مسلمانوں، غیر مسلموں، صحت مندوں اور بیماروں سبھوں کو اس کے سننے پر مجبور کرنا، بہت سے لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے، قرآن مجید کی تلاوت سے بڑھ کر کونسا ذکر ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ نماز میں نہ بہت زور سے تلاوت کریں اور نہ بہت پست آواز میں کہ شرکاء نماز بھی نہ سن سکیں؛ بلکہ آواز کو معتدل رکھیں: ﴿وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا﴾ (الاسراء: ۱۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی راحت کا اس درجہ پاس ولحاظ تھا کہ آپ سلام بھی ایسی آواز میں فرماتے کہ جس سے سونے والوں کو خلل نہ ہو، دین کے اس مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں کہ رات کا وقت ہو، لوگ سوئے ہوئے ہوں اور اس درمیان کوئی شخص زور سے قرآن مجید پڑھے تو وہ گنہگار ہوگا: "**لو قرأفي الليل جهرًا و الناس ينام يأثم**" (**البحر الرائق، باب الإمامة**: ۱/ ۳۶۴) — سوچئے کہ ہمارا یہ طرزِ عمل کیا اللہ تعالیٰ کے حکم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہے؟

یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم جذبات کی رو میں اس بات کا بھی لحاظ نہیں رکھتے کہ کہیں ہم دین کی تعظیم کے نام پر دین کی بے احترامی کے مرتکب تو نہیں ہو رہے ہیں؟ — قرآن مجید کا ادب یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو لوگ خاموش رہیں اور توجہ سے سنیں، اگر کوئی مجلس قرآن کی تلاوت کے لئے منعقد کی گئی ہو اور اس میں لوگ بات چیت کرنے لگیں تو بات کرنے والے گناہ گار ہوں گے اور اگر کہیں لوگ اپنی ضرورتوں میں مشغول ہوں اور وہاں کوئی شخص قرآن کی تلاوت شروع کر دے، نتیجہ یہ ہو کہ لوگ قرآن کی طرف دھیان نہ دے سکیں، کھانے پینے، خرید وفروخت، بات چیت اور دوسری ضروریات میں مشغول رہیں تو قرآن پڑھنے والا گناہ گار ہوگا؛ اس لئے کہ وہی شخص غلط جگہ اور غلط وقت کا انتخاب کر کے قرآن مجید کی بے احترامی کا سبب بن رہا ہے، آج کل ہمارے جلسوں میں عمومی صورت حال یہی ہوتی ہے، قرآن پڑھا جاتا ہے، دینی باتیں بیان کی جاتی ہیں، جلسہ گاہ سے باہر دور دور تک آواز پہنچانے کا نظم کیا جاتا ہے، لوگ دنیا کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، قرآن کی تلاوت اور دین کی باتیں ان کے کانوں تک پہنچتی ہیں؛ لیکن اپنے مشاغل کی وجہ سے نہ وہ سنتے ہیں اور نہ وہ خاموش رہتے ہیں — کیا ہمارا یہ طریقہ قرآن مجید کی اور دینی باتوں کی بے احترامی کے مترادف نہیں ہے؟

پھر مزید ستم یہ ہے کہ بعض اوقات ہم کلمۂ طیبہ، قرآنی آیات، احادیث، اللہ اور اللہ کے رسول کے اسماء مبارکہ کے جھنڈے، پوسٹر، بینر وغیرہ بھی لگاتے ہیں اور جلسہ ختم ہونے کے بعد نہیں دیکھتے کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ یہ مبارک اور مقدس کاغذ اور کپڑے کے ٹکڑے سڑکوں پر گرتے ہیں اور لوگوں کے قدموں سے روندے جاتے ہیں، اس بے تعظیمی کی ذمہ داری کس پر آئے گی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کے بعد جاگنے اور گفتگو کرنے سے منع فرمایا، خود آپ کا معمول مبارک یہ تھا کہ سوائے اس کے کہ کوئی ضروری دینی بات ہو آپ عشاء کے بعد آرام فرمایا کرتے تھے، عشاء کے بعد جلد سو جانے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ لوگ بہ آسانی فجر کی نماز ادا کر سکیں اور جن لوگوں کو تہجد پڑھنے کی توفیق ہو، وہ آخر شب میں بیدار ہو سکیں؛ لیکن بعض اوقات یہ جلسے رات دیر تک ہوتے رہتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں بہت سے سامعین فجر کی نماز سے محروم رہتے ہیں، پس کیا جلسوں کی یہ ترتیب دین کے مزاج سے ہم آہنگ ہے؟

حاصل یہ ہے کہ جلسے اور اجتماعات دعوت واصلاح کے مؤثر ذرائع ہیں۔ یہ انبیاء کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہیں؛ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو منعقد کرنے میں شریعت کی حدود اور دین کے مزاج کو پیش نظر رکھا جائے، یہ دوسرے کے لئے تکلیف دہ نہ ہو، زور زبردستی نہ ہو، غیر شرعی طریقے پر ایسی چیزوں کا استعمال نہ کیا جائے، جن کے ہم مالک نہیں ہیں، یہ جلسے صرف کان کی لذت کا سامان نہ ہوں؛ بلکہ ان کے ذریعہ امت کو عمل کا پیغام ملے، ہم اپنے اجتماعات کے لئے قرآن وحدیث اور صحابہ کے عمل کو بنیاد بنائیں، نہ کہ ہم جوش وجذبہ میں برادرانِ وطن کے طریقوں کی پیروی کرنے لگیں، تبھی یہ جلسے سماج میں صالح تبدیلیاں لانے اور معاشرہ کو ایک نمونہ کا معاشرہ بنانے میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں، کاش، ہم پوری دردمندی کے ساتھ ٹھنڈے دل سے ان سچائیوں پر غور کریں!

❁

تقریبِ نکاح اور دعوتیں

انسان کے اس دنیا میں آنے کے بعد اس کی زندگی میں جو سب سے اہم واقعہ پیش آتا ہے، وہ ہے اس کا ازدواجی رشتہ کے بندھن میں بندھنا، نکاح ہی کے ذریعہ خاندان وجود میں آتا ہے، نسلِ انسانی میں افزائش کا تسلسل باقی رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے انسانوں کی یہ بسائی گئی بستی لاکھوں سال سے آباد ہے اور قیامت تک آباد رہے گی، اس کے علاوہ نکاح پاکیزہ اور عفیف زندگی گذارنے میں معاون ہوتا ہے، مرد وعورت کے لئے سکون وطمانینت کا ذریعہ بنتا ہے، دو خاندانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتا ہے اور زندگی کی دُھوپ کی تپش سے جب آدمی بے چین ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے کی محبت کی شبنم اس تپش کو بجھاتی ہے اور دلوں کو راحت پہنچاتی ہے، اسی لئے اسلام نے نکاح کی ترغیب دی ہے اور نکاح میں سادگی اور کم سے کم خرچ کی تلقین بھی کی ہے۔

مگر افسوس کہ اس وقت مسلم معاشرہ میں بھی برادرانِ وطن کے ساتھ ساتھ بے جا رُسوم کی کثرت ہوگئی ہے اور فضول خرچی اپنی انتہاء کو پہنچ گئی ہے، ان فضول خرچیوں میں بڑا حصہ ان دعوتوں کا ہے، جنھیں تقریب نکاح سے جوڑ دیا گیا ہے، اس تکلف کا آغاز لڑکی دیکھنے اور منتخب کرنے سے ہوتا ہے، لڑکی کو دیکھنے کے لئے گھر کی ایک دو خواتین کا آجانا کافی ہے، اگر لڑکا خود دیکھنا چاہے تو اس کے لئے بھی اپنی منگیتر کو دیکھنے کی گنجائش ہے؛ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے بھی درجن دو درجن مرد و عورت پہنچ جاتے ہیں اور ان کے لئے پر تکلف کھانا تیار کرنا ہوتا ہے، پھر اس میں بعض اور قبیح باتیں بھی شامل ہوگئی ہیں، بعض دفعہ اس لڑکے کے علاوہ جو رشتہ چاہتا ہے، خاندان کے کئی دوسرے مرد بھی جیسے بھائی بہنوئی وغیرہ لڑکی کو دیکھتے ہیں، یہ قطعاً جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ غیر محرم عورت کو دیکھنا جائز نہیں، صرف وہ شخص اس سے مستثنیٰ ہے، جو خود نکاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، اس کے رشتہ داروں کے لئے وہی حکم ہے، جو دوسرے مردوں کے لئے ہے، دوسری تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جب اس دُھوم دھام کے ساتھ لڑکی کو دیکھا جاتا ہے اور پسند نہ آنے کی وجہ سے رشتہ رد کر دیا جاتا ہے تو لڑکی پر اس کا خراب

نفسیاتی اثر پڑتا ہے، اس کو سخت صدمہ پہنچتا ہے اور بعض دفعہ تو ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں؛ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی لڑکی سے رشتہ کرنا ہوتو ایسے طریقہ پر لڑکی کو دیکھا جائے کہ اسے احساس تک نہ ہو، حدیث میں بھی اس کا اشارہ ہے اور فقہاء وشارحین حدیث نے اس کی صراحت کی ہے، آج کل یہ ضرورت تصویر سے بھی پوری ہو جاتی ہے اور ایک دومنٹ کی متحرک تصویر براہ راست دیکھنے کے مقصد کو اچھی پوری کر دیتی ہے اور شرعاً اس کو بھی تصویر کی ان صورتوں میں شامل کیا جاسکتا ہے، جن کی ضرورۃً اجازت دی گئی ہے؛ البتہ دیکھنے کے بعد تصویر واپس کر دینی ضروری ہے، موجودہ حالات میں اس طریقۂ کار سے فائدہ اُٹھانا اس بات سے بہتر ہے کہ اس کے لئے دعوت کا تکلف ہو، غیر محرم مردوں کے سامنے لڑکی کو چہرہ کھولنا پڑے، یا اگر رشتہ نہ ہو پائے تو لڑکی کو ایک ذہنی تکلیف اور قلبی صدمہ سے گزرنا پڑے۔

اس کے علاوہ اب بعض علاقوں میں ایسی دعوتیں بھی لوازم میں شامل ہوگئی ہیں، جو مہندی، چوڑی، جوتے کے ناپ اور کپڑوں کے ناپ دینے یا کپڑے ایک دوسرے کو پہنچانے، شادی کی تاریخ مقرر کرنے وغیرہ سے مربوط ہیں، یہ سب محض رسمیں ہیں، شریعت میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اگر کسی رواجی کام میں شریعت کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی ہو اور اس کو دینی حکم سمجھ کر نہیں کیا جاتا ہو؛ لیکن وہ معاشرہ کے لئے بوجھ بن جائے تو شرعاً ایسی رسموں کو ترک کرنا اور اس سے اجتناب کرنا واجب ہے، ایسی رسموں سے خود بھی بچنا چاہئے اور اپنے معاشرہ کو بھی بچانا چاہئے، اس لئے اس نوعیت کی ساری دعوتیں اس لائق ہیں کہ ان کو منع کیا جائے اور سختی کے ساتھ ان کو روکا جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آنے والے مہمانوں کی ضیافت ہے، اور مہمان نوازی ایک مستحب اور مسنون عمل ہے؛ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بعض باتیں اپنی اصل کے اعتبار سے جائز ہوتی ہیں؛ لیکن اگر وہ کسی فساد اور بگاڑ کا سبب بن جائیں اور انفرادی عمل اجتماعی سطح پر لوگوں کے لئے دشواری کا باعث ہو جائے تو ایسے جائز عمل سے بھی روکنا واجب ہے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''سدِ ذریعہ'' کہتے ہیں، جیسے کسی بھی شخص سے ہتھیار بیچنا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ ہتھیار ظلم کرنے کے لئے حاصل کیا جائے، ہتھیار ظالم کو ظلم سے روکنے اور مظلوم کی مدافعت کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے؛ لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ بدقماش لوگوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنا یا فتنہ وفساد کے

ماحول میں ہتھیار بیچنا جائز نہیں ؛ کیوں کہ غالب گمان ہے کہ اس ہتھیار کا استعمال فساد کے لئے ہوگا۔

نکاح کے موقعہ سے ایک دعوت جو ملک کے اکثر علاقوں میں مروج ہے، یہ ہے کہ عقد کے دن لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلایا جاتا ہے بظاہر اس کی شروعات اس طرح ہوئی ہوگی کہ عام طور پر پہلے لڑکے اور اس کے متعلقین کو دور جانا پڑتا تھا، اور وہاں ایک دن یا ایک شب رہ کر واپسی ہوتی تھی، اسی طرح خود لڑکی والوں کی دعوت پر اس کے بھی رشتہ دار و متعلقین آجاتے تھے، ان حالات میں ان کی ضیافت کرنا ایک اخلاقی فریضہ بھی تھا؛ اس لئے لڑکی والے اپنی استطاعت کے مطابق کھانے کا نظم کر دیتے تھے، نہ اس میں لڑکے والوں کی طرف سے کوئی مطالبہ ہوتا تھا، نہ باراتیوں کا لشکر جرار کھانے پر ٹوٹا پڑتا تھا، نہ لڑکے والوں کی طرف سے کھانے کا مینو طے کیا جاتا تھا، نہ یہ بات کہی جاتی تھی کہ فلاں فنکشن ہال میں دعوت کا اہتمام کیا جائے، ورنہ ہماری ناک کٹ جائے گی، اسی پس منظر میں بہت سے اربابِ افتاء نے اس کی اجازت دی ہے؛ چنانچہ ہندوستان کے معروف فقیہ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ جو تقسیم ہند سے پہلے بجا طور پر ''مفتیٔ اعظم ہند'' کہے جاتے تھے، فرماتے ہیں:

> لڑکی والوں کی طرف سے براتیوں کو یا برادری کو کھانا دینا لازم یا سنت اور مستحب نہیں ہے، اگر بغیر التزام کے وہ اپنی مرضی سے کھانا دے دیں تو مباح ہے، نہ دیں تو کوئی التزام نہیں۔ (کفایت المفتی: ۵/۱۵۷)

اسی طرح ماضی قریب میں فقہ وفتاویٰ کے مرجع استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ رقم طراز ہیں:

> یہ صحیح ہے کہ ولیمہ لڑکا یا اس کے اولیاء کریں گے؛ لیکن جو لوگ لڑکی والے کے مکان پر مہمان آتے ہیں اور ان کا مقصود شادی میں شرکت کرنا ہے اور ان کو بلایا بھی گیا ہے تو آخر وہ کھانا کہاں جا کر کھائیں گے اور اپنے مہمان کو کھلانا تو شریعت کا حکم ہے اور حضرت نبی اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی ہے؛ البتہ لڑکے والے کی طرح مقابلہ پر ولیمہ لڑکی کی طرف سے ثابت نہیں ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۲/۱۴۲)

اس کی ایک بنیاد حدیث میں بھی ملتی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک طویل حدیث منقول ہے، جس میں ذکر آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کے نکاح کے موقعہ پر کھانا کھلانے کا

اہتمام فرمایا ہے، آپ ﷺ نے اس دعوت کے لئے ایک بکرا ذبح کیا اور مہاجرین و انصار کو مدعو کیا، (مصنف ابن عبد الرزاق، باب تزویج فاطمہؓ: ۵/۴۸۶) لیکن عبد الرزاق بن ہمام نے اس روایت کو یحییٰ بن علاء بجلی سے نقل کیا ہے اور یہ بے حد ضعیف اور نامعتبر راوی ہیں، امام احمدؒ نے فرمایا کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور حدیثیں وضع کرتا ہے، فن رجال کے بڑے امام یحییٰ بن معینؒ کہتے ہیں کہ یہ غیر معتبر راوی ہیں، علامہ نسائیؒ اور علامہ دارقطنیؒ جیسے بلند پایہ محدثین ان کو متروک قرار دیتے ہیں، امام بخاریؒ اور متعدد دوسرے علماءِ فن نے بھی ان پر کلام کیا ہے، (تہذیب الکمال: ۳۱/۴۸۴) اس لئے یہ روایت قابل اعتبار نہیں — البتہ شریعت کے عام اُصول کہ ضیافت جائز ہے اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

(۱) لڑکے والوں کی طرف سے کھانے کا مطالبہ ہو، یا اگر لڑکی والے اپنی مرضی سے خود کھانا کھلانا چاہیں اور لڑکے والوں کی طرف سے کھل کر یا ڈھکے چھپے انداز پر کھانے کی اقسام کی تعیین کی جائے، یا کسی خاص فنکشن ہال میں دعوت کے اہتمام کا تقاضا کیا جائے تو یہ تمام صورتیں قطعاً ناجائز اور گناہ ہیں، اور ایسی صورت میں لڑکے والوں کے مدعوئین اور متعلقین کا بھی جانتے بوجھتے اس دعوت میں شریک ہونا ناجائز ہے؛ کیوں کہ یہ فریقین کے حق میں رشوت دینا اور لینا ہے اور شرکاء کے حق میں بھی رشوت کے حرام مال کو کھانا ہے۔

(۲) اگر لڑکے والوں نے کھل کر مطالبہ تو نہیں کیا؛ لیکن دل میں یہ خیال ہے کہ لڑکی والے کھانے کا اہتمام کریں، لڑکی والوں نے رسم و رواج کی رعایت کرتے ہوئے، یا لڑکے والوں کے مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے کھانے کا اہتمام کرلیا اور لڑکے والوں نے اس سے منع نہیں کیا؛ بلکہ عملاً اس پر خوشی اور رضامندی ظاہر کی تو اس دعوت کے مکروہ ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، اندیشہ ہے کہ یہ بھی ناجائز کی فہرست میں شامل ہو؛ کیوں کہ فقہی اُصول یہ ہے کہ جس چیز کی شرط نہیں لگائی جاتی، مگر وہ بات رواج کا درجہ اختیار کرچکی ہو تو یہ بھی شرط لگانے کے ہی درجہ میں ہے، فقہاء نے اس اُصول کو ''**المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً**'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) اگر لڑکے والوں نے دعوت دینے سے منع کیا، اپنی طرف سے روکنے کی کوشش کی، اس کے باوجود لڑکی والوں کی طرف سے دعوت کا اہتمام کیا گیا اور اس میں اپنے زمانے کے لحاظ سے فضول خرچی سے بچنے کی کوشش کی گئی، سودی قرض لینا نہ پڑا اور نہ کسی کے سامنے مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے کی نوبت آئی تو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن بہتر یہ بھی نہیں، گنجائش اس لئے ہے کہ اُصولی طور پر میزبانی ایک درست عمل ہے اور دعوت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اور بہتر نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس سے اس رسم کو تقویت پہنچتی ہے، جس کو بہت سے لوگ مجبور ہو کر انجام دیا کرتے ہیں۔

(۴) اگر لڑکی والوں کے اپنے کچھ مدعوئین اور مہمان آجائیں اور وہ ان کے لئے بہت تکلف میں پڑے بغیر ضیافت کا اہتمام کردیں، یا لڑکے اور اس کے متعلقین دوسرے شہر سے آئیں، یا اتنے فاصلہ سے آئیں کہ ان کا گھر واپس جا کر کھانا کھانا دشوار ہو اور لڑکے والوں کی طرف سے کسی خاص تعداد میں مدعوئین کو کھانا کھلانے کا اور کسی خاص نوعیت کے کھانے کا مطالبہ نہ ہو، آنے والے مختصر تعداد میں ہوں، جن کی عام طور پر نکاح کے اُمور کو انجام دینے اور عاقدین کو واپس لے جانے میں ضرورت پڑتی ہے، اور آنے والے نوشہ کے قریبی رشتہ دار اور متعلقین ہوں تو یہ صورت جائز ہے؛ کیوں کہ یہ ضیافت ہے، جس میں دباؤ اور مشقت نہیں ہے اور یہ ایک ضرورت بھی ہے۔

(۵) اگر لڑکی والوں کی طرف سے ایسی مختصر ضیافت کا نظم ہو جائے، جس میں تکلف نہیں ہو جیسے: چائے، بسکٹ یا آئسکریم، اور یہ لڑکی والے اپنی خوشی سے کریں، کوئی دباؤ نہ ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نظر نہیں آتا؛ کیوں کہ ممانعت دو صورتوں میں ہے، ایک: اس وقت جب دوسرے فریق کی طرف سے مطالبہ ہو، دوسرے: اس وقت جب یہ مالی اعتبار سے مشقت کا باعث ہو۔

(۶) بعض علاقوں میں لڑکی والوں اور لڑکے والوں پر التزام ہوتا ہے کہ وہ اپنی برادری کے تمام لوگوں کی دعوت کریں، یہ جائز نہیں ہے، نہ اس کا مطالبہ جائز ہے، اور نہ بغیر مطالبہ کے جائز ہے؛ کیوں کہ مطالبہ نہ بھی کیا جائے تو رواج کے تحت لوگ دعوت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اگر کوئی شخص

برادری کے خوف سے دعوت کربھی دے تو لوگوں پر داعی کو اور برادری کے لوگوں کو روکنا چاہئے۔

(۷) اس رسم کی قباحت اور اس کے غلط اثرات کو دیکھتے ہوئے بعض حضرات دعوت نامہ پر لکھ دیتے ہیں کہ ''کوئی استقبالیہ نہیں رہے گا'' یا یہ کہ ''کھانے کا کوئی نظم نہ ہوگا'' اگرچہ کہ موجودہ حالات میں رسم ورواج کو دیکھتے ہوئے ایسی صراحت قابل مذمت عمل نہیں ہے؛ لیکن بہتر بھی نہیں ہے، آپ کسی کو اپنے گھر بلائیں اور کھانا نہ کھلائیں تو یہ اخلاق کے خلاف عمل نہیں ہے؛ لیکن اگر آپ اپنے مدعو کو کہیں کہ آپ فلاں وقت تشریف لائیے، مگر یاد رکھئے کہ ہم آپ کو کھانا نہیں کھلائیں گے، غور کیجئے کہ کیا یہ بات ان اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ ہوگی، جو شریعت کا مزاج ہے؟ ملا علی قاری ایک بڑے فقیہ اور محدث ہیں، اُنھوں نے ایک خاص موقعہ پر مروج مصافحہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سنت سے ثابت نہیں ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دے تو ہاتھ کھینچنا بھی نہیں چاہئے— تو بُری رسموں کو ختم کرنا اچھی بات ہے؛ لیکن اخلاق کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنا نہ چاہئے۔

یہ تو وہ دعوتیں ہیں، جو یا تو درست نہیں ہیں یا کم سے کم سنت اور مستحب کے دائرہ سے باہر ہیں؛ لیکن جو دعوت مسنون ہے، یعنی دعوتِ ولیمہ، اس کو بھی ہم نے کیا کم پر تکلف بنالیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص مسلسل تین دن تک دعوتِ ولیمہ کھلاتا رہے، آپ ﷺ نے تلقین فرمائی کہ ایک ہی دن دعوتِ ولیمہ ہونی چاہئے، یہ اس پس منظر میں تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں ایک ایک ہفتہ اور بعض مرتبہ اس سے بھی زیادہ لوگ ولیمہ کی دعوت کرتے رہتے تھے، آپ ﷺ نے اس بیجا تکلف کو ختم کرنے کے لئے ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دن کی تحدید فرمائی؛ لیکن آج کل ایک ہی دن کی دعوت میں اتنا تکلف کیا جاتا ہے کہ اتنے پیسوں میں شاید مدعوئین کو دس دنوں تک کھانا کھلایا جاسکتا ہے، اس کو بھی روکنے کی ضرورت ہے رسول اللہ ﷺ نے سب سے بہتر ولیمہ اُم المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ کے نکاح کے موقعہ پر فرمایا، اور اس ولیمہ میں آپ ﷺ نے ایک بکرا ذبح فرمایا تھا، (بخاری، **باب من أولم علی بعض نسائه الخ**، حدیث نمبر: ۵۱۷۱) ورنہ بعض ازواج کا ولیمہ تو آپ ﷺ نے جو کی تھوڑی سی مقدار سے فرمایا، (بخاری، **باب من أولم بأقل من شاة**، حدیث نمبر: ۵۱۷۲) کھانے کے تنوع، مدعوئین کی کثرت، فنکشن ہال کے انتخاب، آنکھوں کو خیرہ کردینے والا ڈیکوریشن اور ان

سب کے ساتھ ساتھ بچے ہوئے کھانے کی بربادی، یہ ایسی باتیں دعوتِ ولیمہ کا جز بن چکی ہیں، جو یقیناً فضول خرچی کی آخری حد کو بھی پار کر جاتی ہیں اور سنت کے نام پر ایک عمل کو اس طرح انجام دیا جاتا ہے کہ اس میں بہت سے گناہ شامل ہو گئے ہیں۔

موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ملت اسلامیہ اور خاص کر اہل علم کی بارگاہ میں یہ مشورہ پیش کرنے کا خیال ہوتا ہے کہ کیوں نہ عقد نکاح کے بعد اور لڑکی کی رُخصتی سے پہلے ہی لڑکے کی طرف سے ولیمہ کی دعوت رکھ دی جائے، اس میں شبہ نہیں کہ احناف کے نزدیک میاں بیوی کی تنہائی کے بعد ولیمہ کرنا بہتر ہے، (دیکھئے: طحطاوی علی الدر: ۴/ ۱۷۵) اور مالکیہ کا بھی مشہور قول یہی ہے، (دیکھئے: دسوقی مع الشرح الکبیر: ۲/ ۳۳۷، فتح الباری: ۹/ ۱۳۹) لیکن یہ بات متفق علیہ نہیں ہے، حنفیہ اور مالکیہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ نکاح کے بعد اور زوجین کی یکجائی سے پہلے بھی ولیمہ کرنا درست ہے، (دیکھئے: طحطاوی علی الدر: ۴/ ۱۷۵، دسوقی: ۲/ ۳۳۷) فقہاء شوافع نے بھی صراحت کی ہے کہ اگرچہ زوجین کی ملاقات کے بعد ولیمہ افضل ہے؛ لیکن عقد کے بعد سے ہی ولیمہ کا وقت شروع ہو جاتا ہے، (نہایۃ المحتاج: ۶/ ۳۶۳) اور فقہاء شوافع میں علامہ مرداوی نے تو لکھا ہے کہ عقد کے بعد ہی سے ولیمہ کا وقت مستحب شروع ہو جاتا ہے: ''**وقت الاستحباب موسع من عقد النکاح إلی انتھاء ایام العرس**'' (مطالب اولی النہی: ۵/ ۲۳۲) جب کہ حنابلہ کے نزدیک عقد کے ساتھ ہی ولیمہ کرنا مسنون ہے، (الانصاف: ۸/ ۳۱۷) اور اسی کے مطابق ایک قول حنفیہ اور مالکیہ کا بھی ہے، (طحطاوی: ۴/ ۱۷۵، دسوقی: ۲/ ۳۳۷) گویا حنابلہ کے نزدیک عقد نکاح کے وقت ہی ولیمہ مسنون ہے اور بقیہ تینوں دبستانِ فقہ میں بھی عقد کے بعد اور زوجین کی ملاقات سے پہلے ولیمہ کرنا درست ہے اور ایک قول کے مطابق یہی بہتر ہے، اگر رسول اللہ ﷺ کے عمل کو دیکھا جائے تو آپ ﷺ سے دونوں طرح کا عمل ثابت ہے، زیادہ تر روایتوں میں تو خلوت کے بعد ولیمہ کا ذکر ہے؛ لیکن جب حضرت اُم حبیبہؓ کے لئے آپ ﷺ نے نجاشی کے واسطہ سے پیغام نکاح بھیجا تو حضرت عثمان غنیؓ نے لوگوں کو کھانا کھلانے کا اہتمام کیا، (مستدرک حاکم: ۴/ ۲۱) مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ عقد نکاح کے بعد اور زفاف سے پہلے بھی ولیمہ کیا جا سکتا ہے، (کفایت المفتی: ۵/ ۱۵۶) اگرچہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اس کو 'دعوت تزویج' قرار دیا ہے نہ کہ دعوتِ ولیمہ (اعلاء

السنن: ۱۱/ ۱۲)؛ لیکن مفتی صاحب کی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ نکاح کے موقع سے دعوتِ ولیمہ ہی کا معتبر احادیث میں ذکر ملتا ہے، دعوت تزویج کے نام سے کسی اور دعوت کا ذکر نہیں ملتا، اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی خلوت سے پہلے ولیمہ کی مصلحتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ: ۲/ ۱۳۰)

پس اگر عقد نکاح کے بعد ہی ولیمہ کا اہتمام کیا جائے اور مدعوئین کو کھانا کھلا دیا جائے تو لڑکی والوں سے جو کھانا وصول کیا جاتا ہے، یا سماجی رسم کے تحت لڑکی والے جو کھانا کھلاتے ہیں؛ حالاں کہ یہ ان کے لئے مالی زیر باری کا باعث ہوتا ہے تو اس سے کم سے کم یہ رسم تو ختم ہوجائے گی، اور شادی کے اخراجات میں ایک اہم بوجھ سے تو لوگوں کو چھٹکارا ملے گا، خدا کرے یہ تجویز قابل غور سمجھی جائے۔

ایک مثالی شادی

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اشیاء کی فراہمی کا جو نظام رکھا ہے وہ بجائے خود اللہ کی شان ربوبیت کا عکس جمیل اور مخلوق پر اس کی بے پناہ شفقت و رحمت کا مظہر ہے، اس کی رحمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو چیز انسان اور دوسری مخلوقات کے لئے جتنی زیادہ ضروری ہے، اس کی فراہمی اتنی ہی آسانی کے ساتھ اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں کی گئی ہے، آکسیجن کے بغیر جاندار چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا، اسے نہ صرف اپنے پھیپھڑوں کے لئے سانس کی ضرورت ہے؛ بلکہ اس کا پورا وجود آکسیجن کا رہین منت ہے، جو خون کے ذریعہ فراہم ہوتا ہے اور یہ آکسیجن گیس اسے بغیر کسی خرچ کے حاصل ہوجاتی ہے؛ لیکن کرۂ زمین سے باہر یہی آکسیجن ناپید ہے؛ کیوں کہ وہاں کوئی ایسی مخلوق نہیں، جس کی زندگی کا مدار آکسیجن پر ہو، دوسری بڑی ضرورت انسان کے لئے پانی ہے، جسم کا پانی خارج ہوجائے تو آناً فاناً انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے پانی کی بھی وافر مقدار اس دنیا میں رکھ دی ہے، دریا، ندی، نالے، چشمے ہمیں بے حساب پانی فراہم کرتے ہی ہیں، زیر زمین پانی کا ایک غیر معمولی ذخیرہ بھی رکھ دیا گیا ہے، جسے انسان تھوڑے خرچ اور معمولی محنت سے حاصل کرلیتا ہے، پانی کے محفوظ اسٹاک کے لئے ایک غیر معمولی نظام برفیلی چٹانوں کا ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں بڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں، خود ہمارے ملک سے متصل ہمالیہ سر اٹھائے کھڑا ہے، جو کچھ بلندی پر پہنچنے کے بعد اپنی بلند ترین چوٹی تک برف میں ڈھکا ہوا ہے اور عام لوگوں کے لئے ناقابل عبور ہے، یہ چٹانیں سال بھر صاف شفاف، میٹھا، خوش ذائقہ پانی آدمی کو فراہم کرتی رہتی ہیں، پھر پینے کے پانی کی مسلسل فراہمی کے لئے اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندروں کو وجود بخشا گیا، جو سورج کی تپش سے ہم آغوش ہوکر اپنے بخارات فضا میں بکھیرتے ہیں اور ہوائیں انہیں اپنی گودوں میں لے کر فضا کی ایسی بلندیوں تک پرواز کرتی ہیں کہ یہی بھاپ کے قطرات گھنے بادل بن جاتے ہیں، اور ضرورت کے مطابق اپنے وقت پر برستے ہیں۔

یہ تو صرف ہوا اور پانی کا معاملہ ہے، اگر نظام کائنات میں غور کیا جائے تو جو چیز انسان یا دوسری مخلوقات کو جتنی زیادہ مطلوب ہوں وہ اتنی ہی آسانی سے اور اتنی ہی زیادہ فراہم ہیں، اگر ایک انسان بصیرت کی آنکھ کو کھلا رکھے اور چشم دل سے نظام قدرت کی ان جلوہ فرمائیوں کو دیکھے تو خدا پر اس کا ایمان تازہ ہوجائے، اور اپنے خالق و مالک سے اس کی محبت بڑھ جائے؛ چوں کہ فطرتِ کائنات کا خالق اللہ ہے اور شریعتِ اسلامی کے احکام بھی اسی کی طرف سے ہیں؛ اس لئے قانونِ شریعت میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے، کہ جو چیز انسان کے لئے جس درجہ ضروری ہے، اسی درجہ اس کے حاصل ہونے کو آسان بنایا گیا ہے۔

انسانی زندگی کی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت نکاح ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ خوشی اور غم میں کسی شریک وانیس کی موجودگی کو چاہتا ہے، بچپن میں اس کے انس ومحبت کا محور ماں باپ ہوتے ہیں؛ لیکن زندگی کے ایک مرحلہ میں پہنچ کر مرد اپنے آپ کو بیوی کا اور عورت اپنے آپ کو شوہر کا محتاج محسوس کرتے ہیں، یہ مصنوعی خواہش نہیں ہے؛ بلکہ ایک فطری ضرورت ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے عالم بالا میں حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت حواء علیہا السلام کی تخلیق فرمائی اور انبیاء کرام — جو عالمِ نوع انسانی کی سب سے برگزیدہ ہستیاں تھیں — انہوں نے بھی ازدواجی نظام سے اپنے آپ کو وابستہ فرمایا۔

نکاح کے تین بنیادی مقاصد ہیں: ایک سکون خاطر اور طمانینت قلبی؛ چنانچہ خود قرآن مجید میں ﴿لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ (الروم: ۲۱) کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، دوسرا مقصد ہے عصمت وعفت کی حفاظت؛ اسی لئے قرآن مجید میں نکاح کئے ہوئے مردوں کو 'محصنین' اور عورتوں کو 'محصنات' فرمایا گیا ہے، (النساء: ۲۴، المائدہ: ۵) جس کے معنی قلعہ بند اور محفوظ کے ہیں، گویا جو مرد وعورت نکاح کرتے ہیں وہ عفت وپاکدامنی کے قلعہ میں اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس کو اور زیادہ وضاحت سے ارشاد فرمایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نکاح نگاہوں کو پست رکھتا ہے، یعنی انسان کو بدنگاہی سے بچاتا ہے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرتا ہے: "**فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج**" (**صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب الصوم لمن خاف على نفسه العزوبة**، حدیث نمبر: ۱۹۰۵) — نکاح کا تیسرا مقصد جو بعض اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے، وہ

ہے توالد وتناسل، اللہ تعالیٰ نے نباتات میں افزائش کا ایسا نظام رکھا ہے کہ زمین میں بیج ڈالی جائے تو خود بہ خود پودے نکل آتے ہیں؛ بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ باضابطہ کاشت کئے بغیر کہیں سے بیج گر گئی اور پودے نکل آئے؛ لیکن جانداروں میں افزائش نسل کا نظام نر و مادہ کے اتصال پر موقوف ہے؛ اس لئے نسلِ انسانی کا پاکیزہ طریقہ پر تسلسل نکاح کے بغیر نہیں ہوسکتا، قرآن مجید میں اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے۔ (النساء:۱)

غرض کہ نکاح سے متعلق مختلف فوائد ہیں اور انسانی سماج کے لئے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے نکاح کے نظام کو آسان رکھا ہے، نکاح سے متعلق اسلامی قانون اور مختلف مذاہب کے قوانین کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے، جیسے اسلام نے بیوہ عورتوں کو نہ صرف نکاح کی اجازت دی؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی اور اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا؛ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ (النور: ۳۲) خود رسول اللہ ﷺ کے حرم مبارک میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوا جتنی ازواج آئیں، وہ سب بیوہ یا مطلقہ تھیں، اس طرح آپ ﷺ نے بیوہ عورت سے نکاح کی عملی سنت بھی قائم فرمائی، اس کے برخلاف دنیا کے دو بڑے مذاہب عیسائیت اور ہندومت میں بیوہ سے نکاح کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا؛ بلکہ ہندو معاشرہ میں بیوہ کو منحوس سمجھا جاتا تھا اور بہت سی کوششوں کے باوجود اب بھی ہندو سماج اس تصور سے آزاد نہیں ہوسکا؛ بلکہ برادرانِ وطن سے متاثر ہوکر خود مسلم سماج میں یہ بیماری در آئی ہے، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تجدیدی کارناموں میں یہ بات شامل ہے کہ انہوں نے ''نکاحِ بیوگاں'' کی اس سنت کو زندہ کرنے کی کوشش فرمائی؛ لیکن افسوس کہ ان کوششوں کے باوجود نہ صرف والدین اور اولیاء بیوہ عورتوں کے نکاح کی فکر نہیں کرتے؛ بلکہ جوان عمر بیوائیں بھی اس میں حیا محسوس کرتی ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بعض گھروں میں انہیں منحوس بھی سمجھا جاتا ہے اور ان کو شوہر کی موت کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

اسی طرح اسلام میں حسبِ ضرورت اور بشرطِ عدل و انصاف ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی گئی ہے، نکاح میں آسانی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کو مالی اعتبار سے سادہ اور آسان رکھا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ترغیب دی کہ نکاح مسجد میں کیا جائے: "**اجعلوه في المساجد**" (**سنن**

الترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء في إعلان النکاح، حدیث نمبر: ۱۱۱۲) اس طرح عالی شان فنکشن ہالوں کی ضرورت باقی نہیں رہی، عام شادی خانوں کا ہی بوجھ کیا کم تھا کہ اب تھری اسٹار، فائیو اسٹار، گارڈن اور فنکشن ہال بنائے جارہے ہیں، جن میں بعض اوقات ایک شب کا کرایہ لاکھوں میں جاتا ہے — شریعت نے لڑکی والوں پر کھانے کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھی، اس طرح لڑکی کے سرپرستان، مہمان نوازی کے جس بڑے خرچ سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے قرض؛ بلکہ بعض اوقات سودی قرض لئے جاتے ہیں، اس کی کوئی حاجت نہیں، لڑکی والوں کی طرف سے کھانے کا نظم دراصل ہندوانہ رسم ہے، جسے ہم نے قبول کرلیا ہے۔

اسی طرح جہیز کا تصور ان قوموں میں تھا جن کے یہاں عورت کو میراث نہیں ملتی تھی، خیال ہوتا تھا کہ یہ جو کچھ جائداد ہے لڑکوں کی ہوجائے گی، تو بیٹیوں کو گھر سے رخصت کرتے ہوئے کچھ دے کر رخصت کردیا جائے، شادی کے بعد ان کا رشتہ ایک طرح سے خاندان سے کٹ جاتا تھا، اسلام اس کا قائل نہیں، اسلام میں عورت کا رشتہ نکاح کے بعد بھی اپنے خاندان سے علی حالہ باقی رہتا ہے، وہ نہ صرف اپنے ماں باپ سے وارث ہوتی ہے؛ بلکہ بعض اوقات دوسرے رشتہ داروں سے بھی حصہ پاتی ہے؛ اس لئے اسلام میں شادی سے متعلق جہیز کا کوئی تصور نہیں، رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات اپنے گھروں سے جہیز لے کر نہیں آئیں، اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادیوں حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہن کو کوئی جہیز نہیں دیا، عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ نے جہیز دیا تھا؛ لیکن یہ درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ فروخت کی گئی اور اس کی قیمت میں سے کچھ پیسوں سے آپ ﷺ نے ایک نئے گھر کو بسانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی، ان کا نظم فرمادیا، اگر آپ ﷺ نے اپنی طرف سے جہیز دیا ہوتا تو تمام صاحبزادیوں کو عطا فرمایا ہوتا؛ کیوں کہ خود آپ ﷺ نے اولاد کے درمیان برابری کا حکم دیا ہے۔ (**صحیح البخاری، کتاب الهبة، باب الهبة للولد، حدیث نمبر: ۲۵۸٦، صحیح مسلم، کتاب الهبات، حدیث نمبر: ۴۲٦۲**)

موجودہ دور میں لڑکے والوں کی طرف سے مختلف قسم کے مطالبات کئے جانے لگے ہیں، لڑکی کے لئے اشیاء جہیز کا، لڑکے کے لئے گاڑی اور بیرون ملک کے ویزے کا، نقد رقم کا، اس بات کا کہ لڑکی

والے عقد کے دن کھانا کھلائیں، اب تو بے شرمی کی انتہا یہ ہے کہ کھانے کا مینو بھی متعین کیا جاتا ہے، زیادہ کرایہ کے فنکشن ہال میں نکاح کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے، جیسے بھوکا شخص چاہتا ہے کہ دسترخوان پر جو کچھ موجود ہے، سب اپنے حلق میں ڈال لے، اسی طرح لڑکے اوران کے سر پرستاں چاہتے ہیں کہ اگر ممکن ہو تو لڑکی کے والدین کا آخری قطرۂ خون بھی نچوڑ لیں، یہ ساری باتیں رشوت کی بدترین صورتیں ہیں، ان کا لینا بھی حرام ہے اور مطالبہ پر مجبوری کے بغیر دینا بھی حرام ہے اور جن اصحاب ضمیر کو تنبہ ہوجائے، ان کے لئے اس کا واپس کردینا واجب ہے، خود لڑکی والوں کا رویہ بھی قابل افسوس ہوتا ہے کہ وہ محض رسم ورواج کی پاسداری میں خود بھی بہت سے تکلفات گوارا کرتے ہیں اور ایک طرح سے گداگروں کو اپنی لڑکی حوالہ کرتے ہیں؛ کیوں کہ اگر پانچ روپیہ کمانے والا پانچ روپیہ کا بھیکاری ہے تو پانچ لاکھ کمانے والا یقیناً اس سے بڑا بھیکاری ہے۔

نکاح میں دو ہی مالی ذمہ داریاں رکھی گئی ہیں: ایک واجب کے درجہ میں ہے، وہ ہے ''مہر'' مگر افسوس کہ آج کل مہر کو ایک رسمی چیز سمجھ لیا گیا ہے، جس کو ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی؛ حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نکاح کیا، نکاح میں مہر مقرر کیا؛ لیکن ادائیگی کا ارادہ نہیں تو وہ زانی ہے، — جب تک شوہر مہر ادا نہ کرے وہ مقروض ہے اور بلاضرورت قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول گناہ ہے، اگر لوگ اسراف اور فضول خرچی کے بجائے نکاح کے وقت ہی لڑکی کا مہر ادا کردیں تو یقیناً یہ شریعت کے مزاج کے مطابق عمل ہوگا اور ایک ضروری صفت زندہ ہوگی۔

دوسرا مالی خرچ جو نکاح سے متعلق ہے، وہ ہے ''ولیمہ''، ولیمہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے؛ لیکن ولیمہ میں آج کل جو تکلفات کئے جاتے ہیں وہ اکثر اوقات اسراف اور فضول خرچی کے دائرے میں آجاتے ہیں، اور اسراف گناہ ہے، جس کو قرآن مجید نے بڑی تاکید سے منع کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے جو ولیمہ زیادہ وسعت کے ساتھ فرمایا: اس میں ایک بکرا ذبح کیا گیا، اس طرح عملاً اس سنت کو بھی ہم نے فضول خرچی کے رنگ میں رنگ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مظہر بنادیا ہے، اس موقعہ سے رنگ و نور کے آبشار بہائے جاتے ہیں، پٹاخے اور آتش بازی سے ماحول کو گرمایا جاتا ہے، مصنوعی فوارے نصب کئے جاتے ہیں، مردوں، عورتوں کی ویڈیوگرافی کی جاتی ہے، آراستہ وپیراستہ خواتین کے حصے میں مرد ویٹر کھانا سپلائی کرتے ہیں اور بعض خدا ناترس لوگ تو اس مسنون تقریب کو رقص وسرور اور

گانے بجانے سے بھی آلودہ کردیتے ہیں، یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی اور نکاح کو برکت وسعادت سے محروم کرنے والی ہیں، اگر نکاح شریعت کے مطابق نہ ہو اور آئندہ میاں بیوی میں جھگڑے کھڑے ہوں، ساس سسر اور داماد و بہو کے درمیان بدمزگی ہو، نکاح سکون حاصل ہونے کے بجائے سکون لٹ جانے کا سبب بن جائے تو انسان کیوں کسی سے شکوہ کرے؟ حقیقت میں یہ اس کی اپنی ہی سلگائی ہوئی آگ اور لگائی ہوئی کھیتی ہے۔

خدا کے احکام کو پامال کرنے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کو روندنے والی شادیاں تو دن رات دیکھی جاتی ہیں، اب آنکھیں ان کو دیکھنے اور کان ان کو سننے کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ ان باتوں کے تذکرہ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی؛ لیکن ایسی تقریبات نکاح جو سنت کے مطابق ہوں اور سادگی کے ساتھ انجام دی گئی ہوں، سماج میں غیر معمولی واقعہ بن گئی ہیں؛ اس لئے مناسب ہوگا کہ اب ایسے واقعات کا اہتمام سے ذکر کیا جائے؛ تاکہ یہ لوگوں کے لئے عمل کا محرّک بن سکے، اللہ کا شکر ہے کہ ابھی چند روز پہلے شہر حیدرآباد کی ایک تقریب نکاح میں شرکت کا موقعہ ملا، یہ نکاح فاضل عزیز مولانا حافظ خواجہ نذیر الدین صاحب کے فرزند ارجمند کا تھا، ۱۰ /محرم الحرام کو بعد نماز جمعہ ایک بڑی مسجد میں نکاح ہوا، جس میں علماء اور اہل دانش کی بڑی تعداد شریک تھی، اس تاریخ کا انتخاب خود ایک بہتر بات تھی، تاکہ لوگوں کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ اس تاریخ کو شادی کرنے کی ممانعت ہے یا اس تاریخ میں ایسی تقریبات کا رکھنا نحوست کا باعث ہے، نکاح کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے کوئی اہتمام نہیں کیا گیا، نہ کھانے کا نہ چائے نوشی وغیرہ کا، اور چند خواتین جاکر لڑکی کو ان کے سسرال لے آئیں، اگلے دن ولیمہ میں بھی یہی سادگی ملحوظ رہی اور صرف ایک قسم کے کھانے پر اکتفاء کیا گیا، کاش! مسلمان اس مثال کو عام کریں، کہ جو قومیں بلند نصیب اور صاحب بصیرت ہوتی ہیں، وہ اچھی مثالوں کو اپنے لئے نمونہ بناتی ہیں اور جن کے لئے ذلت وپستی مقدر ہوتی ہے، وہ ناشائستہ طرز عمل کو اپنے لئے مشعل راہ سمجھتی ہے!!

مسلمان لڑکیوں کی غیر مسلم لڑکوں سے شادی
اسباب اور تدارک

اگر آپ کسی مہذب، شائستہ اور سنجیدہ مجلس میں تشریف فرما ہوں اور وہاں ایک ایسے بزرگ آجائیں، جن کے سر پر مرچ کی طرح سرخ گاندھیائی ٹوپی ہو، گہرے سبز کلر کا کرتا ہو اور ہلدی کی طرح زرد رنگ کی دھوتی ہو تو شاید مجلس میں وہی بزرگ ہر شخص کے لئے مرکز توجہ ہوں گے؛ بلکہ عجب نہیں کہ بعض لوگ ان کی دماغی کیفیت کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہو جائیں، یہ اس لئے نہیں کہ ایسے سہ رنگی کپڑا پہننے سے قانون میں منع کیا گیا ہے، یا اس لئے کہ مذہب میں اس کی ممانعت ہے؛ نہیں بلکہ اس لئے کہ لباس کے ان تینوں اجزاء کے درمیان رنگ کے اعتبار سے کوئی مناسبت اور میچنگ نہیں ہے؛ اس لئے ایسے لباس میں ملبوس شخص کے بارے میں یہی تصور ابھرے گا کہ یا تو یہ کوئی تہذیب ناآشنا دیہاتی ہے یا اس کے دماغ میں خلل واقع ہوا ہے؟ ____ غرض کہ ذوق سلیم انسان کے لباس میں مناسبت کا تقاضا کرتا ہے۔

اسی طرح ایک اور لباس ہے، جسے انسان زندگی بھر کے لئے منتخب کرتا ہے، یہ لباس ہے نکاح کے ذریعہ حاصل ہونے والی زندگی بھر کی رفاقت کا، قرآن مجید نے شوہر وبیوی کو بھی ایک دوسرے کے لئے لباس قرار دیا ہے: ﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾ (البقرۃ: ۱۸۷) کیوں کہ لباس انسان کے جسم کا راز دار ہوتا ہے اور اس کی کمزوریوں کو چھپاتا ہے، لباس سرد وگرم کا رفیق ہوتا ہے، گرمی، ٹھنڈک اور بارش سے اسے بچاتا ہے اور لباس انسان کے لئے باعث زینت ہوتا ہے، میاں بیوی کا بھی ایک دوسرے کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے، وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کا معاملہ کریں، وہ اچھے اور بُرے حالات میں ایک دوسرے کے غمگسار بنے رہیں اور اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ ایک دوسرے کے لئے عزت ووقار اور زینت کا سامان ثابت ہوں؛ اس لئے جیسے عام لباس کے انتخاب میں مناسبت اور میچنگ کی رعایت ضروری ہوتی ہے، اسی طرح لباس زندگی یعنی

شوہر و بیوی کے انتخاب میں بھی مناسبتوں کی رعایت ضروری ہے۔

اسی مناسبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کبھی خاندانی وجاہت کو دیکھ کر رشتہ کرتا ہے، کبھی اس کی نظر دوسرے فریق کے مال ومتاع پر ہوتی ہے اور کبھی حسن وجمال اور شکل وصورت پر، یہ تمام معیارات کامیابی کے ضامن نہیں ہیں، چوتھا معیار دین داری کا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اگر اس کو معیار بنا کر نکاح کیا جائے تو کامیابی قدم چومے گی— **فاظفر بذات الدین۔ (صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الأکفاء في الدین، حدیث نمبر: ۵۰۹۰)۔**

گویا سب سے بڑا معیار انسان کے لئے دین واخلاق ہے، ایک دین دار اور خدا ترس شوہر کو بے دین بیوی سے اور بیوی کو بے دین شوہر سے وہ الفت پیدا نہیں ہوسکتی جو باہمی سکون وطمانینت کی ضامن ہو؛ اس لئے دینداری کو معیار بنانے کی ترغیب دی گئی اور اگرچہ اس کو واجب نہیں کہا گیا؛ لیکن اس کی حوصلہ افزائی فرمائی گئی؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے، اور فسق میں مبتلا مسلمان ہدایت کی طرف واپس آجائے؛ لیکن اگر دینداری کا نہیں؛ بلکہ دین کا فرق ہو، یعنی شوہر وبیوی میں سے ایک، ایک مذہب پر ایمان رکھتا ہو اور دوسرا کسی اور مذہب پر، ایک سمجھتا ہو کہ اس کی پیشانی خدا کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتی اور دوسرے کی پیشانی پر ہر مخلوق کے سامنے جھکنے اور سجدہ ریز ہونے کا داغ نمایاں ہو، تو ان دونوں میں کیسے فکری ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ جذبات کی رو میں دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے مرد وعورت ایک دوسرے سے ازدواجی رشتہ کے بندھن میں بندھ جائیں؛ لیکن جوں جوں وقت گذرتا جائے گا اور نشۂ عشق کافور ہوتا جائے گا، فاصلے بڑھتے جائیں گے، دونوں کو اصل کی طرف خود لوٹنے اور دوسرے کو لوٹانے کی فکر دامن گیر ہوگی، بچوں کے بارے میں بھی کھینچاؤ پیدا ہوگا، دونوں فریق کی خواہش ہوگی کہ بچے اس مذہب کی طرف جائیں، جس پر وہ یقین رکھتے ہیں، ان بچوں کی شادی بیاہ کا مسئلہ بھی کچھ کم دشوار نہ ہوگا؛ کیوں کہ دونوں سماج میں سے کوئی بھی ان کو اپنے اندر جذب کرنا نہیں چاہے گا اور ہمیشہ ددیہال اور ننیہال دونوں طرف سے اجنبیت کی دیوار کھڑی رہے گی۔

اس حکم کی بنیادی مصلحت وہی ہے کہ نکاح کے دوام واستحکام اور زوجین کے درمیان خوشگوار تعلقات کے لئے ضروری ہے کہ شوہر وبیوی کے درمیان فکر ونظر اور عقیدہ وعمل میں ہم آہنگی پائی جائے،

اگر یہ ہم آہنگی ختم ہوجائے تو نفرت کے شعلے بھڑکیں گے اور نکاح کے مقاصد پورے نہیں ہوسکیں گے؛ اس لئے مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ مزاج رہا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری، بھائی چارہ اور محبت میں پیش پیش رہے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر معیشت وتجارت اور سیاست میں قدم بڑھائے ہیں؛ لیکن انہوں نے شادی بیاہ کے معاملہ میں اپنا تشخص قائم رکھا اور خاندان کے داخلی ماحول کو اجنبی نو واردوں سے محفوظ رکھنے کی کوششیں کیں؛ اسی لئے ان کے گھر کی فضا اسلام کے رنگ میں ڈوبی رہی، غور کیجئے کہ آپ کا پورا گھر رمضان المبارک کی رحمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہو، دن میں ہر شخص روزہ ہے اور ذکر وتلاوت کی مٹھاس سے خود کو شاد کام کررہا ہے، راتیں تراویح وتہجد سے آباد ہیں، صبح سے پہلے اٹھ کر سحری کھائی جارہی ہے اور بارگاہِ خداوندی میں مناجاتیں ہورہی ہیں؛ لیکن دوسری طرف آپ کی بہو یا آپ کا داماد روزہ ونماز سے ناآشنا ہے، وہ دن میں کھانے کی لذت حاصل کرتے ہیں اور اپنی رات بھجن گانے سے آباد رکھتے ہیں تو اس گھر کے ماحول میں وہ کس طرح ایڈ جسٹ ہوسکتے ہیں؟

افسوس کہ ادھر یہ شعور کم ہوتا جارہا ہے اور مسلم وغیر مسلم شادی کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں، پہلے تو مسلمان لڑکوں اور غیر مسلمان لڑکیوں میں شادی کے واقعات سامنے آتے تھے، ظاہر ہے کہ شریعت اسلامی میں یہ بھی جائز نہیں ہے؛ لیکن معاملہ اب اس سے آگے جاچکا ہے اور اب مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ جانے کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں، پہلے اس طرح کی اکادکا خبریں سماج کو ہلا کر رکھ دیتی تھیں؛ لیکن جب کسی مقام کے لوگ زلزلہ کے عادی ہوجائیں تو زلزلہ سے ان کے سینوں میں کوئی دھڑکن پیدا نہیں ہوتی، یہی کیفیت مسلم سماج میں ایسے واقعات پر سامنے آرہی ہے، ایسا لگتا ہے کہ لوگ اب ایسے واقعات سننے کے عادی سے ہوگئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک گمبھیر سماجی مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے غور کرنے اور حکمت وتدبیر سے اس صورت حال کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ آئندہ نسلوں کی دینی شناخت کو باقی رکھنا دشوار ہوجائے گا، ۱۹۶۷ء کے بعد بہت سے فلسطینیوں کو امریکہ اور برطانیہ میں پناہ دی گئی، ترکوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے جرمنی میں سکونت اختیار کی، ان تارکین وطن کے دلوں سے منصوبہ بند طور پر ایمانی حمیت نکال دی گئی، انہیں بین مذہبی شادیوں کا قائل کیا گیا اور اب صورت حال یہ ہے کہ وہ اپنی پہچان گم کرچکے ہیں، انہیں دیکھ کر سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ ان کے آباء واجداد مسلمان، عرب یا ترک تھے، کیا ہم بھی اس ملک میں اسی

صورت حال کو درآمد کرنا چاہتے ہیں؟

غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ شادی کے واقعات کے بظاہر تین بنیادی اسباب ہیں: اول: شادی کی فضول خرچیاں، دوسرے: مسلمان لڑکوں کی تعلیمی پسماندگی، تیسرے: مخلوط تعلیم — شادی میں فضول خرچی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ اب عام لوگوں کی شادیاں پرانے نوابوں اور راجاؤں کی شادیوں میں ہونے والے تزک و احتشام کو بھی مات کر رہی ہیں، دولت مند طبقوں نے اس کو اپنی مالی فراوانی کے مظاہرہ کا ذریعہ بنالیا ہے، درمیانی طبقہ اس کی وجہ سے بعض اوقات در و دیوار تک بیچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کمزور طبقہ اگر دین سے بے بہرہ ہو تو چاہتا ہے کہ کسی طرح اپنے جگر گوشہ کے بوجھ سے وہ نجات پا جائے، خواہ وہ کسی مسلمان کے گھر میں جائے یا غیر مسلم کے، جب تک معاشرہ کے دولت مند لوگ سادگی کو اختیار نہ کریں گے، اس صورت حال میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ جیسے قدرتی آفات کے مواقع پر مدد اور بچاؤ کی مہم شروع کی جاتی ہے، اسی طرح نکاح میں سادگی پیدا کرنے کے لئے علماء و مشائخ، سماجی و سیاسی رہنما، صحافی اور اہل علم و دانش مذہبی تنظیموں اور جماعتوں کے کارکنان ایک مہم چلائیں اور گھر گھر دستک دے کر انہیں سادہ طریقہ پر تقریب نکاح انجام دینے کی دعوت دیں۔

تعلیمی صورت حال یہ ہے کہ لڑکیاں تعلیم میں آگے بڑھتی جاتی ہیں، لگتا ہے کہ لڑکوں نے پیچھے کی طرف اپنا سفر شروع کر رکھا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ان کے جوڑ کے لڑکے میسر نہیں ہیں، موجودہ حالات میں لڑکیوں کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تعلیم کو ترک کر دیں، بالخصوص ان حالات میں کہ زندگی کے تمام شعبوں میں خواتین کے لئے ۵۰ فیصد حصہ داری کی کوشش کی جا رہی ہے، ان حالات میں اگر مسلمان لڑکیاں تعلیم ترک کر دیں تو 50% سیٹیں بغیر کسی جد و جہد کے دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائیں گی، اور پھر حصول تعلیم میں جو مسابقت جاری ہے، خاص کر لڑکیوں کو جو سہولت دی جا رہی ہے، اس کے بعد اس سلسلہ میں آپ کی نصیحت نتیجہ خیز بھی نہیں ہو سکتی؛ اس لئے لڑکوں میں یہ مزاج پیدا کرنا ہوگا کہ وہ تعلیمی جد و جہد میں اپنے قدم آگے بڑھائیں، اگر ہر مسلمان گھر میں یہ فکر جاگ جائے تو اس کی نوبت نہیں آئے گی کہ تعلیم یافتہ نوجوان لڑکیوں کو ان کے جوڑ کا رشتہ نہیں مل پائے، دوسری طرف تعلیم یافتہ لڑکیوں کی ذہنی اور فکری تربیت کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک

مسلمان کے لئے اصل وجہ افتخار اس کا صاحب ایمان ہونا ہے، نہ کہ اس کا زیادہ تعلیم یافتہ اور اونچے ذریعہ معاش کا حامل ہونا؛ کیوں کہ تعلیم اور دولت کی کوئی نہایت نہیں، ایمان اس سے بھی قیمتی جوہر ہے، کسی مسلمان لڑکی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عار کی بات نہیں ہوسکتی کہ اس نے ایمان سے محروم شخص کو اپنا رفیق زندگی بنا رکھا ہو۔

ان واقعات کا تیسرا سبب ''مخلوط تعلیم'' ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط نہ صرف اخلاقی اعتبار سے نقصان دہ ہے؛ بلکہ تدریسی نفسیات کے اعتبار سے بھی مضر ہے، مگر افسوس کہ مسلمانوں کے زیر انتظام جو درسگاہیں قائم ہیں، ان میں بھی بڑے فخر کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہاں ''کوایجوکیشن'' (مخلوط تعلیم) ہے، مخلوط تعلیم کا یہ نظام نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ پورے ہندوستانی سماج کو غیر معمولی اخلاقی نقصان پہنچا رہا ہے؛ اس لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے کم سے کم جونیئر کالج کی سطح تک زیادہ سے زیادہ الگ الگ درسگاہیں قائم کریں اور پیشہ وارانہ تعلیم کے کالجوں میں اگر جداگانہ درسگاہوں کا قیام دشوار ہو تو کم سے کم کلاس روم میں ایسی عارضی دیواریں رکھی جائیں، جو لڑکوں اور لڑکیوں کی نشست گاہوں کو الگ رکھتی ہوں، نیز مسلم علاقوں میں گورنمنٹ سے گرلس اسکول اور گرلس کالج قائم کرانے کی کوششیں کی جائیں، اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت ملک کے اکثر چھوٹے بڑے شہروں میں مسلمان، تعلیمی ادارے قائم کر رہے ہیں، اگر تمام مسلمان طے کرلیں کہ وہ پرائمری اسکول کی سطح سے اوپر لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے الگ الگ درسگاہوں کا نظم کریں گے تو اندازہ ہے کہ ۵۰ فیصد مسلمان طلبہٗ وطالبات انشاءاللہ مخلوط تعلیم کی برائیوں سے بچ جائیں گے۔

گو ایسے ناخوشگوار حالات کے لئے اور بھی اسباب ہیں؛ لیکن وہ اِکا دُکا واقعات کا سبب بنتے ہیں، یہ تین اسباب زیادہ اہم ہیں اور ضروری ہے کہ مسلمان اس پر توجہ دیں اور امت کے ارباب حل وعقد پوری سنجیدگی کے ساتھ اس ناگفتہ صورت حال پر غور کریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کی غفلت کل کے سیلاب کا پیش خیمہ بن جائے اور پھر اس پر بند باندھنا ممکن نہ رہے!!

❁

والدین — رحمت کے سائے

معاویہ بن جاہم سُلمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سے ہیں، وہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میں آپ کے ساتھ جہاد کرنا چاہتا ہوں اور اس سے میرا مقصود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کا اجر حاصل کرنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ نے فرمایا: واپس ہوجاؤ اور والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، میں پھر دوسری جانب سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے حاضر ہوا، آپ نے پھر وہی سوال کیا اور میں نے بھی وہی جواب دیا، آپ نے بھی پھر وہی ہدایت فرمائی، پھر میں نے آپ کے سامنے آکر وہی بات عرض کی، اب بھی آپ کا وہی سوال اور میرا وہی جواب تھا، اس بار آپ نے ارشاد فرمایا: تجھ پر افسوس ہے، تو اپنی ماں کے قدموں سے چمٹ جا، وہی تمہاری جنت ہیں "**ویحک الزم رجلها فثم الجنة**" (ابن ماجہ: حدیث نمبر:۲۷۸۱) — جہاد کوئی معمولی عبادت نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دین کی سب سے بلند چوٹی قرار دیا ہے، یہ ایسی عبادت ہے، جس میں بندۂ مومن سر میں کفن باندھ کر اسلام کی سربلندی کے لئے نکلتا ہے اور بعض دفعہ اپنا آخری قطرہ لہو نچوڑ کر اسلام کے شجرۂ طوبی کو آبیار کرنے کی کوشش کرتا ہے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماں کی خدمت کو اس پر بھی ترجیح دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض حال کیا کہ میں جہاد کرنے کی خواہش کرتا ہوں؛ لیکن جہاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا؟ آپ نے ارشاد فرمایا: کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہیں؟ ان صاحب نے عرض کیا: میری والدہ زندہ ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہوئے اللہ سے ملو، اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو حج کا، عمرہ کا، اور جہاد کا ثواب حاصل ہوگا: "---**فأنت حاج، ومعتمر، ومجاهد**" (مجمع الزوائد: ۱۳۸/۸) — دوسرے اہل تعلق کا حق ان کی وفات پر ختم ہوجاتا ہے؛ لیکن والدین کا حق ان کی وفات کے بعد بھی باقی رہتا ہے، قبیلہ بنو سلمی کے ایک صاحب بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور

عرض کیا: میرے والدین گذر چکے ہیں، کیا اب بھی ان کا کوئی حق میرے اوپر باقی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، ان کے لئے دعائے رحمت کرتے رہنا، ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا، انہوں نے کسی سے کوئی وعدہ کر رکھا ہو، تو اس کو پورا کرنا، والدین کے واسطے سے تمہاری جو رشتہ داریاں ہیں، انکے ساتھ حسن سلوک کرنا اور والدین کے جو دوست واحباب تھے، ان کا اکرام کرنا۔(سنن ابوداؤد: حدیث نمبر: ۵۱۳۵)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ کے بارے میں ابن دینار نے نقل کیا ہے کہ ایک دیہاتی سے مکہ کے راستے میں ملاقات ہوئی، حضرت عبداللہ نے ان کو سلام کیا، اپنی سواری کا گدھا ان کو دے دیا اور اپنا عمامہ بھی ان کو عطا فرما دیا، ابن دینار کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ تو دیہاتی لوگ ہیں، تھوڑے پر بھی راضی ہوجاتے ہیں، یعنی آپ نے ان کے ساتھ حسن سلوک میں مبالغہ کردیا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس دیہاتی شخص کے والد میرے والد کے دوست تھے، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بہترین حسن سلوک وہ ہے جو بیٹا اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ کرے: ”إن أبر البر صلة الولد أهل ود أبيه“ (مسلم: حدیث نمبر: ۲۵۵۲)...... یہ ایک مثال ہے کہ صحابہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر کس درجہ عمل کا اہتمام فرماتے تھے اور والدین ہی نہیں، ان کے اہل تعلق کے ساتھ بھی قدردانی اور حسن سلوک کا معاملہ فرماتے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے وجود پر والدین سے بڑھ کر کسی کا احسان نہیں ہوتا اور ان کے احسانات کا بدلہ ادا نہیں کیا جا سکتا، ماں اپنی اولاد کو کارخانۂ ہستی تک پہنچانے کے لئے جس طرح نو دس ماہ اسے اپنے پیٹ میں رکھتی ہے اور کروٹ کروٹ تکلیف اٹھاتی ہے، کیا اس کی کوئی قیمت ادا کی جا سکتی ہے؟ بچہ پیدا ہونے کے بعد قدرت نے اس کے سینے میں جو چشمۂ صافی رکھدیا ہے، کس طرح وہ اس سے اپنے بچے کو آسودہ کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کے خون کی ایک ایک بوند دودھ کی شکل میں اس کمزور پودے کو تناور درخت بنانے میں خرچ ہوجائے؟ نہ اسے بچوں کے پاخانہ سے کوئی گھن ہے، نہ پیشاب سے کوئی نفرت ہے، اپنے بچے کے آرام کے لئے رات کی بے سکونی میں ہی اسے سکون آتا ہے اور اس کو آرام پہنچانے کے لئے وہ دن کا ایک ایک لمحہ ہنسی خوشی بے آرامی کے ساتھ گذارتی ہے، اگر بچے کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو ماں کی ممتا کچھ اس طرح بے قرار ہوجاتی ہے کہ جیسے خود اس

کوکوئی خنجر چبھ گیا ہو، ماں کا یہ پیار بچپن سے جوانی اور اگر عمر نے وفا کی تو جوانی سے بڑھاپے تک بچوں پر سایہ فگن رہتا ہے۔

باپ کا حال یہ ہے کہ وہ دردر کی خاک چھانتا ہے، وطن چھوڑ کر بے وطن ہوتا ہے، گاڑھا پسینہ بہاتا ہے اور ہر وقت اسے یہ آرزو بے چین رکھتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر حال میں رکھے، بچوں کے تھوڑے سے آرام کے لئے اپنی ضروریات کو تج کر معمولی حالت میں رہتا ہے، وہ سخت سے سخت تکلیف اٹھا سکتا ہے؛ لیکن اپنے بچوں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، خود مشقت برداشت کرسکتا ہے؛ لیکن چاہتا ہے کہ اپنے بچوں کے لئے ڈھیر ساری دولت چھوڑ جائے — کیا اس محبت کی کوئی قیمت ادا کی جاسکتی ہے؟ اور کیا اس بے غرضی اور ایثار کا دنیا میں کوئی صلہ دیا جاسکتا ہے؟ اسی لئے مہذب انسانی معاشرہ میں ہمیشہ والدین کے رشتے کو سب سے زیادہ مقدس اور قابلِ احترام سمجھا گیا ہے؛ لیکن اس وقت دنیا میں جس تہذیب کا بول بالا ہے، اس کی بنیاد احسان شناسی اور ایثار کے بجائے خود غرضی اور مطلب برآری پر ہے؛ اس لئے والدین جب اس عمر کو پہنچتے ہیں، جب ان سے کوئی مادی غرض وابستہ نہیں ہوتی تو ان کو ایک بوجھ سمجھنے لگتے ہیں، بوڑھاپے میں والدین کی گفتگو — جس میں بعض اوقات چڑچڑاہٹ شامل ہوجاتی ہے — ان کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، والدین کا ان کے گھر میں رہنا بارِ خاطر ہوتا ہے، بیوی کی ناز برداری اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ماں کے ساتھ گھر کی خادمہ کا سلوک ہونے لگتا ہے، بچے نہ صرف یہ کہ والدین کا علاج کرانے سے کتراتے ہیں؛ بلکہ انہیں یہ بات بھی گراں گذرتی ہے کہ والدین کے اپنے پیسے ان پر خرچ ہوں اور ترکہ کی متوقع دولت ان کے لئے کم ہونے لگے، کچھ عرصہ پہلے اس حقیر کے پاس ایک ایسا تکلیف دہ معاملہ آیا کہ بوڑھے ماں باپ کے نصف درجن سے زیادہ بیٹے اور کئی بیٹیاں ہیں، بچوں نے باپ اور ماں کو تقسیم کر رکھا ہے کہ اتنے اتنے دنوں فلاں بیٹا انہیں اپنے پاس رکھے گا اور وہ بھی اس طرح کہ والد کسی اور بیٹے کے پاس اور والدہ کسی اور بیٹے کے پاس، پھر جھگڑا اس بات پر پیدا ہوتا ہے کہ والد اور والدہ میرے پاس اپنی مدت سے زیادہ رہ جاتے ہیں، یہ تو بیٹوں کا حال ہے اور بیٹیوں کا حال یہ ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ماں باپ کی ذمہ داری صرف بیٹوں پر ہے، ان پر نہیں ہے؛ حالاں کہ شرعاً ذمہ داری تمام امکانی ورثہ پر ہے، پھر ماشاء اللہ سب چہرے بشرے سے دین دار اور دینی کاموں سے لگے ہوئے، علماء

ومشائخ سے تعلق رکھنے والے، میرے لئے یہ واقعہ اتنا صدمہ انگیز تھا کہ اپنے مزاج کے برخلاف میں نے کہا کہ آپ حضرات کو شرم آنی چاہئے، آپ کا جھگڑا تو اس بات پر ہونا چاہئے تھا کہ ہمیں دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں خدمت کا زیادہ موقع ملے؛ لیکن یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے...... یہ صورتحال ہمارے معاشرے میں بڑھتی جارہی ہے، مغربی سماج کے جو واقعات ہم سنتے تھے اور سن کر حیرت ہوتی تھی، اب اسی طرح کے واقعات خود ہمارے سماج میں پیش آرہے ہیں۔

فیاأسفاه ویاعجباه!

مغربی ملکوں کی صورتحال تو اس معاملے میں حد درجہ ابتر ہے؛ کیوں کہ اخلاقی قدریں وہاں کی ڈکشنری سے مٹادی گئی ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ماں باپ اور شوہر و بیوی سے کہیں زیادہ اہمیت 'کتوں' کی ہے، ان کی راحت وآسائش کی جتنی فکر کی جاتی ہے اور حیوانات کے ساتھ رحم دلی کا خوبصورت عنوان لگا کر ان کا جتنا لحاظ رکھا جاتا ہے، ماں باپ اور بزرگوں کا بھی نہیں رکھا جاتا، برطانیہ کے مشہور اخبار گارجین کے شمارہ ۱۳؍اکتوبر ۲۰۱۰ میں رپورٹ چھپی تھی کہ صرف برطانیہ میں دوسال میں والدین کے خلاف بچوں کے ظالمانہ تشدد کے ۲۲؍ہزار ۵ سو ۷ ۳ واقعات پولیس میں درج کرائے گئے، آسٹریلیا کے اخبار 'نیوز' کے ۲۳ فروری ۲۰۱۳ کے شمارہ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پولیس کو ہر پانچ میں سے ایک کال والدین پر تشدد کی شکایت کے سلسلہ میں آتا ہے، دور کیوں جائیے، اب تو خود ہندوستان کے اخبارات میں والدین کے ساتھ زیادتی یہاں تک کہ قتل تک کی خبریں آتی ہیں، بوڑھوں کے ہاسٹل ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں بن چکے ہیں، یہ گویا بوڑھے اور معذور لوگوں کا ''ڈسٹ بین'' ہے، جن کو اس لائق نہیں سمجھا جاتا کہ وہ گھر میں رہیں اور ان کو ایک فاضل سامان اور کچڑے کی طرح وہاں پھینک دیا جاتا ہے۔

اس اخلاقی گراوٹ پر توجہ کی ضرورت ہے، ضرورت ہے کہ مسجدوں کے منبر ومحراب سے بار بار نوجوانوں کو والدین کی اہمیت بتلائی جائے، ضرورت ہے کہ اخبارات ورسائل کے ذریعے سماج کو اس کے لئے بیدار کیا جائے، ضرورت ہے کہ ذرائع ابلاغ صرف سنسنی خیز خبروں کو اپنا موضوع نہ بنائیں؛ بلکہ وہ اخلاقی تعلیمات کو مؤثر اور دلچسپ بنا کر پیش کریں، ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ تعلیم میں اخلاقیات کے عنصر کو شامل کیا جائے، یہ بھی سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بیوی کے الگ حقوق ہیں

اور ماں باپ کے الگ، ان میں سے ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے عمل سے نئی نسل کی تربیت کرنی چاہئے، اگر ایک شخص خود اپنے والدین کے ساتھ بہتر سلوک کرے، ان کی اطاعت و فرماں برداری کرے اور تواضع و انکساری کا مظاہرہ کرے، تو یہ خود ان کے بچوں کے لئے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا خاموش مگر موٴثر اور بہترین پیغام ہوگا؛ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے والدین کے ساتھ بہتر سلوک کرو، تو تمہارے بچے تمہارے ساتھ بہترین سلوک کریں گے: "بروا آباء کم تبر کم أبناء کم" (مستدرک الحاکم، کتاب البر والصلۃ، حدیث نمبر: ۷۲۵۹)۔

❁

حسرت اُن غنچوں پر ہے، جو بِن کھِلے مُرجھا گئے!

(ماں کے پیٹ میں دختر کشی)

ایک صاحب خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم کفر و جاہلیت میں مبتلا اور بتوں کے پرستار تھے، خود اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی، وہ میرے پکارنے سے بہت خوش ہوتی تھی، جب بھی بلاتا، دوڑ کر آتی، ایک دن میں نے اسے بلایا، وہ میرے پیچھے پیچھے آئی، میں اسے ساتھ لے کر چلتا رہا، یہاں کہ میں ایک محلہ کے کنویں کے پاس آیا، جو کچھ زیادہ دور نہیں تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنویں میں پھینک دیا اور آخری بات جو میں نے اس کی زبان سے سنی وہ یہ تھی: میرے ابو! میرے ابو!۔ یہ سن کر آپ ﷺ پر گریہ طاری ہوا، اتنا روئے کہ ریش مبارک بھی آنسو سے تر ہوگئی، پھر آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمانۂ کفر کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، اب نئے سرے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرو، (سنن دارمی: ۱۳۱) اسلام سے پہلے عرب میں اس طرح کے ظالمانہ عمل کا ارتکاب کوئی شاذ و نادر بات نہ تھی، بلکہ کثرت سے ایسے واقعات پیش آیا کرتے تھے۔

اسی لئے قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اولاد کشی اور خاص کر دختر کشی کی مذمت کی ہے، (الانعام: ١٦) لوگ فقر و افلاس کے اندیشے سے قتل اولاد کے مرتکب ہوا کرتے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کم سے کم دو جگہ بھوک اور فاقہ کشی کے خوف سے اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب سے منع فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی روزی ہمارے ذمہ ہے نہ کہ تمہارے ذمہ، (الاسرا: ۴، الانعام: ۱۹) ایک بار آپ ﷺ نے اس سوال پر کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ اول نمبر پر شرک کا نام لیا، پھر والدین کی نافرمانی کا اور اس کے بعد اس خوف سے اولاد کو مار ڈالنے کا کہ اس کے کھانے کا کیا نظم ہوگا۔ (بخاری)

کچھ لوگ وہ تھے جو قتل اولاد کو قربانی تصور کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس عمل کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں گے، عربوں میں بھی یہ تصور عام تھا۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس کا ذکر فرمایا

ہے اور اس کی مذمت بھی کی ہے، (الانعام:۱۶) خود آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کی قربانی کی نذر مانی تھی، جب نذر پوری کرنے کی نوبت آئی، تو اپنے دس بیٹوں کو لے کر کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور فال نکالا کہ قربانی کے لئے کس کا نام نکلتا ہے؟ اتفاق کہ سب سے چھوٹے بیٹے عبداللہ کا نام نکلا، یہ وہی عبداللہ تھے جن کے صلب میں نبوت کا ماہِ تمام چھپا ہوا تھا، عبدالمطلب اس قربانی کے لئے پوری طرح تیار تھے، لیکن قریش نے بڑی خوشامدیں کیں کہ اگر بیٹے کی قربانی کا رواج عام ہو گیا تو اس سے ہم کمزور ہو جائیں گے، چنانچہ زمانۂ جاہلیت کے طریقہ کے مطابق پانسے نکالے گئے اور بالآخر عبداللہ کے بدلہ سو اونٹ ذبح کئے، (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام:۱۵۴۱) بچے کی قربانی کے نذر کے بعض اور واقعات بھی حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک خاتون نے اس قسم کی نذر کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ اس کا کفارہ ادا کردو، (موطا امام مالک، باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ) اس سے ظاہر ہے کہ عربوں کے یہاں ایسی قربانی کوئی نادر واقعہ نہ تھی اور یہ کچھ عربوں ہی پر موقوف نہ تھا بلکہ دوسری قوموں میں بھی انسانی قربانی کا رواج رہا ہے، ہندوستان میں بھی دیویوں اور دیوتاؤں پر انسانی چڑھاوے کا رواج تھا اور اس ترقی یافتہ دور میں بھی ایسی خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں کہ باپ نے اپنی ہی اولاد کو بلی چڑھادی۔

تاہم فقر و افلاس کی وجہ سے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے قتل اولاد کے واقعات تو اکا دکا ہوتے تھے، لیکن ''دختر کشی'' کا رواج عربوں میں بہت ہی زیادہ تھا اور اس کے لئے ایسی شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا کہ سن کر اور پڑھ کر آج بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ حضرت قیس بن عاصمؓ نے بارگاہ نبوی ﷺ میں اعتراف کیا کہ وہ اسلام سے پہلے اپنی آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کر چکے ہیں، بلکہ ایک روایت میں بارہ تیرہ لڑکیوں کا ذکر ہے۔ (مجمع الزوائد:۱۳۴/۷)

دراصل عرب کے بعض قبائل اپنے گھر میں داماد لانے کو شرم و عار کی بات سمجھتے تھے، اسی لئے بیٹی کی پیدائش کا نام سنتے ہی مارے غصہ کے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا تھا، اس کے سامنے دو ہی راستے ہوتے تھے، یا تو وہ اس متاعِ رسوائی کو اپنے پاس رکھے یا اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کر دے، (النحل:۷) ہندوستان میں بھی راجپوتوں اور بعض دوسری طاقتور قوموں میں لڑکیوں کے دفن کر دینے کا رواج تھا۔

گو اسلام سے پہلے بھی اور خود عرب سماج میں بھی بعض ایسے شریف النفس اور نیک طبیعت لوگ موجود تھے جو بے گناہ نومولود بچیوں کو حاصل کر لیتے اور پرورش کر کے ان کو جوان کرتے تھے، پھر اگر ان کے والدین چاہتے تو بچیاں ان کو واپس کر دیتے، ورنہ خود ہی ان کی پرورش کرتے رہتے، بخاری میں اس سلسلہ میں خاص طور پر زید بن عمرو بن نفیل کا ذکر آیا ہے، (بخاری:۵۴۰۱) لیکن اس کی حیثیت محض شخصی کوششوں کی تھی اور ایسی کوششیں انفرادی طور پر محض دو چار دس جانوں کے تحفظ کا باعث بن سکتی تھیں، یہ کوششیں اس مقصد میں ذرا بھی بار آور نہیں ہو پائیں کہ عربوں کے ذہن سے شرم و عار کے اس احساس کو مٹا سکیں اور ان کو سمجھا سکیں کہ جو شخص اپنی بیٹی کسی کے حوالہ کرتا ہے وہ ذلیل وحقیر نہیں بلکہ وہ اپنے داماد کا محسن ہے، اور ہر مرد کو اپنی بیوی کے والدین کا منت شناس اور احسان مند ہونا چاہئے۔

لیکن جب پیغمبر اسلام ﷺ رحمت مجسم بن کر تشریف لائے اور کفر و جاہلیت اور اوہام و خرافات کی تہہ در تہہ تاریکی میں ان پر ہدایت کا چراغ روشن کیا، تو آپ ﷺ نے عربوں کے ذہن سے اس تصور ہی کو مٹا دینے میں کامیابی حاصل کی، آپ ﷺ نے لڑکیوں کو ''زحمت'' کے بجائے ''رحمت'' قرار دیا، ان کی پرورش کو آخرت کی نجات کا ذریعہ بتایا، سماج میں قریب قریب مردوں کے مساوی حقوق ان کو عطا فرمائے اور ہر طرح کے اعزاز و احترام سے اس مظلوم طبقہ کو سرفراز کیا، خواتین سے تو آپ ﷺ باضابطہ اس بات کی بیعت ہی لیا کرتے تھے کہ وہ قتل اولاد کا ارتکاب نہیں کریں گی۔

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ یا تو وہ وقت تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ رکھنا اور ان کی پرورش کرنا بھی باعث عار تصور کرتے تھے، یا پھر وہ وقت آیا کہ حضرت امامہ بنت حمزہؓ کی پرورش کے لئے تین تین صحابہ حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ مدعی تھے، مقدمہ آپ ﷺ کی عدالت میں آیا اور آپ ﷺ کو اس سلسلہ میں فیصلہ کرنا پڑا، پھر مسلمان جہاں کہیں گئے وہ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگوں کے لئے ایک پیام رحمت ثابت ہوئے، ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے ہی ستی کی رسم ختم کی اور بیوہ عورتوں کے لئے تحفظ کا سرو سامان کیا۔

افسوس کہ جو دین دختر کشی کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے آیا تھا اور جس نے زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں کو حیات بخشی اور نحس کا دروازہ کہی جانے والی عورت کو سایۂ رحمت اور وسیلۂ جنت قرار دیا،

اسی دین کے ماننے والے اور نبیؑ رحمت ﷺ سے نسبت رکھنے والے نام نہاد مسلمانوں کی طرف سے بعض ایسے واقعات پیش آتے ہیں، جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، چنانچہ ۱۱؍اپریل ۲۰۱۲ء کو بالآخر آفرین نامی تین ماہ کی بچی (بنگلور) کا انتقال ہوگیا، جس کو عمر فاروق نامی اس کے باپ نے سگریٹ کے چرکے دے دے کر، جسم کتر کتر کر اور دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر مار ڈالا، محض اس لئے کہ وہ بدبخت بیٹے کی پیدائش چاہتا تھا اور اس کے گھر میں بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی، اس سے زیادہ شقاوت کی بات کیا ہوگی کہ خود باپ کے ہاتھوں ایک شیر خوار نومولود کا قتل ہوجائے؟ نہایت شرمناک بات ہے کہ علم وترقی کے اس دور میں بھی ایسے انسانیت سوز واقعات پیش آتے ہیں، جو زمانہ جاہلیت کو بھی شرمسار کرتے ہیں، یہ تو پیدا ہونے کے بعد کی دختر کشی ہے، اس سے پہلے رحم مادر میں دختر کشی تو ایسی بات ہے کہ لڑکیوں کی جان بھی لے لی جاتی ہے اور کانوں کان کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

ایک معمولی اندازہ کے مطابق (Sex Dermination Test) ٹسٹ پر مبنی اطلاعات کی روشنی میں روزانہ پانچ تا چھ سو لڑکیاں اس عالم رنگ و بو میں آنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اُتار دی جاتی ہیں، یہ قتل دشمنوں اور غیر سماجی عناصر یا غنڈوں کے ذریعہ نہیں ہوتا؛ بلکہ شفیق باپ اور ممتا سے معمور ماں کے ہاتھوں ہوتا ہے اور خاندان کے بزرگوں اور خیر خواہوں کا مشورہ بھی اس میں پوری طرح شریک رہتا ہے، گو انسانی حقوق اور خواتین کی مختلف تنظیموں کے احتجاج اور مطالبہ پر قانوناً ایسے ٹسٹ کو منع کردیا گیا ہے، لیکن جب تک اندازِ فکر میں تبدیلی نہ آئے، قانون شکنی کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟

اصل میں لوگوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ عورت کا وجود سماج کے لئے اسی قدر ضروری ہے جس قدر مرد کا، اگر عورتوں کی شرح پیدائش گھٹتی چلی جائے اور مردوں کا تناسب بڑھتا چلا جائے تو اس سے ایسے سماجی مفاسد پیدا ہوں گے کہ جن کا تصور بھی دشوار ہے، خواتین پر مجرمانہ دست درازی میں اضافہ ہوگا، زنا اور اغواء کے واقعات بڑھیں گے، گھروں کا ماحول خراب ہوگا، اخلاقی انارکی پیدا ہوگی اور چوں کہ اصل میں افزائش نسل کا مدار عورت ہی کے وجود پر ہے؛ اس لئے مطلق شرح پیدائش کم ہوتی جائے گی اور اس کے نتیجے میں افرادی وسائل کی قلت کا سامنا ہوگا، انسان کو خاندانی نظام کے سکون سے محرومی کو گوارا کرنا پڑے گا اور اس سے ایسی بے حیائی اور بے شرمی کو راہ ملے گی، جو تصور سے بھی ماوراء ہے، خود ہندوستان میں بعض قبائلی اقوام میں عورتوں کی شرح پیدائش میں کمی کی

وجہ سے کئی کئی مردوں کی ’’مشترک بیوی‘‘ کا شرم ناک رواج موجود ہے، اسی سے دختر کشی کے جرم کی سنگینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اگر ہم صرف والدین کو دختر کشی کی اس ’’جاہلیت جدیدہ‘‘ کا مجرم قرار دیں، تو شاید انصاف نہ ہو، پورا سماج اس کا مجرم ہے، وہ ظالم سماج جو اپنے لڑکوں کو بازار کے سامان کی طرح اُونچی قیمتوں پر فروخت کرتا ہے، جو چاہتا ہے کہ لڑکیوں کے والدین سے ان کی رگ گلو کا آخری قطرۂ خون بھی وصول کرلے، جس کو حرص وطمع نے سیم وزر کا ایسا پیاسا بنادیا ہے کہ جیسے کوئی سگ گزیدہ مریض ہو، اور جس کی بے رحمی وشقاوت اور سنگدلی پر شاید درندے بھی شرماتے ہوں، جب تک ہم اس اصل مرض کا علاج کرنے میں کامیاب نہ ہوں، دختر کشی کے جرم کو روک نہیں سکتے۔

قرآن مجید نے زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں کی بابت عجیب نقشہ کھینچا ہے کہ خدا کا دربارِ انصاف لگا ہوگا، خدا پوری شان قہاری کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا، ناحق قتل کردی جانے والی پھولوں کی طرح معصوم بے گناہ لڑکیاں لائی جائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائیں گے کہ آخر یہ کس جرم میں قتل کی گئی ہیں؟ ﴿بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ﴾ (التکویر:۹) شاید اس وقت ان لڑکیوں کے قاتل باپ یا ماں بھی کٹہرے میں کھڑے ہوں گے، وہ ڈاکٹر اور معالج بھی جن کا فریضہ بہ حد امکان زندگی کی حفاظت ہے نہ کہ زندگی کا خاتمہ، اور شاید وہ پورا سماج بھی جو بالواسطہ ان بے گناہوں کے قتل میں شریک وسہیم ہے!

❁

احسان، ہر عمل میں!

جب آپ جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں اور خطبہ سنتے ہیں تو قرآن مجید کی ایک آیت تقریباً ہر بار آپ کے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ (النحل: ۹۰) — اس میں عدل اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا مفہوم تو ایک حد تک آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے؛ لیکن احسان سے کیا مراد ہے؟ یہ بات عام طور پر لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہے؛ حالاں کہ یہ قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے اور قرآن میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور اس پر اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے پانچ مواقع پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ 'احسان' کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۹۵، آل عمران: ۱۳۴، ۱۴۸، المائدۃ: ۱۳، ۹۳) کم سے کم دو مواقع پر ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾ (النحل: ۱۲۸) نیز ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (العنکبوت: ۶۹) یہ بھی فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی عمل کو قبول فرماتے ہیں، جس میں احسان شامل ہو اور احسان کے ساتھ عمل کرنے والوں کا اجر محفوظ ہے: ﴿بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۱۲)، احسان کا فائدہ صرف آخرت میں ہی نہیں؛ بلکہ دنیا میں بھی ان کے لئے بھلائی ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (النحل: ۳۰)۔

پھر مختلف اعمال سے متعلق بھی احسان کا حکم دیا گیا، والدین کے بارے میں بار بار تاکید کی گئی کہ ان کے ساتھ تمہارا رویہ احسان کا ہو: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (البقرۃ: ۸۳)، اگر رشتہ کے بندھن کمزور ہو جائیں اور میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹنے کی نوبت آجائے تو فرمایا گیا کہ چھوڑتے ہوئے بھی

احسان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے: ﴿فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ (البقرۃ: ۲۲۹) اگر قاتل اور مقتول کے ورثہ کے درمیان خون بہا کی ادائیگی کا معاملہ طے پا جائے تو تاکید کی گئی کہ قاتل بعد میں ٹال مٹول سے کام نہیں لے؛ بلکہ واجبات کی ادائیگی میں احسان کا راستہ اختیار کرے: ﴿فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ (البقرۃ:۱۷۸)۔

غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں احسان ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان کو ضروری قرار دیا ہے؛ لہٰذا (اگر شرعا کوئی شخص قتل کئے جانے کا مستحق ہو تو) بہتر طور پر قتل کرے اور جانور کو ذبح کرنا ہو تو بہتر طور پر ذبح کرے: "--- وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح" (مسلم، حدیث نمبر: ۱۹۵۵) لڑکیوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر ان کی پرورش احسان کے ساتھ یعنی بہتر طور پر کی جائے تو وہ دوزخ سے پردہ بن جائیں گی: "من يلي من هذه البنات شيئًا فأحسن إليهن لكن سترا من النار" (بخاری، حدیث نمبر: ۵۹۹۵) باندیوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جو اُن کی پرورش کرے اور اچھی طرح پرورش کرے، نیز تعلیم وتربیت کرے اور اچھی طرح تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے: "--- غذاها فأحسن غذائها ثم أدبها فأحسن تأديبها" (بخاری، حدیث نمبر: ۹۷)۔

احسان کا اللہ کی عبادت سے خصوصی تعلق ہے، چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحابہ کی تعلیم وتربیت کے لئے انہوں نے چند سوالات کئے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ احسان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو؛ اس لئے کہ اگر چہ تم خدا کو دیکھنے سے قاصر ہو؛ لیکن خدا تو تم کو دیکھ رہے ہیں: "أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك" (بخاری، حدیث نمبر: ۵۰) اسی طرح وضوء ایک عبادت بھی ہے اور عبادت کا ذریعہ بھی، وضوء گناہوں کا کفارہ بھی ہوا کرتا ہے؛ لیکن یہ اس وقت ہوگا جب وضوء میں احسان ہو، یعنی اچھی طرح وضوء کرتے: "فيحسن وضوءها" (مسلم: ۲۲۸) پڑوسیوں کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص تاکید فرمائی کہ احسان کا رویہ ہو اور پڑوس کا حق ادا کیا جائے: "وأحسن جوار من جارك" (ترمذی حدیث نمبر: ۲۳۰۵) غرض کہ زندگی کے تمام گوشوں میں احسان ضروری ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ احسان سے کیا مراد ہے؟— احسان یہ ہے کو جس کام کو کیا جائے بہتر طور پر خوش سلیقگی کے ساتھ اور اس کا حق ادا کرتے ہوئے انجام دیا جائے، عبادت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حاصل کرنا ہے اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب خشوع وخضوع بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار بھی؛ اسی لئے فرمایا گیا کہ اس طرح عبادت کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، جانور کو ذبح کرنے میں شریعت کی ہدایت یہ ہے کہ تم سے اس کو کم سے کم تکلیف پہنچے؛ اس لئے آپ نے جانور کے بارے میں فرمایا کہ ذبح کرنے کے لئے تیز دھار دار آلہ استعمال کیا جائے، معاملات میں احسان یہ ہے کہ آدمی صرف دوسروں کو ان کا حق ادا کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے؛ بلکہ اپنے حق کے معاملہ میں ایثار سے کام لے اور دوسروں کے لئے اپنا حق یا اس کا کچھ حصہ چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔

سماجی زندگی سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ دراصل اسی احسان کی عملی تشریح ہے؛ لیکن آج اس سلسلہ میں مسلمان دوسری قوموں سے بھی گئی گذری حالت میں ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کسی سے اختلاف کی نوبت آئے تو بہتر طریقہ پر دفاع کرو اور ان کا سنجیدہ جواب دو: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ﴾ (المؤمنون: ۹۶) مگر آج صورت حال یہ ہے کہ معمولی معمولی اختلاف پر مسلمان اور بعض اوقات پڑھے لکھے یہاں تک کہ دین سے واقف حضرات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح الجھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں ایسی زبان استعمال کرتے ہیں کہ اس پر اسلام کے کھلے ہوئے دشمن بھی خندہ زن رہتے ہیں، اگر ہم بہتر الفاظ اور اچھے لب ولہجہ میں اپنی بات کہیں اور خوش اسلوبی وخوش اخلاقی کے ساتھ اختلاف رائے کو پیش کرنے کا سلیقہ سیکھ لیں تو امت کا بہت سارا اختلاف ختم ہوسکتا ہے اور ملت اسلامیہ جنگ وجدال کے شعلوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماحول کو صاف رکھنے کا حکم دیا ہے، اس زمانہ میں عام طور پر گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوا کرتے تھے؛ اس لئے آپ کی ہدایت تھی کہ لوگ آبادی سے نکل کر قضاء حاجت کریں؛ تا کہ تعفن پیدا نہ ہو، اس بات سے بھی منع فرمایا گیا کہ گھر کی نالیاں راستوں پر نکالی دی جائیں کہ اس سے گذرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے؛ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ ہر شہر میں گندگی اور کثافت مسلمان محلوں کی پہچان بن گئی ہے، گھروں کی نالیاں گھر سے باہر نکال دی

جاتی ہیں اور بعض دفعہ تو ان نالیوں کے ذریعہ غلاظتیں اور فضلات تک بہائے جاتے ہیں، جو لوگ اس ماحول کے عادی نہیں ہوتے، ان کو اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر گذرنا پڑتا ہے، کیا مسلمانوں سے یہی کردار مطلوب ہے اور ''احسان'' کا تقاضا یہی ہے؟ حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کے ہٹانے کو ایمان کا ایک حصہ قرار دیا ہے: **''وأدناها إماطة الأذى عن الطريق''** (**صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب شعب الإیمان، حدیث نمبر: ۱۶۲**)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ لوگ راستوں پر کھڑے رہیں، جس سے خواتین کو گذرنے میں دقت ہوتی ہے؛ لیکن آج مسلم محلوں کی پہچان یہ ہے کہ جگہ جگہ اوباش نوجوانوں کی ٹولیاں کھڑی ہوتی ہیں، رات گئے تک لوگ اپنے گھروں کے باہر چبوتروں پر بیٹھے رہتے ہیں، بعض اوقات اس بیٹھک میں فحش ہنسی مذاق اور شطرنج وتاش کی شمولیت بھی ہوجاتی ہے، باعزت خواتین وہاں سے گذرنے میں خوف محسوس کرتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں جب بہت معمولی آبادی تھی، لوگ پیدل چلتے تھے یا اونٹ اور گھوڑے کی سواری ہوتی تھی، ہدایت دی تھی کہ راستے کم سے کم سات ہاتھ چوڑے ہونے چاہئیں، آج حکومتیں موجودہ ٹریفک کے لحاظ سے راستوں کی حدود متعین کرتی ہیں، ان کی رعایت ضروری ہے؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ ہم نہ صرف قانون کے مطابق اپنے تعمیری حصہ کو پیچھے نہیں کرتے اور راستے سے متصل جگہیں نہیں چھوڑتے؛ بلکہ مزید اپنی حدود سے باہر سڑک کے حصہ میں —جس سے تمام عوام کے حقوق متعلق ہیں— تجاوز بھی کرتے ہیں، اگر دیوار آگے نہ بڑھائی تو کم سے کم چبوترے، سیڑھیاں اور بالکونی کو سرکاری حصہ میں بنالینا اپنا حق سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ یہ نہ صرف دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا ہے؛ بلکہ عوامی جگہ ہونے کی وجہ سے اس عمل کے ذریعہ آپ ہزاروں افراد کے حقوق کے غاصب بھی بنتے ہیں۔

شریعت نے اسراف وفضول خرچی کو منع کیا ہے، قرآن نے کہا کہ اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے: ﴿وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (الانعام: ۱۴۱، الاعراف: ۳۱) قرآن مجید نے یہ بھی کہا کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، فضول خرچی کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اپنے وسائل کو ناجائز کام میں خرچ کیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ جائز کام میں ضرورت سے زائد خرچ کیا جائے، فضول خرچی کی یہ دونوں صورتیں آج ہمارے معاشرے میں

مروج ہیں، بات بات پر چراغاں کرنے اور روشنی کی بارش برسانے کا رواج سا ہو گیا ہے، یہاں تک کہ ہمارا دین —جس کا اصل حسن اس کی سادگی ہے — میں بھی ہم نے ایسی چیزوں کو شامل کرلیا ہے، دعوتوں میں کھانے اتنے زیادہ پکائے جاتے ہیں کہ بہت سارا کھانا پھینکنے میں آجاتا ہے؛ حالاں کہ اسی محلہ میں آپ کے بہت سے ایسے بھائی موجود رہتے ہیں جو لقمہ لقمہ کو ترستے ہیں، ظاہر ہے یہ احسان کے تقاضے کے مغائر ہے۔

اسلام میں شور وغل کو پسند نہیں کیا گیا ہے، اس سے صوتی آلودگی پیدا ہوتی ہے، دماغ اور دل کے مریضوں کو بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے؛ لیکن خود مسلمانوں کی نکاح کی تقریبات کس قدر پُر شور ہوتی ہیں، وہ محتاج اظہار نہیں، اسی طرح ہمارے جلسے اور بعض اوقات ہمارے دینی جلسے رات دیر گئے تک چلتے ہیں اور پوری آبادی کو جگائے رکھتے ہیں، یہ شریعت کا مزاج نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی راحت اور عافیت کا اس قدر لحاظ تھا کہ اگر کچھ لوگ سوئے ہوں اور کچھ بیدار ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی آواز میں سلام فرماتے تھے کہ جو لوگ جاگے ہوئے ہوں وہ سنیں اور جو سو ئے ہوئے ہوں، ان کی نیند خراب نہ ہو، فقہاء نے لکھا ہے کہ نماز میں تلاوت اس طرح کی جائے کہ جماعت میں جو لوگ شریک ہیں وہ سن لیں، اس سے زیادہ بلند آواز نہ ہو؛ لیکن افسوس کہ آج کل قراء ت کے ریکارڈ بھی اس طرح لگائے جاتے ہیں کہ پورے محلے میں اس کی گونج سنی جاسکتی ہے، شاید لوگ محبت واحترام کے جذبہ سے ایسا کرتے ہوں؛ لیکن حقیقت میں یہ قرآن کی بے احترامی ہے نہ کہ احترام؛ کیوں کہ قرآن کا ادب یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو لوگ خاموش ہوں اور قرآن کی طرف متوجہ ہوں؛ لیکن یہاں صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ریکارڈ بجتا رہتا ہے اور لوگ اپنی باتوں میں اور اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔

یہ ساری باتیں اس احسان کے مغائر ہیں، جس کی مسلمانوں کو بار بار تاکید فرمائی گئی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان آج ایک نیک نام گردہ کی بجائے ایک بدنام گروہ کی حیثیت سے زندگی گذار رہے ہیں، مسلمانوں کے محلوں میں غیر مسلم بھائی رہائش اختیار کرنے سے ڈرتے ہیں، غیر مسلم آبادیوں میں مسلمانوں کو جلدی مکان نہیں ملتا، ہماری پہچان ایک ایسی قوم کی ہوگئی ہے جو بات بات پر مشتعل ہوجاتی ہے، جو اپنے مسائل کو حل کرنے میں سنجیدہ طریقہ اختیار کرنے کی بجائے جذبات کی رو میں بہہ

جانے کا مزاج رکھتی ہے، جس کے یہاں صفائی، ستھرائی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، جو حق چھوڑنے کی بجائے دوسروں کا حق غصب کر لینے کی عادی ہے، جس کا رویہ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا، جو رات میں دیر سے سونے کی عادی ہے اور جس کی صبح دن کو دس گیارہ بجے ہوتی ہے۔

خاص کر ان مسلمانوں کو جو کسی خطہ میں اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہیں، اپنے اخلاق و معاملات کو درست کرنے پر خصوصی توجہ دینی چاہئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تلقین کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اللہ نے ہر چیز میں احسان کا یعنی اس کو بہتر طریقہ پر انجام دینے کا حکم دیا ہے کہ ہر کام خوش سلیقگی، شائستگی، مروت و رواداری، حسن اخلاق اور جذبۂ اخلاص کے ساتھ انجام دیا جائے اور دنیا محسوس کرے کہ یہ عام لوگوں سے مختلف اور اخلاقی اعتبار سے بلند ایک داعی امت ہے، جو کائنات کے خالق و مالک سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھتی ہے اور اس کے بندوں سے بھی پیار کرتی ہے۔

❁

کمھلائے ہوئے پھول

(یتیموں کی پرورش)

قرآن مجید میں اللہ تعالی کی جس صفت کا بار بار ذکر کیا گیا ہے، وہ رب ہونا ہے، رب کا ترجمہ فارسی میں ''پروردگار''، ہندی میں ''پالنہار'' اور اردو میں ''پالنے والا'' کیا جاتا ہے، پالنے اور پرورش کرنے سے مراد ہے کسی چیز کو بتدریج پایۂ کمال کو پہنچانا اور مکمل بنانا، جیسے ایک پودا زمین سے اگتا ہے، اسے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے، اس کو دھوپ اور گرمی پہنچانے کا نظم کیا جاتا ہے اور بعض اوقات کھاد بھی دی جاتی ہے، اب تو زراعت کی پوری سائنس وجود میں آچکی ہے؛ چنانچہ بیمار پودوں پر دواؤں کا چھڑکاؤ ہوتا ہے، درختوں کو انجکشن لگائے جاتے ہیں، کیڑوں سے حفاظت کے لئے خصوصی دواؤں کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے، اس طرح بہ تدریج پودے بڑے ہوتے ہیں اور پھل پھول دینے کے لائق ہوتے ہیں۔

انسان اپنی پرورش میں زیادہ محتاج ہوتا ہے، اس کے لئے مخصوص غذا مطلوب ہوتی ہے، لباس و پوشاک کی ضرورت پڑتی ہے، آرام دہ، محفوظ، گرمی و سردی اور بارش سے بچانے والے مکان کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی نشو ونما کی رفتار بھی سست ہوتی ہے، وہ ۱۵، ۱۶/ سال کی عمر ہونے کے بعد بلوغ کو پہنچتا ہے، اس درمیان وہ جسمانی پرورش ہی کا محتاج نہیں ہوتا؛ بلکہ تعلیم و تربیت کا بھی محتاج ہوتا ہے؛ اسی لئے انسان کو ''پالنے والے'' کی احتیاج بہ مقابلہ دوسری مخلوقات کے زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے جیسے پیڑ پودوں کی پرورش کے لئے کاشتکاروں اور باغبانوں کو واسطہ بنایا ہے، اسی طرح انسانوں کی پرورش کے لئے اس کے والدین کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔

والدین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اس کو الفاظ کا پیکر دینا دشوار ہے، باپ کو دیکھئے جو شخص کسی کو دو چار پیسے دینے کا روادار نہیں ہوتا اور جس کو کسی اور کے لئے چند قدم چلنا گوارا نہیں، وہ اپنے بچوں کی پرورش کے لئے کس طرح صبح سے شام تک دوڑ دھوپ میں

لگا رہتا ہے اور پسینہ میں نہا نہا کر اپنے بچوں کو راحت پہنچانے کے لئے کمایا ہوا ایک ایک پیسہ اپنے گھر لاتا ہے، خود معمولی کھانوں پر اکتفا کرتا ہے؛ لیکن بچوں کی خواہش اس سے رد نہیں کی جاتی، خود بوسیدہ اور پھٹے پرانے کپڑوں پر گذارا کر لیتا ہے؛ لیکن بچوں کے چونچلے پورا کئے بغیر اسے چین نہیں آتا، مزاج ایسا تیز ہے کہ کوئی شخص اس کے منہ آنے کی ہمت نہیں کرتا؛ لیکن اپنے بچوں کے ساتھ وہ پیار میں خود بچہ بن جاتا ہے، باپ سے بھی بڑھ کر ماں کی کیفیت ہے، جو شب و روز اپنے نونہال کو سینہ سے چمٹائے رہتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ چاہے اس کی رات آنکھوں میں کٹ جائے؛ لیکن اس کے دل کا ٹکڑا میٹھی نیند سے محروم نہ رہے، اسے اپنے بچوں کی ہلکی سے ہلکی تکلیف بھی تڑپا کر رکھ دیتی ہے، اس کے لئے یہ بات آسان ہوتی ہے کہ غم کا پہاڑ اٹھا لے اور اپنے کرب کے آنسوؤں کا آبشار بہا دے؛ لیکن اس کے جگر گوشوں کی آنکھیں تر نہ ہوں اور انہیں کسی مصیبت سے دوچار نہ ہونا پڑے، بچوں کی ادنیٰ تکلیف بھی اسے برداشت نہیں ہوتی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماں باپ کا وجود اور اولاد کے ساتھ ان کی ممتا اور محبت اس دنیا میں اللہ کی شان ربوبیت کا سب سے بڑا مظہر ہے؛ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی اپنے بندوں سے محبت کو ماں کی اپنی اولاد کے ساتھ محبت کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ خدا کی محبت ستر ماؤں کی محبت سے زیادہ ہے، اسی لئے والدین کے ساتھ سب سے بڑھ کر حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اسی شانِ ربوبیت کے حوالہ سے ماں باپ کے حق میں دعاء سکھائی گئی ہے کہ اے میرے پروردگار! جیسے ان دونوں نے محبت کے ساتھ بچپن میں میری پرورش کی ہے، آپ بھی ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرمایئے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ (الاسراء: ۲۴)۔

ان شفیق والدین میں سے کسی کا سہارا ٹوٹ جائے تو بچوں کی مثال ایسے پھول کی ہو جاتی ہے، جس کو اس کی ٹہنی سے توڑ دیا گیا ہو، ایک کمھلایا ہوا بے جان پھول، جو زندگی کی حرارت اور تر و تازگی سے خالی ہو، مصیبت میں جس کے آنسو پونچھنے والا کوئی ہاتھ موجود نہ ہو، جس کی خوشی ادھوری ہو اور جس کا غم بانٹنے والا موجود نہ ہو، زندگی کی راہ میں جس کی حیثیت ایسے مسافر کی ہو جس کو اپنی منزل بھی معلوم نہ ہو اور جس نے ابھی چلنا بھی نہ سیکھا ہو، ایسے ہی بچے کو اصطلاح میں ''یتیم'' کہتے ہیں، فقہاء نے ''یتیم''، ایسے نابالغ بچہ کو کہا ہے جس کا باپ دنیا سے گذر جائے، تجربہ کی بات یہ ہے کہ اگرچہ باپ کے

گذرنے سے بچے آزمائش سے دوچار ہوجاتے ہیں؛ لیکن ان سے زیادہ برا حال ان بچوں کا ہوتا ہے جو اپنی ماں سے محروم ہوگئے ہوں؛ اس لئے شفقت ومحبت اور رحم وکرم کی جو تعلیم باپ سے محروم بچوں کے لئے ہے، ماں سے محروم بچوں کے لئے بدرجۂ اولی ہوگی، اور جو اجر وفضیلت ان بچوں کے ساتھ حسن سلوک کی ہے، جن پر باپ کا سایہ نہ رہ گیا ہو، وہی اجر یقیناً ان بچوں کے ساتھ حسن سلوک کا بھی ہوگا، جن کے لئے ماں کی گود باقی نہیں رہ گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں پیدا ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد رخصت ہو چکے تھے اور چند ہی سال میں آپ کی والدہ ماجدہ بھی دنیا سے گذر گئیں؛ اس لئے آپ کو اس کسک کا بخوبی احساس تھا، جو ایک یتیم بچے کے دل میں اٹھتی ہے؛ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے ساتھ سب سے زیادہ حسن سلوک کی ترغیب دی اور جن کے حقوق کی طرف بار بار توجہ دلائی، ان میں ایک یتیم بچے بھی ہیں، زمانۂ جاہلیت میں یتیموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بالکل ابتدائی عہد میں جو احکام نازل کئے گئے، ان میں یہ بھی ہے کہ یتیموں کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کرو: ﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ (الضحیٰ:۹) لوگ یتیموں کا مال جیسے تیسے کھا جاتے تھے اور اچھے مال خود لے لیتے تھے، معمولی چیزیں انہیں دے دیتے تھے، قرآن نے اس سے منع کیا: ﴿وَاٰتُوا الْيَـتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾ (النساء:۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمیشہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جو ان کے حق میں مفید ہو کہ یہ نہ صرف ان کے لئے؛ بلکہ تمہارے لئے بھی بہتر ہے: ﴿قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ﴾ (البقرۃ:۲۲۰) اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہوئے ایک ایسی بات فرمائی جو ہر صاحب اولاد کو لرزا دینے کے لئے کافی ہے کہ غور کرو کہ اگر تم اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے اور بے سہارا بچے چھوڑ کر دنیا سے جاؤ تو تمہیں ان نونہالوں کے سلسلہ میں کیسے کیسے اندیشے ہوں گے؟، دوسرے یتیم بچوں کے سلسلہ میں بھی اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو: ﴿وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ﴾ (النساء:۹)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی درمیانی انگلی اور انگشت شہادت کو پھیلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جیسے یہ دو انگلیاں ہیں، جنت میں، میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اسی طرح ہوں گے:

”أنا و كافل اليتيم في الجنة هكذا“ (صحيح البخاري، كتاب الطلاق، باب اللعان، حديث نمبر: ۵۳۰۴، و كتاب الأدب، باب فضل من يعول يتيما، حديث نمبر: ۶۰۰۵) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ جس نے تین یتیموں کی پرورش کی وہ ایسا ہے کہ جیسے وہ رات بھر نماز پڑھتا ہے، دن میں روزہ رہتا ہے اور صبح وشام اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہے اور وہ اور میں جنت میں دو بھائی کی طرح ہوں گے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی آپ سے قربت کو ظاہر کرنے کے لئے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا: ”من عال ثلاثة من الأيتام كان كمن قام ليله و صام نهاره و غدا و راح شاهرا سيفه في سبيل الله و كنت أنا و هو في الجنة أخوين كهاتين أختان“ (سنن ابن ماجة، كتاب الأدب، باب حق اليتيم، حديث نمبر: ۳۸۱۱، عن ابن عباس رضی اللہ عنہ)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسلمان والدین کے یتیم بچے کو کھانے پینے میں اپنے ساتھ شریک رکھے، یہاں تک کہ وہ خود مکتفی ہو جائے، اس کے لئے جنت واجب ہوگئی: ”من ضم يتيما بين أبوين مسلمين إلى طعامه و شرابه حتى يستغني عنه وجبت له الجنة ألبتة“ (مسند أحمد، حديث نمبر: ۱۹۰۴۷، ۱۹۰۵۲، ۲۰۳۴۵، ۲۰۳۴۶) نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں کا بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بہتر سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں کا بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا ہو: ”خير بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يحسن إليه و شر بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يساء إليه“ (سنن ابن ماجة، كتاب الأدب، باب حق اليتيم، حديث نمبر: ۳۸۱۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص کو عذاب نہیں دیں گے، جو یتیم پر رحم کھائے گا، اس کے ساتھ نرم گفتگو کرے گا اور اس کی یتیمی اور بے کسی پر ترس کھائے گا: ”۔۔۔ لا يعذب الله يوم القيامة من رحم اليتيم“ (المعجم الأوسط للطبراني عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ، حديث نمبر: ۸۸۲۸)، ایک صاحب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی سخت دلی کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو، اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو: ”إمسح رأس اليتيم وأطعم المسكين“ (مسند أحمد بن

حنبل، حدیث نمبر:۹۰۰۶،۷۵۶۶)۔

غرض کہ یتیموں کی پرورش اور ان کے ساتھ حسن سلوک آخرت کے عذاب سے نجات کا، جنت کے حاصل ہونے کا، گھر میں برکت کا، قساوت قلبی کے دور ہونے کا اور اللہ کی بے شمار رحمتوں کا ذریعہ ہے اور یقیناً اسی نسبت سے یتیموں کے ساتھ بدسلوکی انسان کے لئے مؤاخذہ کا باعث بھی ہوگی، اسلام کی ان ہی تعلیمات کا اثر تھا کہ عہد نبوت میں کئی جنگیں ہوئیں، بہت سے بچے یتیم ہوئے، عورتیں بیوہ ہوئیں؛ لیکن یتیم بچوں کی پرورش کا کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا، سماج نے ان بچوں کو اپنے اندر اس طرح جذب کرلیا کہ انہیں اپنے باپ یا ماں سے محرومی کا احساس تک نہیں ہو پایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں نے بیوہ عورتوں کے ساتھ اسی نیت سے نکاح کیا کہ ان کے یتیم بچوں کی پرورش ہوجائے اور صرف پرورش ہی نہ ہو؛ بلکہ انہیں باپ کا سایہ بھی حاصل ہوجائے؛ اسی لئے شاید ہی مدینہ کا کوئی گھر تھا، جہاں کوئی یتیم بچہ زیر پرورش نہ ہو۔

مگر افسوس کہ موجودہ دور میں مسلم سماج سے یہ جذبہ رخصت ہوتا جارہا ہے، آج بہت سے مسلمان لاوارث اور یتیم بچے ان سرکاری پرورش گاہوں میں ہیں، یا خدمت خلق کی تنظیموں کے قائم کئے ہوئے اداروں میں ہیں، جہاں ان کا ایمان بھی محفوظ نہیں رہ پاتا، جہاں مسلمان لڑکیوں کو غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے اور مسلمان لڑکوں کی شادی غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ کردی جاتی ہے، اس طرح ان بچوں کی بڑی تعداد ایمان سے محروم اور مسلم سماج سے دور ہوجاتی ہے، ہم لوگوں کو ہمیشہ اپنا بار گناہ دوسروں پر رکھنے کی عادت ہے اور ایسے واقعات سامنے آنے پر ہم حکومت اور رفاہی تنظیموں پر لعنت ملامت کرتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں ہم خود مجرم ہیں، ہم نے ایسے ادارے قائم نہیں کئے جن میں باعزت طور پر بے سہارا بچوں کی پرورش ہو، جو یتیم خانے قائم ہیں، ایک تو یتیم خانہ کا نام ہی بہت تکلیف دہ ہے؛ کیوں کہ اس سے بچوں میں اول دن سے احساس کمتری پیدا ہوجاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو محروم و بے سہارا خیال کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، دوسرے وہاں کا نظم ونسق بچوں کے لئے نہایت اہانت آمیز ہوتا ہے کہ نہ وہاں محبت مل پاتی ہے اور نہ عزت واحترام؛ اس لئے ضرورت ہے کہ اولاً مسلمان اپنے گھروں میں ایسا ماحول بنائیں کہ وہاں یتیم بچوں کی پرورش ہو سکے؛ تاکہ انہیں صرف کھانے، کپڑے ہی نہیں ملیں؛ بلکہ خاندان بھی ملے اور ان کو اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے درمیان

رہنے کا احساس پیدا ہو، دوسرے ایسے ادارے قائم کئے جائیں، جن میں محبت اور پورے احترام کے ساتھ مختلف عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام ہو، ورنہ ہم اپنے بہت سے بچوں کو کھو دیں گے اور یقیناً ہمیں آخرت میں بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شرمسار ہونا پڑے گا۔

بلاتحقیق اظہارخیال — ایک سماجی برائی

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر مختلف صلاحیتیں رکھی ہیں، یہ صلاحیتیں جسم کے مختلف اعضاء پر تقسیم کردی گئی ہیں اور یہ انسان کے لئے معلومات کے حصول کا نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہیں، کان سنتا ہے، آنکھیں دیکھتی ہیں، زبان چکھتی ہے، ہاتھ کے بشمول تقریباً پورے جسم میں کم وبیش یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ چیزوں سے اتصال کے ذریعہ ان کے بارے میں محسوس کرتی ہے اور ناک کے اندر چیزوں کے سونگھنے کی صلاحیت ہے، ان ہی کو فلاسفہ ''حواسِ خمسہ ظاہرہ'' کہتے ہیں، کان کے سوا یہ جتنے اعضاء ہیں، ان کی معلومات براہ راست ہوتی ہے؛ اس لئے عام طور پر ان میں غلطی کا امکان کم ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ انسان مریض یا معذور ہو یا کسی وجہ سے اس کی وہ صلاحیت کمزور پڑ گئی ہو؛ لیکن انسان کی سماعت میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ جیسے زبان میٹھے اور کھارے، ناک خوشبو اور بدبو، آنکھ سیاہ وسفید اور ہاتھ گرم وٹھنڈے میں امتیاز کرلیتے ہیں، وہ سچ اور جھوٹ اور درست ونادرست کے درمیان اپنے آپ فرق کرلے اور نہ ایسا ہے کہ سچی بات کہی جائے تو کان کھلے رہیں اور جھوٹی بات کہی جائے تو کان آپ سے آپ سننا چھوڑ دیں۔

اسی لئے انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب وہ کوئی بات سنے تو پہلے تحقیق کرے اور تحقیق کے بعد اس کے ماننے اور نہ ماننے کا فیصلہ کرے، جیسے ہر زرد چیز سونا نہیں ہوتی اور جیسے ہر پھول خوشبودار نہیں ہوتا، اسی طرح ہر سنی ہوئی بات اس لائق نہیں ہوتی کہ انسان اسے قبول کرلے اور اسے دوسروں تک پہنچانا شروع کردے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ﴾ (الحجرات:۶)

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر معتبر شخص کوئی خبر لائے تو اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ناواقفیت کی وجہ سے تم کسی گروہ کو تکلیف پہنچادو اور

پھر اپنے کئے ہوئے پر شرمسار ہونے کی نوبت آجائے''

معلوم ہوا کہ تحقیق کا پہلا معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ خبر دینے والا کس حد تک بھروسہ کے لائق ہے؟ اگر وہ بھروسہ کے لائق نہ ہو، تب بھی یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کی اطلاع کو بالکل ہی قابلِ توجہ نہ سمجھا جائے؛ کیوں کہ بعض دفعہ جھوٹے بھی سچ بولتے ہیں اور نہ یہ ہونا چاہئے کہ اسے بغیر تحقیق کے قبول کرلیا جائے، قرآن مجید میں ''تبین'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، عربی گرامر کے لحاظ سے اس کے معنی ''مناسب اور معیاری تحقیق'' کے ہیں، اس کے بعد ہی اس خبر کو قبول کرنا چاہئے۔

تحقیق کا دوسرا معیار انسان کی وہ صلاحیتیں ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے معلومات کے حاصل کرنے کے لئے دی ہیں، جیسے ایک شخص ایسی بات کہہ رہا ہے، جو مشاہدہ کے خلاف ہے، تو اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا، —تحقیق کے لئے ایک تیسرا معیار انسان کی عقل بھی ہے، عقل انسان کی ایسی متاع ہے کہ اس کے ذریعہ وہ اَن دیکھی اور اَن سنی یہاں تک کہ اَنجانی چیزوں کے بارے میں بھی رائے قائم کرنے کا اہل ہوجاتا ہے، دوسری مخلوقات کے مقابلہ یہ صلاحیت اس کو امتیازی شان عطا کرتی ہے اور دنیا میں علم وسائنس کی ترقی کے جو مظاہر نظر آتے ہیں، وہ عقل ہی کا کرشمہ ہے، اگر کوئی انسان ایسی بات کہہ رہا ہو، جو عقل کے متواتر تجربہ کے خلاف ہے تو اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا، یہاں تک کہ محدثین نے کسی روایت کے بے اصل ہونے کے جو معیارات مقرر کئے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ مشاہدہ یا عقل کے خلاف ہو۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض دفعہ معتبر لوگوں کے بیان میں بھی غلطی ہوتی ہے، یہ غلطی دانستہ نہیں ہوتی، نادانستہ ہوتی ہے؛ اس لئے بہت سی دفعہ خبر دینے والا فاسق ونامعتبر نہ ہو، تب بھی تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے، خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بعض ایسی مثالیں موجود ہیں کہ منافقین نے ایک خبر پھیلائی، یہ خبر اس قدر دہرائی اور عام کی گئی اور اس کا زیادہ سے زیادہ چرچا کیا گیا کہ سادہ لوح مخلص مسلمان بھی غلط فہمی میں پڑ گئے اور وہ بھی اس خبر کو دہرانے لگے، یہاں تک کہ خود قرآن مجید میں اس کی تردید نازل ہوئی؛ اس لئے نامعتبر شخص کی خبر تو قابل تحقیق ہوتی ہی ہے، بعض اوقات معتبر اور قابلِ بھروسہ لوگوں کی اطلاعات بھی تحقیق طلب ہوتی ہیں۔

جب تک کسی بات کی تحقیق نہ ہوجائے، اس کے بارے میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟

— رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں بھی ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تک تحقیق نہ ہوجائے، اس بات کو دوسروں سے نقل نہ کیا جائے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ انسان کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو نقل کرنے لگے: ''**کفی بالمرء کذبا أن یحدث بکل ما سمع**'' (**صحیح مسلم، المقدمۃ، باب النھي عن الحدیث بکل ما سمع،** حدیث نمبر: ۷)— یہ بڑی اہم ہدایت ہے، افسوس کہ ہمارے معاشرہ میں یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ لوگ سنی سنائی باتیں بلاتحقیق نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور عام لوگ ہی نہیں، اچھے خاصے پڑھے لکھے بہ ظاہر دیندار لوگ بھی اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے؛ بلکہ بعض لوگ تو ڈھال کے طور پر ''دروغ بر گردن راوی'' (جھوٹ کا وبال مجھ سے نقل کرنے والے کی گردن پر) یا ''نقلِ کفر کفر نہ باشد'' (کفر یہ بات کا نقل کرنا کفر نہیں ہے) جیسے فقرے کہہ کر اپنے آپ کو بریٔ الذمہ ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں؛ حالاں کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق جھوٹی بات تو کجا، جس بات کی تحقیق نہ ہو، اس کو نقل کرنا بھی جھوٹ میں شامل ہے۔

سماج میں بہت سے اختلافات، جھگڑے، لوگوں کی بے آبروئی اور ہتکِ عزت اسی طرز عمل کا نتیجہ ہوتی ہے کہ بلاتحقیق سنی سنائی باتوں کو نقل کردیا اور بعض حضرات کو تو نقل کرنے سے تشفی نہیں ہوتی؛ اس لئے وہ اسی کی بنیاد پر اپنے فیصلے بھی فرمادیتے ہیں، یہ آزادروی اس وقت ''کریلا نیم چڑھا'' بن جاتی ہے، جب شریعت کے احکام کے بارے میں بھی لوگ رائے زنی کرنے لگتے ہیں، اسی طرح کا ایک واقعہ ابھی چند دنوں قبل پیش آیا، جس کی گونج ہندوستان سے پاکستان تک سنی گئی، وہ ہے شعیب ملک اور ثانیہ مرزا کے نکاح کا مسئلہ، نکاح زندگی ایک نجی واقعہ ہوتا ہے، مگر ایک تو دو ایسے مرد وعورت کا نکاح جو بہ حیثیت کھلاڑی پوری دنیا میں اپنا ریکارڈ رکھتے ہوں اور شہرت کے اوجِ کمال پر ہوں اور پھر اس میں تیسرے فریق کی مداخلت اور ادعاء، اس نے معاملہ کو ذرائع ابلاغ کے لئے نہایت دلچسپی کا موضوع بنادیا، ان چند دنوں میں حالاں کہ بعض بڑے اہم واقعات پیش آئے؛ لیکن ذرائع ابلاغ کو ان میں وہ لطف نہیں آیا، جو اس سنسنی خیز واقعہ میں آرہا تھا؛ اسی لئے اُن کو وہ اہمیت نہیں دی گئی، جب کہ اس واقعہ کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا کہ گویا اس وقت پوری دنیا کے لئے سب سے اہم مسئلہ یہی ہے اور اس کے نتیجہ سے ساری انسانیت کی فلاح یا نقصان متعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کا یہ

غیر تعمیری، نامعقول اور سستی مقبولیت کے حصول کی کوشش صحافت کے ساتھ کھلواڑ ہے۔

اس معاملہ میں جو نزاع پیدا ہوئی، اسی میں سچائی کیا ہے؟ یہ ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے؛ لیکن سیاسی لیڈروں سے لے کر مذہبی قائدین تک مختلف شخصیتوں نے اس بے تحقیق معاملہ پر اظہار رائے میں بڑی فیاضی سے کام لیا، یہاں تک کہ جن لوگوں کو اسلامی شریعت کے بارے میں کچھ پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا، یا ان کی معلومات نہایت ابتدائی درجہ کی ہیں، انہوں نے بھی خالص شرعی مسائل کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے میں قطعاً تکلف سے کام نہیں لیا، ٹی وی پر بھی اور اخبارات میں بھی۔

ایسے موقعہ پر صحیح رویہ یہ ہے کہ لوگ کہہ دیں کہ یہ ایک نجی مسئلہ ہے، جو لوگ اس معاملہ سے متعلق ہیں، انہیں اس کے بارے میں شریعت کے علماء سے فتویٰ حاصل کر لینا چاہئے اور اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے، اگر ملت کے نمائندہ حضرات اس طرح اپنی بات کہہ دیتے تو ذرائع ابلاغ کے لئے خواہ مخواہ اس موضوع کو پھیلانے کی نوبت ہی نہیں آتی، راقم الحروف سے متعدد انگریزی اخبارات اور الکٹرانک میڈیا کے لوگوں نے خواہش کی کہ میں اس پر اظہار خیال کروں؛ لیکن میں نے سبھوں سے ایک ہی بات کہی کہ متضاد دعوے ہیں اور میں حقیقی واقعات سے واقف نہیں ہوں؛ اس لئے جب تک فریقین سے میں خود صورتِ حال کو سن نہ لوں، میں اس پر کوئی اظہارِ خیال کرنا نہیں چاہتا، نیز ویسے بھی یہ ایک نجی مسئلہ ہے، خواہ مخواہ لوگوں کو دوسروں کے گھروں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

ایک رجحان ہمارے یہاں یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ خواہ کوئی بھی مسئلہ ہو، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کو اس پر اظہار خیال کرنا چاہئے؛ بلکہ آگے بڑھ کر اس کو حل کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہئے؛ حالاں کہ بورڈ کا مقصد مختلف افراد کے باہمی نزاعات کو طے کرنا نہیں، اس کے لئے دارالقضاء اور شرعی پنچایت کا نظام موجود ہے، بورڈ کا بنیادی کام حکومت اور عدالتوں کی جانب سے قانونِ شریعت میں مداخلتوں کو روکنا ہے، امت کے دوسرے مسائل اس کے دائرہ کار سے باہر ہیں اور ان کو حل کرنے کے لئے بہت سی ملی تنظیمیں موجود ہیں، اگر بورڈ ہر کام کو اپنے ہاتھ میں لینے لگے تو ملتِ اسلامیہ کے اس واحد متحدہ پلیٹ فارم کا شیرازہ بھی بکھر کر رہ جائے گا؛ اس لئے نہ بورڈ کے لئے ایسے مسائل میں دخل دینا مناسب ہے، نہ یہ اس کی پالیسی ہے اور نہ لوگوں کو اس کی امید رکھنی چاہئے۔

اس دوران ٹیلیفون پر نکاح کا مسئلہ زیر بحث بھی آ گیا، بعض حضرات نے کہا کہ فون پر نکاح

ہوجاتا ہے، بعض نے کہا کہ نکاح منعقد نہیں ہوتا، بعض حضرات کی طرف منسوب یہ بیان بھی آیا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ فون پر نکاح کو روکنے کی کوشش کرے گا، یہ ساری باتیں وہ ہیں، جو تحقیق کے بغیر کہی گئی ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ علماء اس مسئلہ سے ناواقف یا بے خبر ہیں، نکاح ایک فریق کی پیشکش اور دوسرے فریق کے قبول کرنے سے منعقد ہوتا ہے، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں ''ایجاب وقبول'' کہتے ہیں، فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ایک ہی مجلس میں ایجاب وقبول کا ہونا اور اسی مجلس میں دو گواہوں کا اس کو سننا ضروری ہے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ فون پر ایجاب وقبول معتبر نہیں؛ کیوں کہ اس صورت میں ایجاب کرنے والے، قبول کرنے والے اور ایجاب وقبول کو سننے والے گواہوں کی ایک مجلس نہیں ہو پائے گی، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے تیرھویں سیمینار منعقدہ ملیح آباد (لکھنؤ) میں ملک بھر کے علماء اور ارباب افتاء کے اتفاق رائے سے یہی بات طے کی ہے۔

لیکن اس بات کی گنجائش ہے کہ ایک شخص فون یا انٹرنیٹ یا خط یا کسی اور ذریعہ سے دوسرے شخص کو اپنے نکاح کا وکیل بنائے، وکیل اس کی طرف سے نکاح کا ایجاب کرے یا قبول کرے، نیز اس وقت دو گواہان موجود ہوں تو اس طرح نکاح منعقد ہوجائے گا، اس کی مثال خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں موجود ہے، رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو اس وقت وہ حبشہ میں تھیں، آپ ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو دو گرامی نامے لکھے اور انہیں عمرو بن امیہ کے ہاتھ بھیجا، ایک گرامی نامہ میں ان کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور دوسرے گرامی نامہ میں انہیں آپ ﷺ نے نکاح کا وکیل بنایا تھا؛ چنانچہ نجاشی نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا آپ ﷺ سے نکاح کردیا، ایک گراں قدر مہر مقرر کیا اور آپ ﷺ کی طرف سے ان کا مہر بھی ادا کردیا، امام ابوحنیفہؒ کے ممتاز شاگرد امام محمد نے اسی واقعہ سے غائبانہ نکاح پر استدلال کیا ہے۔ (دیکھئے: المحیط البرہانی: ۴/ ۸۳، کتاب النکاح، فصل: ۱۲)۔

غرض کہ ایسے واقعات میں خواہ مخواہ اظہار خیال اور اٹکل پر رائے دینے سے بچنا چاہئے اور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ذرائع ابلاغ ایسے مسائل کو مسلمانوں کی بے آبروئی، مسلم سماج کی غلط تصویر کشی اور امت اسلامیہ کی تذلیل ورسوائی کا ذریعہ نہ بنالیں۔

خرچ کرنا کمانے سے بڑا فن

عام طور پر لوگ معاشی قوت کا راز اس بات کو سمجھتے ہیں کہ آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو اور اسے دس ہزار کے پندرہ ہزار ملنے لگیں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ معیشت کے استحکام کا تعلق آمدنی سے بھی ہے اور خرچ سے بھی؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کمانے سے زیادہ مشکل اور اہم خرچ کرنے کا فن ہے، اگر انسان اپنی زندگی کا ایک نظام بنائے اور خرچ میں اپنے آپ کو اس کا پابند رکھے، تو نسبتاً کم آمدنی کے ساتھ بھی وہ اپنے سے زیادہ کمانے والوں کے مقابلہ خوشگوار اور خوش حال زندگی گذار سکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن اُمور میں پیسے خرچ کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے، اس کے چار حصے کرے: بہت ضروری، ضروری، نہ ضروری اور نہ غیر ضروری، غیر ضروری، غور کیا جائے تو انسان ان چاروں مدات سے گذرتا ہے، ''بہت ضروری مصارف'' کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، جیسے کھانے پینے کی اتنی مقدار جو آدمی کی بقا کے لئے ضروری ہے، سادگی کے ساتھ علاج ومعالجہ، بچوں کی کفایت کے ساتھ تعلیم، فضول خرچی سے بچتے ہوئے شادی بیاہ، یہ انتہائی ضروری اخراجات ہیں، ''ضروری مصارف'' میں مناسب اور طبیعت کے لئے موزوں کھانے پینے کا نظم، بہ قدرِ ضرورت سواری، سہولت بخش علاج، سماجی مزاج سے ہم آہنگ بہ قدرِ ضرورت کپڑے وغیرہ داخل ہیں، ان کو فقہ اسلامی کی اصطلاح میں ''حاجت'' کہتے ہیں، تیسرا درجہ ایسی چیزوں کا ہے جو ضروری نہیں؛ لیکن انسان مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سہولت کے لئے ان کا طالب ہوتا ہے: جیسے آرام دہ سواری، ایک حد تک راحت بخش علاج وغیرہ، یہ ضریات نہیں ہیں، البتہ ''جائز خواہشات'' ہیں اور فقہ اسلامی کے ماہرین کی زبان میں ''تحسینات'' ہیں، چوتھا درجہ ایسی چیزوں کا ہے، جو بالکل غیر ضروری اور فضول ہیں، جیسے مکانات میں حد سے زیادہ تزئین وآرائش، کپڑوں میں بہت قیمتی ملبوسات کا انبار، کھانے پینے میں ایسی فضول خرچی کہ دس آدمی کے کھانے کی جگہ بیس آدمی کا کھانا پک جائے، آدھا استعمال ہو اور آدھا ضائع ہو، شادی بیاہ میں ہزاروں روپے کارڈ کی طباعت پر خرچ کر دینا، شادی خانہ کی بہت زیادہ آرائش، دعوت میں کئی طرح کے میٹھے، سواریوں میں ضرورت ایک گاڑی سے

پوری ہوجاتی ہے؛لیکن کئی کئی گاڑیوں کا رکھنااور جب کسی نئے ماڈل کی گاڑی آئے تو بلاضرورت جدید سے جدید تر کا شوق فرمانا، یہ سب فضول خرچی اوراسراف کے دائرہ میں آتا ہے۔

جو چیزیں بہت ضروری ہیں، ان میں کمی نہیں کی جاسکتی، جو چیزیں ضروری ہیں، زندگی میں سادگی اپنا کراوراپنے آپ کوسادہ زندگی کا عادی بنا کراس میں بھی کسی قدرکمی کی جاسکتی ہے، تیسرے درجہ میں جو چیزیں ہیں، ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، زیادہ تر حرص وہوس اورخواہشات کالامتناہی سلسلہ آدمی کو نت نئی آسانیوں کا قیدی بنالیتا ہےاور یہ آسانیاں انسان کواسراف اورفضول خرچی کی طرف لے جاتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اپنے لئے سادہ زندگی کو پسندفرمایااور مسلمانوں کواسی کی ترغیب بھی دی، آپ ﷺ کا مکان، آپ ﷺ کا لباس، کھانا پینا، بستر، رہن سہن، غرض پوری زندگی سادگی اور کفایت شعاری کانمونہ تھی، خوب سے خوب تر کی خواہش بھی ایک بیماری ہے، بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، قرض خواہوں سے چھپے پھرتے ہیں، صبح وشام قرض خواہ دروازہ پر دستک دیتا ہے، تقاضہ کرتا ہے، صلواتیں سناتا ہے، سرراہ بے آبرو کرتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی نئی چیز بازار میں آگئی، تو باوجود اس قرض کے وہ اس کے لئے بے قرار سا ہوجاتا ہے، چاہے اس سے اس کے قرض میں کتنا بھی اضافہ ہوجائے؟ گویا یہ ایک نشہ ہے، جواپنے مخمور کوہوش کے ناخن نہیں لینے دیتا۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ دنیا ضروریات پوری کرنے کی جگہ ہے اور آخرت خواہشات کی تکمیل کی جگہ، آخرت اسی لئے بنائی گئی ہے، کہ جنت میں جانے کے بعد جنتی جو چاہے وہ بھرپور طریقہ پر اور فوراً اسے مہیا کردی جائے: ﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ ﴾ (حم السجدہ: ۳۱) دنیا خواہشات کی تکمیل کی جگہ نہیں ہے؛ بلکہ ضروریات پر اکتفا کرنے کی جگہ ہے، یہاں انسان کا اپنی خواہشات کا غلام بن جانا منزل کو بھول کر راستہ کومقصد بنا لینے کے مترادف ہے؛ لیکن افسوس کہ انسان اسی کیفیت میں مبتلا ہے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے خوب فرمایا کہ: قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں جو انسان کے پیٹ کو بھر سکے، انسان کو چاہئے کہ اپنی زندگی کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لےاور دیکھے کہ وہ کہاں ضروریات کی حد سے آگے بڑھ کر خواہشات کے دام میں گرفتار ہو چکا ہےاور اپنی زندگی میں سادگی لانے کی کوشش کرے، آپ سادہ زندگی گذار کر اپنے سماج میں زیادہ باعزت رہ سکتے ہیں اور اپنے آپ کو پُرسکون بھی رکھ سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کے پاس عمدہ سواری نہ رہے، آپ کے گھر میں دیدہ زیب فرنیچر نہ ہو؛ لیکن آپ کے دراوزہ پر کوئی قرض وصول کرنے والا دستک نہ دے رہا ہو اور نہ کوئی آپ کے نادہندہ ہونے کی شکایت کرنے والا ہو، تو آپ باعزت طریقہ پر سماج میں زندگی گذار سکیں گے اور آپ ذہنی تناؤ کی کیفیت سے محفوظ رہیں گے، یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔

اخراجات کا وہ طریقہ جسے میں نے ''غیر ضروری اور فضول'' سے تعبیر کیا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے گناہ اور ناجائز ہے، قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مواقع پر فضول خرچی کی ممانعت کی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اسراف نہ کرو کہ: اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے: ﴿وَ لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (الانعام: ۱۴۱) ایک اور موقع پر فضول خرچی سے روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں: ﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ﴾ (الاسراء: ۲۷) فضول خرچی دو طریقوں پر ہوتی ہے، ایک یہ کہ بے جا مصرف میں پیسے خرچ کئے جائیں، جیسے ضرورت سے زیادہ روشنی میں، آتش بازی میں، گانے بجانے میں، دکھاوے کے اظہار اور زیادہ تشہیر میں، حد یہ ہے کہ بعض لوگ حج کے لئے جانے اور آنے کے موقع سے بھی کثیر رقم خرچ کر کے اخبارات میں مصور اشتہار طبع کراتے ہیں، یہ سب بے محل خرچ ہیں، جو شرعاً جائز نہیں، بے محل خرچ کرنے کو قرآن نے ''تبذیر'' سے تعبیر کیا ہے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ تبذیر ناحق اُمور میں خرچ کرنے کا نام ہے: ''**الانفاق فی غیر حق**'' (تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۳۶) فضول خرچی کی دوسری صورت یہ ہے کہ جن چیزوں میں خرچ کرنا چاہئے، انھیں میں خرچ کیا جائے؛ لیکن ضرورت سے زیادہ، جیسے: کھانا ایک غیر ضروری چیز ہے؛ لیکن اسی میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے، لباس و پوشاک دین میں مطلوب ہے؛ لیکن اسی میں تفاخر آمیز کپڑے بنانا اور ایک جوڑے کی جگہ دس جوڑے کا اہتمام کرنا فضول خرچی ہے اور اسی کو قرآن نے ''اسراف'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اسلام فضول خرچی کو نہایت ناپسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس نے ہر باب میں فضول خرچی کو منع کیا ہے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دنیا میں جو جتنا زیادہ آسودہ ہو کر کھاتا ہوگا، قیامت کے دن وہ اسی قدر بھوکا ہوگا: ''**ان اکثر الناس شبعا فی الدنیا اطولھم جوعا یوم القیامة**'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۳۹۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو کچھ طبیعت چاہے اسے کھا

گذرنا اسراف ہی کی ایک صورت ہے: ''ان من السرف ان تاکل کل ما اشتھیت''۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۳۹۵)

آپ ﷺ نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا کہ کھاتے ہوئے اگر کوئی لقمہ ہاتھوں سے گر جائے، تو اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے، معمولِ مبارک تھا کہ اگر کوئی ٹکڑا گر جاتا تو اسے اٹھاتے، پونچھتے، پھر اسے تناول فرماتے، (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۳۹۶) لباس و پوشاک میں بھی آپ ﷺ نے اعتدال اور میانہ روی کی تلقین فرمائی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے شہرت اور دکھاوے کا لباس پہنا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت ورسوائی کا لباس پہنائیں گے، (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۶۵۳) ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کھاؤ، پیو، صدقہ کرو اور پہنو؛ البتہ فضول خرچی نہ ہو اور تکبر نہ ہو، (ان ماجہ، حدیث نمبر: ۳۶۵۰) اسی لئے آپ ﷺ نے بسیار خوری کو بھی بہت ناپسند فرمایا ہے۔

نہ صرف کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا؛ بلکہ دینی امور میں بھی آپ ﷺ نے فضول خرچی کو پسند نہیں فرمایا، ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی نے ایک دن پانچ سو کھجور کے درختوں کے پھل کاٹے اور اسی دن پورے تقسیم کر دیئے، اہل وعیال کے لئے کچھ نہیں رکھا، تو آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور اسی موقع سے حکمِ ربانی نازل ہوا: ''و لا تسرفوا'' (الجامع لاحکام القرآن: ۷/ ۱۱۰) یہاں تک کہ آپ وضو اور غسل میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال نہیں فرماتے، غسل ایک ''صاع'' پانی سے کرتے، جو تین لیٹر سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور اس کے چوتھائی پانی سے وضو فرماتے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نہر کے پاس ہو جب بھی وضو میں ضرورت سے زیادہ پانی کے استعمال سے گریز کرے اور ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے نہر کے پاس برتن میں پانی لے کر وضو فرمایا اور جو پانی بچ رہا اسے دوبارہ نہر میں ڈال دیا۔ (مجمع الزوائد: ۱/ ۲۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اسراف اور فضول خرچی نے ہمارے سماج کو ایک ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے جس کی سزا معاشرہ کا ہر شخص بھگت رہا ہے؛ کیوں کہ جب کسی معاشرہ میں فضول خرچی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، تو لوگ خواہی نہ خواہی اس معیار کو پورا کرنا چاہتے ہیں، چاہے اس کے لئے کتنی بھی مشقت اٹھانی پڑے، فضول خرچی جہاں ایک شخصی مرض ہے، وہیں ایک قومی مرض بھی ہے، غور فرمایئے کہ اس وقت

ہندوستان کے ذریعۂ آمدنی میں سب سے بڑا ذریعہ قرض ہے، ملک کی مجموعی آمدنی کا پچیس فیصد قرض سے حاصل ہوتا ہے اوراخراجات کی سب سے بڑی مد بیرونی سود کی ادائیگی ہے، کہ کل بجٹ کا ستائیس فیصد صرف بیرونی سود کی ادائیگی پر خرچ کیا جاتا ہے، عالمی مالیاتی بینک کی رپورٹ کے مطابق اس وقت ہر ہندوستانی بچہ جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، وہ دس ہزار روپے کا مقروض ہوتا ہے، ان بڑھتے ہوئے اخراجات کی سب سے بڑی وجہ سرکاری اخراجات میں بڑھتا ہوا اضافہ ہے، ۱۹۹۸ء-۱۹۹۹ء میں قریب ستائیس لاکھ کروڑ روپے صرف ہندوستانی حکمرانوں کے اخراجات ہیں، ۱۹۹۷ء میں مرکزی انتظامیہ کی تنخواہ اورالاونس کی مد میں تقریباً پینتالیس ہزار کروڑ کا اضافہ ہوا اور ۱۹۹۹ء میں یہ اضافہ کئی چند ہو چکا ہے۔

اسی طرح الیکشن کا معاملہ ہے: تیرہویں لوک سبھا کے انتخاب میں الیکشن کمیشن کا اندازہ ہے کہ ایک ہزار کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور سیاسی پارٹیاں بھی اتنی ہی مقدار میں سفید سرمایہ (White Money) خرچ کریں گی؛ لیکن مبصرین کا اندازہ ہے کہ اُمیدواروں کی طرف سے جائز و ناجائز رقم ملا کر پچاس ہزار کروڑ سے کم اخراجات نہ ہوں گے، اس طرح اندازہ کیجئے کہ ہمارے ملک کی مقنّنہ کے بننے میں اور پھر مقننہ کی شاہ خرچی میں قوم کا کتنا کثیر سرمایہ ضائع ہو رہا ہے؟ یہ قومی فضول خرچی کا ایک کھلا ہوا اور سادہ سا حساب ہے، سرکار تو جو فضول خرچی کرتی ہے، وہ کرتی ہی ہے، نجی کئی کمپنیوں کا حال بھی اس سے کچھ کم بُرا نہیں، مثلاً ورلڈ کپ ۱۹۹۹ء میں ملک کی مختلف کمپنیوں نے اس کرکٹ میچ کے اشتہار اور اس اشتہار کے پسِ پردہ اپنی تشہیر پر نوسو کروڑ روپے خرچ کئے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صرف شخصی اور انفرادی بلکہ قومی اور اجتماعی سطح پر بھی فضول خرچی کی بیماری کس قدر روز افزوں ہے؟ ایک ایسا ملک جو تعلیم اور صحت جیسی اہم ضروریات پر اپنے بجٹ کا دس فیصد بھی خرچ کرنے کے موقف میں نہ ہو اور ایک ایسا ملک جس میں کروڑوں انسان خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرتے ہوں، ہزاروں افراد کے پاس سر چھپانے کے لئے جگہ نہ ہو، ایک وقت کھانے کے بعد دوسرے وقت کھانے کا انتظام نہ ہو اور جو قوم اپنے ہزاروں کم عمر اور معصوم بچوں کو ہوٹلوں میں برتن دُھونے اور اس طرح اپنی روزی کمانے پر مجبور ہو، کیا اُسے یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پانی؛ بلکہ گندے اور آلودہ پانی کی طرح پیسے بہائیں؟؟

تمباکونوشی — ایک مہلک بیماری

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اصل میں انسان ہی کے نفع کے لئے ہے، بشرطیکہ انسان اس کا صحیح استعمال کرے، دنیا میں یقیناً ایسی چیزیں بھی ہیں کہ غلط طریقہ پر ان کا استعمال طرح طرح کی بیماریوں کا سبب اور ہلاکت کا باعث بھی ہوسکتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی ہے اور تجربات سے فائدہ اُٹھانے کا شعور بخشا ہے، اس سے بڑھ کر ناسمجھی کی کوئی اور بات نہیں ہوسکتی کہ انسان ایک شئے کے نقصان کو جانتے اور سمجھتے ہوئے پھر اسی کو استعمال کرتا جائے اور اپنی گاڑھی کمائی ایک ایسی چیز پر خرچ کرے جو خود اس کو نقصان پہنچانے والی ہو۔

لیکن عجیب بات ہے کہ عملاً صورتِ حال یہی ہے کہ محنت ومشقت سے حاصل کی ہوئی دولت کا اچھا خاصا حصہ ہماری سوسائٹی میں بہت سے لوگ اسی طرح ضائع کرتے ہیں اور قیمتاً مہلک بیماریاں خریدکرتے ہیں، تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ صرف جاہل وناخواندہ عوام ہی اس میں مبتلا نہیں ہیں؛ بلکہ پڑھے لکھے اصحابِ ذوق وادب اور اربابِ فکر ودانش بھی اس نادانشمندانہ عمل میں برابر کے شریک ہیں — آپ کے لئے یقیناً یہ بات باعثِ حیرت ہوگی کہ آخر وہ کیا بیماری ہے جو مہلک اور تکلیف دہ بھی ہے؛ لیکن پیسے دے کر خرید کی جاتی ہے اور پڑھے لکھے سمجھ دار لوگ بھی اسے خرید کرتے ہیں؛ لیکن آپ حیرت زدہ نہ ہوں، یہ ایک واقعہ ہے اور آپ کو اپنے گرد وپیش، دوست احباب میں ہی اس کی کتنی ہی مثالیں مل جائیں گے!

یہ بیماری ہے ''تمباکو کا استعمال''، خواہ آپ پان کے ساتھ زردہ کے نام سے استعمال کریں، یا بیڑی اور سگریٹ کی صورت میں، آپ اپنے سینہ کو بھٹی بنالیں یا آپ نسوار کی شکل میں ناک میں اس کا استعمال کریں یا دانت میں مَل کر تسکین خاطر کا سامان کریں، یہ تمام صورتیں دراصل بیماریاں ہیں اور ایسی بیماریوں کا پیش خیمہ ہیں جو انسان کو شدید قسم کے آلام میں مبتلا کرتی ہیں اور بالآخر زندگی کی نعمت سے محروم کردیتی ہیں۔

یہ بلامشرقی ممالک میں غالباً مغربی ممالک ہی سے درآمد ہوئی ہے، علامہ طحطاوی نے شیخ نجم غزی شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ دمشق میں پہلی دفعہ ۱۰۱۵ھ میں اس کا ظہور ہوا، (طحطاوی علی المراقی: ۳۶۴) اسی کے آگے پیچھے ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں تمباکو کی آمد ہوئی، ہندوستان میں گو تمباکو بہت پہلے سے موجود رہا ہے؛ لیکن مسلم عہدِ حکومت میں اکبر کے دور میں حقوں کی صورت تمباکو نوشی کے رواج میں اضافہ ہوا، بعض محققین کا خیال ہے کہ تمباکو کا ورود اولاً جنوبی ہند ہی کے علاقہ میں ہوا ہے؛ چنانچہ حکیم محمد عبداللہ رقمطراز ہیں:

> تمباکو ابتداء میں جنوبی ہند کی طرف سے آیا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اہل فرنگ ہند میں اسی جانب سے وارد ہوئے تھے، امریکہ کا جنگلی تمباکو آج کل بھی ممبئی ہڑاونکور اور لنکا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، مآثر رحیمی میں مرقوم ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا اور وہاں سے اکبر کے زمانہ میں شمال مشرقی ہند میں پہنچا۔ (خواص تمباکو: ۱۴-۱۳)

تمباکو اور سگریٹ کے نقصانات اب کوئی ایسی چیز نہیں رہی جو محتاجِ بیان ہو، اب اس کے نقصانات مسلّمات میں سے ہیں، یوں تو یہ انسان کے پورے وجود کے لئے مضرت رساں ہے؛ لیکن خاص کر پھیپھڑے کے لئے سم قاتل ہے، برطانیہ میں ۱۹۵۷ء میں ایک طبی بورڈ مقرر کیا گیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اکثر اموات کا سبب پھیپھڑے کا کینسر ہے اور یہ تمباکو کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے، ۱۹۶۲ء رپورٹ کے بموجب برطانیہ میں ایک سال میں ۲۳ ہزار انسان کی موت صرف پھیپھڑے کے کینسر سے ہوئی جس کا سبب سگریٹ کا استعمال تھا اس کے علاوہ منھ اور حلق کا کینسر اور دل کی بیماریاں تمباکو کے استعمال کی رہین منت ہیں، تازہ امریکی تحقیق کے مطابق تمباکو میں شامل جزء ''پائرین''، تمباکو نوشی کے ''جین'' کو کمزور کر کے کینسر کے جراثیم سے لڑنے کی جسمانی صلاحیت کو کمزور کردیتا ہے، انسانی جسم میں اگر ''جین، پی، '' 53 صحت مند ہو تو وہ کینسر کے مقابلہ قوت مدافعت فراہم کرتا ہے اور یہی جین تمباکو نوشی سے اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے، حالیہ تحقیق کے مطابق امریکہ میں کینسر سے جو افراد موت کا شکار ہوتے ہیں، ان میں سے دو تہائی افراد کی تمباکو نوشی، موٹاپا، بسیار خوری اور کاہلی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ (روزنامہ منصف ۱۴؍جولائی، سائنس ٹکنالوجی ایڈیشن)

سگریٹ میں جو نکوٹین پائی جاتی ہے، خون پر اس کے سخت مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں تمباکو

کا اثر انسان کی قوتِ ہضم پر بھی پڑتا ہے، آج کل تمباکو خوری کی جونئی صورتیں وجود میں آئی ہیں جس میں سب سے کثیر الاستعمال ''گٹکا'' ہے، یہ تو اور بھی زیادہ مضرت رساں ہے، اس سے مسوڑھوں اور منھ کے باہری حصہ کا کینسر ہوتا ہے اور گٹکا خوری کی وجہ سے کینسر پیدا ہونے کا تناسب تشویش ناک حد تک بہت زیادہ ہے؛ اسی لئے ہمارے ملک اور دنیا کے متعدد ملکوں میں سگریٹ کے پیکٹ پر قانوناً اس جملہ کے لکھنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ''سگریٹ پینا صحت کے لئے نقصان دہ ہے'' اور اب ہمارے ملک میں تمباکو خوری اور تمباکو نوشی کو روکنے کے لئے بعض اور تدابیر کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تمباکو نوشی کو عام طور پر ناپسند کیا گیا ہے، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی تمباکو نوشی کی ممانعت وارد ہوئی ہے ''براہما پُران'' ہندو پرانوں میں سے ایک ہے، اس میں یہاں تک مذکور ہے کہ تمباکو نوشی کرنے والا گو براہمن ہو ''دان'' (عطیہ) دیتا ہو پھر بھی وہ نرک (جہنم) ہی میں جائے گا، ''اسکند پران'' میں ہے کہ ''براہمن، چھتری اور ویش جو تمباکو پیتے ہیں وہ چنڈال کی طرح ہیں''، یاگیہ ولکیہ سمرتی میں آٹھ قسم کی منشیات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ایک تمباکو بھی ہے، سکھوں کے دسویں گرو گوند سنگھ جی نے اپنے پیروؤں پر تمباکو کے استعمال کو ممنوع قرار دیا تھا، (ہدایت، شمارہ: ۷، ۸، جے پور: ۳۲) اسی لئے گردواروں میں تمباکو رکھنے کو بھی سخت خلاف احترام سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو عرب میں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تمباکو غالباً نہیں پایا جاتا تھا، گو بعض روایات میں تمباکو کی مذمّت وارد ہوئی ہے؛ لیکن یہ روایات حد درجہ ضعیف اور نا معتبر ہیں، مگر اسلام کی اصولی تعلیمات سے تمباکو کا حکم جانا جاسکتا ہے، اسلام نے بنیادی طور پر تمام نباتات کو حلال رکھا ہے، سوائے ان نباتات کے جو نشہ آور ہوں، مہلک ہوں یا صحت جسمانی کے لئے ضرر رساں ہوں اور ظاہر ہے کہ تمباکو کا جسم انسانی کے لئے مضر ہونا ایک مسلمہ اور متفقہ حقیقت ہے، نیز رسول اللہ ﷺ نے ہر ''مسکر'' اور ''مفتر'' شئ سے منع فرمایا ہے: ''**نھی عن کل مسکر و مفتر**'' (ابوداؤد، باب ما جاء فی السکر) مسکر سے مراد نشہ آور اشیاء ہے اور مفتر کا لفظ ''فتور'' سے ماخوذ ہے، فتور کے معنی کمزوری اور گراوٹ کے ہیں، علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: ''**ضعف و انکسار**'' (نہایہ: ۳ / ۴۰۸) پس ''مفتر'' کا لفظ ہر ایسی چیز کو شامل ہے جو انسانی جسم اور صحت کو کمزوری سے دو چار کرتا ہو، اسی لئے علامہ محمد عبدالرؤف مناوی نے ''حشیش'' کو بھی مفتر اشیاء میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ زین الدین

عراقی نے بھی اسی حدیث سے ''حشیش'' کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے، (دیکھئے: فیض القدیر: ۶/ ۳۳۸) اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مفتر اشیاء میں تمبا کو بھی شامل ہے۔

تمبا کو کے احکام کی بابت فقہاء اسلام کے درمیان اختلاف رائے ہے، بعض حضرات نے اس کی مضرتوں کی وجہ سے اسے بالکل ہی حرام قرار دیا ہے، بعض حضرات نے بالکل ہی جائز اور مباح؛ کیوں کہ چیزوں میں اصل مباح ہونا ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک یہ مکروہ ہے، فقہاء شوافع میں علامہ نجم غزی اس کو حرام قرار دیتے ہیں، (طحطاوی: ۳۶۴) اور طحطاوی ہی نے بعض فقہاء حنفیہ سے اس کی کراہت نقل کی ہے، ہندوستان میں ماضی قریب کے اہل علم زیادہ تر اس کے جواز کے قائل ہیں؛ البتہ اس کو خلاف اولیٰ سمجھتے ہیں اور مسجد جاتے وقت منھ صاف کر کے جانے کی تلقین کرتے ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہی، (فتاویٰ رشیدیہ: ۴۸۱) مولانا اشرف علی تھانوی (امداد الفتاویٰ: ۴/ ۱۱۴) اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی (فتاویٰ رضویہ: ۱۱/ ۴۵) اوران سے پہلے کے اہل علم میں مولانا عبدالحئ فرنگی محلی (مجموعہ الفتاویٰ: ۱/ ۲۲۹) کے فتاویٰ ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں؛ لیکن عرب علماء کا عام رجحان اس کے ناجائز ہونے کی طرف ہے، شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد ابراہیم آل شیخ کے فتاویٰ اس سلسلہ میں بار بار سعودی عرب سے طبع ہو چکے ہیں، شیخ محمد ابراہیم کا فتویٰ بہت تفصیلی ہے اور انھوں نے حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ چاروں دبستانِ فقہ کے اہل افتاء کے فتاویٰ اس کی حرمت وممانعت پر نقل کئے ہیں، یہی رائے علماء ہند میں مولانا عبدالرحمان مبارکپوری کی ہے، (تحفۃ الاحوذی: ۳/ ۴۴) فقہی نقطۂ نظر سے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ تمبا کو کا استعمال مکروہ ہے اور طبّی اعتبار سے تمبا کو کے استعمال کی جو صورت جتنی زیادہ مضرت رساں ہو، اس میں اسی قدر شدت کے ساتھ کراہت پائی جائے گی، ایسا لگتا ہے کہ ہمارے علماء ہند تک اس کے نقصانات اور مضرتوں کی تفصیلات پہنچ نہیں پائی تھیں، انھوں نے تمبا کو کے صرف ظاہری اور وقتی اثرات پر نگاہ رکھی اور اس کے اندرونی اور مستقل مضرتوں اور ہلاکت خیزیوں کے بارے میں ان کو کما حقہ علم نہیں ہو پایا، آج کل جو طبی تحقیقات سامنے آرہی ہیں، اگر یہ ان کے سامنے موجود ہوتیں تو یقیناً ان کا رجحان اس بارے میں زیادہ شدید ہوتا۔

تمبا کو نوشی کے نقصانات عالم اسلام میں جب کبھی بھی سامنے آئیں اس کو روکنے کی بھرپور تدابیر کی گئیں، ۱۰۳۲ھ میں سلطان احمد اول نے تمبا کو کی تمام دکانیں بند کرنے کا حکم دیا، سلطان مراد

چہارم کے بارے میں تو منقول ہے کہ وہ تمبا کونوشی کرنے والوں کے دونوں ہونٹ اورنسوار استعمال کرنے والے کی ناک کٹوا دیتا تھا، شریف مکہ سعود بن سعود نے ۱۱۴۶ھ میں برسرِ عام قہوہ خانوں اور بازاروں میں تمبا کونوشی کی ممانعت کا فرمان جاری کر دیا تھا، سوڈان میں مہدی تمبا کو استعمال کرنے والوں کو اسی ۸۰ کوڑے اور ایک ہفتہ قید کی سزا دیتا، مغل بادشاہ جہانگیر نے اپنی قلمرو میں تمبا کونوشی پر سخت پابندی عائد کر دی تھی، کم وبیش دوسری قوموں میں بھی ملک وقوم کے بہی خواہ حکمرانوں نے تمبا کو نوشی کا سدباب کرنے کی بھی کوشش کی، انگلینڈ میں شاہ جاک اول نے سر والٹر رالی کو جس نے انگلینڈ میں تمبا کو کو فروغ دیا، گرفتار کر کے سزائے موت دی، سترہویں صدی کے اواخر تک روسی حکام تمبا کو نوشوں کو سخت سزا دیا کرتے، پہلی دفعہ کوڑے لگاتے، دوسری بار پینے پر ناک کاٹ دیتے اور تیسری دفعہ میں سزائے موت دے دیتے۔ (ماہنامہ ہدایت، شمارہ: ۷:۷ صفحہ ۳۰)

گو تمبا کونوشی فطرتِ سلیمہ کے لئے متفقہ طور پر نہایت مذموم، ناپسندیدہ، قابل ترک اور لائق اجتناب شئ ہے، اس سے بچنا اور اگلی نسلوں کو اس سے بچانا ہم سب کا فریضہ ہے، بدقسمتی سے نوجوانوں کے لئے اب یہ ایک فیشن بنتا جا رہا ہے، اگر ہم نے اپنی نسلوں کو اس بلاء بے درماں سے بچانے کی کوشش نہیں کی تو یہ ان کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہوگا۔

معاملات کی صفائی

دنیا میں بہت سی مخلوقات ایسی ہیں کہ وہ اپنے باقی رہنے میں اپنی ہم جنس کی محتاج نہیں ہیں، جیسے درخت ہے، درخت کو اپنے ہی جیسے درخت کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلند و بالا پہاڑ اپنے باقی رہنے میں دوسرے پہاڑ کے محتاج نہیں ہیں؛ لیکن جاندار اور خاص کر انسان اپنی زندگی میں اپنی ہم جنس مخلوق اور انسان کے محتاج ہیں، ماں باپ کا 'بوڑھاپا' بال بچوں کے بغیر گذارے نہیں گذرتا، بچے باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کے بغیر بچپن سے جوانی تک کا سفر طے نہیں کر سکتے، ایک خاص عمر کو پہنچنے کے بعد ہر شخص کو ایک رفیق کی ضرورت پیش آتی ہے، جو شوہر و بیوی کی شکل میں مہیا ہوتا ہے، یہ ضرورتیں تو چھوٹے سے خاندان سے متعلق ہیں، اس سے باہر نکلئے تو ضرورتوں کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے، تاجر و گاہک ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور آجر و مزدور کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔

سماج کے دو یا اس سے زیادہ افراد کے درمیان باہمی احتیاج و ضرورت کی بناء پر جو مالی تعلق قائم ہوتا ہے، اسی کو فقہ و قانون کی زبان میں "معاملہ" کہتے ہیں، معاملات میں بعض دفعہ "ادھار" کی بھی نوبت آتی ہے اور مہلت کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کئے جاتے ہیں، ایسے وقت میں خاص کر باہمی نزاع کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، عام طور پر معاملات میں جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں، وہ بڑی شدت اختیار کر جاتے ہیں؛ اس لئے کہ مال کی حرص اور مال کے سلسلہ میں بخل انسانی فطرت میں داخل ہے، ایسے اختلافات محبت کے رشتوں کو کڑواہٹوں میں تبدیل کر دیتے ہیں، کینہ و کدورت کی آگ سینوں کو سلگا کر رکھ دیتی ہے؛ یہاں تک کہ لوگ مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں، اور قتل و قتال تک نوبت آجاتی ہے، — یہ اختلاف عام طور پر دو اسباب کی وجہ سے رونما ہوتا ہے: ایک: بد دیانتی، دوسرے: معاملات میں ابہام۔

بد دیانتی اور خیانت کے واقعات تو دن رات پیش آتے رہتے ہیں؛ اس لئے کہ بد دیانتی آج کی دنیا میں جرم کی بجائے آرٹ بن چکا ہے اور بعض لوگ ایسی حرکتوں کو ہوش مندی اور عقل مندی باور کرتے ہیں؛ لیکن بہر حال جو لوگ دین و شریعت سے جڑے ہوئے ہیں، نماز و روزہ کے پابند ہیں اور

اسلامی وضع قطع رکھتے ہیں، وہ بڑی حد تک اس سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ لیکن معاملات میں ابہام اور صفائی و وضاحت کا نہ ہونا ایسی بیماری ہے، جس میں یہ طبقہ بھی گرفتار رہتا ہے، قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت سورۃ البقرہ کی آیت نمبر: ۲۸۲ ہے، جو آیت ''مداینت'' کہلاتی ہے، اس میں قرض کا ایک اہم حکم بتایا گیا ہے اور خاص طور پر ایسے معاملہ کو لکھ لینے کا حکم دیا گیا ہے، عدّاء بن خالد بن ہوذہ ﷛ کے پاس خرید وفروخت کی ایک دستاویز تھی، جو رسول اللہ ﷺ نے تحریر کرائی تھی، اس میں خریدار کی حیثیت سے عدّاء ﷛ کا نام تھا اور فروخت کنندہ کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کا (سنن الترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء فی کتابة الشروط، حدیث نمبر: ۱۲۶۰)، اس سے معلوم ہوا کہ خرید وفروخت نقد ہو تب بھی لکھ لینا بہتر ہے۔

خرید وفروخت کی ایک صورت یہ ہے کہ قیمت نقد ادا کر دی جائے اور خریدی جانے والی شئ ادھار رکھی جائے، اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''سَلم'' کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں ایسی خرید وفروخت کا عام رواج تھا، آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی؛ لیکن فرمایا کہ پیمانہ متعین ہونا چاہئے، وزن متعین ہونا چاہئے اور مدت متعین ہونی چاہئے: ''**من أسلف في شيء ففي كيل معلوم، ووزن معلوم، إلى أجل معلوم**'' (صحیح البخاري، **کتاب السلم، باب السلم في وزن معلوم**، حدیث نمبر: ۲۲۴۰)، فقہاء نے اس سلسلہ میں مزید تفصیل کی ہے کہ چوں کہ شریعت کا منشاء نزاع کو روکنا اور جھگڑے کا سد باب کرنا ہے؛ اس لئے ان تمام چیزوں کا متعین اور واضح ہونا ضروری ہے، جن کے بارے میں آئندہ اختلاف پیدا ہوسکتا ہے، جو شئ ادھار ہے، وہ بھی متعین ہو، جیسے چاول، گیہوں، پھر اس کی قسم بھی متعین ہو، جیسے باسمتی چاول، کوالیٹی اور کیفیت میں بھی ابہام نہ ہو، جیسے اعلیٰ درجہ، درمیانی درجہ وغیرہ، سامان کی ڈیلیوری کی جگہ بھی مقرر ہو، مثلاً یہ چیز فلاں شہر میں مہیا کی جائے گی، وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن عباس ﷛ نے قرض و ادھار کی تمام صورتوں کے بارے میں اصولی بات فرمائی ہے کہ ادائیگی کی مدت واضح اور متعین ہونی چاہئے، کوئی شخص کہے کہ کھیت کی کٹائی یا فلاں شخص کے دینے تک کے لئے ادھار ہے، تو اس کا اعتبار نہیں؛ بلکہ مدت یا ادائیگی کا وقت کسی ابہام کے بغیر مقرر ہونا چاہئے: ''**لا تسلف إلى العطاء ولا إلى الحصاد، وأضرب أجلا**'' (**إعلاء السنن**: ۱۴/ ۳۸۱، بہ حوالہ: **مصنف ابن أبي شيبة**)۔

آج کل دارالافتاء، دارالقضاء اور محکمۂ شرعیہ وغیرہ میں متعدد ایسے معاملات آتے رہتے ہیں، جن میں آپسی جھگڑے کی بنیاد معاملات کا واضح نہ ہونا ہے، اس وقت اس کی چند صورتوں کا ذکر مناسب محسوس ہوتا ہے:

☆ بعض اوقات والد ایک کاروبار شروع کرتے ہیں، اس وقت بچے چھوٹے ہوتے ہیں، بچے جیسے جیسے بڑے ہوئے ان میں سے بعض والد کے ساتھ کاروبار میں لگ جاتے ہیں، بعض ملک یا بیرون ملک میں اچھی ملازمتیں حاصل کر لیتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے لڑکے تو کاروبار میں شامل ہو گئے؛ تاکہ تجارت کو فروغ دیں اور اس کی وجہ سے وہ آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکے، چھوٹے بھائیوں نے تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہو گئے، اب والد کے انتقال کے بعد جب ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ آیا تو جس بھائی نے کاروبار میں تعاون کیا تھا، وہ چاہتا ہے کہ اس کو اس کی محنت کا معاوضہ ملے، اور چھوٹے بھائیوں کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ترکہ برابر تقسیم کیا جائے؛ بعض دفعہ اس میں اُن بھائیوں کے ساتھ بظاہر ناانصافی ہوتی ہے، جنھوں نے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے خود الگ سے کوئی ملازمت نہیں کی یا اپنی تعلیم کو قربان کیا، بعض دفعہ اس کے برعکس صورت حال بھی پیش آتی ہے کہ جو بھائی کاروبار میں شریک تھا، وہ پورے کاروبار پر قابض ہو جاتا ہے، اور دوسرے بھائی بہنوں کو بے دخل کر دیتا ہے، — اگر والدین بچوں کو کاروبار میں شریک کرتے ہوئے وضاحت کر دیں کہ تمہاری حیثیت پارٹنر کی ہوگی اور تم اس میں اتنے فیصد کے مالک ہوگے، یا تمہاری حیثیت ملازم کی ہوگی اور تم ماہانہ اتنی تنخواہ کے مستحق ہوگے، یا تم میرے معاون و مددگار ہو، الگ سے تمہارا کوئی حصہ نہیں ہوگا تو بعد کو چل کر اس طرح کا اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔

☆ عملی تعاون ہی کی طرح بعض دفعہ مالی تعاون میں بھی یہ صورت پیش آتی ہے، جیسے والد کی تجارت میں ان کے مطالبہ پر یا بلا مطالبہ بعض بچوں نے مختلف موقعوں پر پیسے دئے، یہ سرمایہ کاروبار کا حصہ بن گیا؛ لیکن یہ بات متعین نہیں ہوئی کہ سرمایہ لگانے والوں کا کاروبار میں خصوصی شیئر ہوگا، یا ان کی یہ رقم قرض ہے جو بعد میں ادا کی جائے گی، یا اپنے والد کا تعاون ہے؟ یہ عدم وضاحت پھر بعد میں بڑے جھگڑے کا سبب بنتی ہے، جن لڑکوں نے رقم دی تھی وہ زائد حصہ چاہتے ہیں، اور دوسرے بھائی پورے کاروبار کو والد کا ترکہ قرار دیتے ہیں۔

☆ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بھائی نے کاروبار شروع کیا، سب لوگ مل کر رہ رہے تھے، مختلف بھائیوں نے حسب گنجائش موقعہ بہ موقعہ کاروبار میں رقم لگائی، بعض نے نہیں لگائی، بعض محنت میں شامل ہوئے، بعض نہیں ہوئے، اب ہوتا یہ ہے کہ جس بھائی نے کاروبار شروع کیا تھا، وہ سمجھتا ہے کہ یہ پورا کاروبار تنہا اسی کی ملکیت ہے، اور دوسرے بھائی اپنے حصہ کے دعویدار ہوتے ہیں، یہ بات اس وقت زیادہ پیش آتی ہے، جب والد کی زندگی میں اس نوعیت کا کاروبار شروع ہوا ہو، کبھی کبھار وہ بھی دوکان پر بیٹھ جاتے ہیں، یا تجارت شروع کرنے والے بچے نے اپنے والد کے نام سے تجارت شروع کی، اگر شروع ہی میں یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ کاروبار مشترک ہے، یا جس بھائی نے شروع کیا ہے، اس کا ہے اور جن دوسرے بھائیوں نے کچھ پیسے لگائے ہیں یا محنت کی ہے، وہ تعاون ہے یا قرض ہے یا شرکت ہے؟ اور اگر اسی کاروبار سے گھر کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں تو یہ بہ طور شرکت کے ہے، یا جس کا کاروبار ہے اس کی طرف سے تبرع و احسان ہے؟ تو بعد میں اختلاف پیدا نہ ہو۔

☆ اسی طرح کی صورت حال بعض دفعہ اراضی کی خریداری میں پیش آتی ہے، ایسا ہوتا ہے کہ بعض لڑکے بیرون ملک ملازمت کر رہے ہوتے ہیں، وہ زمین یا مکان کی خریداری کے لئے رقم بھیجتا ہے، اب والد نے اس رقم سے اپنے نام مکان یا زمین خرید کر لی، یا اپنے کسی ایسے لڑکے کے نام خرید کر دی جو ہندوستان میں ہے؛ حالاں کہ پیسے بھیجنے والے کا مقصد اس کے لئے جائداد خریدنا ہے اور والد کی بھی یہی نیت ہے، بھائیوں کو معلوم ہے؛ لیکن جب والد کا انتقال ہوا تو نیت بدل گئی اور اصل صاحبِ حق کا نقصان ہو گیا؛ اس لئے اولاً تو خود رقم بھیجنے والے لڑکے کو چاہئے کہ اپنے والد پر اس بات کو واضح کر دے کہ اس کی نیت خود اپنے لئے زمین خریدنے کی ہے اور والد کو بھی چاہئے کہ اس کی نیت دریافت کر کے اس کے نام سے زمین خریدے، اور اگر اس میں کوئی قانونی دقت ہو تو اپنے نام سے خرید کر اس لڑکے کے نام ہبہ نامہ بنا دے، یا اس کو پاور آف اٹارنی دے دے، یا کم سے کم اپنا یہ اقرار نامہ رجسٹرڈ کرا دے کہ یہ زمین حقیقت میں میرے فلاں لڑکے کی ملکیت ہے، میں اس کا مالک نہیں ہوں اور میرے دوسرے ورثہ کا بھی اس سے حق متعلق نہیں ہے۔

☆ اسی طرح کا اختلاف بعض اوقات مکان کی تعمیر میں بھی پیدا ہوتا ہے، جیسے والد نے مکان کی تعمیر شروع کی اور بعض لڑکوں نے اس میں پیسے دئے؛ لیکن ان کا پیسہ دینا کس حیثیت سے

ہے؟ یہ واضح نہیں ہوتا، بعد میں پیسہ دینے والے لڑکے کی خواہش ہوتی ہے کہ اس مکان میں اس کا خصوصی شیئر ہو اور دوسرے لڑکے پورے مکان کو والد کا ترکہ قرار دیتے ہیں، یہی صورت حال اس وقت بھی پیش آتی ہے جب اتفاق واتحاد کے ماحول میں کوئی بھائی مکان کی تعمیر شروع کرتا ہے، اب کئی بھائیوں میں سے ایک دو کچھ پیسے لگا دیتے ہیں، کوئی اپنا وقت دے دیتا ہے، اور یہ بات طئے نہیں ہوتی کہ اس مالی اور عملی تعاون کی حیثیت کیا ہوگی؟ اگر یہ شروع میں طئے پا جائے تو نہ دل کے آ بگینے ٹوٹیں گے نہ کینہ وکدورت کی آگ سلگے گی۔

☆ ایک قابل توجہ بات تقسیم میراث کی ہے، جیسے ہی مورث کا انتقال ہوا، اس کے ترکہ سے تمام ورثہ کا حق متعلق ہوجاتا ہے، اور ترکہ میں مرنے والے کی تمام چیزیں شامل ہیں، مثلاً اگر ایک لڑکا مرنے والے کے ساتھ اس مکان میں مقیم تھا، اب والد کی وفات کے بعد تنہا اس مکان کو یا والد کی دوسری اشیاء کو استعمال کر رہا ہے تو اپنے شیئر سے زیادہ حصہ جو اس کے استعمال میں ہے، وہ اس کے حق میں گناہ اور حرام ہے، پھر تقسیم میں جتنی تاخیر ہوتی جاتی ہے الجھنیں بڑھتی جاتی ہیں اور اختلاف کے مواقع بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں؛ اس لئے شریعت کا مقرر کیا ہوا اصول یہ ہے کہ مرنے والے کے گذرنے کے بعد جلد سے جلد ایک دو دنوں کے اندر تمام ورثہ بیٹھ کر شریعت کے حکم کے مطابق اپنے حصے تقسیم کرلیں اور اس تقسیم میں ہر چیز کو شامل کریں؛ کیوں کہ قرآن مجید میں ترکہ کے لئے ''مَا تَرَکَ'' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی مرنے والا جو بھی چھوڑ جائے؛ اس لئے گلاس اور پلیٹیں بھی ترکہ میں شامل ہیں، ہاں، اگر مرحوم کی بعض اشیاء کے استعمال کے بارے میں ورثہ کا اتفاق ہوجائے کہ یہ چیز فلاں کے استعمال میں رہے گی تو حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ دوسرے حقداروں کی طرف سے اس کے حق میں ہبہ ہے۔

یہ اور اس طرح کے معاملات میں جہاں وضاحت ضروری ہے، وہیں یہ بھی مناسب ہے کہ ان معاملات کو تحریر میں لے آیا جائے اور اس تحریر پر تمام متعلقہ لوگوں اور کچھ گواہوں کے دستخط ہوجائیں؛ تاکہ آئندہ طے پانے والے امور کے سلسلہ میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ اگر معاملات کی اچھی طرح وضاحت ہوجائے اور اسے تحریر میں لایا جائے تو زمین وجائداد کے پچاس فیصد جھگڑے ختم ہوجائیں اور اختلاف کی نوبت ہی نہیں آئے۔

تکبر کا انجام

مصر و تیونس کے بعد لیبیا میں بھی انقلاب کی آندھی نے ۴۲ر سالہ اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، ۱۹۶۹ء میں — جب معمر قذافی کی عمر صرف ۲۷ر سال تھی — شاہ ادریس کی حکومت کا تختہ الٹ کر وہ لیبیا کے حکمراں بن گئے تھے، ۱۹۷۷ء میں قذافی نے اس ملک کو ''سوشلسٹ پیوپلز لیبیا عرب جمہوریہ'' قرار دیا، انہوں نے اپنے مقابلہ کسی بھی سیاسی جماعت کے قیام کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے خاص طور سے اسلام پسندوں پر بڑے مظالم ڈھائے اور نہایت سفا کانہ رویہ اختیار کیا، ملک کے باہر انجام پانے والے مختلف تخریبی واقعات میں بھی قذافی کو مورد الزام ٹھہرایا گیا، جس کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی؛ لیکن اندرون ملک انہوں نے اور ان کے فرزندان نے جو جور وستم ڈھائے اور خود اپنی عوام کا قتل کیا، وہ ایک ایسی سچائی ہے، جس کا ان کے دشمنوں کو بھی اعتراف ہے، صرف ابوسالم جیل میں انہوں نے گیارہ سو سے زیادہ قیدیوں کو بیک جنبش قلم ہلاک کروادیا۔

انہیں دنیا میں ایک پاگل قائد اور جنونی حکمراں کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور ان کے بعض اقدامات نہایت عجیب اور حیران کن ہوتے تھے، جیسے اپنے باڈی گارڈ کی حیثیت سے ۲۰۰ر نوجواں لڑکیوں کو متعین کرنا، کسی بھی ملک جائیں وہاں ایک الگ خیمہ لگا کر اس میں مقیم ہونا، اپنی مخصوص اونٹنی کو ساتھ لے جانا اور اس کا دودھ پینا، ایک طرف امریکہ اور اسرائیل کا سخت ناقد ہونا اور دوسری طرف یہ مشورہ بھی دینا کہ مسجد اقصی کو فراموش کردینا چاہئے، ملک کے دستور کے طور پر 'کتاب الاخضر' کے نام سے انہوں نے کتاب مرتب کی، حکومت کی نظر میں اس کا تقدس کسی مذہبی کتاب سے کم نہیں تھا، وہ دینی موضوعات پر عالمی کانفرنس بھی کرتے تھے اور دوسری طرف کمیونزم کے حامی بھی تھے، اور شریعت کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔

۲۰۰۹ء میں انہوں نے نہایت تزک واحتشام کے ساتھ اپنے ۴۰ سالہ اقتدار کا جشن منایا، انہیں کیا خبر تھی کہ اس جشن کے بعد ملک میں ایک اور جشن منایا جانے والا ہے، اور یہ جشن ان کی

رسوا کن ہلاکت کا ہوگا، جو پورے ملک کے لئے فرحت ومسرت کا دن ثابت ہوگا؛ چنانچہ ۲۰۱۱ء کے اوائل ہی سے ان کے خلاف عوامی غیظ وغضب کی چنگاری سلگنی شروع ہوگئی، قذافی کو ان کے دوستوں نے بہت سمجھایا؛ لیکن کسی طرح وہ صلح کی میز پر آنے کو تیار نہیں ہوئے، یہاں تک کہ فروری ۲۰۱۱ء میں انہوں نے پُرامن احتجاجیوں پر نہایت سفاکانہ حملے کرائے اور اپنی عوام کے لئے بندوق کی گولی کو کافی نہ جانا؛ بلکہ ٹینک کے گولے اور بمبار طیاروں سے آتشیں بم بھی ان پر پھینکے، بالآخر مجاہدین آزادی کے لئے مغربی ملکوں سے مدد لینے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا، اور نیٹو کی مدد سے ۲۱ / اگست کو قومی عبوری کونسل نے دار الحکومت طرابلس پر کنٹرول حاصل کرلیا، نیز ۲۰ / اکتوبر کو کرنل قذافی کو نہایت ذلت کے ساتھ اس وقت گرفتار کرلیا گیا، جب وہ ایک نالہ میں چھپے ہوئے تھے، وہ اور ان کے ایک بیٹے اس حال میں مارے گئے کہ نہ کوئی آنکھ ان پر رونے والی تھی اور نہ کوئی زبان ان پر آہ کرنے والی، ان کی موت پر غم وحزن کے مرثئے نہیں پڑھے گئے؛ بلکہ مسرت وشادمانی کے نغمے گائے گئے اور پورے ملک میں اس شان سے خوشیاں منائی گئیں کہ گویا یہ عید کا دن ہے۔

افسوس کہ قذافی اپنی آزمائش کے آخری دنوں میں بھی اپنی اسلام دشمنی کو چھپا نہیں سکے، انہوں نے آزادی کی جدو جہد کو بغاوت قرار دیتے ہوئے 'القاعدہ' اور 'الاخوان المسلمون' کو اس کا ذمہ دار قرار دیا؛ تاکہ مغربی آقاؤں کی تائید حاصل کرسکیں، انہوں نے اپنی تقریر میں نوجوانوں کو جوش دلاتے ہوئے کہا: تم شراب پیو، ناچو، گاؤ، عیش کرو اور ان جھگڑوں میں نہ پڑو بعد کو ان کے دفتر سے جو خفیہ دستاویزات سامنے آئی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر وہ مغرب کے خلاف تھے؛ لیکن حقیقت میں وہ اس کے آلۂ کار تھے، سوڈان میں انتشار اور بدامنی پھیلانے میں مغربی طاقتیں ان کو استعمال کررہی تھیں، شمالی سوڈان سے جنوبی سوڈان کو الگ کرنے میں بھی ان کی خفیہ تائید شامل تھی، اور دارفور کے حالات کو بگاڑنے میں بھی ان کا نمایاں حصہ تھا، وہ افریقہ کے مختلف مسلم ملکوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکساتے تھے، یہ بھی انکشاف ہوا کہ ان کی ذاتی دولت جو مغربی ملکوں میں محفوظ ہے، کئی سوٹن سونے کے برابر ہے، اس سے شاید فراعنۂ مصر کی روح بھی شرمندہ ہوگئی ہوگی، جو اپنی لاش کے ساتھ سونے کے زیورات اور جواہرات دفن کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، ان بے چاروں کو ایسی دولت کہاں نصیب ہوئی ہوگی؟

بحیثیت مسلمان ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایسے واقعات میں عبرت وموعظت کے پہلو تلاش کریں اور اپنے اپنے دائرہ میں اس کو مشعل راہ بنائیں، قرآن نے دنیا میں جن حکمرانوں کی ہلاکت و بربادی کا ذکر کیا ہے، ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ تکبر کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، قرآن نے سب سے زیادہ جس جابر گروہ کے رویہ کا ذکر کیا ہے، وہ فرعون مصر اور اس کی قوم ہے، اور بار باران کا یہی مزاج بتایا گیا کہ وہ ایک متکبر گروہ تھے: ﴿وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ﴾ (القصص: ۳۹)، نیز فرمایا گیا: ﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ﴾ (المؤمنون: ۴۶) یعنی فرعون اور اس کی قوم نے تکبر کا راستہ اختیار کیا اور وہ لوگ تھے ہی بڑے مغرور اور اپنی برتری کے احساس میں مبتلا، جن قوموں پر عذاب آیا وہ اسی لئے کہ ان میں کبر وتعلی اپنے حدود کو پار کر چکی تھی، حضرت صالح علیہ السلام کی قوم پر بھی عذاب آیا، قرآن مجید نے ان کے کبر و غرور اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کا نقشہ بھی کھینچا ہے، (الاعراف: ۷۵) حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں بھی قرآن میں کہتا ہے کہ وہ لوگ متکبر ہو گئے تھے، (الاعراف: ۸۸) حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے ان کے غرور وتکبر او دعوت حق کی تحقیر کا گلہ کیا ہے، (نوح: ۷) قوم عاد جو اللہ کی معذّب قوموں میں ہے، قرآن نے ان کے غرور وتکبر کا بھی خوب نقشہ کھینچا ہے، (الفصلت: ۱۵) اور ان تمام باطل قوموں کا سرچشمہ یعنی شیطان لعین کو جس چیز نے راندۂ درگاہ کر دیا تھا، وہ بھی یہی تکبر کی بیماری تھی: ﴿اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ﴾ (البقرۃ: ۳۴)۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبر وتعلی کی بیماری کسی فرد یا گروہ میں داخل ہوتی ہے تو اسے مختلف ذہنی اور نفسیاتی امراض کا شکار بنا دیتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو حرف آخر سمجھنے لگتا ہے، اور اپنے ہی بہی خواہوں کے مشوروں پر عمل کرنا تو کجا ان کے سننے کا بھی روا دار نہیں ہوتا، قرآن کے الفاظ میں: ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا﴾ (لقمان: ۷) یعنی کبر وغرور کی وجہ سے سنی ان سنی کر دیتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر سے ہٹ کر کسی بات کا سننا ان پر بوجھ ہوتا ہے: ﴿يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا﴾ (الجاثیۃ: ۸) چنانچہ معروف محدث حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ کبر انسان کو حق کو قبول کرنے کی استعداد سے محروم کر دیتا ہے: "--- بأن يمنع قبول الحق" (فتح الباري:

۱۰/ ۴۸۹) — اس کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بالاتر ایک گروہ خیال کرنے لگتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اصول وقوانین اس کی ذات سے فروتر چیز ہے، جیسا کہ قرآن نے فرعون کے بارے میں کہا: ﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ﴾ (المؤمنون: ۴۶) اسی طرح اللہ نے شیطان کو اس کے تکبر آمیز رویہ پر فرمایا: ﴿اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ﴾ (ص: ۷۵)

تکبر کی ایک نفسیات یہ بھی ہے کہ وہ کسی حزب اختلاف اور اپوزیشن کو گوارا نہیں کرتا؛ چنانچہ قرآن نے قوم شعیب کے متکبرانہ رویہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا کہ یا تو تم ہمارے نقطۂ نظر کو قبول کرلو یا تم کو اور تمہارے ماننے والوں کو ہم اپنے شہر سے نکال باہر کردیں گے: ﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا﴾ (الاعراف: ۸۸) اقتدار کا طویل عرصہ ان میں یہ احساس پیدا کردیتا ہے کہ ہم سب سے زیادہ طاقتور ہیں اور ہمارے مقابلہ سارے لوگ کمزور و حقیر: ﴿وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (الفصلت: ۱۵) وہ دوسروں کو تحقیر کی نظر دیکھنے لگتا ہے، جس کو قرآن مجید نے 'استنکاف' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، (النساء: ۱۷۳) پھر کبر وغرور جب دل ودماغ کی آخری سرحدوں تک اپنا سفر طئے کرلیتا ہے تو اس میں اپنے قول وفعل کے بارے میں جواب دہی کا احساس ختم ہوجاتا ہے: ﴿وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ﴾ (القصص: ۳۹)۔

کبر وغرور یوں تو ہر فرد کے لئے دنیا وآخرت میں نقصان دہ ہے؛ لیکن جس گروہ کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہو، اگر وہ اس مرض میں مبتلا ہوجائے تو وہ قوم کے لئے کینسر اور ناسور بن جاتا ہے؛ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم وسلم نے خاص طور پر ظالم حکمرانوں کی مذمت فرمائی اور انہیں ان چار لوگوں میں شمار کیا جن کو اللہ تعالیٰ بہت ناپسند فرماتے ہیں، (سنن النسائي عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ: ۵/ ۸۶)۔

افسوس کہ اسلام نے دنیا سے ملوکیت کو ختم کیا اور آمریت کی جگہ خلافت کو وجود بخشا؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس وقت مسلم ممالک بدترین قسم کی آمریت کے پنجۂ استبداء میں پھنسے ہوئے ہیں، اگر اس صدی کے ظالم حکمرانوں کی فہرست تیار کی جائے تو ان کی اکثریت کا تعلق عالم اسلام سے اور عالم اسلام میں بھی عالم عرب سے ہوگا، تیونس، پھر مصر اور اس کے بعد لیبیا میں ظلم وجور کے یہ بت زمین بوس ہوچکے ہیں، شام اور یمن میں آزادی کی تحریک انگڑائی لے رہی ہے اور قریب ہے کہ وہاں

کے ظالم حکمرانوں کا بھی وہی حشر ہو، خدا کرے کہ یہی آگ الجزائر تک بھی پہنچے اور وہاں کے آمروں کے قلعہ اقتدار کو ریزہ ریزہ کردے اور پھر ان خاکستروں سے اسلامی اقدار اور امن وآشتی کی ایک نئی اور روشن صبح طلوع ہو، جس کی روشنی عالم اسلام کے چپہ چپہ کو روشن کردے اور اس کی شعاعوں سے مغرب کے پھیلائے اندھیرے رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوجائیں۔

یہ مسئلہ نہ صرف حکومتوں کا ہے؛ بلکہ مسلم تنظیموں اور مسلمانوں کی اکثر جماعتوں کا بھی ہے، جہاں فرد کی اہمیت جماعت سے بڑھ جاتی ہے، جہاں شورائیت کو پنپنے نہیں دیا جاتا، جہاں اصول و قواعد کی حکمرانی کی بجائے صرف ایک شخص کی رائے سکۂ رائج الوقت بن جاتی ہے اور زبان بندی کے ماحول مین زبانیں بات کہنے کو ترستی ہیں، اس شخصی وخاندانی اقتدار وحکمرانی اور اختیارات کے ارتکاز کی وجہ سے باہمی اختلاف وانتشار پیدا ہوتا ہے، ترقی کا عمل رک جاتا ہے، ایک شخص کے گذرنے کی وجہ سے تنظیمیں دولخت اور سہ لخت ہوجاتی ہیں، نیز نوجوانوں اور نئی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں مل پاتا؛ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ کرنل قذافی، حسنی مبارک اور زین العابدین ابن علی نیز اس طرح کے دوسرے لوگ نہ صرف مسلم حکمرانوں کے لئے سرمایۂ عبرت ہیں؛ بلکہ اس میں مسلم تنظیموں، جماعتوں اور اداروں کے لئے بھی سبق ہے کہ وہ آمریت کی بجائے شورائیت، اختیارات کے ارتکاز کی بجائے تقسیم، شخصیتوں کی بجائے مقاصد اور انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو اہمیت دینا سیکھیں، نیز تکبر، دوسروں کی تحقیر اور مفید مشوروں پر ناگواری کی اس کیفیت سے اپنے آپ کو بچائیں، جو اکثر اقتدار کے تسلسل سے پیدا ہوجاتی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

ہزارے کے ساتھ ہزاروں
(رشوت کو روکنے کی تدبیریں)

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ زندگی گذارنے کے لئے کوئی نمونہ چاہتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان کی فطرت اور اس کی ضرورت کے لحاظ سے انسان ہی اس کے لئے نمونہ بن سکتا ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں ہی میں سے انبیاء کرام علیہم السلام کو پیدا فرمایا اور ہر نبی کو اس کی امت کے لئے اسوۂ و نمونہ بنایا گیا، قرآن مجید نے اس امت کے لئے خاص طور پر محمد رسول اللہ ﷺ کے نمونہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) اسی طرح ابو الانبیاء سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمونہ قرار دیا گیا: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ (الممتحنۃ: ۴)

نمونہ بنانے کا عمل ارادہ و اختیار اور منصوبہ و پروگرام کے ساتھ ہی نہیں ہوتا؛ بلکہ بہت سی دفعہ غیر محسوس طور پر انسان اپنے کسی بزرگ، محبوب، دوست یا محترم شخصیت کو نمونہ بنالیتا ہے، یہاں تک کہ آدمی جس سے محبت رکھتا ہے، اس کی وضع قطع، لباس و پوشاک اور چال ڈھال کی بھی پیروی کرتا ہے اور اس پیروی کو اپنے لئے قابل افتخار اور باعث مسرت محسوس کرتا ہے، یہ بات تو ہمیں آئے دن سماج میں دیکھنے کو ملتی ہے کہ کسی فلم میں کسی مقبول ہیرو نے کسی خاص انداز کا بال رکھا ہو، کسی خاص انداز کی قمیص پہنی ہو تو نوجوان اسے اپنے لئے فیشن بنا لیتے ہیں، یہاں تک کہ پھٹے ہوئے کپڑے، بوسیدہ قسم کے پینٹ، جنہیں آدمی مجبوری ہی کی حالت میں پہن سکتا ہے، کو بھی ذوق وشوق سے پہنا جاتا ہے اور اس کی بھاری قیمتیں ادا کی جاتی ہیں، حد تو یہ ہے کہ یہ اتباع و پیروی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ بہت سے نوجوانوں کے کانوں میں بالیاں اور سر پر چوٹی بھی نظر آتی ہے، غرض کہ اپنے محبوب کو آئیڈیل بنانا اور اپنی پسندیدہ شخصیتوں کے نقش قدم پر چلنا فطرت انسانی کا حصہ ہے۔

انسان جن شخصیتوں سے بہت زیادہ متأثر ہوتا ہے، ان کو آئیڈیل بناتا ہے اور ان کے نقش

قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے، ان میں نمایاں مقام سیاسی قائدین کو حاصل ہے، چوں کہ وہ پوری قوم کے نمائندہ ہوتے ہیں، عزت واحترام کی کرسیاں ان کے حصے میں آتی ہیں، وہ ڈائس پر بٹھائے جاتے ہیں، محبت کے پھول ان پر نثار کئے جاتے ہیں اور گاہے ان کے نام کی جے کار بھی لگائی جاتی ہے، ان کے نام اخبارات کی پیشانیوں کی زینت ہوتے ہیں اور ان کے فرمان سے الکٹرانک میڈیا کے درودیوار گونجتے رہتے ہیں؛ اس لئے فطری طور پر عوام وخواص، پڑھے لکھے لوگ اور ناخواندہ واَن پڑھ، مرد وخواتین، دولتمند وغریب، ان کے مقام ومرتبہ کو آخری منزل کمال باور کرتے ہیں؛ اسی لئے کہا گیا ہے کہ لوگ اپنے حکمرانوں کے طریقہ پر رہتے ہیں: ''**الناس علي دين ملوكهم**'' (**تذكرة الموضوعات**: ۱؍۱۸۳) اگر فرمانرواؤں اور حکمرانوں میں اللہ کا خوف ہو، انسانیت پروری کا جذبہ ہو، مخلوق کی محبت ہو، عدل وانصاف کا پاس ولحاظ ہو تو عوام پر خود بخود اس کا اثر پڑتا ہے، انہیں دعوت دینے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی، اسی طرح جہاں حکمراں گمراہ ہوجاتے ہیں، عیش وطرب کی زندگی کو اپنی منزل مقصود بنالیتے ہیں اور حلال وحرام کی سرحدیں ختم کردیتے ہیں، وہاں رعایا کو ان برائیوں سے بچانا ممکن نہیں ہوتا۔

اس وقت ہمارے ملک میں کرپشن کا جو سیلاب آیا ہوا ہے، اس نے ایسا ماحول بنادیا ہے کہ رشوت خوری پر لوگ کوئی حیا بھی محسوس نہیں کرتے، یوں تو ہر سماج میں اچھے اور برے دونوں طرح کے لوگ موجود ہیں؛ لیکن کرپشن کے سلسلہ میں جو عالمی ریکارڈ مرتب کیا گیا ہے، اس میں ہمارے ملک کا نام بہت اوپر ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ معیشت وٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہم بدعنوانی میں بھی مسلسل ترقی کا سفر طے کررہے ہیں، آج زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جو رشوت خوری سے خالی ہو، اگر آپ ٹرین کا سفر کررہے ہیں اور پہلے سے ریزرویشن نہ ہو تو رشوت دئے بغیر آپ کو سیٹ نہیں مل سکتی، اگر آپ کو کوئی سرکاری دستاویز حاصل کرنی ہے، خواہ راشن کارڈ ہو، ڈرائیونگ لائسنس ہو، یا پاسپورٹ کے لئے پولیس تحقیق ہو، ہر جگہ آپ کو ایک چیز ادا کرنی ہے، جسے سماج میں ''معمول'' کہا جاتا ہے، اگر آپ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی کریں تو کچھ حرج نہیں؛ لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ کی جیب ''معمول'' ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، پولیس والے تو ''معمول'' کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، اگر ''معمول'' کی مقدار ان کے حوصلہ کو پورا کرتی ہو تب تو آپ ادب واحترام کے ساتھ رخصت ہوتے

ہیں؛ بلکہ بعض اوقات عزت وتوقیر کے ساتھ وہ سلام بھی بجالاتے ہیں کہ آپ کو اپنے آفیسر ہونے کا گمان ہوجائے اور اگر''معمول'' کی رقم توقع سے کم ہو تو مخاطب کے معیار کے لحاظ سے دو چار گالیوں سے بھی نوازا جاتا ہے۔

اگر آپ کسی سرکاری دفتر میں پہنچ جائیں تو وہاں اس''معمول'' کی تاثیر دیکھئے، جو فائل سالوں سے دبی ہوئی تھی اور اس کے بال و پر پوری طرح غبار آلود ہو چکے تھے، اس کی برکت سے اس میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ آپ کا کام ہونے لگتا ہے، جب سرکاری دفاتر کو معمول وصول کرنے کا حق حاصل ہے تو آخر پرائیوٹ اداروں کا کیا قصور ہے؟ اس لئے وہ بھی اس میدان میں پیچھے رہنے پر آمادہ نہیں، طب و علاج نہایت معزز پیشہ ہے، لیکن وہ بھی بیماریوں کے امتحانات کے مراکز، دواؤں کی دوکان اور دوا خانوں سے کمیشن کے مہذب نام پر''معمول'' وصول کرتے ہیں، کم وبیش یہی حال شعبۂ تعلیم کا ہے، تعلیمی ادارے بغیر کسی رسید کے آپ سے ڈونیشن اور عطیہ کے مبارک نام پر معمول وصول کرتے ہیں، اساتذہ طلبہ کو درسگاہوں میں پڑھانے کی بجائے ٹیوشن پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں، غرض کہ ہر جگہ''معمول'' کا سکہ رائج الوقت حکمرانی کر رہا ہے۔

اب تو مذہبی ادارے بھی اس برائی سے خالی نہیں، برادران وطن کے یہاں تو اس طرح کی باتیں بہت پیش آتی ہی رہی ہیں اور ان کے یہاں ایسی باتوں کا پیش آنا قابل تعجب نہیں؛ لیکن افسوس کہ اس داعی امت کا دامن بھی اس سے پاک نہیں، اوقاف کے محکمہ نے تو گویا سات خون معاف کرالیا ہے، اوقاف کی جائیداد کو جس طرح انہوں نے فروخت کیا ہے اور جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید ہی کسی اور نے پہنچایا ہو، ابھی کچھ عرصہ پہلے ریاست آندھرا پردیش کے وقف آفیسر رنگے ہاتھ رشوت لینے میں پکڑے گئے، اس سے پہلے شعبۂ وقف کے چیئرمین کے در دولت کا نام ہی بعض اخبارات نے ''کرپشن ہاؤس'' رکھ دیا تھا، ان کی دستبرد سے اللہ کا گھر بھی محفوظ نہیں ہے، یہ مردوں کی خوابگاہ کو بھی بخشنا نہیں چاہتے، اب حج جیسی عبادت میں بھی کرپشن بڑھتا جارہا ہے، یہاں تک کہ حج وعمرہ کے ویزا کے لئے ہزاروں روپے کی رشوت وصول کی جارہی ہے، یہ رشوت کی انتہا ہے، جس کا اژدھا ہر شعبۂ زندگی کو نگل جانے کے لئے تیار ہے۔

لیکن رشوت کی یہ گرم بازاری شروع ہوئی بازار سیاست سے، عوامی نمائندوں کے انتخاب

کے لئے اخلاق وکرداراورعلم واستعداد کا کوئی معیارنہیں رکھا گیا، اگر گدھے کو بولنا آتا اوراس کے پاس پیسے ہوتے تو شاید وہ بھی ہمارے ملک میں حق نمائندگی حاصل کرلیتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیسوں کے بل پر عوامی نمائندے منتخب ہونے لگے اورخرچ کرنے میں مسابقت ہونے لگی، پھر جب وہ اقتدار میں آئے تو فطری طور پر وہ اپنی لگائی ہوئی رقم صول کرنے اور آئندہ ''حسب توفیق'' چند پشتوں کے لئے رقم جمع کرنے کی فکر میں لگ گئے، اور چوں کہ گورنمنٹ ایسے ہی افراد کا مجموعہ ہے؛ اس لئے اس نے بھی ان خوش خوراک دوستوں کے لئے کمیشن حاصل کرنے کی مختلف صورتیں نکالنے کی کوشش شروع کردیں، یہاں تک کہ اب رشوت خوری کا سب سے بڑا مرکز میدان سیاست ہے، عوام کا یقین اس سلسلہ میں اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شریف آدمی لباس پہن کر اس حمام میں داخل ہوتا ہے، تب بھی لوگ اسے بے لباس ہی تصور کرتے ہیں، ماضی قریب میں بعض تو ایسے اسکینڈل سامنے آئے ہیں کہ اس میں رشوت کی مقدار ملک کے مجموعی سالانہ بجٹ سے بھی بڑھ گئی ہے، نہ معلوم ان سیاسی رہنماؤں کو کس طبیب یا تدبیر نے ایسی ہاضم دوائیں کھلائی ہیں کہ پورے ملک کا خزانہ کھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے؛ اس لئے اس مرض کا علاج یہیں سے شروع ہونا چاہئے، اگر گورنمنٹ ملازمین کی رشوتوں کو پکڑنے کے لئے ملازمین مقرر ہوں اور سیاستداں اس سے آزاد رہیں تو یہ جڑوں کو چھوڑ کر ٹہنیوں اور پتوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

ابھی ایک سماجی کارکن انا ہزارے نے جب کرپشن کے خلاف اپنی تحریک شروع کی تو ایسا لگا کہ یہ پورے ملک کے ضمیر کی آواز ہے، چنانچہ ہر شعبۂ زندگی سے ہزاروں لوگ اس میں شامل ہو گئے اور بالآخر بادل نخواستہ حکومت کو ان کے مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے، — لیکن سوال یہ ہے کہ اس بیماری کا علاج کیا ہے؟ اس پر ملک کے مفکرین اور وطن عزیز سے محبت رکھنے والی ہستیوں کو غور کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں چند تجویزیں جو سمجھ میں آتی ہیں، اس طرح ہیں:

❁ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دلوں کو بدلنے کی کوشش کی جائے، رشوت کی برائی کو لوگوں پر زیادہ سے زیادہ واضح کیا جائے، اس کے لئے مذہبی قائدین اور مذہبی اداروں کی مدد لی جائے، سماجی تنظیموں کا تعاون حاصل کیا جائے، ہر سطح پر نصابی کتابوں میں اخلاقیات کو داخل کیا جائے، اور رشوت کی برائی کو اس مضمون کا لازمی حصہ بنایا جائے۔

❁ حکومت عوام تک سہولتوں کے پہنچانے میں زیادہ سے زیادہ واسطوں کو ختم کرے اور کوشش کرے کہ براہ راست اس کی سہولتیں عوام تک پہنچیں؛ اس کے لئے عصری ٹکنالوجی سے مدد لی جائے، مثلاً کمپیوٹر ریزرویشن اور ای میل سے ریزرویشن جب تک مروج نہیں ہوا تھا ریلوے افسران پیسے لئے بغیر ریزرویشن دینے کو اپنی حق تلفی تصور کرسکتے تھے؛ لیکن آج بڑی حد تک اس کا سد باب ہو چکا ہے، اسی طرح کوشش کی جائے کہ سرکاری دستاویزات کے حصول اور رعایتوں تک رسائی آن لائن ہو جائے، منظور ہونے والے قرض یا وظیفے، یا اسکالرشپ براہ راست بینک کے ذریعہ متعلقین کو حاصل ہو جائیں، واسطے جتنے کم ہوتے جائیں گے، اسی قدر رشوت میں کمی واقع ہوگی۔

❁ سرکار سے متعلق عوامی کام، نیز پرائیوٹ اداروں سے متعلق ضروری امور کو کھلی کتاب بنا دیا جائے، حکومت اور ان اداروں کی طرف سے نیٹ پر یا دوسرے ذرائع ابلاغ پر ہر چیز کی تفصیل موجود ہو، مثلاً یہ کہ کونسی فائل کہاں رکھی ہوئی ہے، اس میں کیا خامی پائی گئی ہے، کس سیاسی نمائندہ کو کس علاقہ میں کس کام کے لئے حکومت نے کتنی رقم فراہم کی ہے؟ وغیرہ وغیرہ، اور پھر ہر شہری کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ ان کے سلسلہ میں اپنی شکایت درج کرائے اور حکومت اس کا جائزہ لیتی رہے۔

❁ یہ بھی ضروری ہے کہ رشوت کے لئے سخت قوانین رکھے جائیں، مثلاً جو شخص کسی سیاسی عہدے پر رہتے ہوئے یا اس سے پہلے کبھی بدعنوانی کا مجرم پایا گیا ہو تو وہ ہمیشہ کے لئے عوامی نمائندگی کے معاملہ میں نااہل سمجھا جائے، اگر کوئی ملازم اس کا مجرم پایا جائے تو اس کی ملازمت ختم کردی جائے اور اگر کسی کے خلاف کرپشن کی شکایت آئی ہو اور بادیٔ النظر میں یہ شکایت صحیح نظر آتی ہو تو اسے تحقیق تک ملازمت اور نمائندگی سے معطل رکھا جائے۔

❁ یہ ضروری ہے کہ رشوت کے واقعات میں شکایت کرنے کو آسان بنایا جائے، خط کے ذریعہ یا ای میل کے ذریعہ شکایات پیش کرنے کی اجازت ہو اور گورنمنٹ شکوہ کرنے والوں کے ناموں کو مخفی رکھے؛ تاکہ غیر سماجی عناصر کی طرف سے دشواریاں پیدا نہ ہوں۔

❁ یہ بھی ضروری ہے کہ رشوت کے مقدمات دائر کرنے کو آسان بنایا جائے، اس میں 'مَن و تو' کا امتیاز نہ ہو، اونچے سے اونچے عہدیدار اور سیاسی نمائندہ کے خلاف یا پولیس اور اس کے ذمہ داروں کے خلاف عام سے عام شہری کو بھی کسی کی اجازت کے بغیر مقدمہ دائر کرنے کا حق ہو، سیاسی

نمائندوں کے خلاف مقدمہ درج کرنے کے لئے گورنر کی یا دوسرے اعلیٰ عہدیداروں کی اجازت اکثر اوقات انصاف کا خون کر دیتی ہے۔

❁ انصاف میں تاخیر بھی ایک ناانصافی ہے، عام طور پر رشوت کے جو واقعات پیش آتے ہیں، ان کے فیصلوں میں اتنی تاخیر ہوجاتی ہے کہ یہ واقعہ لوگوں کے ذہن سے محو ہونے لگتا ہے؛ اس لئے رشوت کے مقدمات کے لئے فاسٹ ٹریک عدالتیں ہونی چاہئیں، جو مسلسل سماعت کر کے دو تین مہینوں میں فیصلہ سنا دیں۔

غرض کہ رشوت ہمارے سماج کو گھن کی طرح کھا رہا ہے، یہاں تک کہ ہمارے دفاعی راز بھی دشمنوں تک پہنچ جاتے ہیں، حکومت کی اعانتیں عوام تک پہنچ نہیں پاتیں، اور ملک کا کثیر سرمایہ ضائع ہو کر رہ جاتا ہے، یہ وہ صورت حال ہے جس نے ہر محب وطن شہری کو بے چین کر دیا ہے اور اسی لئے جب انا ہزارے اپنی تحریک لے کر اٹھے تو ہزاروں لوگ ان کے ہم آواز ہو گئے؛ لیکن جب تک تمام لوگ مل کر اس برائی کو مٹانے کی کوشش نہیں کریں گے، اس برائی کے دلدل سے سماج کو بچایا نہیں جا سکتا۔

❁

کرپشن — مرض اور علاج

ایک بہتر اور پُرامن سماج کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہو، انصاف کے ذریعہ نہ صرف لوگوں کو ان کے حقوق حاصل ہوتے ہیں؛ بلکہ امن وآشتی کا ماحول بھی قائم ہوتا ہے اور ہر طرح کی ترقی کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، انصاف کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو کسی مشقت اور رکاوٹ کے بغیر اس کا حق مل جائے، اگر کسی کا حق روک لیا جائے اور زبردستی اپنے قبضہ میں لے لیا جائے تو یہ ظلم ہے، اور قرآن مجید میں جس قدر ظلم کی مذمت کی گئی ہے شاید کسی اور گناہ پر کی گئی ہو، اور اگر دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں اس لئے رکاوٹ پیدا کی جائے کہ وہ کچھ پیسے دینے پر مجبور ہوں تو اس طرح ناجائز طریقہ پر پیسے وصول کرنا حرام ہے اور اسی کو رشوت کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف رشوت لینے کی مذمت فرمائی؛ بلکہ بلاضرورت رشوت دینے کو بھی ناجائز قرار دیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو: **"لعن اللہ الراشی والمرتشی"** (مسند احمد، حدیث نمبر: ۹۰۱۱، ۹۰۱۹)۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ملک کا نام تو بدعنوانی کی فہرست میں بہت اوپر ہے اور پوری دنیا میں اس حیثیت سے ہمارا شہرہ ہے؛ لیکن ترقی یافتہ ممالک اور فوجی اور معاشی اعتبار سے سوپر طاقتیں بھی اس بیماری سے محفوظ نہیں ہیں اور رشوت بہ تدریج سرکاری ملازمین کے لئے ایک ذریعۂ آمدنی بن گیا ہے، اب لوگ اس کے اظہار میں بھی جھجکتے نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ تنخواہ تو اتنی ہی ہے؛ لیکن بالائی آمدنی اچھی خاصی ہوجاتی ہے، یہ بالائی آمدنی اصل میں حرام خوری کا مہذب نام ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بیماری کے کسی وبا کی طرح پھیل جانے کا سبب کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟ رسول اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امت کا بناؤ اور بگاڑ علماء اور امراء سے مربوط ہے، جب ان میں بگاڑ آئے گا تو امت میں بگاڑ آئے گا، علماء سے مراد تو وہ لوگ ہیں جو علم دین سے آراستہ ہیں اور جن کے ہاتھوں میں مذہبی قیادت ہے اور امراء سے مراد ہیں حکمراں، سترہویں صدی میں جو

انقلاب آیا، اس نے مذہبی قیادت کے تصور کوختم کر دیا؛ اس لئے آج اگر کسی درجہ میں مذہبی قیادت موجود ہےتو وہ مسلمانوں میں، مگر مغرب نے مذہب کو زندگی سے الگ تھلگ رکھنے کا جو صور پھونکا ہے، ایسا نہیں ہے کہ مسلم سماج اس کے اثر سے پاک ہو اور دوسری قوموں کی صورت حال تو یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی شخصیتوں کو عبادت گاہوں میں کچھ مذہبی رسوم کے انجام دینے تک محدود رکھا ہے، اس وقت امراء یعنی سیاسی قائدین ہی کے ہاتھوں میں ملک وقوم کی قیادت ہے؛ اس لئے ایک لامذہبی اور کثیر مذہبی معاشرہ میں بناؤ اور بگاڑ ان لوگوں سے مربوط ہے جو حکومت کے ایوانوں اور اقتدار کے کاشانوں میں براجمان ہیں۔

اس وقت کرپشن میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ سیاسی طبقہ جس کے ہاتھوں میں قوموں اور ملکوں کی باگ ڈور ہے، وہ خود کرپشن میں پیش پیش ہے، عام لوگوں کی رشوت سو اور ہزار میں ہوتی ہے؛ لیکن اس طبقہ کے لئے یہ ''اونٹ کے منہ میں زیرہ'' کا مصداق ہے؛ اس لئے کئی سو کروڑ اور کئی ہزار کروڑ تک ان کی رشوت پہنچ جاتی ہے، خود ہمارے ملک میں سیاسی شخصیتوں کی مدد سے رشوت کے بعض ایسے واقعات سامنے آئے ہیں، جس میں ملک کی بڑی ریاستوں کے سالانہ بجٹ سے بھی زیادہ پیسوں کی ہیر پھیر کی گئی ہے، بعض اہل دانش کا قول ہے: ''**الناس علی دین ملوکھم**'' (فتح الباری لابن حجر: ۷/۱۵۱) یعنی لوگ اپنے حکمرانوں کے طریقہ سے متأثر ہوتے ہیں اور انہیں اپنے لئے آئیڈیل بناتے ہیں، اگر وہ کسی برائی میں مبتلا ہوں تو وہ برائی عیب کے بجائے ہنر بن جاتی ہے اور لوگوں میں اس کے بُرے ہونے کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اس لئے اگر کرپشن کو دور کرنا ہے تو اس کی ابتداء ایوانِ اقتدار سے ہونی چاہئے اور اوپر سے نیچے تک ہر ایک کو احتساب کے دائرہ میں لانا چاہئے، وزیر اعظم کا عہدہ نہایت موقر عہدہ ہے؛ لیکن کیا یہ عہدہ بھی داغ دار نہیں ہو چکا؟ ہمارے ہی ملک میں راجیو گاندھی پر بوفورس توپ کی خریداری کے معاملہ کو لے کر اور نرسمہا راؤ پر بہت سے اور مسائل سے متعلق انگلیاں نہیں اٹھی ہیں؟ شریعت اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کے سلسلہ میں جواب دہ ہے، کوئی شخص کتنے ہی اونچے عہدہ پر پہنچ جائے؛ لیکن وہ جواب دہی سے بالاتر نہیں ہو سکتا، پیغمبر اسلام ﷺ نے اصول مقرر کر دیا کہ ہر شخص اپنے اپنے دائرہ میں ذمہ دار ہے اور جو شخص جس کے بارے میں ذمہ دار ہے اس کے بارے میں جواب دہ

بھی ہے: ''کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ'' (صحیح البخاری، کتاب الجمعۃ، باب الجمعۃ فی القری والمدن، حدیث نمبر: ۸۴۴) جواب دہی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان اپنے مفوضہ کام کو انجام دے اور یہ بات بھی کہ وہ اس کو پوری دیانت داری اور شفافیت کے ساتھ انجام دے، حضور ﷺ نے یہ تصور لوگوں کے ذہن میں اس طرح راسخ کر دیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور ان کے جسم پر دو چادریں ہیں، جبکہ بیت المال میں آئے ہوئے سامان میں سے ایک ایک چادر ہی لوگوں کو تقسیم کی گئی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ میری بات سنو اور اس کی اطاعت کرو، سامعین میں سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: میں نہ آپ کی بات سنوں گا اور نہ مانوں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سبب پوچھا تو فرمایا: آپ نے سبھوں کو ایک ایک چادر عنایت کی اور آپ کے جسم پر دو چادریں ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ وہ اس سلسلہ میں وضاحت کر دیں، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور وضاحت کی کہ اس میں ایک چادر میرے حصہ کی ہے اور ایک چادر والد صاحب کے حصہ کی، اب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ مطمئن ہوئے اور عرض کیا: اب میں آپ کی بات سنوں گا بھی اور فرماں برداری بھی کروں گا — یہ ہے احتساب کا وسیع تر دائرہ جس میں ایک معمولی شخص کسی بھی وقت امیر المؤمنین کا محاسبہ کر سکتا ہے اور ان سے جواب طلب کرنے کا حق رکھتا ہے۔

سیاست میں کرپشن کی جو بیماری کینسر کی صورت اختیار کر گئی ہیں، اس کی ایک اہم وجہ ہمارا انتخابی نظام ہے، الیکشن میں جلسے، ریلیاں، اشتہارات، پوسٹرس وغیرہ ایک ضرورت بن گئے ہیں اور اس میں کثیر اخراجات صرف ہوتے ہیں، ایک شخص جب پارلیمنٹ کا ممبر بنتا ہے تو وہ کئی کروڑ روپے خرچ کر کے یہاں تک کا سفر طے کرتا ہے، اسی طرح جو شخص ممبر اسمبلی بنتا ہے، اس کے اخراجات بھی کروڑ تک پہنچ جاتے ہیں، کسی ممبر اسمبلی یا ممبر پارلیمنٹ کی تنخواہ اتنی نہیں ہوتی کہ وہ ان اخراجات کو وصول کر سکے اور بہر حال اسے خرچ کیا ہوا وصول بھی کرنا ہے اور مزید دولت بھی اکٹھی کرنی ہے، یہ چیز اسے کرپشن کی طرف لے جاتی ہے؛ اس لئے ضرورت ہے کہ انتخابی نظام کو سادہ بنایا جائے، جلسوں جلوسوں کے بجائے گورنمنٹ کی طرف سے سہولت فراہم کی جائے کہ سرکاری ذرائع ابلاغ پر ہر امیدوار اور ہر پارٹی اپنا منشور پیش کر دے اور کارکردگی کی وضاحت کرے، گورنمنٹ کی طرف سے

ہر آبادی میں انتخاب سے متعلق ایک دو پروگرام رکھے جائیں، جس میں مختلف پارٹیوں اور امیدواروں کو اپنی بات پیش کرنے کا موقع دیا جائے، اس طرح شاید اس کرپشن کو کم کیا جاسکتا ہے اور عوام کو بھی ترجیح دینے میں سہولت ہو سکتی ہے۔

سرکاری سہولتوں کے عوام تک پہنچنے اور ترقیاتی کاموں کے انجام دینے میں واسطوں کی کثرت بھی کرپشن کو بڑھاتی ہے، سیاسی نمائندوں، سرکاری عہدہ داروں اور مقامی ٹھیکداروں کی ایک طویل چین ہے، جو ایک طرف سرکاری اخراجات کو بڑھاتی ہے اور دوسری طرف عوام کو سرکاری اسکیموں کے حقیقی منافع سے محروم رکھتی ہے، گورنمنٹ کو ایسا طریقہ کار وضع کرنا چاہئے کہ یہ واسطے کم سے کم ہو جائیں اور عام لوگ براہ راست سرکار سے رابطہ کر سکیں، اس کی ایک روزمرہ دیکھی جانے والی مثالوں میں ''ریلوے ریزرویشن'' ہے، کچھ سال پہلے رشوت دئے بغیر ریلوے ریزرویشن کا حصول ناممکن سمجھا جاتا تھا، یا تو اسٹیشن ماسٹر کو رشوت دینی پڑتی یا ٹی ٹی کو؛ لیکن ریزرویشن کے لئے کمپیوٹر کے استعمال نے اس کو کافی حد تک کم کر دیا اور ای ٹکٹ کی سہولت نے رشوت کو روکنے میں مزید مؤثر کردار ادا کیا، اگر حکومت اپنے پروگراموں کو عوام تک پہنچانے میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال کرے اور ترقیاتی کاموں میں شفافیت پیدا کرنے کے لئے اس کی تفصیلات نٹ (Net) کے ذریعہ عوام کو فراہم کر دے تو بہت کچھ اس کے سدباب میں مدد ملے گی؛ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا خود حکومتیں اور سیاسی پارٹیاں ایسی شفافیت لانے پر آمادہ ہوگی، جس میں ان کے نمائندوں اور مقامی کارکنوں کے لئے ناجائز خورد ونوش کا راستہ بند ہو جائے اور بڑے ٹھیکداروں سے پارٹی فنڈ کے نام پر رقم حاصل کرنے کی گنجائش نہ رہے؟

کرپشن زندگی کے تمام شعبوں میں اس طرح پھیل گیا ہے اور عوام اس سے اس درجہ پریشان ہے کہ انا ہزارے کی تحریک پر پورا ملک اکٹھا ہو گیا اور ایک ایسا شخص — جس کی پہلے سے کوئی عوامی ساکھ نہیں تھی — کی آواز پر ملک بھر کے لوگ متوجہ ہو گئے اور حکومت کو نیم دلی کے ساتھ ان کی کچھ شرطوں کو قبول کرنا ہی پڑا؛ لیکن محض اتنی سی بات رشوت کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، جب تک لوگوں کی بنیادی سوچ کو نہ بدلا جائے اور ایک ایسا انقلاب نہ لایا جائے جس کا ہدف صرف ''زبانیں'' نہ ہوں؛ بلکہ ''دل'' ہوں، حقیقی تبدیلی نہیں آسکتی؛ کیوں کہ دل کے بناؤ اور بگاڑ پر ہی انسان کا عملی رویہ

موقوف ہے، چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا: جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب اس کی اصلاح ہوتی ہے تو انسان کا پورا وجود صالح بن جاتا ہے اور جب یہ بگڑ جاتا ہے تو انسان کے پورے وجود میں فساد سرایت کر جاتا ہے: "**إن في الجسد لمضغة، إذا صلحت صلح كله وإن فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب**" (سنن البیهقی الکبری، حدیث نمبر: ۱۰۱۸۰) اس لئے ضرورت ایک ایسی تحریک کی ہے جو دلوں کی دنیا کو بدل دے، جو بنیادی سوچ میں تبدیلی لائے اور جو انسان کو سکھائے کہ وہ سکے ڈھالنے والی مشین نہیں ہے؛ بلکہ وہ دردمند دل، انسانیت کے لئے سوچنے والا دماغ اور محبت کی دھڑکنوں سے آراستہ خدا کی ایک عظیم مخلوق ہے، اس کے بغیر کرپشن کو روکنے کی جو بھی کوشش ہوگی وہ درخت کی جڑوں کو سیراب کرنے کی بجائے پتوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہوگی۔

❁

جرائم کی روک تھام

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس طور پر بسایا ہے کہ اس میں انسان کی خواہش کے ایک سے ایک سامان ہیں، لذیذ سے لذیذ غذا ہے، عمدہ سے عمدہ پانی ہے، آنکھوں کو بھانے والے رنگ برنگے پھول ہیں، دل کو رجھانے والے آبشار اور جھیلیں ہیں، حسین سے حسین تر انسان ہے کہ اہل ہوس جس کے اسیر زلف ہوکر رہ جاتے ہیں اور کتنی ہی نعمتیں ہیں، جن سے انسان کی طرح طرح کی خواہشات متعلق ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مفادات وخواہشات اور چاہتوں میں تصادم کی کیفیت رکھی ہے، چیز ایک ہے لیکن طلب گار کئی ہیں، خواہش کسی ایک ہی کی پوری کی جاسکتی ہے؛ لیکن کتنی ہی خواہشات ہیں جو اس ایک شئ سے متعلق ہیں۔

آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا، آخرت کی دنیا میں خواہشات بھی ہوں گی اور ہر خواہش کی تکمیل بھی، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اتنی وافر مقدار میں ہوں گی اور اتنی یکسانیت کے ساتھ دستیاب ہوں گی کہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہ ہوگا اور سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ گو جنت میں بھی درجات ومراتب کا فرق ہوگا؛ لیکن ہر شخص کو یوں محسوس ہوگا کہ وہی سب سے بہتر حالت میں ہے، یہ احساس اس کے قلب کو پُرسکون رکھے گا اور احساس محرومی کا کوئی سایہ بھی اس کے سر سے نہ گذرے گا، جنت میں رہنے والوں کے درمیان نہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ ہوگا، نہ باہمی نفرت وعداوت اور اس لئے وہاں جرم کا کوئی محرک بھی نہ ہوگا۔

اس دنیا میں چوں کہ انسان تصادم اور مسابقت کے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، یہی ٹکراؤ نفرت وعداوت اور مخالفت کو جنم دیتا ہے، پھر کچھ لوگ اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور مفادات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور کچھ لوگ محروم ونا کام، جو محروم ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے، اس کے دل میں انتقام اور تشدد کے جذبات موجزن ہوتے ہیں اور یہی جذبات جرم کی صورت اختیار کرتے ہیں، دنیا میں ہر طبقہ مفادات میں دوسرے طبقہ سے متصادم ہے، غریبوں کو مالداروں سے گلہ

ہے، مزدوروں کو آجرین سے شکوہ ہے، رعایا حاکموں اور فرماں رواؤں سے شاکی ہے، یہ تقسیم دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی کہ اسی سے کائنات کی ہمہ رنگی قائم ہے، اس لئے آخرت سے پہلے ایسی دنیا کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جو جرم اور جرم کے جذبات سے مکمل طور پر محفوظ و مامون ہو؛ البتہ جرم کو روکنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں اور کی جاتی ہیں۔

جرم کو روکنے کے تین محرکات ہیں، اول: طبعی شرافت، دوسرے: قانون کا خوف، تیسرے: آخرت میں جوابدہی کا یقین، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اصلاً سلامتی اور صالحیت رکھی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے: ''**کل ولد یولد علی الفطرۃ**'' (**بخاری: ۱۲۹۶، کتاب الجنائز، باب ماقبل فی اولاد المشرکین**) انسان بہر حال اپنی سرشت کے اعتبار سے درندہ نہیں ہوتا، ظلم و جور اور گناہ پر اس کا ضمیر یقیناً اسے کوستا ہے، اسی لئے جرم پیشہ قاتل نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، گناہوں کا احساس ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے، ان کی راتیں بے خواب ہوجاتی ہیں اور بعض پر تو اتنا زیادہ نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کر لیتے ہیں، بہت سے انسان وہ ہیں جن کو طبعی شرافت اور ضمیر کی آواز گناہ سے روکے رکھتی ہے، گو وہ اسلام اور کسی اور مذہب کے قائل نہ ہوں، وہ دہریہ کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ نے قلب میں گناہ پر ٹوکنے اور روکنے کی جو صلاحیت دی ہے، وہ اسے تھامے رہتا ہے۔

جرم کو روکنے کا دوسرا مؤثر ذریعہ ''قانون'' ہے، اس دنیا میں جب سے انسانوں کی بستی بسی ہے، وہ کسی نہ کسی قانون کا پابند رہا ہے، بہت سے لوگ جو بے ضمیری میں مبتلا ہیں اور خدا کے خوف سے بھی عاری ہیں، سوائے قانون کے کوئی چیز نہیں، جو ان کے ہاتھ کو تھام سکے، اسلام نے بھی کچھ جرائم کے لئے سزائیں مقرر کی ہیں اور وہ یہ ہیں: زنا، چوری، زنا کی تہمت، شراب نوشی، راہزنی اور ارتداد، ان سے متعلق سزاؤں کو ''حدود'' کہتے ہیں، یہ جرائم اللہ کے حقوق سے متعلق مانے گئے ہیں، اس لئے عدالت یا خود صاحبِ معاملہ بھی مجرم کو معاف کرنے کا مجاز نہیں، اسلام کے نظام جرم وسزا میں دوسری اہم چیز ''قصاص و دیت'' ہے، یہ قتل اور جزوی جسمانی مضرت رسانی سے متعلق ہے، اس جرم کو بندوں کے حقوق سے متعلق قرار دیا گیا ہے؛ اس لئے صاحبِ معاملہ یا اس کے اولیاء جرم کو معاف کرسکتے ہیں اور مال کی کسی مخصوص مقدار پر صلح بھی کرسکتے ہیں، ان کے علاوہ جو جرائم ہیں، ان کی بابت، عدالت

اپنی صواب دید سے سزا کا فیصلہ کرسکتی ہے اور ملک کی پارلیامنٹ کے لئے بھی ایسے جرائم کے بارے میں قانون سازی کی گنجائش ہے، ان جرائم سے متعلق سزا کو فقہ کی اصطلاح میں ''تعزیر'' کہا جاتا ہے۔

گناہ سے باز رکھنے کا تیسرا سب سے اہم اور سب سے اثر انگیز محرک آخرت کی جواب دہی کا احساس ہے، قانون دن کے اجالے میں انسان کے ہاتھ تھام سکتا ہے؛ لیکن رات کے اندھیروں اور انسان کے خلوت کدوں تک نہیں پہنچ سکتا، آخرت کی جواب ہی کا احساس ہی ایسی طاقت ہے جو انسان کو اپنی تنہائیوں میں بھی جرم سے باز رکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی طبیعت مجرمانہ ہو اور خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو تو کوئی طاقت نہیں جو اس کو جرم سے روک سکے، وہ اپنی کوتاہ کاریوں کے لئے ہزار تدبیریں نکال لے گا اور نئے نئے راستے تلاش کر لے گا، اسی لئے قرآن مجید نے جہاں کسی بات سے منع کیا ہے وہاں خوفِ خداوندی اور آخرت کی جواب دہی کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

زنا اسلامی نقطۂ نظر سے ''حدود'' میں شامل ہے، غیر شادی شدہ مردوں کے لئے اس کی سزا سو کوڑے ہے اور شادی شدہ کے لئے سنگسار (Stone to Death) کرنا، ظاہر ہے کہ یہ نہایت سخت سزا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا کے نقصانات بھی بہت شدید ہیں، زنا نہ صرف دامن اخلاق کو تار تار کرنے اور مذہبی قدروں کو پامال کرنے کے مترادف ہے؛ بلکہ یہ ایک پورے خاندان کی عزت وآبرو سے کھیلنا اور اس پر ننگ و عار کا ٹیکہ لگانا ہے، جب ایک مرد کسی عورت سے بدکاری کرتا ہے تو یہ فعل عورت کے پورے خاندان کے لئے سماجی اعتبار سے بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے اور اصحابِ شرافت کے یہاں خود اس مرد کے خاندان کے لئے بھی یہ چیز کچھ کم باعث حیاء نہیں ہوتی، زنا کا سب سے زیادہ نقصان پیدا ہونے والے بچہ کو پہنچتا ہے، وہ باپ سے محروم رہتا ہے، باپ سے محرومی نہ صرف اس کو اپنی شناخت اور میراث سے محروم کرتی ہے؛ بلکہ قانونی طور پر اس کے اخراجات کا کوئی کفیل بھی باقی نہیں رہتا، اگر کنواری لڑکی کے ساتھ دست درازی کی گئی ہو تو اس کے کنوارپن کا ضائع ہو جانا ایسا نقصان ہے، جس کی کسی طور تلافی ممکن نہیں اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو یہ اس کے شوہر کے ساتھ بھی زیادتی ہے، کہ اس سے اس کی عزت وآبرو کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ قریبی زمانہ میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب بھی مشکوک ہو جاتا ہے، اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا نہایت سخت مقرر کی ہے۔

اسلام نے یہ اور اس قسم کے جرائم میں جسمانی سزا مقرر کی ہے؛ کیوں کہ تجربہ ہے کہ جسمانی

سزا مجرم پر جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے، محض قید سے وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا؛ بلکہ اعداد و شمار کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مجرمین کو جیل بھیجا گیا، اپنے ہم پیشہ مجرموں کے ساتھ یکجائی کی وجہ سے ان کے جرم کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے، ۱۹۶۰ء میں مصر میں جرائم کے اعداد و شمار کے مطابق چوری کے ۱۹۴۴۷ کیس ہوئے، ان میں صرف ۲۵ کیس ایسے تھے، جن میں مجرم کو پہلی بار یہ سزا مل رہی تھی، باقی تمام ملزمین وہ تھے جو ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ دفعہ چوری کی سزا میں جیل جاچکے تھے اور ان میں غالب تعداد ان مجرمین کی تھی جو تین بار سے زیادہ جیل کے چکر لگا چکے تھے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس مجرم نے جتنی سزا پائی اور جتنی بار جیل گیا، اپنے ہم پیشہ مجرمین کی صحبت سے اس کے جذبۂ جرم میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اس کے برخلاف جسمانی سزائیں جرم کو روکنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں، سعودی عرب میں ۷۴ء تک چوری کے صرف بارہ ایسے واقعات ہوئے تھے، جن میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، لیبیا میں بھی ایک زمانہ میں قانونِ شریعت کا نفاذ عمل میں آیا تھا، تو تین سال میں صرف چھ مجرمین کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ جسمانی سزائیں، قتل وغیرہ کسی جرم کو روکنے میں جس درجہ مؤثر ہیں، محض قید کی سزا اس درجہ جرم کے سدباب میں مفید نہیں۔

زنا بالجبر کے سلسلے میں چند سال پہلے بھی بحث چھڑ گئی تھی کہ زانی کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہئے، اس وقت کے وزیر داخلہ جناب لال کرشن اڈوانی نے مطالبہ کیا تھا کہ زنا پر سزائے موت دی جانی چاہئے، اب چند دنوں پہلے یہ حادثہ پیش آیا کہ چلتی ہوئی بس میں ایک میڈیکل طالبہ کی چھ لڑکوں نے مل کر اجتماعی آبروزیری کی، اس واقعہ نے پورے ملک میں ایک زلزلہ سا برپا کر دیا ہے اور خواتین تنظیموں اور سماجی قائدین سے لے کر سیاسی لیڈروں تک ہر طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس جرم پر سزائے موت دی جانی چاہئے اور بعض لوگوں نے اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ ایسے لوگوں کو شریعت کے قانون کے مطابق سنگسار کر دینا چاہئے، یہ اگرچہ ایک حقیقت پسندانہ مطالبہ ہے؛ لیکن افسوس کہ اس میں بھی پوری طرح سیاسی رنگ موجود ہے، جس لڑکی کی عصمت ریزی کی گئی، وہ اونچی ذات کی تھی اور جن لڑکوں نے یہ ناشائستہ حرکت کی، وہ نیچی ذات کے تھے، اس لئے اس کی خوب مذمت کی جارہی ہے؛ لیکن اسی ملک میں بمبئی اور سورت کے فساد میں بے شمار مسلمان عورتوں کو بے آبرو کیا گیا اور ان کی بے آبروئی کے نقش کو محفوظ رکھنے کے لئے باضابطہ ویڈیو فلمیں بنائی

گئیں، کشمیر میں نہ جانے کتنی عورتوں کی عصمت سے کھیلا گیا اور آج تک فوج کی طرف سے یہ شرمناک فعل جاری ہے، آسام اور منی پور وغیرہ کے قبائلی علاقوں میں سرکاری حفاظتی دستوں کی طرف سے نہ جانے کتنی خواتین بے آبرو کی گئیں، دلت عورتوں کی آبرو سے کھیلنے اور ان کو مزید رسوا کرنے کے لئے پورے گاؤں میں بے لباس گشت کرانے کے کتنے ہی واقعات آئے دن اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں؛ لیکن نہ اس پر کسی کی آہ بلند ہوئی، نہ کسی نے رنج کے دو آنسو بہائے، نہ سیاسی لیڈروں کو جوش آیا اور نہ ذرائع ابلاغ کی غیرت جاگی؛ لیکن یہی ایک واقعہ غالباً اونچی ذات سے ہونے کی وجہ سے اس قدر گرمایا اور بحث و گفتگو کا موضوع بنا؛ لیکن بہرحال اگر بعد از خرابیٔ بسیار بھی سیاسی اور سماجی قائدین بیدار ہوجائیں اور ملک کی عوام ان لوگوں کا دکھ درد محسوس کرنے لگیں جو ایسی مصیبتوں سے گزر رہے ہیں تو اس شکوہ کے باوجود کہ:

ہائے اس زود پشیما ں کا پشیماں ہونا
کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

— اسے ایک مثبت رویہ ہی سمجھا جائے گا!

بہرحال میرے خیال میں یہ مسئلہ اتنا سرسری نہیں اور کئی نکات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ اسلام جب بھی کسی جرم پر سخت سزا متعین کرتا ہے تو اس جرم کو روکنے کے لئے مناسب ماحول بھی تیار کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جرم کے محرکات اور عوامل کو کم سے کم کردیا جائے، مثلاً: یہی زنا کی سزا ہے، تو اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے شریعت نے پردہ کے احکام رکھے، محرم اور غیر محرم کے اختلاط کو منع کیا، دفاتر ہوں یا تعلیم گاہیں، یا سواریاں، ہر جگہ اسلامی نقطۂ نظر سے اختلاط کی ممانعت ہے، شراب کو حرام قرار دیا گیا؛ کیوں کہ نشہ شہوانی تقاضوں کو بے قابو کرنے والی چیز ہے، عورتوں کو برسرِ عام اپنی زیبائش و آرائش کے اظہار سے روکا گیا، دیدہ زیب، چست اور پُر کشش لباس پہن کر باہر نکلنے کی ممانعت فرمائی گئی؛ کیوں کہ یہ چیزیں انسانی ہوس کو راستہ دکھاتی ہیں، پھر اس ماحول میں زنا کی سخت ترین سزا رکھی گئی، دوسرے: جو جرم جتنا شدید ہے اس کے لئے قانونِ شہادت کو بھی اسی قدر سخت بنایا گیا، زنا کے لئے چار عینی مرد گواہوں کی گواہی ضروری قرار دی گئی، بشرطیکہ مجرم کو خود اقرار نہ ہو۔

ہندوستان میں اولاً تو جرم کے محرکات کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے، فحش فلموں کا بازار گرم ہے، عریاں ویڈیو کیسٹ ملتے ہیں، ٹی وی نے حیاء کی چادر اتار پھینکی ہے، فحش لٹریچر کا سیلاب ہے، بے شرمی پر مبنی عشقیہ گانے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، بے پردگی اور عریانیت نے پورے ماحول کو مسموم بنادیا ہے، تعلیم گاہوں سے لے کر دفاتر تک مخلوط نظام کو اپنی ترقی کی علامت تصور کیا جاتا ہے، شراب عام ہے اور ایک طبقہ کو زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں؛ بلکہ غیر شادی شدہ عورتوں سے باہمی رضامندی سے بدکاری کی جائے تو قانون کی نظر میں وہ زنا ہے ہی نہیں، پھر قانون شہادت اتنی بے احتیاطی پر مبنی ہے کہ محض ایک شخص کی گواہی پر بھی اہم سے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں، ان حالات میں زنا کی سزا پھانسی کو قرار دینا کوئی قرین انصاف بات نہ ہوگی، اسی لئے فقہاء نے حدود شرعیہ کے جاری ہونے کے لئے ''دارالاسلام'' کی شرط لگائی ہے، زانی بے شک سخت ترین سزا کا مستحق ہے؛ لیکن تقاضہ انصاف یہ ہے کہ اس کو جرم سے بچنے کا ماحول دیا جائے، جو ماحول قدم قدم پر گناہ کی دعوت دیتا ہو، اس ماحول میں مجرم کو اس طرح کی سزا دیا جانا یقیناً محل نظر ہے، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ پہلے ایسے قوانین بنائے جو جرم کے عوامل اور محرکات کو روک سکے اور ایسے پاکیزہ سماج کی تعمیر ہو سکے جس میں انسان گناہ کی طرف ہاتھ بڑھانے میں سو دفعہ سوچنے پر مجبور ہو، پھر زنا کی قرار واقعی سزا مقرر کرے!

باپردہ لباس — جرم کو روکنے کا ایک اہم ذریعہ

ہمارا ملک ایک مذہبی ملک ہے اور کچھ اخلاقی تعلیمات وہ ہیں، جن پر تمام مذاہب متفق ہیں، انہیں میں ایک عفت و پاکدامنی کے بہتر عمل ہونے کا تصور بھی ہے، ہر مذہب میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ مرد و عورت کا تعلق جائز رشتوں تک محدود ہونا چاہئے اور وہ رشتہ ہے شوہر و بیوی کا، جو نکاح کے ذریعہ وجود میں آتا ہے، پہلے زمانہ میں اس کی ایک اور شکل باندی کی ہوا کرتی تھی، جو عورت کسی مرد کی ملکیت میں آتی، وہ اس کے لئے حلال ہوتی، یہ بھی ایک قانونی تعلق ہوتا تھا، اس میں بھی دونوں فریق کے حقوق ہوتے تھے، مملوکہ باندی سے پیدا ہونے والی اولاد کو وہی حقوق حاصل ہوتے تھے، جو منکوحہ بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد کو حاصل ہوتے ہیں، اگر چہ شریعت اسلامی میں یہ کوئی پسندیدہ طریقۂ کار نہیں تھا؛ اسی لئے مختلف ایسے احکام دیئے گئے، جن کے ذریعہ بتدریج اس سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا؛ لیکن چوں کہ اس زمانہ میں جنگی قیدیوں کے تبادلہ کا کوئی بین الاقوامی معاہدہ نہیں تھا؛ اس لئے گرفتار ہونے والے قیدیوں کو ظلم و جور سے بچانے، انہیں معاشرہ میں جذب کرنے اور انہیں انسانی اور سماجی حقوق فراہم کرنے کے لئے یہ ایک مناسب تدبیر تھی؛ اس لئے شریعت اسلامی نے بعض اصلاحات کے ساتھ غلامی کے قانون کو باقی رکھا؛ لیکن اب عملاً یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور صرف نکاح کا تعلق ہے، جس کے ذریعہ ایک مرد و عورت ایک دوسرے کے ساتھ حلال اور پاکیزہ زندگی گذار سکتے ہیں، یہ نہ صرف اسلام کی تعلیم ہے؛ بلکہ تمام مذاہب میں ''زنا'' سخت گناہ اور انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔

افسوس کہ ہمارے ملک میں زنا کی تعریف مذاہب کے متفقہ تصور سے الگ ہے، ہمارے قانون میں ۱۸؍سال سے کم عمر کی لڑکی کے ساتھ بدکاری کی جائے، یا اس عمر کے بعد کسی لڑکی کے ساتھ جبراً برائی کی جائے، یا کسی منکوحہ عورت کے ساتھ اس کا ارتکاب ہو، تب ہی وہ 'زنا' ہے، اگر اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کی غیر منکوحہ لڑکی سے اس کی رضامندی کے ساتھ برائی کی جائے تو قانون کی نظر میں یہ زنا نہیں ہے۔

یہ بعینہ وہی تصور ہے، جو مغرب میں پایا جاتا ہے، مغرب میں شخصی آزادی کے ہاتھ اتنے لمبے ہو گئے ہیں کہ اگر گناہ کا ارتکاب کسی انسان کی خواہش سے متصادم ہو تو پھر اس گناہ کو روکا نہیں جا سکتا، یعنی شخصی آزادی نے انسان کو خواہشات کی غلامی میں داخل کر دیا ہے، کاش! مغربی مفکرین محسوس کریں کہ یہ آزادی نہیں ہے؛ بلکہ یہ حقیقت میں غلامی کا طوق ہے، جس کو لوگ خود اپنی خواہش سے اپنے گلے میں ڈالے ہوئے ہیں۔

اہل مغرب نے یہ بھی نہیں سوچا کہ زنا سے پہنچنے والا ضرر صرف ایک مرد و عورت تک محدود نہیں رہتا کہ اس کی رضامندی اس کے جائز قرار پانے کے لئے کافی ہو؛ بلکہ بہت سے لوگ اس فعل سے متأثر ہوتے ہیں؛ اگر مرد یا عورت میں سے کوئی متعدی بیماری میں مبتلا ہو تو وہ تو ایک دوسرے کو متأثر کرتے ہی ہیں، اگر اس کے نتیجے میں اولاد پیدا ہوئی تو وہ بیماری کا بوجھ ساتھ لے کر دنیا میں آتی ہے، زنا سے پیدا ہونے والی اولاد اکثر باپ سے اور بعض اوقات ماں سے بھی محروم رہتی ہے، پیدا ہونے والے بچے کی کوئی پہچان باقی نہیں رہتی، یہ شناخت سے محرومی اس کے لئے رسوائی کا دھبہ بھی ہوتی ہے اور ہر لمحہ اسے محرومی کا احساس بھی دلاتی ہے، اس عمل سے سماج میں گندگی پھیلتی ہے، متعدی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور وہ پورے سماج کو متأثر کرتی ہیں؛ اس لئے کہ جب کوئی شخص فطرت سے بغاوت کرتا ہے تو فطرت بھی اس سے انتقام لیتی ہے، غرض کہ زنا صرف زنا کار مرد و عورت ہی کے لئے مضرت رساں نہیں ہے؛ بلکہ پورے سماج کے لئے ضرر کا باعث ہے، مگر افسوس کہ مغرب نے شہوت پرستی اور خواہشات کی غلامی میں پڑ کر اور شخصی آزادی کا خوبصورت عنوان دے کر باہمی رضامندی سے گناہ کے ارتکاب کو جرم کے دائرے سے باہر نکال دیا ہے۔

اس کے باوجود زنا بالجبر کا جرم بڑھتا جا رہا ہے، امریکہ اور یورپ میں تو جرائم کے اعداد و شمار آسمان کو چھو رہے ہیں، ہندوستان بھی اب ان ہی کے نقشِ قدم پر ہے، 2011ء کے اختتام پر ملک کی ریاستوں میں جرائم کے جو اعداد و شمار آئے ہیں، وہ حد درجہ افسوسناک اور اصحابِ ضمیر کے لئے نہایت رنج و ملال کا باعث ہیں، اس موقع پر حیدرآباد کے ڈی آئی جی نے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک سچی بات کہی ہے کہ ایسے واقعات کی کثرت میں لڑکیوں کے ہیجان انگیز لباس کا بھی بڑا دخل ہے، بس یہ بیان دینا تھا کہ ایک طوفان کھڑا ہو گیا، خواتین کی مختلف تنظیموں کی طرف سے ہاہا کار مچ گئی، روشن خیال

ذرائع ابلاغ نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ توعورتوں کی آزادی میں مداخلت ہے اور ایک دقیانوسی فکر کی واپسی ہے، یادش بخیر، چند سال پہلے دہلی کے ایک پولیس آفیسر نے بھی طالبات کے نیم عریاں لباس کو اس طرح کے جرائم کا محرک قرار دیا تھا، اس وقت بھی بڑا شورا ٹھا تھا اور آخر پولیس آفیسر کو معذرت کرنی پڑی تھی، بعینہ یہی صورت حال اب پیش آئی۔

سچ یہ ہے کہ سچی بات کڑوی ہوتی ہے اور سچائی کو قبول کرنا آسان نہیں ہوتا، ہیجان انگیز لباس کا مریضانہ ذہن رکھنے والے نوجوانوں کے لئے جرم کا محرک ہونا ایک ایسی بات ہے، جس کو معمولی عقل وفہم رکھنے والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے، گوشت اور مٹھائیاں غلاف اور بند برتن میں نہ ہوں تو مکھیاں اُن پر لگیں گی ہی، کوئی مسافر روپئے جیب اور سوٹ کیس میں رکھنے کی بجائے سیٹ پر کھلی ہوئی حالت میں رکھ دے تو چوری کا بھی اندیشہ ہے اور سینہ زوری کا بھی، سونا چاندی آپ لاکر میں رکھتے ہیں، اینٹ اور کنکر کے ڈھیر کی طرح چہار دیواری کے باہر نہیں رکھتے؛ اس لئے جس چیز کی طرف لوگوں کو کشش ہوتی ہے اور جس میں خود اپنا بچاؤ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہی ہے اور اس کے لئے حفاظتی تدبیروں کا اہتمام کیا جانا عقل وفطرت کا تقاضا ہے۔

خواتین کی مثال ایسی ہی ہے، نوجوان لڑکوں کے لئے ایک خوش شکل نوجوان لڑکی سے بڑھ کر کوئی چیز شاید وجہ کشش نہیں ہوتی، پھر اللہ تعالیٰ نے خواتین کو لطیف و نازک اندام بھی بنایا ہے، یہ اس کا عیب نہیں ہے؛ بلکہ اس کا حسن ہے، اس کو بمقابلہ لڑکوں کے زیادہ تحفظ مطلوب ہے، وہ اپنا دفاع آپ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی؛ اسی لئے بعض ٹرینوں میں ان کے لئے ڈبے مخصوص کئے جاتے ہیں، بسوں میں ان کے لئے سیٹیں ریزرو رکھی جاتی ہیں، اور بعض ڈیوٹیوں سے انہیں استثناء دیا جاتا ہے، یہ سب کچھ دقیانوسیت نہیں ہے؛ بلکہ فطرت کی آواز ہے، اسی پس منظر میں پولیس آفیسر کے اس بیان کو دیکھنا چاہئے، یہ عورتوں کے ساتھ زیادتی اور ان کی حق تلفی نہیں ہے؛ بلکہ یہ ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کے تحفظ کی تدبیر ہے۔

اسلام کی تعلیمات اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں، قرآن نے لباس کے دو بنیادی مقصد بتائے ہیں: ایک یہ کہ وہ تمہاری قابلِ شرم چیزوں کو چھپاتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ تمہارے لئے زینت کا سامان ہے: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا﴾ (الاعراف:

۲۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض عورتیں لباس پہن کر بھی بے لباس ہوتی ہیں، ان کا مزاج یہ ہے کہ وہ دوسروں کو ریجھاتی ہیں اور خود دوسروں پر ریجھتی ہیں، ان کے سر یعنی بالوں کی وضع ایسی ہوتی ہے کہ گویا اونٹ کے کوہاں ہیں، وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گی؛ بلکہ جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہیں گی؛ حالاں کہ اس خوشبو کو طویل مسافت سے محسوس کیا جاسکتا ہے: "۔۔۔ نساء کاسیات عاریات ممیلات مائلات الخ" (مسلم، کتاب اللباس، حدیث نمبر: ۵۵۸۲)

اگر جسم پر لباس ہو؛ لیکن اتنا باریک کہ جسم کی رنگت نظر آتی ہو، اتنا چست کہ جسم کی ساخت نمایاں ہوجائے، تو یہ لباسِ بے لباسی ہے، ایسا لباس جو نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے اور ہوسناک نگاہوں کی طلب میں اضافہ کا سبب بنتا ہے، یہ لباس نہیں ہے؛ بلکہ جسم کی نمائش کا ایک طریقہ ہے، خاص کر جب کوئی عورت ایسا لباس پہن کر اجنبی مردوں کے درمیان جائے تو یقیناً اس سے انسان کے نفسانی جذبات کو بڑھاوا ملتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خادمہ میمونہ بنت سعد رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جو عورت خوشبو لگا کر زینت کے ساتھ اجنبی مردوں کے درمیان جائے تو قیامت کے دن اس کے لئے ایسی تاریکی ہوگی، جسے کوئی روشنی دور نہ کرسکے گی: "۔۔۔۔۔ کمثل ظلمة یوم القیامة لا نور لها" (ترمذی، کتاب الرضاء، حدیث نمبر: ۱۱۶۸)

یہ تدبیریں اسی لئے ہیں کہ عورتیں اپنی عصمت وآبرو کو مجرمانہ ذہن کے لوگوں سے بچاسکیں اور سماج اخلاقی برائی اور گندگی سے محفوظ رہ سکے، حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ کو مامون، صاف ستھرا اور جرائم سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں طالبات کے لئے ایسے یونیفارم رکھے جائیں، جو ساتر بھی ہوں اور ڈھیلے ڈھالے بھی، یہ عجیب بات ہے کہ لڑکوں کے لئے تو ایسا لباس تجویز کیا جاتا ہے جو ڈھیلا ہو، پوری آستین پر مشتمل ہو، ٹانگیں ڈھکی ہوئی ہوں، لڑکیوں کے لئے اس سے زیادہ احتیاط مطلوب تھی، مگر ان کا یونیفارم اس کے برعکس ہوتا ہے، اسی طرح سرکاری اور پرائیویٹ دفاتر، ہوٹلوں، ہسپتالوں اور دکانوں میں بھی ایسا لباس کوڈ ہونا چاہئے، جس میں عورتیں ڈھیلا ڈھالا اور پورے جسم کو چھپانے والا لباس پہنیں؛ لیکن یہاں بھی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، مردوں کا لباس تو ان خصوصیات کا حامل ہوتا ہے؛ لیکن عورتوں کا لباس ایسا کہ بازو کھلے ہوئے، ٹانگیں عریاں، کپڑے بدن سے چپکے ہوئے، چپلیں ایسی کہ چلتے ہوئے جسم کے نشیب وفراز پوری

طرح نمایاں ہوں، اسی طرح گورنمنٹ کو ایسا قانون بنانا چاہئے کہ خواتین جب باہر نکلیں اور بازاروں اور راستوں سے گزریں تو ان کے لباس میں ستر اور حیا کی پوری رعایت ہو اور وہ سڑک چھاپ فرہادوں کو شہ دینے والا نہ ہو۔

حالاں کہ شرعی نقطۂ نظر سے تو اس سے بھی زیادہ پردہ مطلوب ہے؛ لیکن ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں تمام لوگوں کو قانونِ شریعت کا پابند نہیں بنایا جاسکتا؛ مگر کم سے کم لباس میں ان امور کا لحاظ اخلاقی نقطۂ نظر سے اور امن و امان کی برقراری کے پہلو سے بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں، اگر عورتوں کے ساتھ زیادتی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پس منظر میں کچھ خواتین تنظیمیں اٹھ کھڑی ہوتیں اور حکومت سے مطالبہ کرتیں کہ وہ ڈیزائنروں کو خواتین کے لئے ایسے ملبوسات ڈیزائن کرنے سے منع کرے، جو ہیجان انگیز ہوں، وہ اسکولوں اور کمپنیوں اور تجارت گاہوں کے لئے ایسے قانون بنائے جس میں عورتوں کے لئے لباس کوڈ مقرر کیا گیا ہو، جو انہیں ایسے واقعات سے بچانے میں ممد و معاون ہوں، وہ ایسے پوسٹروں اور اشتہارات کو منع کرے، جن میں عورتوں کو سامانِ تجارت بنادیا گیا ہے، یا ان کا کوئی جلوس مردوں کے خلاف نکلتا کہ یہ ظالم مرد، عورتوں کا استحصال کرتے ہیں، خود تو ڈھکا چھپا لباس پہنتے ہیں اور عورتوں کو بے لباس کرتے ہیں، تو یہ بات قرین عقل و انصاف ہوتی؛ لیکن اس بات پر جتنا ماتم کیا جائے، کم ہے کہ وہ اپنے اس استحصال ہی کو آزادی اور ترقی سمجھتی ہیں، انہوں نے ستم کاروں کو کرم فرما اور جفا کاروں کو اپنا وفا شعار سمجھ رکھا ہے، بہ قول حضرت ذوق:

ستم کو ہم کرم سمجھے، وفا کو ہم جفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ، تو اس بت کو خدا سمجھے

لڑکی کی شرح پیدائش میں مصنوعی طور پر کمی

قرآن مجید میں غالباً اللہ کی جس صفت کا سب سے زیادہ ذکر آیا ہے، وہ ہے صفت ''ربوبیت'' — رب کا ترجمہ فارسی میں ''پروردگار'' اور ہندی میں ''پالن ہار'' کیا جاتا ہے، اردو زبان میں ان دونوں الفاظ کے علاوہ ''پالنے والا'' اور ''پرورش کرنے والا'' بھی بولا جاتا ہے، پرورش کرنے کا عمل لمحہ دو لمحہ اور دن دو دن کا نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ مستقل نگرانی اور مسلسل نگہداشت کا عمل ہے اور پرورش وہی ذات کر سکتی ہے جس میں زیر پرورش چیز کی محبت بھی ہو، وہ اس کی ضروریات سے بخوبی واقف بھی ہو اور ان ضروریات کو پوری کرنے پر قدرت بھی رکھتی ہو؛ اس لئے اللہ کی شانِ ربوبیت دراصل اس کے وجود اور قدرت کی سب سے بڑی دلیل اور اس پر ایمان لانے کی سب سے بڑی محرک ہے؛ اس لئے قرآن مجید میں نو سو بار سے بھی زیادہ اس بات کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانیت کے اور اس پوری کائنات کے رب ہیں۔

یہ اللہ کی شانِ ربوبیت ہی ہے کہ ہم ایک ایسی کائنات میں رہتے ہیں، جس میں بے شمار سیارے اور دنیائیں موجود ہیں، جو ایک مناسب فاصلہ کے ساتھ فضاء میں اس طرح تیر رہے ہیں، جیسے سمندر میں مختلف جہاز سفر کرتے رہتے ہیں؛ لیکن یہ ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں، اگر ان کا فاصلہ ایک دوسرے سے کم ہو جائے مثلاً سورج زمین سے تھوڑا قریب آجائے تو پوری دنیا جل کر بھسم ہو جائے اور وہی دن کائنات کا آخری دن قرار پائے، یہی توازن کائنات کو تھامے ہوا اور اس کرۂ ارض کو انسان کے لئے قابلِ رہائش بنائے ہوا ہے، خود اس دنیا میں دیکھیں کہ اللہ کی لاکھوں مخلوقات ہر آن پیدا بھی ہوتی ہیں اور مرتی بھی ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شیر، ہاتھی، چیتے اور بھیڑیئے کی افزائش کا تناسب اچانک بڑھ گیا ہو اور ان کی وجہ سے زمین کی وسعت تنگ پڑنے لگی ہو، انسان کے لئے یہ مسئلہ بن گیا ہو کہ وہ اب کس جگہ قیام کرے، اس کی آبادیوں پر تو درندوں کا قبضہ ہو گیا ہے، دنیا اس عدم توازن سے بچتے ہوئے کس طرح اپنا سفر طے کر رہی ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

سائنس دانوں کے پاس اس کا جواب نہیں ہے، انسانیت کو اس کا جواب اللہ کے بھیجے ہوئے

پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعہ ملا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کے پیچھے اس کائنات کے خالق و مالک کا منصوبہ کارفرما ہے، ایسا نہیں ہے کہ دنیا اپنے آپ چل رہی ہے، لوگ خود دنیا میں آتے ہیں اور دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں؛ بلکہ خدا کا دست قدرت کائنات کے پورے نظام کو چلا رہا ہے، اور ٹکراؤ سے بچاتے ہوئے اس کے سفر کو جاری رکھے ہوا ہے، خدا کا منصوبہ جیسے کائنات کی دوسری اشیاء میں جاری وساری ہے، اسی طرح خود انسان میں بھی اس کا منصوبہ ہر آن کارفرما ہے، مثلاً ایک میاں بیوی شادی کے بعد اوسطاً بیس سے تیس سال کا عرصہ ایسا گذارتے ہیں کہ اس میں شوہر کے اندر باپ بننے کی اور بیوی کے اندر ماں بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، عام فطرت کے مطابق ایک بچہ کی ولادت اور اس کے بعد عورت کو پیش آنے والی فطری معذوری میں ایک سال سے بھی کم وقت لگتا ہے، اس طرح ہر جوڑے کو بیس پچیس اولاد ہونی چاہئے تھی؛ لیکن آج اگر ہمارے سماج میں کسی شخص کو پندرہ بیس بچے ہوں اور وہ بھی ایک ہی بیوی سے، تو لوگوں کے لئے حیرت واستعجاب کا باعث ہوگا، جن لوگوں کا عمل برتھ کنٹرول پر نہیں ہے، ان کے یہاں بھی بچوں کی تعداد اوسطاً تین چار سے زیادہ نہیں ہوتی، یہ خدا کا منصوبہ ہے کہ مرد میں باپ بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے، عورت میں ماں بننے کی پوری اہلیت ہے، بچوں کی پیدائش میں کوئی مصنوعی رکاوٹ پیدا نہیں کی جارہی ہے، پھر بھی بچوں کی حقیقی پیدائش ان کی صلاحیت کے مقابلہ بہت قلیل ہے، ورنہ اب تک دنیا کی آبادی اس کی موجودہ آبادی سے شاید دسیوں گنا زیادہ ہو چکی ہوتی۔

اسی خدائی منصوبہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسانی آبادی میں جوں جوں اضافہ ہو رہا ہے، اس کی غذائی ضروریات اور زندگی کے لئے مطلوب دوسرے وسائل میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوتا جاتا ہے، ہمارے ملک ہندوستان میں ایک زمانہ ایسا تھا کہ گیہوں کی پیداوار اس کی ضرورت سے بہت کم ہوتی تھی اور ہمیشہ امریکہ اور مغربی ملکوں کے سامنے کاسۂ گدائی بڑھانا پڑتا تھا؛ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ گورنمنٹ کے گوداموں میں گیہوں سڑ رہے ہیں اور پچھلے دو سال کے اتنے گیہوں جمع ہیں کہ گیہوں کی نئی پیداوار کے لئے رکھنے کی جگہ نہیں ہے، دودھ، دہی، انڈا اور چکن آج سے پینتالیس سال پہلے اتنے کمیاب تھے کہ سماج کے غرباء کی ان تک رسائی نہیں تھی؛ لیکن آج صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے اور شہر سے دیہات تک ہر جگہ یہ ساری چیزیں وافر مقدار میں فراہم ہیں، یہی حال

زندگی کی دوسری ضروریات کا ہے؛ چنانچہ آج واضح طور پر یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ گذشتہ بیس پچیس سال کے درمیان معیار زندگی میں غیر معمولی طور پر بہتری پیدا ہوئی ہے اور ایک ایسا معاشی انقلاب آیا ہے، جسے ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے۔

مغرب کے مذہب سے آزاد اور خدا بیزار تصورِ زندگی، مادہ پرستی اور لذت وعیش کی پرستاری نے دنیا کو یہ سوچ دی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے یا تو خدا کا کوئی منصوبہ کار فرما نہیں ہے، یا ہے تو اس لائق نہیں ہے کہ تنہا اس پر بھروسہ کیا جائے؛ اس لئے انسان کو اس کائنات سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں خود اپنا منصوبہ بنانا چاہئے، اور اپنی سوچ کے مطابق فیصلے کرنے چاہئیں، اسی تصور کے تحت یہ بات کہی گئی کہ شرح پیدائش میں اضافہ اگر یوں ہی ہوتا رہا تو مستقبل قریب میں وسائل معیشت انسانی آبادی کے لئے کم پڑ جائیں گے؛ اس لئے مصنوعی طور پر بچوں کی پیدائش پر روک لگائی جانی چاہئے، اس دعوت کو قوت پہنچانے کے لئے بہت سے سائنسی دلائل بھی فراہم کئے گئے اور قلت آبادی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے مصنوعی وسائل بھی وجود میں لائے گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اکثر مغربی ممالک میں شرح پیدائش غیر معمولی حد تک گھٹ گئی ہے اور متعدد ممالک وہ ہیں، جہاں بچے پیدا کرنے کے لئے ترغیب دی جارہی ہے اور اس پر انعامات مقرر کئے گئے ہیں، ہندوستان میں ۲۰۱۰ء کی جو مردم شماری آئی ہے، اس کے مطابق ہمارے ملک کی آبادی ایک ارب بیس کروڑ سے متجاوز ہو چکی ہے اور آبادی کے اعتبار سے ہمارا ملک دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے، آبادی کے اس اضافہ پر حسب توقع بعض ماہرین کی طرف سے اندیشوں اور پریشانیوں کا اظہار کیا جارہا ہے کہ یہ ملک کی ترقی کے لئے بہت بڑی رکاوٹ ہے اور اس سے معیشت کو غیر معمولی نقصان پہنچ سکتا ہے، افسوس کہ یہ بات بھی ان ماہرین کی آنکھ نہ کھول سکی کہ معاشی ترقی کی دوڑ میں آج وہی ممالک آگے ہیں، جو کثیر آبادی کے حامل ہیں، چین، ہندوستان، ترکی وغیرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مستقبل میں معیشت ان ملکوں کے ہاتھ میں ہوگی اور معاشی قیادت یورپ سے ایشیا کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

اس مردم شماری کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ لڑکیوں کی شرح پیدائش میں مسلسل کمی ہوتی جارہی ہے، موجودہ مردم شماری کے مطابق ایک ہزار لڑکوں پر نو سو چودہ لڑکیوں کی پیدائش کا اوسط ہے، گویا قریب قریب دس فیصد شرح پیدائش کا فرق ہے، یہ تو پورے ہندوستان کے لحاظ سے ہے؛ لیکن

ہریانہ اور پنجاب میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش میں تیس فیصد سے بھی زیادہ کا فرق ہے، یعنی ایک ہزار لڑکوں کے مقابلہ چھ سو کچھ لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں، صورت حال اتنی خراب ہو چکی ہے کہ ماہ دو ماہ پہلے راجستھان کے ایک قصبہ کی خبر شائع ہوئی تھی کہ وہاں تقریباً تیس سال کے بعد پہلی بارات آئی، پورے گاؤں میں اس کا جشن منایا گیا، اور لوگوں میں اس کی وجہ سے بے حد خوشی اور مسرت کا ماحول تھا، یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہی رجحان باقی رہا تو لڑکیوں کی گھٹتی ہوئی آبادی سے ایسے خوف ناک اخلاقی اور سماجی مسائل پیدا ہوں گے، جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور اخلاقی گراوٹ اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش کے تناسب میں یہ عدم توازن انسانی کارستانی کا نتیجہ ہے، بعض سماجی رسوم ورواج کی وجہ سے لڑکیوں سے فرار اختیار کرنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے اور پی، این، ڈی، ٹی قانون — جو حالتِ حمل میں جنس کے دریافت کرنے کو جرم قرار دیتا ہے — کے باوجود لالچی ڈاکٹر اور خدا ناترس ماں باپ قبل از پیدائش جنس کی شناخت میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں اور پھر رحم مادری ہی میں لڑکیوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، یہ بھی خدا کے منصوبہ میں دخل دینے کی ایک بدترین صورت ہے، انسان نامعلوم تاریخ سے کرۂ ارض پر زندگی گذار رہا ہے، ہمیشہ ایک توازن کے ساتھ لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش ہوتی رہی ہے؛ اسی لئے کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ فلاں آبادی میں لڑکے ہی لڑکے پیدا ہورہے ہیں یا کسی مقام پر صرف لڑکیاں پیدا ہورہی ہیں؛ بلکہ انسان کے کسی منصوبہ کے بغیر از خود لڑکے اور لڑکیوں کی پیدائش اسی تناسب سے ہوتی رہی ہے، جس کی انسانی معاشرہ کو ضرورت ہے، یہ دراصل انسان کے خالق و مالک کا مقرر کیا ہوا منصوبہ ہے؛ لیکن جب انسان فطرت سے بغاوت پر اتر آتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، کبھی ظالمانہ جنگیں مردوں کی آبادی کو متأثر کرتی ہیں، کبھی لڑکیوں سے راہ فرار کی وجہ سے عدم توازن پیدا ہوجاتا ہے؛ اس لئے محض قانون کا بنانا کافی نہیں ہے، سوچ کا بدلنا ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ کائنات خدا کے منصوبہ کے مطابق چل رہی ہے، خدا کا بنایا ہوا منصوبہ اور قائم کیا ہوا نظام ہی انسانیت کے لئے نفع بخش اور اس کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہے، انسان اگر اپنے عمل کے ذریعہ اس میں رخنہ پیدا کرے تو خود اسی کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا، اگر یہ یقین پیدا ہوجائے اور اس سچائی کو انسان اپنے سامنے رکھے، تب ہی ایسی برائیوں کا تدارک ہوسکتا ہے۔

بے صبری — ایک قومی بیماری

عالم آخرت میں اچھے انسان کو جونعمتیں حاصل ہوں گی، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں اسے انتظار کی زحمت سے دوچار ہونا نہیں پڑے گا، انسان جس وقت جو چاہے گا، بروقت اسے وہ چیز حاصل ہوجائے گی، دنیا میں انسان کو جہاں اور بہت سی مشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے صبر اور انتظار کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے، انسان درخت لگاتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ جلد سے جلد اس کے پھل کھائے، اس کے ہرے بھرے پتوں سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈی کرے اور اس کی گھنی چھاؤں کے سائے سے مستفید ہو؛ لیکن اس کو اس کے لئے برسہابرس انتظار کرنا پڑتا ہے، تب جا کر کہیں اس کی آرزو برآتی ہے، اگر انسان جلد بازی سے کام لے اور کہیں لگے لگائے ہوئے پھل دار درخت کو لاکر اپنی زمین میں لگادے تو اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہو پائیں گی اور درخت بارآور نہیں ہوگا۔

یہی حال زندگی کے دوسرے مسائل کا بھی ہے، انسان کاروبار شروع کرتا ہے اور مدتوں بعد اس کی ساکھ قائم ہوتی ہے، ہر انسان اپنے بچہ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتا ہے؛ لیکن جہدِ مسلسل کے ساتھ ساتھ پندرہ بیس سال کے انتظار کے صبر آزما لمحات سے گذرنے کے بعد ہی کہیں اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے، تخریبی کاموں میں تو زیادہ وقت نہیں لگتا؛ لیکن اکثر تعمیری کاموں میں صبر اور انتظار کی طویل گھڑیوں سے گزرنا پڑتا ہے، کئی منزلہ بلڈنگ چند روز میں زمین بوس کی جاسکتی ہیں؛ لیکن اتنی ہی اونچی بلڈنگ اگر تعمیر کرنی ہوتو بعض اوقات اس کے لئے ایک سال کی مدت بھی ناکافی ہوجاتی ہے، یہ صورتِ حال جیسے انفرادی معاملات میں ہے، ویسے ہی قومی اور اجتماعی مسائل میں بھی ہے، اگر کوئی ایسا شخص اقتدار پر مسلط ہوجائے جو قوم وملت کے لئے مفید نہیں ہوتو ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کے خلاف ہنگامہ شروع کردیا جائے، لوگ سڑکوں پر آجائیں، مخالفین کی جان سے کھیلا جائے، عوامی املاک کو تباہ وبرباد کردیا جائے اور کشت وخون کے ذریعے انقلاب برآمد کیا جائے، یہ

بے صبری اور جلد بازی کا طریقہ ہے، اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے، سماج میں لاقانونیت کا مزاج پیدا ہوتا ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صبر سے کام لیا جائے، امن وامان کو قائم رکھتے ہوئے اپنے مقصد کے لئے سعی کی جائے، ان میں سے پہلا راستہ تخریب کا ہے، اس سے ملک کا سیاسی نظام غیر مستحکم ہوجاتا ہے اور جہاں سیاسی استحکام نہیں ہو، وہاں ترقی بھی رُک جاتی ہے، فلاحی منصوبے بنانے، رفاہی کاموں کو انجام دینے، تعلیمی اور صنعتی ترقی پر توجہ کرنے اور ملک کے دفاع اور سلامتی کو مضبوط کرنے کی طرف توجہ نہیں ہو پاتی۔

اس وقت مصر میں عوامی رائے سے منتخب صدر محمد مرسی کو فوج کی طرف سے بہ جبر عہدۂ صدارت سے ہٹادینا وہی تخریبی طریقہ ہے، جو بے برداشت ہونے کی نفسیات پر مبنی ہے، اس وقت پوری دنیا میں جمہوریت کو ایک آئیڈیل سیاسی نظام کی حیثیت سے قبول کرلیا گیا ہے، جمہوریت کا ایک مفہوم تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین پر اللہ کے بھیجے ہوئے قانون کے بجائے جمہور کا بنایا ہوا قانون نافذ کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، اسلام کا تصور یہ ہے کہ جو ذات کائنات کی خالق اور رب ہے، بنیادی طور پر اسی کو قانون بنانے کا حق حاصل ہے اور اسی کا بنایا ہوا قانون انسانیت کے لئے مفید اور موزوں ہوسکتا ہے؛ لیکن جمہوریت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی شخص یا خاندان کو اپنے طور پر مسلط ہوجانے کا حق نہیں؛ بلکہ یہ عوام کا حق ہے کہ وہ اپنے لئے حکمراں کا انتخاب کریں، اگر عوام کی رائے سے منتخب حکومت شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے قانون کو نافذ کرتی ہے اور حسبِ ضرورت انتظامی قوانین وضع کرتی ہے تو یقیناً یہ جمہوری طرزِ حکومت بادشاہت اور آمریت کے مقابلہ اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہوگا۔

جمہوری نظام کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کے لئے قانونی راستہ موجود ہوتا ہے، عوام ووٹ کی طاقت استعمال کر کے ایک حکمراں کی جگہ دوسرے حکمراں کو لاسکتے ہیں، اس سے ملک میں امن و امان قائم رہتا ہے، سیاسی استحکام پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی وجہ سے سرمایہ کاری ہوتی ہے، معیشت کو فروغ حاصل ہوتا ہے، تعمیری کاموں کی طرف توجہ کا موقع ملتا ہے، دنیا کی دوسری قوموں کے درمیان اس کی بہتر شناخت بھی قائم ہوتی ہے؛ البتہ اس کے لئے صبر وانتظار کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو لوگ اقتدار میں نہیں ہیں، وہ اگلے الیکشن تک انتظار کرلیں، وہ تخریب میں مبتلا ہوئے بغیر حکومت کی مدد

کرتے ہوئے اس کی کارکردگی پر نظر رکھیں، تعمیری تنقید کے ذریعے ایک ذمہ دار اپوزیشن کا رول ادا کریں، پھر جب الیکشن کا وقت آئے تو اپنا موقف عوام کے سامنے رکھیں، رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کریں اور پورے وقار کے ساتھ امن وامان کے ماحول میں اقتدار کی کرسی کو زینت بخشیں، قرآن نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہی صبر ہے، جس کے ذریعے انسان امامت واقتدار کے مرتبے تک پہنچتا ہے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾ (السجدة: ۲۴)

ان دونوں طرزِ عمل کی بہترین مثال ہندوستان اور پاکستان ہے، یہ دونوں ممالک ایک ساتھ آزاد ہوئے، دونوں کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل تھے؛ لیکن ہندوستان نے جمہوریت کا راستہ اختیار کیا، یہاں حزب اقتدار نے اپوزیشن کے وجود کو کھلے دل سے قبول کیا، پارلیمانی نظام میں ان کو پوری اہمیت دی، حزب اختلاف نے بھی پارلیمنٹ کے اندر اپنا موقف پیش کرنے کا رویہ اپنایا، کبھی احتجاج بھی کیا تو پُر امن، ایسا نہیں ہوا کہ احتجاجیوں کے انبوہ نے پارلیمنٹ کو گھیر لیا ہو، وزیر اعظم ہاؤس پر ہلّہ بول دیا ہو اور حزب اقتدار کے دفاتر نذر آتش کر دیئے ہوں؛ لیکن دوسری طرف پاکستان کو تقریباً نصف مدت فوجی آمریت کے تحت اپنا سفر طے کرنا پڑا، بے مہار فوجیوں نے منتخب قیادت کو ہٹا کر خود قصر اقتدار پر قبضہ کر لیا اور غیر قانونی طور پر حکومت تبدیل کی جاتی رہی، اس کا نتیجہ سامنے ہے کہ یہ ملک معاشی اعتبار سے دنیا کے پسماندہ ترین ممالک میں سے ہے، دہشت گردی نے لوگوں کو خوف وہراس میں مبتلا کر رکھا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس ملک کے باشندوں کے لئے اپنے ملک کی نسبت ننگ وعار بن چکی ہے، یہ اسی بے صبری کا نتیجہ ہے!

رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی کہ مسلمان صبر اور ثابت قدمی کا دامن نہ چھوڑیں، مکی زندگی میں بعض صحابہ ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق جہاد کی اجازت طلب کرتے تھے؛ لیکن آپ ہمیشہ صبر کی تلقین فرماتے تھے، آپ چاہتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو، تشدد سے بچا جائے، اہل مکہ سے آپ کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں کو پُر امن طور پر اپنے دین پر چلنے کی اجازت دی جائے، اگر اہل مکہ کو اپنے دین ہی پر اصرار ہو تو وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کریں؛ لیکن دوسروں کو اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے میں رکاوٹ نہ بنیں: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون: ۶) مدینہ جانے کے بعد بھی آپ نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کے اور اہل مکہ کے درمیان امن وامان کی فضاء قائم ہوجائے، یہاں تک

کہ آپ نے آگے بڑھ کر اور اہل مکہ کی شرطوں کو مانتے ہوئے صلح حدیبیہ فرمائی، پھر جب اہل مکہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ کے لوگ مارے گئے، تب بھی آپ نے اہل مکہ کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ مقتولین کا خوں بہا ادا کر دیں؛ لیکن جب اہل مکہ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے تو آخری چارۂ کار کے طور پر آپ ﷺ نے فوج کشی فرمائی، پھر بھی کوشش کی کہ لوٹ مار اور قتل وغارت گری کی نوبت نہ آئے، یعنی آپ ﷺ ۲۱ رسال صبر وانتظار کا راستہ اختیار کرتے ہوئے فتح مکہ کی منزل تک پہنچے۔

خلافتِ راشدہ میں بھی ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں، جن میں بعض حضرات کو خلیفہ وقت سے اختلاف ہوا اور انھوں نے برملا اپنے اختلاف کا اظہار کیا؛ بلکہ بعض دفعہ سخت لب ولہجہ بھی اختیار کیا، ایسا بھی ہوا کہ بعض خلفاء کے ہاتھ پر بعض حضرات نے دیر سے بیعت کی؛ لیکن کبھی بھی تشدد اور لاقانونیت کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا، جب کسی قوم میں صبر وانتظار کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ پُرامن انقلاب کے ذریعے تبدیلی لاتی ہے تو وہ دشمنوں کی سازشوں اور ان کے استحصالی منصوبوں سے محفوظ رہتی ہے: ﴿وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا﴾ (آل عمران: ۱۲۰) اور جب اسی عمل کو لاقانونیت کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے تو قومیں اپنے دشمنوں کا آلۂ کار بن جاتی ہیں، جیسا کہ اس وقت مصر کی صورت حال ہے کہ فوج اور اپوزیشن امریکہ واسرائیل کے چشم وابرو کے اشارہ پر کام کر رہی ہیں، خود ''اخوان'' کے لئے بھی شاید موجودہ حالات میں یہ بات زیادہ بہتر ہوتی کہ وہ احتجاج کے بجائے موجودہ صورتِ حال کو قبول کرتے ہوئے آئندہ الیکشن کی تیاری کرتے اور اس سلسلہ میں ترکی کی موجودہ حکومت کو مشعل راہ بناتے، جس نے تصادم کے بجائے عوام کے سامنے جانے کو ترجیح دی اور بالآخر فوج کو حکومت ان کے حوالہ کرنی پڑی۔

افسوس کہ مسلمان' جن کو عدل اور اعتدال کی تعلیم دی گئی تھی' ان میں بے صبری اور وقت سے پہلے اپنے مقصد کو حاصل کر لینے کا مزاج ہر سطح پر عام ہو گیا ہے، مسلمان مذہبی وسیاسی تنظیمیں ہوں، جماعتیں اور ادارے ہوں، دینی مدارس وجامعات ہوں، افراد واشخاص ہوں، ایک عمومی مزاج یہ ہے کہ جو شخص اقتدار پر ہو، وہ اپوزیشن کو بالکل برداشت کرنا نہیں چاہتا اور چاہتا ہے کہ سارے لوگ دل ودماغ کی آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات کو قبول کرتے جائیں، سارے فیصلے وہ تنہا اپنی رائے سے

کرے اور جو لوگ ذمہ داروں سے اختلاف رکھتے ہیں، ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح قانونی یا غیر قانونی راستہ سے وہ موجودہ شخص کو اُتار پھینکیں اور خود مسلط ہو جائیں، جمہوری مزاج کے فقدان، بے صبری اور بے برداشت ہونے کی کیفیت ایک طرف مسلمانوں کی شبیہ دوسری قوموں کے سامنے خراب کر رہی ہے، دوسری طرف خود اُمت میں اختلاف، جدال اور تشدد کو جنم دے رہی ہے، مسلمان کے ہاتھ خود دوسرے مسلمان کے خون سے رنگین ہوتے رہتے ہیں اور ان کی اس ناسمجھی، عاقبت نا اندیشی اور اپنے نفع ونقصان سے بے خبری پر دنیائے کفر خندہ زن رہتی ہے، کاش! ملت اسلامیہ کے مزاج میں ایک بنیادی تبدیلی آئے اور وہ اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کو کامیابی کی کلید بنایا ہے نہ کہ بے صبری اور جلد بازی کو: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾ (الاحقاف:۳۵)

❁

سفرنامے

رابطۂ عالم اسلامی کی مکہ مکرمہ کانفرنس
نظام اور پیغام

۱۴؍ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۸؍مئی ۱۹۶۲ء کو مکہ مکرمہ میں عالم اسلام کی نمائندہ شخصیتوں کی ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں عالم اسلام کی نمائندہ شخصیتوں نے شرکت کی، کانفرنس میں رابطہ عالم اسلامی کے قیام کے سلسلہ میں تجویز منظور ہوئی؛ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں باضابطہ اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا، جس کا بنیادی مقصد وحدت اُمت کو روبعمل لانا اور اسلام کا تعارف و دعوت کی جدوجہد کرنا ہے، یہ ادارہ نہ صرف عالم اسلام میں؛ بلکہ عالمی سطح پر وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو اور یونیسف میں بھی اس کی نمائندگی ہے اور اقوام متحدہ کی مختلف ذیلی مجلسوں میں مشاہد کی حیثیت سے اس کی شرکت ہوتی ہے، اس کے مختلف شعبے رابطہ کے مقاصد واہداف کو پورا کرنے کے لئے قائم ہیں، جن میں ''**المجلس الاعلی العالمی للمساجد**'' (قائم شدہ: ۱۳۹۵ھ) اور ''**المجمع الفقهی الاسلامی**'' (قائم شدہ: ۱۳۹۸ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رابطہ کو اس کی عظیم دعوتی، علمی اور ملی خدمات کی وجہ سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں قبولیت اور پذیرائی حاصل ہے، اس ادارہ کی خدمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ عالم اسلام اور اُمت مسلمہ کو درپیش اہم مسائل پر غور وفکر کے لئے پوری دنیا سے علماء اور دانشوروں کو طلب کرتا ہے، تبادلہ خیال کا موقع فراہم کرتا ہے اور اِن مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے؛ چنانچہ گذشتہ چند مہینوں کے درمیان عالم اسلام اور خصوصاً عالم عرب میں حکومتوں کے خلاف احتجاج اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا، جو تیونس، مصر اور لیبیا میں کامیابی سے ہمکنار ہو چکا ہے، یمن میں کامیابی کے قریب ہے اور انصاف و آزادی کے حصول کی ایسی ہی کوشش شام میں حکومت کی سفاکی اور ظلم و جور کا شکار ہے، اس پس منظر میں ضرورت تھی کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان حالات کا جائزہ لیا جائے اور مسلمان حکمرانوں کو اور عوام کو ایسے مشورے دیئے جائیں، جو شریعت اسلامی کے مطابق بھی ہوں اور امن و آشتی کے قیام میں

معاون بھی؛ چنانچہ رابطہ نے ۲۲ تا ۲۴ر شعبان ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۳ تا ۲۵ر جولائی ۲۰۱۱ء کو مکہ مکرمہ میں ایک عالمی کانفرنس منعقد کی ، جس کا عنوان تھا: ''**العالم الإسلامی — المشکلات و الحلول**'' (عالم اسلام — دشواریاں اور حل) ۔

اس سیمینار میں مسلم اور عرب ملکوں کی تو خاصی نمائندگی تھی ہی، مسلم اقلیتی ممالک — ہندوستان، امریکہ، برطانیہ، جاپان، چین، جنوبی افریقہ وغیرہ — کے نمائندے بھی شریک تھے، ہندوستان سے اس حقیر کے علاوہ مولانا سید جلال الدین انصر عمری (امیر جماعت اسلامی ہند)، مولانا سید سلمان حسینی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) اور کیرالا کے بعض مندوبین بھی شریک تھے، حیدرآباد سے ابلاغ کے نمائندہ کی حیثیت سے عزیزی مولانا ثناء اللہ قاسمی (ای، ٹی، وی، اُردو) بھی مدعوین میں شامل تھے، خوشی کی بات ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک سے ان ممالک کی نمائندگی کرتے ہوئے متعدد ہندوستان نژاد علماء و اہل دانش نے شرکت کی، جن میں کویت سے مولانا بدرالحسن قاسمی (نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، مقالات کی تعداد تو زیادہ تھی، اس حقیر کا مقالہ ''**الفرقة و النزاعات الطائفية و استغلال الأعداء لها**'' (اُمتِ مسلمہ میں فرقہ وارانہ اختلافات اور اعداء اسلام کی طرف سے اس کا استحصال) تھا، اس حقیر نے اپنی تحریر میں مذہبی، نسلی، علاقائی اور سیاسی بنیادوں پر اختلافات کے اسباب اور ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور خاص طور پر مسلم حکومتوں سے درخواست کی ہے کہ سیاسی اختلافات کے لئے مذہب کو آلہ کار نہ بنایا جائے؛ لیکن چند مقالات ہی نشستوں میں پڑھنے کے لئے منتخب کئے گئے؛ چوں کہ اصل بحث عالم اسلام کی تھی، اس لئے مسلم ممالک کے مقالہ نگاروں کو ہی پیشکش کا موقع دیا گیا۔

افتتاحی نشست میں خوش الحان قاری اور جدہ کے مقبول امام و خطیب ڈاکٹر عبداللہ بصفر نے تلاوت کی، ڈاکٹر فتحی خلیل محمد گورنر شمالی ریاست سوڈان نے بحیثیت مہمان خطاب کیا، رابطہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبد اللہ بن عبد المحسن ترکی نے خیر مقدمی کلمات کہے اور کانفرنس کے موضوع کی وضاحت کی اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز آل الشیخ نے کلیدی خطبہ دیا، اس نشست کے اختتام پر خادم حرمین شریفین شاہ عبداللہ کا خطاب ہونا تھا؛ لیکن ان کی طرف سے مکہ مکرمہ کے گورنر شیخ خالد الفیصل نے اپنے موضوع پر پر مغز خطبہ دیا، اس طرح ۲۲ر شعبان کو بعد ظہر تا عصر یہ افتتاحی

نشست منعقد ہوئی، اس کے بعد موضوع کے مختلف پہلوؤں پر سات نشستیں منعقد ہوئیں، ڈاکٹر حسان حامد حسن (دبئی اسلامک بینک) ڈاکٹر صالح بن عبداللہ بن حمید (چیف جسٹس سعودی عرب) شیخ محمد احمد حسین (مفتی اعظم فلسطین) ڈاکٹر وہبہ زحیلی (شام) شیخ محمد حسن دودو (موریطانیہ) ڈاکٹر محمد عثمان صالح (سوڈان) ڈاکٹر محمد احمد لوح (سینگال) ڈاکٹر احمد محمد ھلیل (چیف جسٹس اُردن) نے ان نشستوں کی صدارت کی، پہلی نشست میں شیخ عبدالفتاح مورو (تیونس) نے اسلامی حمیت سے معمور خطاب کیا اور بنیادی باتوں کی طرف توجہ دلائی، انھوں نے کہا:

افسوس ہے کہ مسلمانوں میں اُمت ہونے کا تصور ختم ہوگیا ہے، اور علاقائیت کو مسلمانوں نے اپنالیا ہے؛ حالاں کہ مسلمانوں کے لئے باہمی رشتہ کی بنیاد دین ہے نہ کہ زمین، آپ نے اس بات پر بھی افسوس ظاہر کیا کہ ہمارے فقہی ذخیرہ میں عبادات پر تو بے شمار کتابیں ہیں؛ لیکن اسلام کے نظام سیاست پر محض دو چار کتابیں ہیں؛ اس لئے ضرورت ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام پر کام ہو اور باضابطہ مجموعہ قوانین' مرتب ہو، انھوں نے کہا کہ کسی باعزت قوم کو یہ بات زیبا نہیں کہ اس کی آنکھوں پر جو عینک ہو، اس کے جسم پر جو پوشاک ہو اور سواری کے لئے جو گاڑی میسر ہو، ان کے بشمول سوئی سے لے کر جہاز تک دوسری قوموں کی صنعت و ٹکنالوجی کی محتاج ہو، اس لئے مسلم ممالک کا فریضہ ہے کہ وہ جدید ٹکنالوجی کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، شیخ تیونس کے مشہور اسلامی مفکر و مصنف ہیں اور چالیس سال تک ایک اسلامی داعی و مفکر ہونے کے جرم میں جیل کی سزا کاٹ چکے ہیں۔

پیش کئے جانے والے تقریباً سبھی مقالات گہری فکر اور علمی بصیرت کا مظہر تھے، مولانا محمد تقی عثمانی —— جو رابطہ کی فقہ اکیڈمی کے ممبر بھی ہیں —— کا مقالہ بھی پسند کیا گیا، اگرچہ انھیں صرف دس منٹ کا وقت ملا اور وہ کچھ منتخب اقتباسات ہی سنا پائے، ان کی تحریر کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ انھوں نے شورائی نظام پر توجہ دلائی، ولی امر اور رعایا کے حقوق بیان کئے، یہ بتایا کہ رعایا کو حکومت پر تنقید کرنے کا حق حاصل ہے؛ البتہ تنقید اور اہانت میں فرق ہے؛ چوں کہ مولانا عثمانی اور متعدد مقالہ نگاروں کی تحریر میں بار بار اطاعت امیر کی بات کہی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''**أطیعوا االله وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم**'' سے استدلال کیا تھا، اس لئے مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے مناقشہ میں گرم جوش حصہ لیتے ہوئے یہ نکتہ اُٹھایا کہ اللہ تعالیٰ نے ''تم میں سے امراء'' کی اطاعت کا حکم دیا

ہے، یعنی ایسے حکمراں جو مسلمان ہوں؛ لیکن اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مسلم ممالک کے جو حکمراں ہیں، وہ عمومی طور پر دائرہ اسلام سے باہر نکل چکے ہیں، وہ احکام شریعت کے منکر ہیں، مسلّمات دین پر پابندی لگاتے ہیں اور مسلمانوں کے نمائندہ ہونے کے بجائے اعداء اسلام کے ایجنٹ ہیں، ایسے لوگوں کی اطاعت کیوں کر کی جاسکتی ہے؟ عبدالفتاح مورو کے خطاب اور مولانا ندوی کی اس تعلیق پر لوگوں نے کچھ اس طرح تحسین وآفرین کے کلمات کہے کہ گویا یہ اکثر حاضرین کے دل کی آواز تھی۔

سیمینار کے درمیان روزانہ رابطہ عالم اسلامی کے ترجمان ''العالم الاسلامی'' کی خصوصی اشاعت بھی عمل میں آتی رہی، جس میں سیمینار میں آنے والے اہم مقالات کے اقتباسات نمایاں طور پر شائع کئے جاتے تھے؛ چنانچہ ۲۳ ؍جولائی کے شمارے میں مولانا بدرالحسن قاسمی کی تحریر کے اقتباسات اور ۲۴ ؍جولائی کے شمارہ میں مولانا محمد تقی عثمانی اور اس حقیر کی تحریر کے منتخب اقتباسات شائع کئے گئے۔

سیمینار کی اختتامی نشست ۲۵ ؍جولائی کو شام ۹ تا ۱۰ بجے منعقد ہوئی، جس کی صدارت مفتی اعظم سعودی عرب نے کی، سعودی عرب کی اہم علمی ودعوتی شخصیت ڈاکٹر عبداللہ معتوق نے خطاب کیا، اختتامی بیان پیش کیا گیا، جو کچھ لفظی ترمیمات کے ساتھ منظور ہوا، شیخ عبداللہ عبدالمحسن ترکی نے تجاویز کی مختصر وضاحت کی اور خوشخبری سنائی کہ خادم حرمین شریفین نے حکم دیا ہے کہ یہ اجلاس ہر سال منعقد کیا جائے اور آپ سبھی حضرات اس کے مستقل شرکاء ہوں گے، اخیر میں مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز آل شیخ کے مختصر خطاب پر کانفرنس اختتام پذیر ہوئی، کانفرنس کے درمیان ایک وقت شاہ عبداللہ سے ملاقات کا بھی رکھا گیا تھا، جس کے لئے تمام مہمانوں کو جدہ لے جایا گیا، اس ملاقات کے لئے چالیس منتخب مندوبین ہی کے نام رکھے گئے تھے، جس میں اس حقیر کا نام بھی شامل تھا؛ لیکن چوں کہ کانفرنس کی نشستوں کے تسلسل کی وجہ سے عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد دوبارہ مسجد حرام جانے کا موقع نہیں ملا تھا؛ اس لئے میں نے مسجد حرام میں وقت گذارنے کو جدہ جانے پر ترجیح دی، معلوم ہوا کہ اس ملاقات میں شاہ نے کانفرنس سے متعلق اچھے تاثرات کا اظہار فرمایا، کانفرنس میں بحیثیت مجموعی ایشیاء، یورپ، امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا کے ۶۷ ملکوں سے ۲۲۲ افراد شریک ہوئے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ رابطہ کے شعبۂ کانفرنس کے ذمہ دار محترم ڈاکٹر رحمت اللہ عنایت اللہ احمد جو ہندوستان کے

معروف مصنف، عالم، صاحب نسبت بزرگ اور تقابل ادیان کے ماہر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ (بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ) کے خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، انھوں نے نہایت خوش سلیقگی اور انتظامی مہارت کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں انجام دیں اور تمام مہمانوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور کشادہ چشمی سے پیش آتے رہے، **فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔**

رابطہ کی اس کانفرنس میں بحیثیت مجموعی چار موضوعات زیر بحث آئے، اول: موجودہ حالات اور دشواریاں کیا ہیں اور اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ دوسرے: حکومت اور عوام کے حقوق کیا ہیں اور ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ تیسرے: مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان مذاکرات کی اہمیت اور طریقۂ کار؛ تاکہ امت کو انتشار وافتراق سے بچایا جا سکے، چوتھے: اِس وقت عالم اسلام کو جو دشواریاں درپیش ہیں ان کا حل کیا ہے؟—— ان ہی موضوعات کے پس منظر میں اختتامی بیان جاری ہوا، جو پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک اہم پیغام کا درجہ رکھتا ہے، اس بیان میں بحیثیت مجموعی سات مرکزی عنوانات کے تحت تجاویز منظور کی گئیں۔

ان میں پہلی تجویز شریعت اسلامی پر ثابت قدمی کی اہمیت سے متعلق ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ نوجوان نسل کو دینی حقائق سے واقف کرانا چاہئے، اس کے لئے وسائل فراہم کرنا چاہئے، مسلم حکومتوں کو بھی اور عوام کو بھی شریعت اسلامی پر عمل کاربند ہونا چاہئے، اسلام کی میانہ روی کو سمجھتے ہوئے اور غلو سے بچتے ہوئے شریعت کا دامن تھامے رہنا چاہئے، مذہبی فرقہ واریت سے بچتے ہوئے امت کی صفوں کو متحد رکھنا چاہئے، حکمرانوں، علماء اور عوام کو باہمی تعاون سے دشواریوں کو حل کرنا چاہئے، نیز ہر قیمت پر شریعت کے مزاج کے مطابق امن وسلامتی قائم رکھنے کو اور جان و مال، عزت و آبرو کی حرمت کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

دوسرا عنوان تھا ''فتنوں کا تدارک''—— اس عنوان کے تحت جو تجاویز منظور کی گئیں، ان میں یہ ہے کہ قتل نفس سے بچنے کا پورا اہتمام کیا جائے کہ یہ زمین میں فساد کا ذریعہ ہے، حکومتیں صالح اسلامی نظام قائم کریں، جو شورائیت، نیکی کی دعوت، برائی سے روکنے، عدل اور مسلمانوں کی خیر خواہی پر مبنی ہو، نیز ڈیموکریسی، آزادی، عوامی حکومت، مساوات اور قومیت وغیرہ کی جدید اصطلاحات کو شرعی اصول وضوابط کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی قبول کیا جائے؛ کیوں کہ ان اصطلاحات میں جو ابہام

اورعموم ہے، اس سے بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

تیسرا عنوان ''اصلاح'' کا تھا —اس عنوان کے تحت علماء سے خواہش کی گئی ہے کہ وہ مسلم ملکوں کے نظم ونسق کے درست کرنے میں حکمرانوں کی مدد کریں اور جو وضعی قوانین شریعت اسلامی سے متعارض ہوں، ان کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے لئے مناسب طریقہ کار وضع کریں، خلافت راشدہ اور اسلامی دور کے وہ عظیم نمونے پیش کئے جائیں، جو حقوق اور واجبات کے درمیان توازن پر مبنی ہیں اور جن کے ذریعہ عادلانہ نظام حکومت قائم ہوسکتا ہے، اس ذیل میں ایک اہم بات یہ بھی کہی گئی کہ مسلم حکومتیں آزاد عدالتی نظام قائم کریں اور شریعت اسلامی کے مطابق تمام مجرمین کے خلاف کاروائی کا انہیں اختیار دیں، اس کے ساتھ ساتھ بعض مسلم ملکوں میں پھیلی ہوئی غربت اور بے روزگاری کے تدارک کے لئے بعض مفید مشورے دیے گئے، جن میں ایک ''مشترک اسلامی مارکٹ'' قائم کرنا بھی ہے۔

تجاویز کا چوتھا عنوان ''حکمراں اور عوام کے تعلقات'' سے متعلق ہے— اس عنوان کے تحت دونوں کے حقوق میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تجویزوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حاکم ومحکوم دونوں کو چاہئے کہ شریعت اسلامی کو اپنے لئے حَکَم بنائیں، اجتماعی اور اقتصادی مسائل میں بھی اسلام پر عمل کریں، تمام طبقات کے حقوق ادا کریں اور ظلم سے اپنا دامن بچائیں، حکمرانی ایک اہم ترین ذمہ داری ہے، جس کا حق ادا کرنے کے لئے کتاب وسنت اور سلف صالحین کے طریقہ کو مضبوطی سے تھامے رہیں، اللہ کی شریعت نافذ کرنے والے مسلمان حاکموں کا حق ہے کہ عوام ان کے ساتھ خیر خواہی اور فرمانبرداری کا رویہ اختیار کریں، علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ حکمرانوں کو کتاب وسنت کی روشنی میں مشورے دیں اور انہیں اسلامی احکام کے تقاضوں سے واقف کرائیں، نیز دعوت دین اور مسلم معاشرہ میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ پر خصوصی توجہ دی جائے کہ مسلمانوں کی موجودہ کمزوری اور دشمنوں کے تسلط کا بنیادی سبب اسی کی کمی ہے۔

''اسلامی تنظیموں'' کا عنوان بھی اس بیان میں مستقل طور پر شامل ہے، جس میں سرکاری اور عوامی سطح پر اسلامی تنظیموں کے درمیان تعاون کی دعوت دی گئی ہے، اس قسم کی تنظیموں کا خصوصی تعاون کرنے کی حکومت اور عوام سے گذارش کی گئی ہے، نیز ان سے کہا گیا ہے کہ علماء کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو حل کریں اور ان میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی

جائے، یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اسلامی تعلیمات میں جواعتدال اور میانہ روی ہے مسلمانوں کواس سے روشناس کرانا چاہئے اور غیر مسلموں کو مساوات اور امن وسلامتی پر مبنی اسلامی نظام حیات سے آگاہ کرنا چاہئے، نیز خاص کر مسلمان اقلیتوں چیرٹیبل خدمات کی طرف توجہ دلانی چاہئے۔

چھٹا عنوان ''ذرائع ابلاغ اور ثقافت'' کا ہے— اس عنوان کے تحت کانفرنس میں مسلمانوں میں کام کرنے والے ابلاغی اور ثقافتی اداروں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ علماء، اہل دانش اور دعوتی تنظیموں کے ساتھ مربوط رہیں اور اصلاحی پہلوؤں کو لوگوں تک پہنچائیں۔

آخری عنوان ''حوار'' یعنی مذاکرات کا ہے، جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مذاکرات، مسائل کو حل کرنے اور مفاہمت پیدا کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور اس پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، جو خود مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان بھی ضروری ہے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ بھی، یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ 'رابطۂ عالم اسلامی' اسلامی ملکوں کو اپنے وفود بھیجے، جو سیاسی، مذہبی، سماجی اور ثقافتی قائدین، اہم اداروں اور تنظیموں سے ملاقات کرے اور اس کانفرنس کی تجویزوں پر عمل کرنے کی ان کو ترغیب دے — بیان کے اخیر میں خادم حرمین شریفین شاہ عبداللہ، دوسرے ذمہ داران حکومت اور رابطۂ عالم اسلامی کا اس اہم پروگرام کے انعقاد پر شکریہ ادا کیا گیا۔

اس بیان کی ایک اہم تجویز ممتاز فقہاء اور ماہرین کی مدد سے ایک ایسا مجموعہ قوانین تیار کرنا ہے جو شریعت اسلامی کی روشنی میں حکمرانوں اور محکوموں کے فرائض وحقوق کو بیان کرتا ہو، ان کا حل پیش کرتا ہو، مسلم اقلیتوں کے احکام کو واضح کرتا ہو، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ ان کے ربط کی نوعیت کیا ہو، نیز دعوت دین، تعارف اسلام اور مختلف دوسرے کاموں کو کس طرح باہمی تعاون سے انجام دیا جائے؟ اس پر روشنی ڈالتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں عالمی سطح پر مسلمانوں کو جوڑے رکھنے والے ایسے ادارہ کا وجود نہایت غنیمت ہے، رابطہ نے جو تجویزیں منظور کی ہیں، وہ تمام مسلمانوں اور خاص کر عالم اسلام کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہیں، مسلمانانِ ہند کے مسائل گو عالم اسلام سے کسی قدر مختلف ہیں؛ لیکن مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان مذاکرات ایک ایسی بات ہے کہ اس کی جس قدر ضرورت مسلم ملکوں میں ہے، شاید اس سے بھی بڑھ کر ہندوستان اور ہندوستان جیسے ممالک میں ہے، ضرورت ہے

اہل سنت اور اہل تشیع میں مذاکرات کی، ضرورت ہے دیوبندی اور بریلوی حضرات کو گفتگو کی میز پر لانے کی اور ضرورت ہے مقلدین اور غیر مقلدین کو مل بیٹھ کر گفتگو کرنے کی۔

یہ بات تو اَنہونی معلوم ہوتی ہے کہ کسی گروہ سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ اپنے افکار سے دست بردار ہوجائیں؛ لیکن ان مذاکرات کے دو فائدے حاصل ہوسکتے ہیں: ایک: اعتدال، دوسرے: اشتراک، اعتدال سے مراد یہ ہے کہ بے موقع اور بے محل اختلافی امور کو زیر بحث نہ لائیں، علماء عوام میں اختلافات کو نہ لے جائیں، علمی مجلسوں تک محدود رکھیں، صحابہ اور اہل بیت کی عظمت کو ملحوظ رکھیں، جن کا کافر ہونا متفق علیہ نہیں، اُن کی تکفیر سے بچیں، تمام سلف صالحین کا احترام کریں، اور اختلافی مسائل کو اپنی درسگاہوں اور اپنی خصوصی مجلسوں کے دائرے سے باہر لانے کی کوشش نہ کریں۔

اشتراک سے مراد یہ ہے کہ بہت سے مسائل وہ ہیں، جو پوری امت کے لئے مشترک ہیں، ایسے مشترک مسائل کے لئے سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں، اور ''بنیان مرصوص'' بن کر باہمی اشتراک سے اپنے مسائل حل کریں، یہ اشتراک پوری ملت کے لئے سودمند ہوگا؛ لیکن یہ اسی وقت ہوسکے گا، جبکہ مختلف مکاتب فکر کے اندر اعتدال ومیانہ روی پیدا ہو، ایک دوسرے کی رعایت ہو؛ کیوں کہ اگر ایک اسٹیج پر ہم ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی کریں گے تو یہ کیونکر ممکن ہوگا کہ دوسرے اسٹیج پر ایک دوسرے کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھ کر اتحاد و یک جہتی کا مظاہرہ کرسکیں اور متفقہ قدم اٹھانے میں ایک دوسرے کے معاون ہوں، خدا کرے دیوار کعبہ کے سایہ سے اٹھنے والی یہ تجویزیں سوئے ہوئے دلوں کو جگانے اور غافلوں کو متوجہ کرنے میں مؤثر و کارگر ثابت ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کا سیمینار

عالمی سطح پر مسلمانوں کی جو مذہبی تنظیمیں ہیں، ان میں سرِ فہرست رابطہ عالم اسلامی (world muslim league) ہے جس کا دفتر مکہ مکرمہ میں واقع ہے، ملت اسلامیہ کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ۱۸؍ مئی ۱۹۶۲ء میں اسلامی کانفرنس کی قرار داد کے ذریعہ اس تنظیم کی بنیاد رکھی گئی، ذوالحجہ ۱۳۸۴ھ میں رابطہ نے مکہ مکرمہ میں اپنی دوسری عالمی کانفرنس منعقد کی، یہ کانفرنس ۱۵ تا ۲۲ ذوالحجہ تک جاری رہی، اس کانفرنس نے طئے کیا کہ رابطہ کے تحت 'انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی' قائم کی جائے، جو عالم اسلام اور مسلمانوں کو پیش آنے والے شرعی مسائل کے بارے میں بحث کرے اور ان کا حل نکالے، ۱۳۸۵ھ میں رابطہ کی مجلس تاسیسی نے فقہ اکیڈمی کے نظام اور طریقہ کار کو متعین کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی، جس کے صدر شیخ ابراہیم آل شیخ مفتی اعظم سعودی عرب تھے اور مولانا سید ابوالحسن ندوی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، شیخ محمد بن علی الحرکان، شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز، شیخ محمد محمود صوّاف، شیخ محمد فاضل بن عاشور - رحمہم اللہ - اس مجلس کے رکن مقرر کئے گئے، ۱۳۹۳ھ میں رابطہ کی مجلس تاسیسی نے اکیڈمی کے انتظامی امور کے لئے بھی ایک مجلس کی تشکیل کی، مولانا مودودی، شیخ محمد بن علی الحرکان، حسنین مخلوف کے بہ شمول چوٹی کے عرب فضلاء کل دس افراد اس کمیٹی کے رکن مقرر کئے گئے، اکیڈمی کا پہلا فقہی سیمینار شعبان ۱۳۹۸ھ میں منعقد ہوا، ہر دور میں عالم اسلام کے ممتاز ترین فقہاء اس کے رکن رہے ہیں، ہندوستان سے مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کے بعد ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوریؒ اور ڈاکٹر فضل الرحمن (مالیگاؤں) اکیڈمی کے رکن تھے، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ وفات سے کچھ پہلے رکن منتخب ہوئے؛ لیکن سیمینار میں شرکت کی نوبت آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے، اس وقت اکیڈمی کے صدر سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز آل شیخ نائب صدر شیخ عبد اللہ بن عبد المحسن ترکی اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر صالح مرزوقی ہیں، ڈاکٹر مصطفی وہبہ زحیلی (شام)، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، رئیس محاکم شرعیہ اردن ڈاکٹر نصر فرید محمد واصل، امام مسجد حرام

ڈاکٹر احمد بن عبداللہ بن حمید، مشہور مؤلف ڈاکٹر علی احمد سالوس، اسلامی معاشیات کے ماہر ڈاکٹر حسین حامد حسان، معروف فقیہ مولانا محمد تقی عثمانی، نیز عالم اسلام کے بلند پایہ علماء وفقہاء اکیڈمی کے ارکان میں شامل ہیں، اکیڈمی کے سیمیناروں میں اس کے ارکان کے علاوہ خصوصی مدعوئیں بھی شریک ہوتے ہیں، جن میں عام طور پر پوری دنیا کے منتخب علماءِ فقہ اور ممتاز اصحابِ قلم ہوتے ہیں۔

اس حقیر کے لئے باعث صد سعادت ہے کہ ''رابطہ عالم اسلامی'' کی مجلسِ تاسیسی کے گذشتہ اجلاس میں اسے انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی کا رکن منتخب کیا گیا، اس کے بعد اکیڈمی کا اکیسواں اجلاس ۲۴ر تا ۲۸ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ مطابق ۸ تا ۱۲ دسمبر ۲۰۱۲ء کو مکہ مکرمہ میں واقع رابطہ عالم اسلامی کے مرکزی دفتر میں منعقد ہوا، اس سیمینار میں کل نو موضوعات زیر بحث تھے، ایک کا تعلق زکوۃ سے تھا کہ investment (استثمار) کے طور پر جو سرمایہ مشغول کیا جاتا ہے اور جس کی وصولی تاخیر سے ہوتی ہے، اس میں زکوۃ واجب ہونے کا کیا حکم ہے؟ تین مسائل سماجی زندگی سے متعلق تھے، ایک یہ کہ جو شخص لاپتہ ہوگیا ہو، اس کی بیوی کو کتنی مدت انتظار کرنا چاہئے؟ دوسرے: حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت کیا مانی جائے؟ تیسرے: جو لڑکیاں جسمانی طور پر بالغ ہو چکی ہیں؛ لیکن ان کی عمر ۱۸ سال سے کم ہے، ان کے نکاح کرنے کا کیا حکم ہے؟ جب کہ تین مسائل کا تعلق میڈیکل سائنس اور میڈیکل اخلاقیات سے تھا، ایک یہ کہ کیا معالج شوہر و بیوی میں سے ایک کی جسمانی کمزوری سے دوسرے کو باخبر کر سکتا ہے؟ دوسرے: جس مریض کے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو، کیا اس کا علاج موقوف کیا جاسکتا ہے؟ تیسرے: کسی شخص کو اس کے زیر ولایت مریض کے علاج کے بارے میں کیا اختیارات حاصل ہیں؟ ایک موضوع ایسے بچوں سے متعلق تھا، جن کا نسب منقطع ہو اور زانی نسب کا دعویٰ کرتا ہو۔ شرکاء کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر فیصلہ سے اجتناب کیا گیا، نیز ایک موضوع غیر معتدل علاقوں میں نمازوں کے اوقات کا تھا، سیمینار میں ارکان اور مدعوئیں کو شامل کرتے ہوئے ۲۳۰ ممتاز علماء شریک تھے، برصغیر سے بحیثیت مدعو ممتاز محقق مولانا بدر الحسن قاسمی نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا (مقیم کویت) اور کیرالا سے جناب علی کوتی مسلیار بھی شریک تھے، صحت سے مایوس مریض کے علاج کو موقوف کرنے کے سلسلے میں منتظمین نے محسوس کیا کہ اس سلسلے میں مزید فنی معلومات کی ضرورت ہے، جو ابھی حاصل نہیں ہے؛ اس لئے اس کو موقوف کر دیا گیا۔

ہر موضوع پر تین چار حضرات کو زیر بحث مسئلہ کا خلاصہ پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور ہر ایک کے لئے دس منٹ کا وقت مقرر تھا، اس حقیر کو زکوۃ سے متعلق موضوع پر عرضِ مسئلہ کی ذمہ داری سپرد کی گئی، سیمینار میں کئی مسلم ممالک کے وزراء اوقاف بھی بحیثیت رکن یا بحیثیت مدعو شریک تھے اور وہ بڑے اصحاب علم، اصحاب افتاء اور اصحاب قلم میں بھی تھے، اس سے اندازہ ہوا کہ عالم عرب میں عام طور پر اوقاف کا محکمہ اہم علمی اور دینی شخصیتوں کو دیا جاتا ہے، کاش! ہندوستان میں بھی اس روایت پر عمل ہوتا تو شاید اوقاف کے خرد برد کے واقعات اس طرح پیش نہ آتے، جو ہمارے یہاں عام ہیں۔

سیمینار میں دو موضوعات پر کافی رد و قدح ہوئی، ایک موضوع ۱۸ رسال سے کم عمر کی لڑکیوں کی شادی کا تھا، یہ موضوع اس لئے اہم ہے کہ اکثر عرب اور مسلم ممالک میں بھی تجدد پسند حکومتوں کے زیر اثر ۲۱ سال سے کم عمر کے لڑکوں اور ۱۸ سال سے کم عمر کی لڑکیوں کے نکاح کو منع کر دیا گیا ہے، متعدد عرب علماء کا رجحان تھا کہ چونکہ یہ حکم واجب کے درجہ میں نہیں ہے، ۲۱ اور ۱۸ سال سے کم عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے نکاح کرنا صرف جائز ہے اور جائز احکام میں کسی مسلم حکومت کو شرعی مصالح کے تحت کسی ایک پہلو کی تحدید کرنے کی اجازت ہے؛ اس لئے اسے درست ہونا چاہئے، بہت سے عرب فضلاء نے بھی اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی اور دوسرے علماء نے بھی، اس حقیر نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے تین باتیں عرض کیں، اول: یہ کہ نابالغ کا نکاح جواز کے درجہ میں ہے؛ لیکن جسمانی طور پر بالغ ہونے کے بعد نکاح بعض افراد کے حق میں واجب یا فرض بھی ہو جاتا ہے؛ لہٰذا بالغ ہونے کے بعد بھی ۲۱ اور ۱۸ سال تک نکاح سے روکنا صرف امر مباح میں دخیل ہونا نہیں ہے؛ بلکہ بعض دفعہ یہ ایک فرض اور واجب سے روکنے کے مترادف ہوگا، دوسرے: مباحات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کے جائز ہونے کی خود قرآن و حدیث میں صراحت آئی ہو، اس میں کسی ایک پہلو کو لازم قرار دینا اور دوسرے سے منع کر دینا حلال کو حرام کر دینے کے زمرہ میں آجائے گا، جو جائز نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ﴾ (التحریم:۱)، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار متعین کر دینی چاہی، تو ایک بوڑھی خاتون نے برسر عام اس پر تنقید کی اور حضرت عمر نے اس سے رجوع فرمالیا، نکاح کی عمر کا مسئلہ ایسے ہی مباحات کے دائرہ میں آتا ہے؛ کیونکہ قرآن و حدیث اور اجماع سے خود نابالغ کے نکاح کا درست

ہونا بھی ثابت ہے اور بالغ ہونے کے بعد تو بہ درجۂ نکاح درست ہوگا، تیسرے: ہندوستان جیسا ملک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں؛ لیکن آبادی کے اعتبار سے انڈونیشیا کے بعد سب سے بڑی مسلم آبادی اسی ملک میں بستی ہے، یہاں برطانوی عہد میں بھی عمر نکاح کی تحدید سے متعلق ''شاردا ایکٹ'' کے خلاف ہندوستان کے علماء نے احتجاج کیا تھا اور ابھی بھی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا مطالبہ ہے کہ شریعت اسلامی میں نابالغ کا نکاح کرنے کی بھی گنجائش ہے؛ اس لئے نکاح کے لئے عمر کی تحدید مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول نہیں، اگر مرکز اسلام سے اس طرح کی تجویز سامنے آئے گی تو ان کوششوں پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے، بعض اور حضرات نے بھی اس پر تحفظ کا اظہار کیا؛ چنانچہ ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی نے شرکاء کے جذبات اور مسئلہ کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع کو ملتوی کردیا، یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو حضرات عمر کی تحدید کے حق میں تھے، ان کی بھی رائے یہ تھی کہ اگر اس عمر سے پہلے نکاح کردیا جائے، تو نکاح منعقد ہوجائے گا اور نکاح کے تمام احکام جاری ہوں گے؛ البتہ یہ عمل قابلِ سرزنش ہوگا۔ مختلف حضرات نے اور خاص کر مولانا محمد تقی عثمانی اور مصر سے آئے ہوئے ایک فاضل نے انفرادی ملاقات میں میری اس بحث کو سراہا اور حوصلہ افزائی کے کلمات کہے۔

زکوۃ کے مسئلہ پر جو تجاویز منظور ہوئیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جس دَین کے وصول ہونے کی توقع نہ ہو، اس میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی، چاہے یہ مقروض کے دیوالیہ ہوجانے کی وجہ سے ہو یا ٹال مٹول کی وجہ سے ہو یا انکار کی وجہ سے ہو، اور جس دین کے وصول ہونے کی امید ہو اور وہ investment کے طور پر دیا گیا ہو تو اس میں زکوۃ واجب ہوگی؛ البتہ جو سرمایہ لگایا گیا ہو اگر چند سال کے بعد وصول ہو تو وصولی کے بعد ہی زکوۃ ادا کرنی واجب ہوگی، اس سے پہلے نہیں۔

مفقود یعنی لاپتہ شوہر کی بیوی کے بارے میں طے پایا کہ قاضی کی صوابدید پر ہوگا کہ وہ غائب ہونے سے ایک تا چار سال کی مدت تک انتظار کا حکم دے، اس مدت کے گذرنے کے بعد اس کا مال ورثہ میں تقسیم کردیا جائے اور اس کی بیوی عدتِ وفات گذارے؛ البتہ اگر عورت ضرر میں مبتلا ہو تو اس مدت کے گذرنے سے پہلے بھی قاضی علاحدگی کا فیصلہ کرسکتا ہے.................. اس حقیر کی رائے تھی کہ مالکیہ کی رائے کے مطابق اگر لاپتہ شخص نفقہ کے لئے کچھ چھوڑ کر نہ گیا ہو یا انتظار میں عورت کی عصمت کو

خطرہ ہوتو بلاتحدید مدت علاحدگی کی گنجائش ہے،جس سے ضرر میں مبتلا عورت کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے؛ اس لئے اس کے مطابق فیصلہ ہونا چاہئے؛ تاکہ ہمارا فیصلہ مذاہب اربعہ کے دائرہ سے باہر نہ ہوجائے؛ لیکن بہرحال اجتماعی طور پر وہی فیصلہ ہوا جس کا ذکر آیا، —حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت کے سلسلے میں غور کرنے کا پس منظر یہ تھا کہ طبی اعتبار سے نو ماہ کے بعد کچھ ہی عرصہ جنین ماں کے پیٹ میں رہ سکتا ہے؛اسی لئے اگر شوہر کے سفر کرنے یا وفات پانے کے دو سال بعد بچہ پیدا ہوتو خلافِ عادت ہونے اور طبی نقطۂ نظر کے مطابق مدت سے بڑھ جانے کی وجہ سے شک وشبہ پیدا ہوتا ہے،اور اختلاف رونما ہوتا ہے؛اسی لئے اکثر مسلم ممالک میں ایک سال مدت حمل مانی گئی ہے؛ چنانچہ یہ بات طے پائی کہ چونکہ زیادہ سے زیادہ مدت حمل پر قرآن وحدیث کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے،فقہاء نے زیادہ تر واقعات پر اعتماد کیا ہے اور واقعات کے سلسلے میں یہ پہلو قابلِ توجہ ہے کہ اطباء کے یہاں ایک اصطلاح ''جھوٹے حمل'' کی بھی آتی ہے،جس میں متلی بھی ہوتی ہے، ماہواری بھی رک جاتی ہے اور پیٹ میں درد بھی ہوتا ہے،اب اگر کوئی عورت دو سال سے اسی کیفیت میں مبتلا ہو اور تیسرے سال اسی حالت میں اس کو حمل ٹھہر جائے اور پھر ولادت ہوتو حقیقت میں حمل کی مدت دس ماہ سے کم ہی ہوگی؛لیکن بظاہر محسوس ہوگا کہ تین سال تک وہ عورت حمل کی حالت میں رہی ہے؛اس لئے میڈیکل تحقیق اور حسابی بھول چوک کو شامل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل ایک سال متصور ہوگی اور اگر ایک سال سے زیادہ مدت کے بعد حمل کا دعوی عورت کی طرف سے ہوتو قاضی علماء اور معتبر میڈیکل ماہرین کے مشورے اور تحقیق سے فیصلہ کرے گا۔

چونکہ کسی شخص کے عیب کو ظاہر کرنا غیبت میں داخل ہے اور یہ بھی شریعت کا اصول ہے کہ کسی بھی انسان کو نقصان اور ضرر سے بچانے کی ممکن حد تک کوشش کی جانی چاہئے،اس پسِ منظر میں یہ بات طے کی گئی کہ اگر شوہر یا بیوی ایسی بیماری میں مبتلا ہوں،جس سے دوسرے فریق کو نقصان پہنچ سکتا ہےتو ڈاکٹر کو چاہئے کہ دوسرے فریق کو اس سے مطلع کردے، یا اگر ابھی نکاح نہیں ہوا اور رشتہ نکاح کے لئے دوسرا فریق معالج سے طبی معلومات حاصل کرنا چاہےتو اگر ایک کی بیماری دوسرے کو متأثر کر سکتی ہو یا پیدا ہونے والے بچے کسی موروثی بیماری کا شکار ہوسکتے ہوں،تو ڈاکٹر کے لئے دوسرے فریق کو مطلع کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ اس کا اصل مقصد ضرر سے بچانا ہے۔

زیر ولایت شخص کے علاج کے سلسلے میں طے پایا کہ اگر مصلحت ہو تو مریض کے ولی کے لئے ضروری ہے کہ وہ میڈیکل ٹیسٹ کی اجازت دے، اگر بیماری کی نوعیت ایسی ہو کہ ولی کی اجازت لینا دشوار ہو اور فوری علاج شروع نہ کرنے میں موت کا یا بڑے نقصان کا خطرہ ہو تو علاج ولی کی اجازت پر موقوف نہیں رہے گا، یہ بحث اس پس منظر میں تھی کہ بعض دفعہ ورثہ پیسہ بچانے کے لئے مورث کے علاج کو موقوف کر دینا چاہتے ہیں اور بعض اوقات ڈاکٹر علاج کو خواہ مخواہ طول دیتا ہے یا پُر خطر طریقۂ علاج کو اختیار کرتا ہے؛ تاکہ اس کی آمدنی میں اضافہ ہو اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض کسی حادثہ کا شکار ہو گیا، اگر علاج ولی کی اجازت پر موقوف رکھا جائے تو جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، بہر صورت ایسا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہئے جس میں مریض کا مفاد ہو۔

ان کے علاوہ ایک اہم مسئلہ ان علاقوں میں نماز کے اوقات سے متعلق تھا، جو اڑتالیس تا چھیا سٹھ ارضِ بلد پر پڑتے ہیں، جہاں معتدل انداز پر نماز کے اوقات نہیں آتے، مثلاً ۲۰۔۲۲ گھنٹہ کا دن ہوتا ہے، دو گھنٹے کی رات ہوتی ہے یا اس کے برعکس، ایسے مقامات کے بارے میں اکیڈمی نے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ اگر مغرب وعشاء کے الگ الگ اوقات نہیں آتے ہوں، جیسے: سورج غروب ہونے کے بعد شفق ڈوبتا ہی نہ ہو کہ عشاء کا وقت شروع ہو، تو بہتر تو یہ ہے کہ دونوں نمازیں اندازے سے ادا کی جائیں، یعنی یا تو عام طور پر معتدل علاقوں میں مغرب وعشاء کے درمیان جتنا فصل ہوتا ہے اتنے فصل کے ساتھ دونوں نمازیں پڑھی جائیں، یا مکہ مکرمہ کو معیار بنا کر اس کے اوقات کے لحاظ سے نمازیں ادا کی جائیں؛ کیوں کہ قرآن مجید میں مکہ مکرمہ کو ''ام القریٰ'' یعنی تمام شہروں کی اصل قرار دیا گیا ہے؛ لیکن اس بات کی بھی گنجائش ہوگی کہ اگر اوقات کی ناہمواری کی وجہ سے کسی کو اس میں دقت ہو تو وہ مغرب اور عشاء کو جمع کر لے، اس فیصلہ کی وضاحت کے لئے اکیڈمی سے استفسار کیا گیا تھا کہ یہ اجازت انفرادی طور پر ہوگی یا اسی لحاظ سے مسجدوں میں جماعت اور اوقات نماز کی تعیین بھی درست ہوگی؟ اس سلسلے میں طے پایا کہ یہ اجازت مخصوص علاقوں میں دشواریوں کی بناء پر بطور رخصت وسہولت کے دی گئی ہے؛ اس لئے یہ گنجائش انفرادی طور پر نماز ادا کرنے میں ہوگی، مسجدوں میں جماعت کا نظم اس طرح پر مقرر کرنا درست نہ ہوگا؛ کیوں کہ اگر ایسا کیا گیا تو غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور اس صورت میں لوگ مغرب اور عشاء کی نمازوں کے جمع کرنے ہی کو شریعت کا اصل حکم خیال کرنے لگیں گے۔

بحمد اللہ یہ سیمینار اچھے ماحول میں ہوا، مذاہب اربعہ کے بصیرت مند علماء وفقہاء نے پوری تیاری کے ساتھ بحث میں حصہ لیا، مقالات بھی علمی لحاظ سے بہت اونچے معیار کے تھے، اظہارِ خیال پر کوئی پابندی نہیں تھی، ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی بڑے تحمل اور بے حد فراست کے ساتھ سیمینار کے پروگرام پر کنٹرول رکھتے تھے، ڈاکٹر مرزوقی (جنرل سکریٹری اکیڈمی) نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے، سیمینار کا افتتاحی اجلاس ۲۴ رمحرم کو بعد نماز ظہر شروع ہوا، جس میں خادم الحرمین الشریفین ملک عبداللہ بن عبدالعزیز کا خطبہ گورنر مکہ امیر خالد بن فیصل نے سنایا، آپ کے خطبہ میں یہ بات کہی گئی کہ شریعت کے احکام ثابت شدہ حقائق سے متعارض نہیں ہوسکتے، آپ نے یہ بھی کہا کہ اس وقت بہت ضرورت اعتدال اور وسطیت کی ہے، بعض لوگ صرف اپنے مسلک کو حق کہتے ہیں اور دوسرے کو باطل یہاں تک کہ دوسروں کو کافر کہتے ہیں، یہ اس دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے، آپ سب کی ذمہ داری ہے کہ اس کا تدارک کریں۔

مفتی اعظم سعودی عرب شیخ عبدالعزیز آلِ شیخ نے اپنے خطاب میں اس بات پر زور دیا کہ اسلام میں خاندانی نظام کے استحکام کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس سیمینار میں بھی اس پہلو پر توجہ دی گئی ہے، آپ نے فرمایا کہ فقہی اختلاف رائے سلف کے دور سے ہوتا رہا ہے، اس میں کوئی نقصان نہیں ہے اور اس سے گھبرانا نہیں چاہئے، مہمانوں کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے مشہور فاضل ڈاکٹر نورالدین خادمی (وزیر اوقاف تیونس) نے خطاب کیا اور اپنے خطاب میں اکیڈمی کی خدمات کی تحسین کی، اختتامی نشست ۲۸ رمحرم کو منعقد ہوئی، جس میں مختلف مسائل سے متعلق تجویز کمیٹیوں کی مرتبہ تجاویز ڈاکٹر مرزوقی نے پڑھ کر سنائی اور کچھ ترمیمات کے ساتھ منظور کر لی گئیں، مفتی صاحب کے مختصر خطاب پر پروگرام ختم ہوا، اس سے پہلے ڈاکٹر ترکی نے اعلان کیا کہ وہ مستقبل قریب میں خاندانی نظام اور اس پر مغربی تہذیب کے اثرات سے متعلق ایک کانفرس رکھیں گے، اس موقع پر ایک اعلامیہ بھی جاری ہوا، جس کا خلاصہ—ان شاء اللہ—آئندہ پیش کیا جائے گا۔

حج کانفرنس مکہ مکرمہ کا پیغام

حج جہاں ایک عبادت ہے وہیں امت مسلمہ کا ایک بین الاقوامی اجتماع بھی ہے، جس میں پوری دنیا کے مسلمان اس شان سے جمع ہوتے ہیں کہ ان میں کالے بھی ہیں اور گورے بھی، عربی بھی ہیں عجمی بھی، بولیاں الگ الگ ہیں، تہذیبیں جداگانہ ہیں، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے طور و طریق ایک دوسرے سے مختلف ہیں؛ لیکن زبان پر ایک ہی بول ہے کہ بار الٰہا! ہم آپ کے دربار میں حاضر ہیں، اور مقصد سب کا ایک ہے کہ ان کا مالک ان سے راضی ہوجائے، اسلام سے پہلے حج کے موقع پر سارا عرب اکٹھا ہوتا تھا اور وہ اپنے اپنے خاندان کی بڑائی بیان کیا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریق کار کو تبدیل فرما کر لوگوں کو اس ذات کی بڑائی بیان کرنے کا سبق سکھایا، جو واقعی بڑائی کا مستحق ہے۔

یہ بین الاقوامی اجتماع ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے، اس سے اسلامی اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، امت کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ وہ ایک آفاقی اجتماعیت کا حصہ ہیں، نیز انہیں مسلمانوں کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کرنے اور ایک دوسرے سے علمی وفکری افادہ واستفادہ کا موقع مہیا ہوتا ہے، اسلام کے ابتدائی ادوار میں خاص کر چوتھی صدی ہجری تک یہ اجتماع علماء اسلام کے باہمی مذاکرہ کے لئے ایک اہم موقع ہوا کرتا تھا اور تمام عالم اسلام کے فقہاء ومحدثین یہاں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتے تھے، جن مسائل میں اختلاف رائے ہوتا تھا، ان میں بحث بھی ہوتی تھی اور جب کسی پر اپنی غلطی واضح ہوجاتی تھی تو وہ کسی تکلف کے بغیر اپنی رائے سے رجوع کر کے دوسرے کی رائے قبول کر لیتا تھا، مکہ اور مدینہ کے اہل علم تو یہاں فروکش تھے ہی؛ لیکن عراق، شام، مصر اور یمن وغیرہ سے بھی بلند پایہ فقہاء ومحدثین کی ایک بڑی جماعت حرمین شریفین پہنچتی تھی اور علم وفکر کی بزمیں آراستہ ہوتی تھیں، حج ہی کے موقع سے مکہ مکرمہ میں فقیہ عراق امام ابوحنیفہؒ اور فقیہ شام امام اوزاعیؒ کی ملاقات ہوئی اور مشہور محدث وزاہد امام عبداللہ بن مبارک اس ملاقات کا سبب بنے،

امام اوزاعی کو امام ابوحنیفہ کے بارے میں بعض غلط فہمیاں تھیں، جب ملاقات ہوئی تو ساری غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور وہ امام صاحب کے بڑے قدر شناسوں میں سے ہو گئے؛ کیوں کہ ان کے قلوب پاک و صاف تھے، اور ان کا اختلاف اخلاص پر مبنی تھا۔

ایسے ہی موقع پر فقیہ مدینہ امام مالک سے سفیان ثوری کی ملاقات ہوئی، امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے درمیان تبادلہ خیال ہوا، انہوں نے امام ابوحنیفہ کے ساتھ توقیر واحترام کا خصوصی معاملہ فرمایا، وہ امام صاحب کی ذہانت اور قوت استدلال سے اس درجہ متأثر ہوئے کہ فرمایا کہ اگر یہ شخص کسی پتھر کے ستون کو ثابت کرنا چاہے کہ یہ سونے کا ہے تو ثابت کرسکتا ہے اور پھر وہ ستون ویسا ہی نکلے گا، غالباً ایسے ہی موقع پر امام ابوحنیفہ کے جلیل القدر تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد کی امام مالک سے ملاقات ہوئی اور ان حضرات نے بعض مسائل پر تبادلۂ خیال کے بعد اپنی رائے سے رجوع کرلیا، افسوس کہ یہ علمی وفکری افادہ واستفادہ عرصہ سے مفقود ہے۔

البتہ اب بھی دوطریقوں پر اس روایت کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ایک حرمین شریفین میں منتخب علماء کے دروس کے ذریعہ جو زیادہ تر تفسیر وحدیث اور فقہ کے مضامین پر ہوتا ہے اور عوام اور طلبہ کے لئے ان کی افادیت ہوتی ہے، دوسرے: بعض ادارے حج کی مناسبت سے مسلمانوں سے متعلق کسی اہم موضوع پر کانفرنس منعقد کرتے ہیں، جن میں کوشش کی جاتی ہے کہ پوری دنیا اور خاص کر عالم اسلام سے منتخب اور ممتاز اہل علم کسی مقررہ عنوان پر اپنا نقطۂ نظر پیش کریں۔

اس سلسلہ میں دو ادارے اکثر وبیشتر اس کا اہتمام کرتے ہیں، ایک: رابطہ عالم اسلامی جس کی کانفرنس میں چند سال پہلے یہ حقیر بھی شرکت کرچکا ہے، دوسرے: سعودی وزارت حج، جو ۱۳۹۷ھ سے لے کر اب تک ایک دوسالوں کو چھوڑ کر حج کانفرنس کرتی رہی ہے اور یہ سب سے بڑی حج کانفرنس ہوتی ہے؛ اسی لئے اس کو ''ندوة الحج الكبرى'' کا عنوان دیا جاتا ہے، اس حقیر کے لئے سعادت بخشی اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس سال کی کانفرنس ۳ر تا ۵ر ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ مطابق ۸ر تا ۱۰ر اکتوبر ۲۰۱۳ء کو منعقد ہوئی، جس میں اس حقیر کو بھی سعودی وزیر حج ڈاکٹر بندر بن محمد حجاز کی جانب سے دعوت موصول ہوئی، اس کانفرنس کا مرکزی عنوان تھا ''فقه الاولويات في الحج'' یعنی ''احکام حج میں ترجیحات''، کم وبیش ۱۰۰ یا اس سے زائد ملکوں سے اہل علم کو مدعو کیا گیا تھا، سعودی عرب کے علاوہ

بیرونی مندوبین کی تعداد ۱۰۰ر سے اوپر ہی رہی ہوگی، جن میں زیادہ تعداد بہ حیثیت سامع شرکت کرنے والوں کی تھی، عام طور پر ایک ملک سے ایک دو ہی نمائندوں کو دعوت دی گئی تھی؛ البتہ مصر سے جامع ازہر کے کئی اساتذہ مدعو تھے، ہندوستان سے اس حقیر کے علاوہ برادران وطن میں دعوت کا کام کرنے والے نوجوان فاضل آصف نور اللہ ندوی بھی شریک تھے، واقعہ ہے کہ ان کی رفاقت میرے لئے سفر میں بڑی عافیت کا باعث ہوئی، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ ۳۲ر حضرات کو الگ الگ عنوانات پر مقالہ لکھنے کی دعوتی دی گئی تھی، اس حقیر سے یہ عنوان متعلق کیا گیا تھا کہ ''حج کے ترجیحی احکام کی رہنمائی کے سلسلہ میں علماء اور داعیان دین کا کیا کردار ہونا چاہئے اور عام مسلمانوں تک اس پیغام کو پہنچانے کے لئے کن وسائل کو استعمال کرنا چاہئے؟''۔

مورخہ ۳ر ذی الحجہ کو ٹھیک صبح نو بجے مکہ مکرمہ میں واقع ''ماربیلا آڈیٹوریم'' میں کانفرنس کا آغاز ہوا، وزیر حج نے بنفس نفیس افتتاحی نشست کی صدارت کی اور مفتی عام شیخ عبدالعزیز آل شیخ نے افتتاحی خطبہ دیا، نیز حرم مکی کے مقبول امام جو حرمین شریفین کے امور کے صدر بھی ہیں، شیخ عبدالرحمن السدیس نے تفصیلی خطاب فرمایا اور مسعی، مطاف، جمرات نیز حرمین شریفین کی توسیع میں سعودی حکومت کی نمایاں خدمات اور اس کی وجہ سے حاصل ہونے والی سہولتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی، مجموعی طور پر کانفرنس میں افتتاحی اجلاس کے علاوہ مقالات اور تبادلۂ خیال کی دس نشستیں منعقد ہوئیں، شیخ سدیس کا خطاب اس کے علاوہ ہے، اسی طرح آخری نشست میں مکہ کے ممتاز فقیہ ڈاکٹر عبدالوہاب ابراہیم ابوسلیمان کا خطاب ہوا، جو مملکت میں استاذ الاساتذہ کا درجہ رکھتے ہیں، اختتامی اجلاس وزارت حج کے نمائندہ کی صدارت میں منعقد ہوا اور اس میں تجاویز پیش کی گئیں، اس طرح مجموعی طور پر پندرہ نشستیں منعقد ہوئیں اور ان نشستوں میں پوری دنیا کے منتخب اہل علم نے اپنے خیالات و افکار پیش کئے، علمی نشستوں کی صدارت زیادہ تر سعودی عرب کے ممتاز علماء اور اساتذہ نے کی، مقالہ نگاروں میں اور شرکت کرنے والوں میں بھی ایک مناسب تعداد خواتین کی بھی تھی، جو زیادہ تر یونیورسٹیوں کی اساتذہ تھیں، خواتین کی نشستیں پیچھے کی جانب لکڑیوں کی جالی نما عارضی دیواروں کے فاصلہ سے تھیں اور خواتین نے اپنے مقالات کو وہیں سے پیش کئے۔

جن مسائل پر بحث ہوئی، ان میں اس بات پر زیادہ توجہ تھی کہ کتاب وسنت اور مذاہب اربعہ

(احناف، مالکیہ، شوافع، حنابلہ) کی آراء کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایسے پہلو کو اختیار کرنا چاہئے، جس میں سہولت ہو اور جو دوسرے حجاج کے لئے تکلیف اور ضرر کا باعث نہ ہو، یہ بات اس حقیر کے خیال میں بنیادی طور پر واقعی صورت حال کو دیکھتے ہوئے نہایت مناسب ہے؛ لیکن اس میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے، بعض مقالہ نگار حضرات نے احکام حج میں بہت زیادہ رعایت کا پہلو اختیار کرنے کی کوشش کی، جو ضرورت کی حد سے آگے محسوس ہوتی تھی؛ جبکہ بعض حضرات نے بہت شدت اور تنگی کے پہلو کو اختیار کیا، جو نا قابل عمل محسوس ہوتا ہے، اگر کچھ لوگ اس پر عمل کر لیں تب بھی تمام حجاج اس پر عمل نہیں کر سکتے، ہر مقالہ کے بعد سوال و جواب اور مناقشہ کے لئے وقت بھی رکھا جاتا تھا، اس کا فائدہ یہ تھا کہ رائیں اعتدال پر آ جاتی تھیں، مگر یہ بات بہر حال بہتر محسوس ہوئی کہ یہ نقطہ سبھوں کے درمیان متفق علیہ تھا کہ جو بھی رائے اختیار کی جائے، وہ کتاب و سنت اور مذاہب اربعہ کے دائرہ سے باہر نہ ہو، راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں حج سے متعلق پندرہ مسائل کی نشاندہی کی تھی، جن پر علماء کو غور کرنے کی ضرورت ہے، ان میں بیشتر مسائل وہ ہیں جن میں فقہ حنفی کے مطابق گنجائش موجود ہے اور بعض مسائل وہ ہیں جن میں ہندوستان کے علماء نے پہلے سے ہی حالات کو دیکھتے ہوئے وہ رائے اختیار کی ہے، جو امام ابو یوسف اور امام محمد کی ہے اور جو دوسرے فقہاء کی رائے کے مطابق ہے۔

البتہ دو مسائل وہ ہیں جن پر فقہ حنفی کے نقطۂ نظر سے برصغیر کے علماء کو ابھی مزید غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، ایک مسئلہ طواف زیارت کا ہے، طواف زیارت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ۱۲؍ذی الحجہ کی شام تک ہی کیا جا سکتا ہے؛ لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد کے بشمول دوسرے فقہاء کے نزدیک ۱۲؍ذی الحجہ کے بعد بھی طواف کرنے کی گنجائش باقی رہتی ہے، اس وقت حجاج کی جو تعداد ہے اور فی گھنٹہ جتنے لوگوں کے طواف کرنے کی گنجائش ہے، اس کے لحاظ سے ۷۲؍گھنٹوں میں تمام حجاج کا طواف مکمل نہیں ہو سکتا، اس حقیر نے گیارہ ذی الحجہ کو طواف کیا؛ لیکن اس طرح کہ ازدحام کی وجہ سے دم گھٹنے لگتا تھا، خدا کرے مطاف کے موجودہ توسیعی منصوبہ کے بعد یہ مشکل آسان ہو جائے، ورنہ علماء کو اس کا حل تلاش کرنا چاہئے۔

دوسرا مسئلہ نماز میں خواتین کی شرکت کا ہے، اگر چہ خواتین کے لئے نماز کی جگہیں مخصوص ہیں؛ لیکن جب ازدحام بڑھ جاتا ہے تو آنے والی خواتین مردوں کے مجمع کے درمیان پھنس جاتی ہیں، اگر

طواف اور سعی کے درمیان ہی نماز شروع ہوگئی، تب بھی عام طور پر اس کی نوبت آجاتی ہے، حج کی تربیت کرنے والوں کو چاہئے کہ خواتین کو سمجھائیں کہ ایسی حالت میں وہ اپنے کمروں میں ہی نماز ادا کرلیں، وہاں بھی ان کو وہی ثواب ملے گا جو مسجد حرام میں نماز ادا کرنے کا ہے؛ لیکن عام طور پر خواتین کو یہ بتایا نہیں جاتا، اب صورت حال یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اگر کوئی عورت مردوں کی صف میں نماز پڑھے تو خود اس عورت کی بھی نماز فاسد ہوجاتی ہے اور اس کے دائیں بائیں اور پیچھے نماز پڑھنے والے مرد کی بھی؛ جبکہ دوسرے فقہاء کے نزدیک یہ فعل غلط ہے؛ لیکن اس صورت میں اس عورت کی نماز کراہت کے ساتھ ادا ہوجاتی ہے اور اس کے دائیں بائیں اور پیچھے نماز پڑھنے والے مرد اگر مجبور ہوں تو ان کی نماز بلا کراہت درست ہوجاتی ہے، حرمین شریفین کی حد تک خاص حج اور رمضان المبارک میں جو صورت حال درپیش ہوتی ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، عوام کو تو اسی پر عمل کرنا چاہئے جو علماء اور ارباب افتاء مشورہ دیں؛ لیکن خود علماء اور فقہاء کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

اس حقیر نے اپنے مقالہ میں دو باتوں پر خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، ایک یہ کہ سہولت پر مبنی جو بھی رائے اختیار کی جائے، وہ سلف صالحین کی آراء سے بالکل الگ نہ ہوجائے، اور کتاب وسنت میں اس کی بنیاد موجود ہو، نیز اس سلسلہ میں علماء اس بات کا خیال رکھیں کہ انہیں خود زیادہ سے زیادہ احتیاط پر عمل کرنا چاہئے اور عوام کو ممکن حد تک قابل عمل اور آسان راستہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے بتانا چاہئے، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا نماز پڑھتے تو لمبی پڑھتے؛ لیکن جب لوگوں کو پڑھاتے تو ہلکی نماز پڑھاتے؛ چنانچہ ایک بڑے فقیہ علامہ ابوالبقاء محمد بن اسعد مکی حنفی متوفی (۸۵۴ھ) نے حج کے موضوع پر اپنی نہایت اہم اور مفصل کتاب ''**البحر العميق**'' میں حائضہ عورت کے لئے طواف زیارت پر بحث کرتے ہوئے متعدد اہل علم سے نقل کیا ہے کہ مفتی کو دوسرے کے حق میں خاص کر کمزور لوگوں کے معاملہ میں آسان رائے کو اختیار کرنا چاہئے: ''**ينبغي للمفتي أن يأخذ بالأيسر في حق غيره خصوصاً في حق الضعفاء**'' (**البحر العميق**: ۳/ ۱۸۹۳)۔

دوسرے یہ کہ عوام کی تربیت کرنے میں احکام شریعت کے درجات کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور اُس پہلو کی طرف توجہ دلانی چاہئے، جس سے دوسروں کو اذیت نہ پہنچے، مثلاً: جب ہم حج کی فضیلت بیان کریں تو جہاں حج فرض کو جلد سے جلد ادا کرنے کی ترغیب دیں، وہیں حج نفل کے بارے میں یہ بھی

بتائیں کہ بار بار حج نفل کرنے کے مقابلہ صدقہ کی فضیلت زیادہ ہے؛ چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مجھے حج نفل کرنے سے زیادہ یہ بات پسند ہے کہ میں مدینہ کے کسی گھر کے لئے سال بھر کا غلہ فراہم کردوں، احناف، شوافع، حنابلہ اور اکثر فقہاء کی یہی رائے ہے، اسی طرح جہاں ہم یہ مسئلہ بتائیں کہ طواف کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا واجب ہے، وہیں یہ بھی بتائیں کہ اسے مسجد حرام یا حدود حرم میں کہیں بھی ادا کیا جاسکتا ہے، اگر مقام ابراہیم پر اس نماز کے پڑھنے میں زحمت ہو تو اس سے بچنا چاہئے؛ کیوں کہ یہ زیادہ سے زیادہ مستحب ہے اور مسلمان کو اذیت پہنچانا حرام ہے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ بعض مفسرین اور سلف صالحین نے مقام ابراہیم سے پورا حرم مراد لیا ہے۔

اسی طرح مسجد حرام میں نماز ادا کرنے کا مسئلہ ہے، جن دنوں میں ازدحام بڑھ جاتا ہے، یعنی حج شروع ہونے سے پہلے کے تین چار دن، ان میں بوڑھے، ضعیف، مریض اور خواتین وغیرہ کا مسجد حرام میں پہنچنا ان کے لئے بھی غیر معمولی مشقت کا باعث بنتا ہے اور ان کے رفقاء سفر اور دوسرے حجاج کے لئے بھی، ایسے موقع پر اگر وہ قیام گاہ کی قریبی مسجد میں نمازیں ادا کرلیں، نیز خواتین اور بہت معذور لوگ اپنی بلڈنگ میں نماز پڑھ لیں، تب بھی انہیں انشاء اللہ ایک نماز پر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے اس کی صراحت منقول ہے۔ (مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی، حدیث نمبر: ۵۸۶۵) اور قرآن مجید میں جہاں مسجد حرام کا ذکر آیا ہے، (الاسراء: ۱) اس سے راجح قول کے مطابق پورا حرم شریف مراد ہے؛ چنانچہ حنفیہ، مالکیہ اور شوافع کے نزدیک حرم شریف میں کہیں بھی نماز پڑھی جائے انشاء اللہ اس پر ایک لاکھ نمازوں کا اجر حاصل ہوگا، (الموسوعۃ الفقہیہ: ۲۳۹/۳۷) — واقعہ یہ ہے کہ حج کی تربیت کرنے والے اداروں اور شخصیتوں کو اس پہلو پر نظر رکھنی چاہئے اور ایسے عمل کی رہنمائی کرنی چاہئے جو شریعت کی بنیادی روح سے ہم آہنگ ہو اور وہ یہ کہ انسان کا عمل خود اس کے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی ضرر کا باعث نہ بن جائے، جو تجاویز پیش کی گئیں ان میں بھی اس بات پر زور دیا گیا کہ حج نہ صرف ایک عبادت ہے؛ بلکہ مسلمانوں کی تہذیب وشائستگی کا مظہر بھی ہے؛ اس لئے ہمیں اس اہم ترین عبادت کو اس طرح انجام دینا چاہئے کہ دشمنانِ اسلام کو ہم پر ہنسنے اور اسلام کا مذاق اڑانے کا موقع نہ مل جائے۔

کانفرنس سے پہلے ایک دن اس جگہ لے جایا گیا، جہاں کعبۃ اللہ کا غلاف تیار کیا جاتا ہے،

قریب سے اور تفصیل کے ساتھ اسے عقیدت کی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا، یہاں حرمین شریفین سے متعلق ایک میوزیم بھی ہے، جس میں کعبۃ اللہ کی اور مسجد نبوی کی بہت سی چیزیں رکھی گئی ہیں، وہاں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد کے وہ چوبی ستون اور دروازے بھی ہیں، جو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر میں ۶۵ھ میں استعمال ہوئے تھے، اس طرح اس عہد کے وہ سنگی ڈھانچے بھی ہیں، جن پر ان ستونوں کو کھڑا کیا گیا تھا، کعبۃ اللہ کے قدیم زمانہ کے قفل، اس کی کلید، میزاب رحمت، عباسی اور ترکی دور کے دروازے، زمزم کی کھدائی میں نکلنے والی چیزیں، وہ صراحیاں جن میں زمزم کا پانی دیا جاتا تھا، وہ مشکیزے جن میں زمزم کا پانی بھرا جاتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش پا پر نصب بلوری غلاف سے پہلے ترکوں کے عہد کے غلاف وغیرہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں، جنہیں آنکھوں کا سرمہ بنانے کا دل چاہتا ہے، یہ سب کچھ دیکھنے کا موقع ملا اور یہاں ہم لوگوں کی ضیافت بھی کی گئی، ایک دن ام القریٰ یونیورسٹی بھی لے جایا گیا، جس کا نیا کیمپس عرفات کے قریب زیر تعمیر ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سعودی حکومت نے حرمین شریفین کی جو خدمت کی ہے اور کر رہی ہے، وہ بے حد قابل تحسین اور لائق تعریف ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مہمانوں کی ضیافت کا بھی حق ادا کرتی ہے؛ چنانچہ مقامات حج میں کہیں کوئی مشقت اٹھانی نہیں پڑی، اور جو تھوڑی بہت ہوئی، اگر وہ بھی نہ ہوتی تو حج کا کیا لطف آتا؟ حج میں آئے ہوئے اہل تعلق اور اعزہ ملتے رہے اور میں نے ان سے کہا کہ اصل حج آپ لوگوں کا ہے، ہم لوگوں کے ساتھ ہم لوگوں کی کمزوری، بیماری اور کم حوصلگی کو دیکھتے ہوئے اللہ نے سہولت کا معاملہ فرمادیا ہے، عرض کیا کہ اس سفر سعادت کا پیغام قارئین کے لئے یہی ہے کہ وہ صرف حج کی مادی تیاری پر توجہ نہ دیں؛ بلکہ علمی اور روحانی تربیت بھی حاصل کریں اور حج کی تربیت کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ انہیں مسائل حج میں بصیرت حاصل ہو، وہ جہاں مستحبات پر عمل کرنے میں دقت نہ ہو، وہاں مستحبات پر زور دیں، اور جہاں مستحبات پر عمل کرنا ان کے لئے یا دوسروں کے لئے ضرر و نقصان کا باعث بن سکتا ہو، یا دوسرے شرعی منکرات کا سبب بن سکتا ہو تو وہاں ان سے بچنے کی تلقین کریں!

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّہَا النَّبِیْ!

اس سال حج کانفرس مکہ مکرمہ میں شرکت کے موقع پر ایک ایسے نو قائم شدہ ادارہ کو دیکھنے کا موقع ملا، جس نے بے حد شاد کام کیا، اور جس کو دیکھتے ہوئے کئی بار آنکھوں نے رشک محبت سے وضو کیا، یہ ادارہ ہے: ''**السلام علیک ایھا النبی**'' — ادارہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا میوزیم تعمیر کر رہا ہے، پانچ سو جلدوں میں سیرت پر ایک عظیم الشان انسائیکلوپیڈیا بھی تیار کیا ہے، اس کیلئے اس نے پوری دنیا سے اہل علم کی مدد حاصل کی ہے۔ڈاکٹر ناصر بن مسفر قریشی زہرانی اس کے بانی اور نگران اعلیٰ ہیں، اس کا مقصد آج کی دنیا میں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، اخلاق حسنہ اور سیرت مبارکہ کا ایسا جامع پیش کرنا ہے، جو لوگوں کیلئے دلچسپ ہو، سمجھنے میں آسان ہو، اعداء اسلام کی ان ناشائستہ پروپیگنڈوں کا ازالہ کرتا ہو، جو اعداء اسلام کی طرف سے پھیلائے جاتے ہیں۔

مکہ مکرمہ جہاں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی اور جہاں آپؐ کی نبوت کا آفتاب طلوع ہوا، وہیں اس کی مرکزی بلڈنگ تعمیر کی گئی ہے، لیکن دنیا کے بہت سے ملکوں میں اس کی شاخیں قائم کرنا ادارہ کے مقاصد میں سے ہے، جس کا آغاز دبئی سے ہو چکا ہے، بلڈنگ کے مجوزہ نقشہ کی پیشانی پر چہار طرف سے بہت ہی نمایاں حروف میں کنکریٹ کے ذریعہ ﴿یَا أَیُّھَا النَّبِیُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِیْرًا وَدَاعِیًا إِلَى اللّٰہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا﴾ کی آیت لکھی گئی ہے، اس ادارہ کے مقاصد میں سیرت انسائیکلوپیڈیا اور سیرت میوزیم کے علاوہ سیرت کی نشرواشاعت کیلئے جدید الکٹرانک ذرائع کا استعمال، دنیا کی مختلف زبانوں میں کتابوں پر مشتمل کتب خانہ اور مختلف زبانوں میں سیرت کے معتبر لٹریچر کی اشاعت شامل ہے، نیز سیرت کا مواد اس طور پر جمع کیا جا رہا ہے کہ وہ مسلکی اختلاف سے بالاتر ہو، عربی زبان میں اس لٹریچر کی کتابت کیلئے مدینہ منورہ میں تاہم مصحف قرآنی کی طباعت کے ادارہ سے وابستہ نامور اور ماہر خطاط ڈاکٹر عثمان طہٰ کی خدمات حاصل کی گئی ہے اور انہوں نے ایک سعادت سمجھ کر اس پیش کش کو قبول کیا ہے۔

حقیر جب ادارہ کی بلڈنگ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے جس حصہ میں داخلہ ہوا، قدیم زمانہ کی وضع کا ایک چھپر پوش حجرہ ہے، احادیث نبوی سے آپ کے حجرۂ اقدس کے فرش، چھت، تعمیری مٹیریل، لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، ٹھیک اسی طرح کا حجرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا، یہ منظر دیکھ کر اکثر زائرین کی طبیعت بے قابو ہوگئی اور ایسا لگا کہ گویا ہم ساڑھے چودہ سو سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔

اس سے پہلے ترکی میں توپ کالی کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء کرام اور صحابہ کے بہت سے مقدس آثار محفوظ کئے گئے ہیں، انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کلیجہ باہر آجائے گا، قریب قریب یہی کیفیت یہاں پیش آئی؛ البتہ یہاں حقیقی آثار نہیں ہیں؛ بلکہ حدیث وسیرت کی تفصیلات کو ملحوظ رکھ کر ان کے ڈھانچے بنائے گئے ہیں، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشست گاہ بھی ہے، آپ کے لئے کپڑے کا جو ٹکڑا بچھایا جاتا تھا، اسی طرح کا کپڑا بھی تیار کیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو برتن استعمال فرمایا کرتے تھے، اسی طرح کا برتن بھی ہے، اس زمانے کے پیمانے، ''صاع'' اور ''مد'' بھی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمان، جنگ میں پہنی جانے والی زرہ اور خود، تلوار، نیزہ، عصا، خاتم مبارک، اس زمانے میں استعمال ہونے والے مشکیزے، تیر و کمان، کلہاڑی، نعلین مبارکین، کنویں کی منڈھیر اور اس پر پانی کھینچنے کے لئے لکڑیاں، غرض کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استعمال کی جن جن اشیاء کا حدیث کی کتابوں میں ذکر ملتا ہے اور ان کی جو شکل بیان کی گئی ہے، ٹھیک اسی طرح اس کی تمثیل تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اگر یہ بات نہ بتائی جائے کہ یہ حقیقی آثار نہیں ہیں تو دیکھنے والے کے لئے اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ اس کے نمونہ پر تیار کیا گیا سامان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بادشاہوں کے نام گرامی ناموں کی بہت ہی معیاری طریقہ پر لی ہوئی تصویریں بھی ہیں۔

ایک بڑی میز پر عہد نبوی کے مکہ مکرمہ کا تعمیری ماڈل تیار کیا گیا ہے، اس میں روشنی کے ذریعہ کعبۃ اللہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دولت خانہ، ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مکان، حضرت ابوبکر اور صحابہ کے مکانات، چلنے کا راستہ، یہاں تک کہ اس زمانے کے کنوؤں کو واضح کیا گیا ہے، اسی طرح ایک ماڈل مدینہ منورہ کا تیار کیا گیا ہے، جس میں مسجد نبوی، حجرات مقدسہ، سقیفۂ بنوساعدہ وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے اور جو علاقے نخلستان کے تھے انہیں بھی نمایاں کیا گیا ہے، غرض کہ عہد نبوی کا مکہ اور مدینہ

ماڈل دیکھنے والوں کی نگاہ میں گھوم جاتا ہے، پھر چارٹ کے ذریعہ مکہ میں کوہ حراء اور کوہ ثور کو اور مدینہ منورہ میں کوہ احد نیز حدیث میں مذکور دوسرے مقامات کو واضح کیا گیا ہے، اسی چارٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان سے کوہ حرا کا فاصلہ چھ کلومیٹر کا تھا، طائف کا فاصلہ یہاں سے ۱۳۰ رکلومیٹر اور قبیلۂ بنوسعد — جہاں بچپن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حلیمہ کا دودھ نوش فرمایا تھا — کا فاصلہ تقریباً دوسو کلومیٹر کا تھا، نیز سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان سے کوہ ثور کی مسافت سات کلومیٹر تھی، ہجرت کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہیں سے کوہ ثور تشریف لے گئے تھے، غرض کہ دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا محبت کی آنکھوں سے دیکھا اور قلب کے جذبات نے آنکھوں کی رفاقت کا حق ادا کیا، ایسا محسوس ہوا کہ ہمارا سفر روشن ماضی کی طرف ہورہا ہے جس کا ورق ورق روشن اور جس کا غنچہ غنچہ مشک بار ہے۔

ادارہ نے سیرت کی مناسبت سے بہت سے مفید چارٹ بھی بنائے ہیں، جیسے ایک چارٹ ''**الحديقة المحمدية**'' (گلشن محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام سے ہے، اس چارٹ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آبائی سلسلہ اور مختلف صحابہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت اور پھر حضرت فاطمۃ الزہراء کے ذریعہ ذریت نبوی کے پھیلاؤ کو پیش کیا گیا ہے اور ایک نظر میں آپ کی تمام قرابتیں سامنے آجاتی ہیں، اسی طرح ایک چارٹ ''الأنبياء الأقرباء'' کے عنوان سے ہے، یعنی انبیاء ایک دوسرے کے قرابت دار ہیں، اس میں حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل واسحاق علیہم السلام سے لے کر انبیاء بنی اسرائیل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سلسلہ خاندان کو مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایک چارٹ میں آپ کی جامعیت کو بتانے کے لئے مختلف شعبوں کو ڈبوں کی شکل دی گئی ہے، جیسے: نظام سلطنت، عدلیہ، فوج، تعلیم، خزانہ وغیرہ، اس طرح کے اور کئی چارٹ مرتب کئے گئے ہیں، جو سیرت فہمی کو آسان بھی بناتے ہیں اور جو دریا بہ کوزہ کا مصداق ہیں۔

سب سے اہم کام سیرت کے موضوع پر ایک عظیم الشان اور بے نظیر انسائیکلو پیڈیا کی تیاری ہے، جیسا کہ مذکور ہوا، اس انسائیکلو پیڈیا کا خاکہ پانچ سو جلدوں پر مشتمل ہے، جس کی ایک سو سے زیادہ جلدیں عربی زبان میں مرتب ہوچکی ہیں اور طباعت کے لئے تیار ہیں، اس انسائیکلو پیڈیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کے ساتھ ساتھ اخلاق وعادات اوصاف، وکمالات، زندگی کے مختلف

شعبوں سے متعلق آپ ﷺ کی تعلیمات، ان مقامات کی تفصیل جن سے آپ ﷺ کا گذر ہوا ہے، موجودہ دور میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کے بارے میں آپ ﷺ کی ہدایات اور اسوۂ مبارکہ وغیرہ کو واضح کیا گیا ہے، ان تمام عنوانات کی فہرست ادارہ کے اس دفتر میں آویزاں ہے اور مضمون کی مناسبت سے الگ الگ حصوں میں انہیں تقسیم کیا گیا ہے، راقم الحروف نے کئی فہرستوں کو بہ نظر غائر دیکھا اور بہ مشکل ایک آدھ ایسے پہلو نظر آئے کہ ان کا اضافہ مناسب ہوتا، مگر ان کی بھی نوعیت یہ ہے کہ وہ بعض مرکزی عنوانات کے ذیل میں آجاتے ہیں، شاید اسی لئے ان کے لئے الگ عنوان قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ۔

اس عظیم سیرت انسائیکلوپیڈیا میں دو باتیں بڑی اہم محسوس ہوئیں، ایک یہ کہ آپ ﷺ کی ان اخلاقی صفات کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آپ ﷺ کے رحم و کرم، عفو و درگذر، دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک، انسانیت نوازی، غریب پروری وغیرہ سے متعلق ہیں، دوسرے: عہد حاضر میں جو عائلی اور سماجی مسائل اٹھائے جاتے ہیں، ان کے سلسلہ میں آپ ﷺ کی زریں تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، جیسے خواتین اور بچوں کے مسائل، مزدور و ملازمین سے متعلق احکام، ماحولیات کا تحفظ، دہشت گردی اور اس کے مقابلہ مذہبی رواداری، اقلیتوں کے حقوق وغیرہ، امید ہے کہ یہ انسائیکلو پیڈیا - ان شاء اللہ - ان پروپیگنڈوں کا خاموش اور مثبت جواب ہوگا، جو مغرب کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

دین کی بنیاد تین اساسی عقیدوں پر ہے: توحید، رسالت اور آخرت، توحید کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے ہے، رسالت کا تعلق انبیاء اور خود رسول اقدس ﷺ سے ہے، اور عقیدۂ آخرت جزاء وسزا کے نظام سے متعلق ہے، ان تینوں نکات میں بھی عقیدۂ رسالت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات بے شک بلند و برتر ہے اور انسان کی نجات توحید پر ایمان لانے میں ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات، عقیدۂ توحید کی وسعت و گہرائی اور اللہ پر ایمان لانے کی کیفیت اور اس کی اہمیت کو صرف عقل سے نہیں سمجھا جاسکتا، یہ بات ہر دور میں اللہ کے پیغمبروں نے بتائی ہے، اور اب قیامت تک اس سلسلہ میں انسانیت کی رہنمائی تعلیمات محمدی ﷺ سے وابستہ ہے، انسانی فطرت یہ کہتی ہے کہ اچھے کاموں پر جزا ملنی چاہئے اور بُرے کاموں پر سزا ہونی چاہئے؛ لیکن عالم برزخ اور حشر ونشر

کی تفصیلات اور جنت و دوزخ کے احوال یہ سب کچھ ہمیں رسول ہی کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ انسان توحید اور آخرت کو جاننے میں بھی رسول کا محتاج ہے، امت کی تشکیل رسول ہی کی نسبت سے ہوتی ہے، انسان کو زندگی گذارنے کے لئے انسانی نمونہ رسول ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے؛ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر اسلام کی بنیاد و اساس ہے؛ اس لئے جن لوگوں کو اسلام سے عداوت اور دین حق سے بغض ہے، انہوں نے ہمیشہ انبیاء ورسل کو نشانہ بنایا ہے اور اسی لئے موجودہ دور میں تمام خدا بیزار، مذہب معاند اور اسلام دشمن طاقتیں پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات والا صفات کو نشانہ بنانے پر تلی ہوئی ہیں، واقعہ بیہودہ ناول نگاری کا ہو یا کارٹونوں کا، یا مستشرقین کے زہر آلود لٹریچر کا، سب کا بنیادی ہدف یہی ہے۔

صرف احتجاج اور مظاہروں کے ذریعہ ایسی ناشائستہ حرکتوں کا جواب نہیں دیا جا سکتا؛ بلکہ اس کا حقیقی جواب یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کی صحیح تصویر انسانیت کے سامنے پیش کی جائے، کئی سال پہلے خادم الحرمین الشریفین شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز کی دعوت پر رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں تقریباً بیس علماء حرم شریف میں حاضر ہوئے تھے، اس سلسلہ میں ہندوستان کا قرعۂ فال اس حقیر کے نام نکلا، اس میں مختلف علماء سے تجاویز طلب کی گئی تھیں، اس کوتاہ علم نے چند تجاویز پیش کیں، جن میں سے ایک اہم تجویز یہ تھی کہ جیسے شاہ فہد نے مدینہ منورہ میں بڑے پیمانے پر قرآن مجید اور اس کے تراجم کی طباعت کا ادارہ قائم کیا ہے، آج بحمد اللہ دنیا کی بہت ساری زبانوں میں یہ ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں تک بھی پہنچ رہے ہیں، اسی طرح موجودہ حالات میں ایک خاص ادارہ سیرت نبوی کی نشر و اشاعت کے لئے ہونا چاہئے، جس کے ذریعہ عصری تناظر میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی زیادہ سے زیادہ زبانوں میں کتابیں شائع ہونی چاہئیں اور ابلاغ کے جدید وسائل کو اختیار کرنا چاہئے؛ تاکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی حقیقی سیرت عالم انسانیت تک پہنچ سکے، رئیس شؤون اسلامیہ نے اس تجویز کو پسند کیا اور انہوں نے اپنے نوٹ میں اس کو شامل فرمایا؛ اگرچہ کہ اس وقت جس ادارے کا ذکر ہو رہا ہے، اس کا قیام کچھ شخصیتوں نے اپنی دلچسپی سے کیا ہے اور اس کا اس حقیر کی پیش کردہ تجویز سے بظاہر تعلق نہیں ہے؛ لیکن امید ہے کہ یہ زیادہ بہتر طور پر اس مقصد کو پورا کرے گا؛ اس لئے اس ادارہ کو دیکھ کر اور اس کے منصوبوں کو جان کر بے حد مسرت ہوئی۔

قارئین تک ان تفصیلات کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں آباد مسلمان اسے اپنے لئے نمونہ بنائیں، ہم بے فائدہ اختلافی باتوں سے بالاتر ہوکر رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ کو برادران وطن تک پہنچائیں، ہندوستان کی تمام زبانوں میں سیرت کے پیغام کو عام کریں، جھوٹے پروپگنڈوں کا جواب سچائی سے دیں، حقیقت کی روشنی سے جھوٹے افسانوں کی تاریکیوں کا پردہ چاک کردیں، اس طرح شاید حضور ﷺ کی محبت کے تقاضوں میں سے کوئی حصہ ادا ہو پائے، رسول اللہ ﷺ کی اہانت پر جذبات کا مشتعل ہونا ایک فطری بات ہے؛ کیوں کہ ہر مسلمان کی نظر میں آپ کی تقدیس وحرمت اپنی جان ومال سے، اولاد سے اور عزت وآبرو سے کہیں بڑھ کر عزیز ہے؛ لیکن بہر حال تشدد اور اشتعال ان لوگوں کا ہتھیار ہوتا ہے، جن کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی، جس گروہ کے پاس دلیل کا ہتھیار ہوتا ہے، اس کو کسی اور ہتھیار کی ضرورت نہیں، جس کے پاس سچائی کی روشنی موجود ہو، اس کو اندھیروں سے خوف کھانے کی حاجت نہیں، اس کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ حق اور سچائی کو دنیا کے سامنے رکھ دے۔

ترکی میں چند دن

راقم الحروف کو دوسری بار ۲۱ / اکتوبر ۲۰۱۰ء کو خلافت عثمانیہ 'مرحوم' کی سابق راجدھانی استنبول جانے کا اتفاق ہوا، منزل جوں جوں قریب آرہی تھی ایسا لگتا تھا کہ ترکی کی پوری تاریخ ذہن کے اسکرین پر رقص کر رہی ہے، اگر کوئی شخص مجھ سے سوال کرے کہ گذشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ اور دور رس نقصان کا حامل اور المناک حادثہ کیا تھا تو تاریخ کے حقیر مطالعہ کی روشنی میں میرا جواب ہوگا: خلافت عثمانیہ ترکی کا سقوط — اسلامی تاریخ میں مختلف ایسی قومیں گزریں ہیں، جنہوں نے بحیثیت قوم اسلام قبول کیا ہے، اس میں بعض قومیں تو وہ ہیں، جو ان کے علاقوں پر مجاہدین کی یلغار کے بعد دامن ایمان میں آئیں اور پھر انہوں نے اسلامی علوم کی خدمت اور اسلامی سلطنت کی توسیع میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے، جیسے ایران، اور بعض قومیں وہ ہیں کہ جنگجوئی میں ان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اور دشمن ان کے نام سے لرزاٹھتے تھے؛ لیکن اسلام کی کشش نے ان کے دلوں کو فتح کیا، انہوں نے زروزمین کی جنگ نہیں ہاری، قلب ونظر کی جنگ ہاری اور اسلام کی فتح وکامرانی کا جھنڈا آپ اپنے اوپر نصب کرلیا، ان قوموں میں ایک 'ترک' بھی ہیں۔

تاریخ میں ترکوں کا نام چھٹی صدی عیسوی سے ملتا ہے، جس میں پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی، یہ ایک خانہ بدوش قوم تھی، جو ایشیاء کے مغربی اور یورپ کے مشرقی علاقوں کو وقتاً فوقتاً تاراج کرتی رہتی تھی، یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی میں منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے بحر اسود تک انہوں نے ایک وسیع سلطنت قائم کرلی، یہ بنیادی طور پر بت پرست تھے، مسلمانوں کو ان سے سابقہ اس وقت پیش آیا، جب پہلی صدی ہجری میں ولید اول کے عہد خلافت میں قتیبہ بن مسلم نے بخارا، سمرقند، فرغانہ، تاشقند، اور کاشغر وغیرہ کے علاقوں کو فتح کرکے انہیں خلافت اسلامی کا حصہ بنادیا، جو پہلے سے ترکوں کے زیر اقتدار تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور سے ترکوں میں دعوت اسلام کی بھی کوششیں کی گئیں، یہاں

تک کہ عباسی خلیفہ منصور نے ترکوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا، چنانچہ معتصم باللہ کے بعد سے ہی عالم اسلام کی طرف ترکوں کی آمد، ان کا قبول اسلام اور ترک سرداران قبائل کی اپنے قبائل میں دعوتی مہم اس زور کے ساتھ شروع ہوئی کہ آج خود ترک کہتے ہیں کہ کسی شخص کے ترکی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین کے اعتبار سے مسلمان ہوگا اور عقیدہ کے اعتبار سے اہلسنت میں ہوگا اور فقہ کے اعتبار سے حنفی المسلک۔

ترکوں کی حوصلہ مندی بڑھتی گئی اور قسمت ان پر مسلسل مہربان رہی، یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری میں ترکوں کی ایک شاخ سلجوقیوں نے خراسان میں ایک نئی حکومت قائم کی، اور ساتویں صدی ہجری تک عباسی خلافت کے بیشتر ایشیائی مقبوضات سلجوقیوں کے زیر اقتدار چلے گئے، یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا، ساتویں صدی میں ترکوں کے ایک قبیلہ 'اوغوز' کا ایک شخص ارطغرل کو سلطان علاء الدین سلجوقی کی فوج میں اپنی بہادری اور وفاداری کی وجہ سے ایک اہم مقام حاصل ہوا، جس کی حکومت روم کے علاقہ میں تھی، اور جو سلاجقۂ روم کہلاتے تھے۔

اس کی وفات کے بعد عثمان اس کا جانشیں ہوا، جس نے سلجوقی حکومت کے خاتمہ کے بعد ایک خودمختار مملکت کی بنیاد رکھی، ایشیاء کی سمت میں اس کے حریف وہ سلجوقی امراء تھے، جنہوں نے اپنے طور پر خودمختاری قائم کر لی تھی، ان سے مقابلہ آسان نہ تھا، اس کے مغربی جانب میں بازنطینی حکومت تھی، جو ایک زمانہ میں دنیا کی عظیم الشان اور طاقتور ترین عیسائی مملکت تھی؛ لیکن اب اندرونی اختلافات کی وجہ سے انحطاط پذیر تھی، ان حالات میں عثمان نے اپنے لئے مغرب یعنی یورپ کی طرف فاتحانہ پیش قدمی کو بہتر سمجھا، اور چوں کہ وہ خود ایک مذہبی شخص تھا؛ اس لئے غالباً اسلام کی دعوت بھی اس کے پیش نظر تھی، اور وہ بازنطینی علاقوں کو فتح کرتے ہوئے بحر اسود تک پہنچ گیا، اس طرح عثمان جن کو 'سلطان عثمان اول' کہا جاتا ہے، حکومت عثمانیہ کا بانی و مؤسس تھا۔

اس خاندان میں ایسے حوصلہ مند اور جفاکش حکمراں پیدا ہوئے کہ کامیابی اور فتح مندی ان کے قدم چومتی رہی، یہاں تک کہ تین سو سال گذرنے نہ پائے تھے کہ جغرافیائی وسعت، فوجی طاقت اور وسائل کی کثرت کے اعتبار سے یہ دنیا کی سب سے عظیم مملکت بن گئی، سلطان سلیمان اعظم کے

زمانہ میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے بڑے حصوں پر عثمان ترکوں کی حکومت تھی، یورپ کا مشہور ملک ہنگری اس کے زیر اقتدار تھا، موجودہ بلغاریہ، بوسینیا، سربیا وغیرہ عثمانی حکومت کے زیر قبضہ تھا، اور آسٹریا کے دارالحکومت فریانا کی فصیلوں تک ان کی فوجیں پہنچ چکی تھیں، وہ چھ سو سال سے زیادہ عرصہ ایک ایسی حکومت کے تاجدار رہے، جس کی وسعت اپنے عہد میں سب سے بڑھی ہوئی تھی، جہاں ابتدائی تین صدی کا عرصہ اس کے عروج کا تھا، وہیں اگلی تین صدیاں بتدریج اس کے زوال کی ہیں۔

یوں تو شروع ہی سے ترک اسلام کے ایک وفادار سپاہی رہے ہیں، لیکن سلطان سلیم اول نے کسی خونریزی کے بغیر حجاز کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرلیا اور حرمین شریفین اس کی ولایت میں آ گیا، نیز غالباً سب سے پہلے اسی نے اپنے لئے ''خادمُ الحرمین الشریفین'' کا لقب استعمال کیا، جب حرمین شریفین کی خدمت کا شرف سلطان سلیم کو حاصل ہوگیا تو آخری عباسی خلیفہ متوکل — جو سلاطین ملوک کے زیر سایہ ایک رسمی حکمراں کی حیثیت سے زندگی گذار رہا تھا اور عملاً بے اختیار تھا — نے خلافت اس کے سپرد کردی، مقاماتِ مقدسہ اور حرمین شریفین کی کنجیاں، حضور اقدس ﷺ کی شمشیر مبارک، علم، رداء مبارک اور دوسرے آثار و تبرکات بھی بطور یادگار خلافت کے اس کے حوالہ کردیا؛ چنانچہ سلطان سلیم کی خلافت کا اس شان کے ساتھ اعلان ہوا کہ پورے عالم اسلام میں کسی کی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوئی؛ کیوں کہ اس وقت اس مملکت سے بڑھ کر کوئی اور حکومت نہیں تھی، جو امت اسلامیہ اور عالم اسلام کا تحفظ کرسکتی، اب یہ عثمانی ترک صرف ایک حکمراں ہی نہیں تھے؛ بلکہ عالم اسلام کی خلافت اور پوری دنیا کے مسلمانوں کی امارت کا تاج ان کے سروں پر تھا، اگرچہ سلطان سلیمان اول قانونی متوفی ۱۵۶۶ء کے بعد ہی سے حکومت میں انحطاط پیدا ہوتا چلا گیا؛ لیکن ۱۵۱۷ء میں عثمانیوں کو خلافت کا جو اعزاز عطا ہوا، وہ ۱۹۲۲ء تک ان کے حصہ میں رہا اور اس کے بعد دنیا سے اسلامی خلافت کا چراغ پوری طرح بجھ گیا۔

۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مصطفی کمال پاشا نے اقتدار پر قبضہ کیا، اپریل ۱۹۲۴ء میں نیا آئین بنا، اس آئین کا مقصد تھا اسلام اور اسلامی قدروں کو پوری طرح ترکی سے ملک بدر کردینا، چنانچہ خلافت منسوخ کردی گئی، شیخ الاسلام اور وزیر اوقاف کے عہدے ختم کردیئے گئے، خانقاہوں اور دینی مدارس کو مقفل کردیا گیا، ترکی ٹوپی کا استعمال ممنوع ٹھہرا، ۱۹۲۸ء میں عربی رسم الخط کی جگہ ترکی زبان

کے لئے لاطینی رسم الخط کو اختیار کیا گیا، استنبول کے بجائے ''انقرہ'' کو دارالحکومت بنایا گیا، عربی زبان میں اذان دینے اور نماز پڑھنے تک پر پابندی عائد کردی گئی، سینکڑوں علماء ومشائخ کو پھانسی دے دی گئی، عورتوں کے لئے برقعہ تو کجا سر چھپانا بھی جرم قرار پایا، بہت سی مسجدیں میوزیم میں تبدیل کردی گئیں، اور 'ایا صوفیا' کو بھی میوزیم بنادیا گیا۔

خلافت عثمانیہ کے سقوط میں جہاں حکمرانوں کی نااہلی اور ان کی بعض غلطیوں کا دخل ہے، وہیں یہودیوں اور عیسائیوں کی شاطرانہ چالوں، عالم اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی سازشوں، نیز مختلف علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں خاص کر عربوں کی عاقبت نااندیشی، تنگ نظری اور اسلام کے بجائے مادر وطن کی محبت کا بھی بڑا حصہ ہے؛ چنانچہ عثمانی خلافت کے سقوط کے ساتھ ہی یورپ کے مختلف ملکوں نے اسلامی سلطنت کے ٹکڑے کردئے، یہودیوں کی ہزار کوشش کے باوجود خلیفہ عبدالحمید ثانی نے یہودیوں کو بیت المقدس میں بسنے کی بھی اجازت نہیں دی تھی، جب کہ سقوط خلافت پر ۲۵ سال نہیں گذرے تھے کہ مملکت اسرائیل وجود میں آگئی اور آج بارہ کروڑ سے زیادہ عرب چند لاکھ اسرائیلوں کے مقابلہ ایسے بے وزن ہیں جیسے ہاتھی کے مقابلہ مچھر اور مکھی، پوری دنیائے اسلام عالمی سطح پر انتہائی بے وزنی کا شکار ہے، اور عالمی فیصلوں میں ان کا کوئی رول نہیں ہے؛ یہ اسی جرم کی سزا ہے کہ عربوں نے دین محمدی سے تعلق کے مقابلہ قومیت کو ترجیح دی اور خلافت جو پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے وحدت کی ایک علامت تھی، اسے موت کی نیند سلادیا۔

مسلمانوں کو آج بھی اس واقعہ سے سبق لینے کی ضرورت ہے کہ ہماری شکست وریخت کا سبب خود ہمارے اندر چھپا ہوا ہے اور وہ ہے امت کے وسیع تر مفاد کے مقابلہ ذاتی اور گروہی مفاد کو ترجیح دینا، ایک آفاقی امت بننے کی بجائے ایک فرقہ اور گروہ کے طور پر سوچنا اور دین کی وسعتوں کی بجائے قومیت کی تنگنائیوں میں پھنس کر رہ جانا، اگر مسلمانوں نے اپنے اس طرز عمل کو نہیں بدلا تو وہ ہمیشہ صہیونی اور صلیبی دشمنوں کی سازشوں کا شکار بنتے رہیں گے اور بوسنیا، عراق، افغانستان اور فلسطین کی طرح کتنے ہی معرکہ کارزار بنیں گے، جن کی پیاس ان کے لہو سے بجھائی جائے گی اور جہاں ان کے خون ناحق سے خوشیوں کے چراغ جلائے جائیں گے۔

راقم الحروف گذشتہ سال بھی ''الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین'' کی دعوت پر اس کے رکن کی

حیثیت سے ترکی حاضر ہوا تھا، مؤرخہ ۲۳-۲۴ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد نے خود استنبول میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا، یہ پروگرام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ایوارڈ کے سلسلہ میں تھا، اس ایوارڈ کا آغاز یوں ہوا کہ میرے لڑکے عزیزی مولوی عمر عابدین مدنی قاسمی نے اپنے دوست ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ (مدینہ منورہ) سے ذکر کیا کہ ہندوستان کے بزرگ علماء کا عالم اسلام میں خاطرخواہ تعارف نہیں ہے؛ اس لئے کیوں نہ ''مولانا محمد قاسم نانوتوی عالمی ایوارڈ'' کا سلسلہ شروع کیا جائے، جو ہر سال کسی نمایاں دینی خدمت انجام دینے والی شخصیت کو پیش کیا جائے، مجھے بھی یہ تجویز بہت پسند آئی؛ کیوں کہ لوگ سلاطین اور بادشاہوں کے نام سے ایوارڈ دیتے ہیں اور ناچنے گانے پر ایوارڈ دیا کرتے ہیں؛ حالاں کہ اصل میں تو ایوارڈ دینی خدمت گزاروں کے نام سے ہونا چاہئے اور دین کی خدمت کرنے والوں کو دینا چاہئے، اس میں دونوں شخصیتوں کا اعتراف ہے، اس کا بھی جس سے ایوارڈ منسوب کیا جارہا ہے اور اس کا بھی جس کو ایوارڈ دیا جارہا ہے؛ چنانچہ پہلے ایوارڈ کے لئے ترکی کے ممتاز عالم، مذہبی رہنما اور نقشبندی سلسلہ کے بزرگ شیخ محمود آفندی کا نام منتخب ہوا، شیخ آفندی ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے، انہوں نے ترکی کے ایک بڑے عالم اور صاحب نسبت بزرگ شیخ علی حیدر آفندی سے ظاہری اور باطنی دونوں علوم میں استفادہ کیا ہے، خود شیخ علی حیدر اس پایہ کے عالم تھے کہ کہتے تھے: ''اگر فقہ کے چاروں مذاہب کی کتابیں ضائع ہوجائیں تو میں انہیں اپنے حافظہ سے لکھ سکتا ہوں''۔

ترکی میں اس وقت اسلام کی جو لہر چل رہی ہے، اس میں شیخ محمود آفندی کی خدمت کا بھی بڑا حصہ ہے، کمال اتاترک کے آنے کے بعد جب علماء و مشائخ پر ابتلاء کا دور شروع ہوا اور بہت سوں کو دار و رسن کو گلے لگانا پڑا، اس وقت شیخ آفندی نے بڑے ہی استقامت کے ساتھ ترکی اور مشرقی یورپ کے علاقہ میں تحریک مدارس کی بنیاد رکھی، انہوں نے بڑی حکمت کے ساتھ خانقاہی اشغال کے پردہ میں اسلامی علوم کی تدریس کا فریضہ انجام دیا، اور سینکڑوں مدارس قائم کئے، نقل کیا گیا ہے کہ جب بھی کوئی شخص ان سے پوچھتا کہ ہم آپ کی کیا خدمت کرسکتے ہیں؟ تو ایک ہی جواب ہوتا کہ ہر محلہ میں نوجوان لڑکوں کے لئے ایک مدرسہ اور نوجوان لڑکیوں کے لئے ایک علیحدہ مدرسہ قائم کرو، یہی وجہ ہے کہ اس تحریک مدارس نے اسلام کے احیاء میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، چنانچہ شیخ کے معتقدین کی جو کثرت ہم لوگوں نے ترکی میں دیکھی اور ان کے تلامذہ اور متوسلین کا شیخ سے جو والہانہ تعلق نظر آیا،

شاید ہی کسی اور خطہ میں اور کسی عالم کے سلسلہ میں دیکھا ہو، اس ایوارڈ کے لئے شیخ آفندی کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اور مولانا نانوتوی کی شخصیت میں کئی باتیں مشترک ہیں، مولانا نانوتوی نے برطانوی استعمار کا مقابلہ کیا اور شیخ آفندی اس مغربی استعمار کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے، جس کے لئے مصطفی کمال اتاترک کو آگے رکھا گیا؛ لیکن اس کے پیچھے پوری قوت کے ساتھ صہیونی اور صلیبی طاقتیں تھیں، دوسرے: ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے بجائے اسلام پر ہونے والی بیرونی یلغار کو اپنی توجہ کا اصل مرکز بنایا، فکری وتہذیبی ارتداد کے فتنہ سے مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی اور دفاع عن الاسلام کا فریضہ انجام دیا، تیسرے: حضرت نانوتوی نے بھی مخالفانہ ماحول میں اسلام کے تحفظ کے لئے تحریک مدارس کی بنیاد رکھی اور اس کے ذریعہ اپنے مشن کو شہر شہر قریہ قریہ پہنچایا، شیخ آفندی نے بھی نظام مدارس ہی کو اس فتنہ کے استیصال کے لئے ذریعہ بنایا؛ چوں کہ یورپ میں عورتوں کو شرم وحیاء کے لباس سے عاری کرنے کی کوشش کی جارہی تھی؛ اس لئے شیخ نے لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی دینی درسگاہوں کے قیام پر بھی خصوصی توجہ دی اور خانقاہی سلسلہ کے ذریعہ عام مسلمانوں کو اسلام سے جوڑا؛ چنانچہ اس وقت ترکی میں احیاء اسلام کی جو بہار نظر آرہی ہے، وہ دراصل اسی طرح کی کوششوں کی دَین ہے۔

اسی پس منظر میں پہلے عالمی ایوارڈ کے لئے شیخ محمود آفندی نقشبندی مجددی خالدی کا انتخاب عمل میں آیا، ۲۱ / اکتوبر کو ہم لوگ دہلی ایرپورٹ سے ترکش ایرلائنز کے ذریعہ استنبول کے لئے روانہ ہوئے، ہندوستان سے جانے والے قافلہ میں مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی صدر شعبہ حدیث دار العلوم دیوبند، مولانا سید ارشد مدنی، مولانا نور عالم خلیل امینی ایڈیٹر ''الداعی'' دیوبند، مولانا سعید الرحمان اعظمی، مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا سید سلمان حسینی ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا عتیق احمد بستوی سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، مولانا عبید اللہ اسعدی شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ، مولانا محمد رفیق قاسمی سکریٹری جماعت اسلامی ہند، مولانا مفتی احمد دیولوی (گجرات)، پروفیسر سعود عالم قاسمی مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ، مولانا کاکا سعید عمری عمرآباد، پروفیسر محسن عثمانی ایفل یونیورسیٹی حیدرآباد، جناب اقبال احمد انجینئر (حیدرآباد) اور کچھ اور حضرات تھے اور مولوی عمر عابدین قاسمی مدنی اس پورے قافلہ کے ذمہ دار تھے، ہم لوگ فجر سے پہلے ہی دہلی سے روانہ ہوئے

اور تقریباً چھ گھنٹے کے سفر کے بعد جب استنبول پہنچے تو وہاں ابھی ۹/ بج رہے تھے۔

استنبول جانا ایک دیرینہ خواب تھا، جس کی تعبیر دوسری دفعہ اس حقیر کو مل رہی تھی، لیکن اکثر شرکاءِ قافلہ کے لئے استنبول کے سفر کا یہ پہلا موقع تھا، استنبول کی فضا میں پہنچتے ہی ایک ایسا خوشگوار منظر سامنے آتا ہے، جس سے ایمان کو تازگی حاصل ہوتی ہے، ایک طرف نیلگوں سمندر اور سبز و شاداب ہرے بھرے درختوں کی کثرت ایک خوبصورت منظر پیش کرتی ہے، دوسری طرف مسجدوں کے بلند مینارے، اور پُرشکوہ اور فلک بوس گنبد اسلامی شناخت کو ظاہر کرتے ہیں اور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ہم ایک ایسے شہر میں پہنچ رہے ہیں، صدیوں سے جو اسلامی قدروں کا امین ہے اور شناخت نبوت محمدی ﷺ کی نسبت سے ہے، اسی منظر کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ کمال اتاترک ایر پورٹ پر اترے، یہ بہت وسیع اور سہولتوں کے اعتبار سے نہایت ترقی یافتہ ایر پورٹ ہے، ایر پورٹ کا عملہ بھی بڑا خلیق محسوس ہوا، اور بہت کم وقت میں ایمیگریشن کی کارروائی مکمل ہوگئی، ایمیگریشن سے باہر آنے کے بعد جب ہم لوگوں نے سامان حاصل کرنے کے لئے ٹرالی لینی چاہی تو وہ مقفل تھی، معلوم ہوا کہ ایک ترکی لیرا ڈالنے کے بعد ہی یہ قفل کھل سکے گا، چنانچہ وہیں ایکسچینج سے ڈالر بھنائے گئے اور سکے حاصل کئے گئے، پھر ہم لوگ سامان لے کر آگے بڑھے، اندازہ ہوا کہ سیاحتی مرجع ہونے کی وجہ ہے یہاں ہر چیز تجارتی نقطۂ نظر سے فراہم کی جاتی ہے، لندن ایر پورٹ پر بھی ایسا ہی نظام دیکھا تھا؛ لیکن وہاں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ جب آپ ٹرالی کو اپنی جگہ لے جا کر چھوڑتے ہیں تو پھر آپ کا سکہ آپ کو واپس مل جاتا ہے، یعنی یورپ میزبانی میں اب بھی ہم سے آگے ہے اور سیاحت پر آنے والوں کے لئے زیادہ آسانیاں فراہم کرتا ہے؛ تاکہ لوگ یہاں کے سفر کو دشوار محسوس نہ کریں، کاش ایشیائی ممالک بھی اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ مسافروں کو دی جانے والی سہولت تھوڑے سے اخراجات کو بڑھاتی ہے؛ لیکن انجام کے اعتبار سے زیادہ نفع کا باعث ہوتی ہے۔

ایر پورٹ کے قریب ہی WOW کے نام سے ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہے، اس میں وہ تمام سہولتیں میسر ہیں جو ایسے ہوٹلوں میں ہوا کرتی ہیں، اب یہ میزبانوں کی شرافت ہے کہ انہوں نے مہمانوں کے نظام کو اس طرح ترتیب دیا کہ غیر اخلاقی چیزوں کا سامنا نہ ہو، کھانے کے لئے ایسا ہال جو ان ہی مہمانوں کے لئے مخصوص ہو، جس میں شراب کی سپلائی اور دوسرے سیاحوں کی آمد و رفت نہ ہو،

ٹی وی میں ایسے چینل جو صاف ستھرے اور مذہبی انداز کے ہوں۔

پروگرام میں ایشیاء، یورپ، افریقہ، امریکا وغیرہ کے ۵۵ ممالک کے نمائندے شریک تھے اور امریکہ سے لے کر چین تک کے مذہبی قائدین اس اجلاس کی رونق میں اضافہ کررہے تھے، مشہور محدث شیخ محمد محمد عوامہ (مدینہ منورہ)، ممتاز مفسر قرآن شیخ محمد علی صابونی (شام)، یورپی افتاء کونسل کے ذمہ دار و رئیس محاکم شرعیہ قطر، مفتی اہل سنت (لبنان)، یورپی اسلامی تنظیموں کے وفاق کے جنرل سکریٹری، میرے دوست اور سفر حج کے رفیق شیخ شکیب مخلوف، جنوبی افریقہ کے جوہانسبرگ اور کیپ ٹاؤن کے صدر جمعیت علماء، کئی مسلم ملکوں کے وزرائے اوقاف اور عالم اسلام کی کئی ممتاز یونیورسٹیوں کے نمائندے اس پروگرام میں شریک تھے، اس طرح ہندوستان کے برگزیدہ عالم اور طبقۂ علماء کے سرخیل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ان کی تحریک مدارس، بالخصوص دار العلوم دیوبند کے ذکر خیر سے پوری فضا گونج رہی تھی اور شاید پہلی بار اس بڑے پیمانے پر علماء ہند کی خدمات کا تعارف ہورہا تھا۔

۲۲/ اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا، آج تمام مہمانوں کو نماز جمعہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر سے متصل جامع ابی ایوب انصاری رضی اللہ عنہ میں ادا کرنی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ قسطنطنیہ میں شریک ہونے والوں کے لئے مغفرت کی خوشخبری سنائی تھی، جب فتح قسطنطنیہ کے لئے پہلی کوشش کی گئی تو یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا، حضرت ابوایوب انصاری کی اس وقت کافی عمر ہوچکی تھی؛ لیکن اس خوشخبری میں حصہ پانے کے لئے وہ باوجود ضعف اور پیرانہ سالی کے جہاد میں شریک ہوئے، قسطنطنیہ اس وقت فتح نہیں ہو پایا؛ لیکن جب آپ کی شہادت کا وقت آیا تو آپ نے وصیت فرمائی کہ قسطنطنیہ سے جتنا قریب مجھے لے جاسکو، وہاں مجھے دفن کرنا، چنانچہ ابنائے فاسفورس کے کنارے اور دیوار قسطنطنیہ سے بالکل قریب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی تدفین عمل میں آئی اور ترکی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ میزبان رسول کی میزبانی کرے۔

ہم لوگ یہاں جمعہ سے کچھ پہلے پہنچے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک کی زیارت کا شرف حاصل کیا، واقعہ ہے کہ یہاں ہر زائر کو ایک خاص روحانی کیفیت اور سکینت محسوس ہوتی ہے، قبر شریف سے متصل راہداری میں کچھ تبرکات کی تصویریں بھی آویزاں ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے قبر شریف پر فاتحہ پڑھ کر ہم لوگ مسجد میں حاضر ہوئے، یہ مسجد اگرچہ استنبول کی بعض دیگر مساجد سے

چھوٹی ہے؛ لیکن پھر بھی کافی کشادہ ہے، مسجد کا گنبد جو بڑے گنبد کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے گنبدوں پر مشتمل ہے، اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ درمیان میں ستون نہیں ہے، سمت قبلہ میں محراب اور اس کے قریب ہی منبر ہے اور یہ منبر ٹھیک اسی طرح کا ہے جیسا کہ مسجد نبوی میں ترکی حصہ تعمیر میں واقع ہے، اگر آپ قبلہ رخ ہو کر بیٹھیں تو اس کے بائیں جانب زمین سے آٹھ دس فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹی سی بالکونی ستون سے متصل بنی ہوئی ہے، جمعہ کی اذان سے پہلے یہاں خطیب ترکی زبان میں اسلام کے بارے میں خطاب کرتا ہے، یا قرآن مجید کا درس دیتا ہے، ہم لوگ جب مسجد میں داخل ہوئے تو درس کا سلسلہ جاری تھا، درس تو ترکی میں تھا؛ لیکن درمیان میں کثرت سے قرآن مجید کی آیتیں اور احادیث نبوی کی عبارتیں فاضل مقرر پیش کر رہے تھے، اور آیات واحادیث کو بہترین عربی لہجہ میں پڑھ رہے تھے، ان کا خطاب سن کر اندازہ ہوا کہ ترکی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت ہیں اور بعض الفاظ وہ بھی ہیں، جو ترکی میں اور اردو میں استعمال ہوتے ہیں، جیسے: چاقو، قینچی وغیرہ، غالباً یہ ازہری عالم تھے، چہرہ تو بالکل صاف تھا؛ لیکن ازہری علماء کی طرح سرخ ٹوپی، اس پر سفید کپڑے کا عمامہ نما پیچ اور کاندھوں سے پاؤں تک عبا میں ملبوس، خوبرو اور خوش اخلاق، اندازہ ہے کہ تیس چالیس کے درمیان عمر رہی ہوگی، جب تقریر سے فارغ ہوئے تو سیڑھی لگائی گئی اور وہ نیچے اتر گئے، اب مؤذن صاحب نے سمت قبلہ کی مخالف جانب میں واقع چھت کی بالکونی سے اذان دی اور ایسے خوبصورت لب ولہجہ میں دی کہ اگر اسے حرمین شریفین کے مؤذنین کی اذانوں سے بھی فائق قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا؛ البتہ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ چہرہ ان کا بھی بے ریش تھا، سنتوں کے بعد دوسری اذان ہوئی اور خطیب صاحب منبر پر خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، یہ اپنی وضع قطع میں متشرع نوجوان تھے، دونوں خطبوں میں ابتدائی اور آخری فقرے عربی زبان میں ادا کئے گئے اور بقیہ ترکی میں، انہیں صاحب نے نماز پڑھائی اور بڑا عمدہ قرآن پڑھا، اندازہ ہوا کہ یہاں اذان اور تلاوتِ قرآن وغیرہ میں حرمین شریفین کے لب ولہجہ کے مقابلہ مصر کا لب ولہجہ زیادہ مقبول ہے، بہر حال نماز سے فارغ ہو کر ہم لوگ ہوٹل واپس پہنچے اور اس دن کا زیادہ تر وقت مہمانوں کی باہمی ملاقات اور تعارف میں گزرا۔

اگلے دن ۲۳ / اکتوبر کی صبح میں علمی محاضرات رکھے گئے تھے، شیخ حمدی ارسلان نے

استقبالیہ کلمات کہے، پھر تلاوت ہوئی، کانفرنس کے افتتاح کی ذمہ داری اس حقیر سے متعلق رکھی گئی تھی، چنانچہ خطبۂ افتتاحیہ پیش کیا گیا، اس حقیر نے اپنے خطبہ میں علماء کی اتنی بڑی تعداد کی حاضری کی نسبت سے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے علماء کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے اور قرآن مجید میں ستاروں کی تین خصوصیات ذکر کی گئی ہیں: ایک یہ کہ ستارے رات کی تاریکیوں اور سمندر کی تنہائیوں میں لوگوں کے لئے رہنمائی کا کام کرتے ہیں، دوسرے: ستارے آسمان کے لئے زینت کا باعث ہیں اور تیسرے: یہ شیاطین کو بھگاتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ علماء کی تین بنیادی ذمہ داریاں ہیں: ایک یہ کہ امت کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنیں، دوسرے: وہ اپنے اعمال واخلاق اور علم پر استقامت کے اعتبار سے امت کے لئے زینت کا درجہ رکھتے ہوں اور نمونہ ہوں، تیسرے: وہ دین پر ہونے والی یلغار اور دین میں پیدا کی جانے والی انحرافی کوششوں کا مقابلہ کریں، میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اس وقت علماء اپنی بالغ نظری سے صہیونی اور صلیبی سازشوں کو سمجھیں، ان کے عزائم سے آگاہ ہوں، امت کو اختلاف وانتشار سے بچائیں اور اختلاف مسائل میں تحمل و بردباری سے کام لیں۔

اس افتتاحی نشست میں ڈاکٹر یحییٰ عبدالرحیم (امریکہ) نے امریکہ میں دعوت کے مواقع اور مسائل پر روشنی ڈالی، شیخ آفندی کے شاگرد شیخ احمد جبلی نے میزبانوں کی طرف سے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، ڈاکٹر فاروق نے فکری اعتبار سے وحدت امت پر خطاب کیا اور بڑا عمدہ مقالہ پیش کیا، جس میں ان لوگوں کا رد تھا جو اشاعرہ اور ماتریدیہ کو گمراہ ٹھہراتے ہیں، ڈاکٹر یوسف قرضاوی کو اس نشست میں فکری اعتبار سے امت کی وحدت پر خطاب کرنا تھا؛ لیکن وہ بعض مشغولیتوں کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے؛ تاہم انہوں نے اپنی سی ڈی بھیجی جو نشر کی گئی، شیخ قرضاوی نے اپنے دردمندانہ خطاب میں علماء کو اعداء اسلام کی سازشوں کی طرف متوجہ کیا اور اسلام کی دعوت واشاعت کے سلسلہ میں صوفیاء کی بلند خدمات کا بھی ذکر فرمایا، نیز دیوبند اور المعہد العالی اسلامی حیدرآباد کا بھی بلند الفاظ میں ذکر کیا، شیخ کی یہ سی ڈی سنائی اور دکھائی گئی، جس کا ایک ایک لفظ دردِ دل کا مظہر تھا۔

آج ظہر کے بعد ہم لوگوں کو مسجد سلطان احمد جانا تھا، یہ مسجد آیا صوفیہ کے سامنے ہے، آج کل اسے بُلو مسجد (مسجد ازرق) بھی کہا جاتا ہے، یہ نہایت خوبصورت، طویل وعریض اور ترکی طرز تعمیر کا شاہکار ہے، اصل مسجد چار میناروں اور بڑے گنبد سے مربوط کئی چھوٹے چھوٹے گنبد پر مشتمل ہے،

مسجد سے متصل گنبدوں سے آراستہ برآمدوں کے درمیان ایک وسیع صحن ہے اور اس کے اختتام پر ایک خوبصورت باب الداخلہ ہے، یہ مسجد واقعی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اندر سے بھی دیواروں پر مختلف رنگوں کی حسین وجمیل مینا کاری ہے، واقعہ یہ ہے کہ الفاظ میں اس کی خوبصورتی کا نقشہ کھینچنا دشوار ہے، پانچ ہزار سات سو میٹر کی مسجد کی اندرونی عمارت صرف چار ستونوں پر کھڑی کی گئی ہے، اس مسجد کو سلطان احمد نے ایک خواب کے بناء پر سترہویں صدی عیسوی میں تعمیر کروایا تھا، اس شان سے اس کی تعمیر کا آغاز ہوا کہ خود سلطان اور اس کے وزراء نے برکت حاصل کرنے کے لئے اس کے آغاز میں شرکت کی، اس عظیم الشان مسجد کے سامنے ہی دوسری طرف اَیا صوفیہ نام کا وہ تاریخی چرچ ہے، جس کو فاتح قسطنطنیہ محمد الفاتح نے مسجد بنا دیا تھا، ان دونوں تاریخی عمارتوں کے درمیان بہت وسیع اور پُر رونق پارک ہے، جو سیاحوں سے بھرا رہتا ہے، چنانچہ ہم لوگوں نے مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی، پھر واپس سامنے اَیا صوفیا پہنچے۔

یہ بہت بڑا چرچ تھا، جو درجہ مغرب میں ویٹیکن سیٹی کو حاصل تھا، وہی درجہ مشرق کی عیسائی دنیا میں اس چرچ کو حاصل تھا، اس میں شبہ نہیں کہ اَیا صوفیا کا یہ چرچ بھی فن تعمیر کا ایک نمونہ ہے، جو ایک بڑے اور اس سے متصل کئی چھوٹے چھوٹے گنبدوں پر نہایت وسیع اور کشادہ ہالوں پر مشتمل ہے، یہ نوسوسولہ سال چرچ رہا ہے، چار سو اکاسی سال یہاں نماز پڑھی گئی ہے اور ۱۹۳۵ء میں کمال اتاترک (لعنۃ اللہ علیہ) نے اس کو میوزیم بنا دیا، قسطنطین اول (۳۲۴-۳۳۷ء) کے عہد حکومت میں اس کی تعمیر کا آغاز ہوا اور قسطنطین ثانی کے عہد حکومت میں ۳۶۰ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی، پانچویں صدی عیسوی کے بعد اس کا نام اَیا صوفیا پڑ گیا، جس کے معنی ہیں ''مقدس علم کی جگہ'' پھر بعض بادشاہوں نے اس میں اضافہ بھی کیا اور اس کی تزئین وآرائش میں حصہ لیتے رہے، ابتداء یہ عمارت لکڑیوں کے ستونوں پر تھی، موجودہ پُرشکوہ عمارت کا افتتاح ۵۳۷ء میں ہوا، اس کا گنبد تقریباً ۵۶ میٹر بلند ہے، محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس چرچ کو مسجد میں تبدیل کر دیا، مسجد بننے کے بعد باہر کے حصہ میں چاروں طرف ترکی طرز کے چار بلند مینارے بنا دئے گئے، مسجد کے اندر عبادت کے مرکزی ہال میں ایک عظیم الشان منبر بنا دیا گیا اور امام کے لئے محراب بنائی گئی ہے، بقیہ تعمیرات میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں کی گئی، اس بلند و بالا چھت کی دیواروں پر مختلف تصویریں خاص کر حضرت مریم اور حضرت عیسی

علیہا السلام کی خیالی تصویریں آج بھی موجود ہیں، کہا جاتا ہے کہ محمد الفاتح نے احتراماً ان تصویروں کو کھرچنے کے بجائے اس پر کوئی چیز چسپاں کرادی تھی؛ تاکہ تصویر چھپ بھی جائے اور عیسائیوں کی دل آزاری بھی نہ ہو، اب ان تصویروں کو صاف کردیا گیا ہے، یہاں نماز پڑھنے پر تو مکمل پابندی تھی، اب بھی جماعت کے ساتھ باضابطہ نماز نہیں ہوتی؛ لیکن عمارت کے ایک گوشہ میں اگر کوئی شخص اپنے طور پر نماز پڑھنا چاہے تو اس کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

مسجد سلطان احمد سے ہم لوگ مشہور عالم میوزیم ''توپ کاپی'' کی طرف لے جائے گئے، جو یہاں سے بالکل قریب ہے، یہ توپ کاپی اصل میں عثمانی سلاطین کا قصر شاہی تھا، جسے سلطان محمد الفاتح نے ۱۴۶۰ء سے ۱۴۷۸ء کے درمیان تعمیر کرایا، پھر مختلف سلاطین اس میں اضافہ کرتے گئے، اسی میں حکمرانوں کی رہائش بھی تھی، عدالت بھی تھی، اور سیکریٹریٹ بھی، اس کا وہ حصہ جو شاہی محل کے طور پر استعمال ہوتا تھا، چار سو کمروں پر مشتمل ہے، یہ عمارت بھی ترکی طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے، جب سلطان سلیم نے عباسی خلیفہ سے رسول اللہ ﷺ کے تبرکات حاصل کئے تو اسی محل میں ایک خصوصی ہال اس کے لئے مخصوص کیا گیا، اب یہ پوری عمارت میوزیم ہے، اور اس میوزیم کی عظمت اور اس کی شناخت رسول اللہ ﷺ کے تبرکات اور مختلف انبیاء کی طرف منسوب اثاثے ہیں، ہم لوگ جب اس مقام کی زیارت کے لئے آئے تو ہمارے پیچھے پیچھے شامی نوجوانوں کا ایک نعت خواں گروپ بلند آواز میں ترنم کے ساتھ صلاۃ وسلام اور عربی میں نعتیہ اشعار پڑھتا آرہا تھا، واقعہ ہے کہ ان اشعار سے اس ماحول میں ایک خاص کیفیت پیدا ہورہی تھی، حج کے موقع پر تلبیہ کے کلمات سن کر جو کیفیت پہلی بار میں نے محسوس کی تھی، آج ان نعتیہ اشعار کو سن کر لگتا تھا کہ وہی کیفیت عود کر آئی ہے۔

میوزیم کے اس گوشہ سعادت میں رسول اقدس ﷺ کی عباء مبارک ہے، جو ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی بلوری صندوق میں بند ہے، غزوۂ احد میں آپ ﷺ کے جو دندان مبارک شہید ہوئے، وہ بھی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کئی عدد ہیں اور الگ الگ تین شیشیوں میں رکھے گئے ہیں، آپ ﷺ کی نعلین مبارکین بھی ہیں، ایک مہر بھی ہے جو آپ ﷺ کی طرف منسوب ہے، ایک پتھر ہے جسے ''نقش قدم شریف'' کہا جاتا ہے اور لوگوں میں مشہور ہے کہ جب آپ بیت المقدس سے معراج کے لئے تشریف لے گئے تو جس چٹان پر آپ ﷺ نے پائے مبارک رکھا، وہاں نقش پا ثبت ہوگیا، اسی میں

وہ سیاہ رنگ کا علم نبوی بھی ہے، جس کو''عقاب'' کہا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کے بعض نامہ ہائے مبارک بھی ہیں، قرآن مجید کا ایک نسخہ بھی ہے جو عہد عثمانی کا بتایا جاتا ہے، بیس تلواریں ہیں، جو رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت خالد بن ولید، حضرت زبیر بن عوام اور حضرت جعفر طیار وغیرہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار خاصی بڑی اور چوڑی ہے، ہم جیسے لوگ شاید اسے اٹھا بھی نہ سکیں، رسول اللہ ﷺ کی خُود مبارک بھی ہے، ان کے علاوہ کعبۃ اللہ کا دروازہ، میزاب رحمت اور کعبۃ اللہ کے بعض تبرکات بھی، جو عہد عثمانی سے تعلق رکھتے ہیں، ترکوں نے ان تبرکات کو بڑے احترام اور اہتمام کے ساتھ رکھا ہے اور اس حصہ میں چوبیس گھنٹہ ایک قاری قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہتا ہے، واقعہ ہے کہ اس زیارت نے ایمان کی تازگی کا سامان کیا، حرمین شریفین کے بعد شاید ہی کہیں جا کر ایسی مسرت حاصل ہوئی ہو۔

اگلے دن ۲۴ / اکتوبر کو صبح نو بجے سے خطبات کا ایک اور پروگرام تھا، ڈاکٹر ابراہیم فوتلائی نے پانچ منٹ افتتاحی کلمات کہے، ایک خوش آواز قاری عبدالملک نے قرآن مجید کی تلاوت کی، اس نشست میں ڈاکٹر قیس مبارک نے فقہی نقطۂ نظر سے اور ممتاز محدث شیخ محمد عوامہ نے حدیث کے پہلو سے''اتحاد امت'' پر خطاب کیا، یوں تو دونوں ہی خطبات اچھے تھے؛ لیکن شیخ عوامہ کا خطاب بڑا ہی عالمانہ اور چشم کشا تھا، جس میں انہوں نے ناواقفیت، یا کم واقفیت کے ساتھ حدیث پر اظہار رائے اور سلف پر طعن و تشنیع کے سلسلہ میں بڑی ہی دردمندانہ گفتگو کی، شیخ عبداللہ بن بیّہ نے''تصوف'' کے موضوع پر خطاب کیا، اور کتاب وسنت سے تصوف کی اصل اور اس کی اساس کو واضح فرمایا۔

آج ہی بعد نماز مغرب ایوارڈ کی حوالگی کا اصل پروگرام تھا، یہ پروگرام شہر کے ایک بڑے اسٹیڈیم میں ہونے والا تھا، اور توقع تھی کہ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد کی شرکت ہوگی؛ لیکن ملک کے نام نہاد پرستاران سیکولرزم نے اس پروگرام کے خلاف میڈیا کے ذریعہ شوروغوغا شروع کردیا؛ اس لئے حکومت کی خواہش پر مناسب سمجھا گیا کہ اسٹیڈیم کے بجائے ہوٹل ہی کے بڑے ہال میں یہ تقریب منعقد ہو اور شرکاء کی تعداد کو محدود رکھا جائے، اس ہال میں پانچ چھ ہزار افراد کی گنجائش تھی اور ہال بھرا ہوا تھا، بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے، اس پورے پروگرام میں شیخ کے تلامذہ اور متوسلین کے جذبات عقیدت اور شیخ سے وفور محبت دیدنی تھا، نشست کا آغاز مشہور مصری قاری شیخ عبدالباسط

عبدالصمد کے صاحبزادے یاسر بن عبدالباسط کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا، انہوں نے اپنے والد ہی کے لب ولہجہ میں سورۂ رحمن، والضحیٰ اور سورۂ تکویر کی تلاوت کی، تلاوت اچھی کی؛ لیکن وہ بات کہاں جو شیخ عبدالباسط میں تھی؟ اس کے بعد ایوارڈ کے پس منظر میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی خدمات پر اس حقیر کو خطبہ پیش کرنا تھا، راقم الحروف نے اپنے خطبہ کے آغاز میں عرض کیا کہ دنیا کے مختلف ملکوں اور مختلف نسلوں کے اہل علم کا یہ اجتماع ظاہر کرتا ہے کہ یہ امت اپنی فطرت کے اعتبار سے آفاقی امت ہے، مگر صلیبی اور صہیونی طاقتوں کے دام فریب میں پھنس کر کبھی کبھی یہ افتراق کے راستے پر چلی جاتی ہے؛ لیکن اس کا اصل مزاج اسلامی وحدت واخوت کا ہے، راقم الحروف نے عرض کیا کہ ایوارڈ دینے کی اصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف صحابہ کے مناقب بیان کئے ہیں، اس سے جہاں صحابہ کا درجہ اور مقام معلوم ہوتا ہے، وہیں حضور ﷺ کی یہ سنت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں اس کے سینہ کو وسیع ہونا چاہئے، ایوارڈ بھی اعتراف خدمات ہی کی ایک صورت ہے۔

اس حقیر نے حضرت نانوتویؒ کے خصائص وامتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ایمانی حمیت اور دینی غیرت ہے، اسلام پر کوئی آنچ آئے اور امت کسی ابتلا سے دوچار ہو تو ممکن نہیں تھا کہ وہ گوشۂ عافیت پکڑ لیں، نہ لوہے کی زنجیر انہیں خوفزدہ کر سکتی تھی اور نہ سونے کی زنجیر ان کے دل وزبان کو خرید سکتی تھی، ان کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے امت کے داخلی اختلافات کو اپنی کوششوں کا محور نہیں بنایا؛ بلکہ اس میں تسامح اور نرمی سے کام لیا اور اسلام پر ہونے والی بیرونی یلغار کا پوری قوت سے مقابلہ کیا، دفاع عن الاسلام پر توجہ دی؛ اسی لئے ان کی زیادہ تر تالیفات عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے رد میں ہیں۔

علمی اعتبار سے ان کی امتیازی شان یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی عقائد — وجود باری، توحید، نبوت کی ضرورت، نبوت محمدی ﷺ، آپ ﷺ پر ختم نبوت، قرآن مجید کی حقانیت اور ابدیت، کچھ جانوروں کا حلال اور کچھ کا حرام ہونا، قبلہ کی مصلحت وغیرہ — پر عقل اور انسانی فطرت کی روشنی میں بحث کی اور محسوس چیزوں سے معنوی امور پر استدلال کیا، اسی طرح ان کی زندگی کا ایک اہم اور علماء کے لئے قابل تقلید پہلو حضرت نانوتویؒ کا توکل اور تعلق مع اللہ ہے جو اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ انہوں نے دارالعلوم

دیو بند کے لئے سرکاری امداد اور مستقل ذریعۂ آمدنی کے حصول کو بھی پسند نہیں فرمایا۔

اس حقیر نے عرض کیا کہ حضرت نانوتویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ تحریک مدارس کی بنیاد رکھنا ہے، جس نے گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے برصغیر میں اسلام کی حفاظت و اشاعت اور دین حق کے خلاف اٹھنے والی مختلف یورشوں کا نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے، اور آج دنیا میں مشرق سے مغرب تک اس کے اثرات محسوس کئے جا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلام دشمن طاقتیں مدارس کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں، اس حقیر نے اخیر میں عرض کیا کہ یہ شہر ''قسطنطنیہ'' وہ شہر ہے، جس کے فتح کئے جانے کی رسول اللہ ﷺ نے تمنا کی تھی اور جس میں شریک ہونے والوں کے لئے آپ ﷺ نے مغفرت کی خوشخبری دی تھی، نیز مکہ اور بیت المقدس کے بعد اس شہر کے فتح ہونے پر مسلمانوں کو جو مسرت ہوئی، شاید ہی کسی شہر کے فتح ہونے پر ہوئی ہو، مزید عرض کیا گیا کہ آپ کے لئے تمغۂ افتخار اور وجہ سعادت ہے کہ اسی سرزمین میں میزبان رسول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ آسودۂ خواب ہیں، جیسے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے پیغمبر اسلام ﷺ کی میزبانی فرمائی اور ان کی محبت کو اپنی آنکھوں کا سرمایہ بنایا، اسی طرح ترکوں نے اسلام کی میزبانی کی اور اسلام کو اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنایا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جیسے عربوں کی عزت اور ان کا وقار اسلام سے متعلق ہے، عربوں کے تمدن وثقافت کی اسلام سے پہلے کوئی اہمیت نہیں تھی، اسی طرح ترک بھی اسلام سے پہلے ایک گمنام اور غیر اہم قوم تھے، اسلام نے انہیں دنیا میں ایسی عزت اور سربلندی عطا فرمائی کہ انہوں نے ایشیا، یورپ اور افریقہ کے بڑے حصے پر حکومت کی اور ہندوستان جیسے دور دراز ملکوں میں بھی جمعہ وعیدین کے خطبوں میں عثمانی خلفاء کے نام پڑھے جاتے تھے، آج بھی آپ کی سربلندی اسلام ہی سے جڑی ہوئی ہے؛ اس لئے ایک مسلمان بھائی کی حیثیت سے ہم آپ کو مغرب سے مشرق کی طرف، یورپ سے عالم اسلام کی طرف اور سیکولرزم سے دین محمدی کی وسعت کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں اور سخت ابتلاء و آزمائش کے باوجود آپ نے جس طرح اسلام پر استقامت اختیار کی ہے، اس کے لئے آپ کو اور آپ کے آباء واجداد کی پاکیزہ روحوں کو پوری دنیا کی طرف سے سلامِ محبت پیش کرتے ہیں۔

میں نے یہ بھی عرض کیا کہ عام طور پر سلاطین اور بادشاہوں کے نام سے ایوارڈ پیش کئے جاتے ہیں؛ لیکن یہ ایوارڈ دین کے ایک خادم کے نام سے ہے؛ تاکہ مسلمان اس بات کو محسوس کریں کہ سلطنت

واقتدار کا شکوہ اور سیم وزر کی کثرت وفراوانی کسی مسلمان کے لئے باعث اعزاز وافتخار نہیں؛ بلکہ اس کے لئے فخر وعزت کا اصل سبب دین سے تعلق، اسلام کی خدمت اور راہ حق میں جد وجہد کی توفیق ہے۔

میرے خطبہ کے ترکی ترجمہ کے بعد شیخ آفندی کے ایک شاگرد رشید شیخ احمد جبلی نے شیخ آفندی کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ان کی اُن قربانیوں کا ذکر کیا جو ترکی میں اسلام پر پابندی کے عہد میں انہوں نے پیش کی ہیں، اس کے بعد مولانا سید محمد ارشد مدنی (صدر جمعیۃ علماء ہند) نے اسلام کی خدمت میں علماء دیوبند کا حصہ نیز حضرت نانوتوی اور شیخ آفندی کے درمیان مناسبت پر روشنی ڈالی اور اخیر میں لبنان کے علاقہ 'عکار' کے مفتی اہل سنت ڈاکٹر شیخ اسامہ رفاعی نے خطاب فرمایا اور ایوارڈ کے اس سلسلہ کی تحسین وپذیرائی کی، ان کا شمار عالم اسلام کے بڑے علماء میں ہوتا ہے، انہوں نے بعد میں بہ اصرار اس حقیر سے حدیث کی اجازت بھی حاصل کی، پھر ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ (جو شیخ محمد عوامہ کے صاحبزادہ ہیں) نے ایوارڈ سے متعلق تفصیلات پیش کیں، اس کے بعد عزیزی مولوی محمد عمر عابدین قاسمی مدنی سلمہ نے رسمی طور پر ایوارڈ کی تجویز پیش کی اور پورے مجمع نے باتفاق رائے اس کی تائید کی، چنانچہ استاذ گرامی حضرت مولانا محمد سالم قاسمی (مہتمم دار العلوم وقف دیوبند) کے ہاتھوں شیخ کو ایوارڈ پیش کیا گیا، یہ ایوارڈ لکڑی پر بنے ہوئے پیتل وغیرہ کے کام سے آراستہ ایک ایسے مومنٹو کی شکل میں تھا، جو تقریباً قد آدم رہا ہوگا، اس میں اوپر شیخ کا نام کندہ تھا، اس کے نیچے ''المعہد العالی اسلامی حیدرآباد'' کا مونوگرام اور اس کے بعد ''**جائزة الإمام محمد قاسم النانوتوي الإسلامية العالمية**'' — جس وقت ایورڈ دیا جارہا تھا پورا ہال نعرۂ تکبیر اور تحسین وآفرین کی صدا سے گونج رہا تھا، ایوارڈ حوالہ کرنے کے بعد مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی نے دعاء فرمائی، اخیر میں شامی نعت خوانوں نے اپنی خوبصورت آواز اور دلکش لَے میں مشہور نعتیہ کلام 'قصیدۂ بردہ' پیش کیا، اس طرح ایوارڈ کی یہ باوقار اور اثر انگیز تقریب پایۂ تکمیل کو پہنچی، نیز یہ حقیر ایک دن رک کر اور دیگر حضرات اگلے دن ہندوستان واپس ہوگئے۔

قطر میں چند دن

پندرہ جون ۲۰۱۴ء کو ہندوستان کے ممتاز فقہی وتحقیقی ادارہ 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' کے ایک سہ رکنی وفد نے خلیج کی ایک چھوٹی مگر فعال ریاست قطر کا دورہ کیا، یہ حقیر بھی اس وفد میں شامل تھا، اور یہ دورہ عالمی باوقار تنظیم ''**الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین**'' کی دعوت پر ہوا تھا، عالم اسلام اور عالم عرب کے موجودہ حالات کے پس منظر میں میرے لئے یہ ایک دلچسپ سفر تھا؛ تاکہ وہاں کے حالات کو قریب سے جانا جاسکے اور بدلتی ہوئی مسلم دنیا کے حالات سے آگہی حاصل ہو۔

قطر رقبہ کے اعتبار سے ایک مختصر ملک ہے، جو صرف ۴۲۷ مربع میل پر واقع ہے، ۲۰۰۷ء کے تخمینہ کے مطابق یہاں کی مقامی آبادی ۸/لاکھ اکتالیس ہزار افراد پر مشتمل ہے اور ایک مربع کلو میٹر میں اوسطاً ۴۷/افراد بستے ہیں، اس کی راجدھانی دوحہ ہے، جو نہایت خوبصورت، پُرکشش اور قابل دید شہر ہے اور اس کے سینہ پر فلک بوس عمارتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، کسی زمانہ میں یہ خلافت عثمانی کا حصہ تھا، پھر جب مغربی ملکوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور ان کی طاقت کو بے اثر کرنے کے لئے عالم اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کئے تو بعض حصوں کو برطانیہ نے اپنے قبضہ میں لیا، بعض پر فرانس کا تسلط قائم ہوگیا، اور بعض علاقے چھوٹے چھوٹے قبائلی سرداروں کے حوالہ ہوگئے، قطر برطانیہ کے حصہ میں آیا، پھر جب برطانیہ اور فرانس کو ان علاقوں سے رخت سفر باندھنا پڑا تو انہوں نے اپنے سازشی عزائم کے تحت اس پورے خطہ کو مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بانٹ دیا، اور ان کے درمیان اختلاف کی بنیادیں بھی رکھ دیں، یہ آویزشیں اب تک باقی ہیں؛ چنانچہ خلیج میں کئی ممالک تو ایسے ہیں کہ ان کا رقبہ ہندوستان کے کسی بڑے شہر سے، اور ان کی آبادی ہندوستان کے کسی اوسط درجہ کے شہر سے بھی کم ہے، قطر کی صورت حال بھی یہی ہے، اس چھوٹے سے ملک کو جو تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے اور خشکی کے علاقہ کی سرحدیں سعودی عرب اور غالباً عرب امارات سے ملتی ہیں، تیل کے بڑے ذخائر حاصل ہیں؛ اس لئے یہاں فی کس آمدنی کا اوسط

پوری دنیا سے بڑھ کر ہے۔

قطر میں اگر چہ بیش تر عرب ملکوں کی طرح مطلق العنان بادشاہت کا نظام قائم ہے؛ لیکن کئی پہلوؤں سے اسے امتیازی اہمیت حاصل ہے، جیسے: ذرائع ابلاغ کی آزادی، الجزیرہ کا مرکز دوحہ میں قائم ہے، مشرق وسطی کی صحیح صورت حال کی عکاسی اسی چینل کے ذریعہ ہوتی ہے، اس کے نمائندوں کو کئی ملکوں میں اپنی حقیقت بیانی اور راست گوئی کی سزا مل چکی ہے، اور اس جرم میں ان کو موت کی نیند سلا دیا گیا ہے، شام، عراق اور بالخصوص مصر کے ناگفتہ حالات کی عکاسی یہی، چینل کرتا رہا ہے، خلیجی ریاستیں عام طور پر غیر جمہوری انداز میں کام کرتی ہیں اور عوام کے جذبات کو گھونٹ کر اپنے مفادات کی تکمیل کرتی ہیں؛ اس لئے ان کا قطر پر کافی دباؤ ہے کہ وہ اس چینل کو بند کر دیں یا کم سے کم اس کی آزادی کو سلب کرلیں؛ لیکن اب تک قطر نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے، اس سلسلہ میں اس کو جتنی داد دی جائے، کم ہے۔

اس کا دوسرا بڑا کارنامہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنا اور انصاف قائم کرنے کی کوشش ہے؛ چنانچہ وہ فلسطین اور حماس کی سرگرم مدد کرتا رہا ہے، اور اس نے اس سلسلہ میں اسرائیل کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کی، اس نے ترکی کی اسلام پسند جمہوری حکومت کو بھی قوت پہنچائی ہے، اور اس ملک میں کافی سرمایہ کاری کی ہے، مصر میں عوام کی منتخب حکومت (جس کی قیادت محمد مرسی کر رہے تھے) کا بھی اس نے غیر معمولی مالی تعاون کیا، جبکہ بیشتر مسلم ممالک اپنے بھائیوں کی مدد کرنے میں مغربی ملکوں کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کے چشم و ابرو کے اشارہ کے بغیر اپنے بھائیوں کے تعاون کی بھی ہمت نہیں کرتے۔

قطر کا ایک اہم کام؛ بلکہ کارنامہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو دور کرنے کی کوشش ہے، اس نے فلسطینی قیادتوں کے درمیان بھی اختلاف کی خلیج کو پر کرنے کی کوششیں کی، اس نے مصر کے موجودہ آمر سیسی اور سابق منتخب حکومت کے درمیان بھی اتحاد کی سعی کی، افغانستان میں امن اور اتحاد قائم کرنے کے لئے دوحہ میں طالبان کا دفتر کھولا، یہ اور بات ہے کہ مختلف ملکوں میں جو لوگ برسر اقتدار ہیں، ان میں کدورتیں اور زندگی کی آخری سانس تک کرسی اقتدار پر جمے رہنے کی ہوس اتنی زیادہ ہے کہ ایسی کوششیں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتیں؛ لیکن یقیناً اس سلسلہ میں کی جانے والی مساعی قابل ستائش ہیں۔

عام طور پر مسلم حکومتوں نے اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کو اپنے ایجنڈے سے باہر کر دیا ہے،

دوتین ملکوں کواس سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے،ان میں ایک نمایاں نام قطر کا ہے،قطر کی وزارت اوقاف نے بڑے پیمانے پر تفسیر،حدیث اوردوسرے اسلامی موضوعات پر زیادہ تر قدیم علماء کی نیز بعض جدید مصنّفین کی بڑی ہی اہم کتابیں شائع کی ہیں اوران کو دنیا بھر کے اہل علم تک اعزازی طور پر پہنچایا ہے، اس طرح موجودہ زمانہ میں ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے کم مدت میں علم وتحقیق اورنشر واشاعت کا اتنا سارا کام ہوگیا ہے، جوگذشتہ زمانہ میں حکومتیں بھی پچاس سوسالوں میں کرپاتی تھیں۔

قطر میں جوادارے قائم ہیں،ان میں ایک اہم اورقابل ذکر تنظیم **''الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین''** ہے، جس کے صدر شیخ یوسف قرضاوی، نائبین صدر شیعہ علماء میں سے محمد واعظ زادہ خراسانی (ایران) اوراباضیہ میں سے مفتی عمان شیخ احمد خلیلی (مسقط) ہیں،مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین علی قرہ داغی جنرل سکریٹری ہیں، دنیا کے مختلف ملکوں سے تقریباً ۱۶۷ارکان ہیں، ۲۰۰۴ء میں اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا، جومسلمانوں کی فکری رہنمائی کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ دعوت اسلام کی بھی قابل قدرخدمت انجام دیتی ہے، تنظیم کے جنرل سکریٹری نے ۱۷رجون کی صبح کواس کے مرکزی دفتر میں اس حقیر کے لئے خصوصی ملاقات رکھی، اس ملاقات اور تبادلۂ خیال نے جہاں عالم اسلام میں وحدت عمل کے فقدان کے اعتبار سے رنجیدہ کیا، وہیں اس بات پر بڑی مسرت ہوئی کہ'اتحاد'افریقی ممالک میں غیر مسلم بھائیوں کے درمیان دعوت وتبلیغ کا وقیع کام کررہا ہے؛ چنانچہ کئی قبائل کے سرداروں نے اس کی کوششوں سے اسلام قبول کیا ہے، اوران کے ساتھ ساتھ پورا پورا قبیلہ دامنِ اسلام میں آگیا ہے، راقم سطور نے عرض کیا کہ دنیا کے موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام یہ ہے؛ کیونکہ مسلمانوں کوشکست دی جاسکتی ہے؛ لیکن اسلام کو شکست نہیں دی جاسکتی، اتحاد کے جنرل سکریٹری شیخ قرہ داغی صاحبِ نظر مصنّفین اوروسیع المطالعہ علماء میں شامل ہیں، اوراس وقت عالمی سطح پر ان دوتین شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنہیں اسلامی اقتصادیات کا ماہر سمجھا جاتا ہے،انہوں نے اپنے دولت خانہ پر بھی ہم لوگوں کو مدعو کیا، بڑی ہی پرتکلف دعوت کی، اوراسلامی مالیات کے موضوع پر اپنی بارہ کتابوں کا مجموعہ بھی عنایت فرمایا، اس موقع پر انہوں نے موریتانیہ کے دو بڑے علماء کو بھی مدعو کیا تھا، گفتگو کے دوران اس حقیر نے ہندوستان کے مدارس کے منہج اوراسلام کے احیاء واشاعت میں ان کی غیر معمولی کوششوں کا تذکرہ کیا، ڈاکٹر قرہ داغی نے اس پر گہرے تأثر کا اظہار کیا، اوراپنے بچپن کے بعض واقعات ذکر کئے کہ ان کی تعلیم

بھی مسجدوں میں ہوا کرتی تھی، اوران کے اساتذہ کا حال یہ تھا کہ وہ فجر سے لے کر عشاء کے بعد تک درس دینے میں مشغول رہتے تھے، موریتانیہ کے ان عالم صاحب نے ان کے ملک کی روایتی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایسے مدرسہ کی تصویر دکھائی، جو درخت کے سایہ میں خیموں میں چلتا ہے اور صحراء میں واقع ہے، لوگ وہاں کسب فیض کے لئے دور دور سے آتے ہیں۔

قطر میں پورے عالم عرب اور عالم اسلام کی ایک اہم شخصیت شیخ یوسف عبداللہ قرضاوی کی ہے، ان کی پیدائش ۹ ر ستمبر ۱۹۲۶ء کی ہے، ان کا اصل وطن تو مصر ہے؛ لیکن انہیں قطر کی بھی شہریت حاصل ہے، اور وہ مستقل طور پر قطر ہی میں مقیم ہیں، ۱۹ ر جون کو شیخ کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی، وہ بے حد اکرام اور غیر معمولی شفقت کے ساتھ ملے، انہوں نے خود بتایا کہ ان کی ایک سو ساٹھ تالیفات منظر عام پر آچکی ہیں ان کتابوں میں فقہ الزکوٰۃ، الحلال والحرام، فقہ الجہاد، فقہ الدولۃ، اور فقہ الاولیات جیسی کتابیں شامل ہیں، جنہیں پوری دنیا میں ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ اس سلسلہ میں کم ہی کتابیں ان کی ہمسر ہوں گی۔

اور امید ہے کہ دوسو کتابیں مکمل ہوجائیں گی، ان کی عمر نوے کے قریب ہے، ضعف اور پیرانہ سالی کے تمام آثار موجود ہیں، سماعت بھی کمزور ہوگئی ہے؛ لیکن حاضر دماغی میں کوئی فرق نہیں، اظہار خیال میں اب بھی وہی جوش وخروش ہے، جیل کی صعوبتوں سے بھی گزر چکے ہیں، مصر اور بعض خلیجی ملکوں کے بغض وعناد کا بھی سامنا کر چکے ہیں؛ لیکن پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آیا، وہ دیر تک گفتگو کرتے رہے، اور اس پوری گفتگو میں دو باتوں پر خاص طور پر زور دیا، ایک: اتحاد امت، دوسرے: دعوت اسلام، ان کے ایک ایک لفظ سے وہ تڑپ آشکار تھی، جس سے ان کا سینہ معمور ہے، اگر چہ شیخ قرضاوی کی بعض فقہی آراء سے بہت سے اہل علم کو اختلاف ہے اور یہ حقیر بھی ان سے اختلاف کرنے والوں میں شامل ہے؛ لیکن ان کی دینی حمیت، اسلامی غیرت، فقہی بصیرت، اسلام کی سربلندی کے لئے بے پناہ درد وتڑپ اور جرأت وہمت کا کوئی صاحب انصاف انکار نہیں کرسکتا۔

اکیڈمی کے اس وفد میں اس حقیر کے علاوہ ہندوستان کے ایک ممتاز عالم دین اور اسلامی کتابوں کے مصنف مولانا سید محمد عبیداللہ اسعدی، نیز اکیڈمی کے شعبۂ علمی کے رفیق مولانا امتیاز احمد قاسمی بھی شامل تھے، قطر میں ہندوستان کے بہت سے نوجوان فضلاء مصروف خدمت ہیں، ان میں سب سے

نمایاں شخصیت مولانا محمد رحمت اللہ ندوی ہیں، جنہوں نے کئی کتابوں پر بیش قیمت تحقیق وتعلیق کا کام کیا ہے، جن میں سے **ادلة الحنفية** اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کاندھلوی کی ''الابواب والتراجم'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، قطر کے مقامی علماء میں آل ثانی خاندان کے نوجوان فاضل شیخ خالد اور شیخ احمد کی مہمان نوازی اور اکرام نے بڑا متاثر کیا، انہوں نے بہ اصرار عشائیہ پر مدعو کیا اور تقریباً پورے سفر میں ایک رفیق؛ بلکہ ایک شاگرد کی طرح ساتھ رہے، اور تواضع وفروتنی کی تصویر بنے رہے، حکومت کے شعبۂ دعوت اور اسلامی علوم کی وزارت کے وکیل شیخ محمد المحمود سے بھی بڑی اہم ملاقات ہوئی، انہوں نے قطر میں موجود غیر مسلم تارکین وطن میں دعوت کی کوششوں اور ان کوششوں کے نتیجہ خیز ہونے پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اور خاص کر فلپائن کے لوگوں میں اسلام کا جو رجحان پایا جاتا ہے، اس کو واضح کیا، قطر کے سابق چیف جسٹس شریعہ کورٹ ڈاکٹر عبدالرحمن آل محمود نے بھی ایک دن عصرانہ پر مدعو کیا، وہ اسلامک فقہ اکیڈمی کی دعوت پر ہندوستان آچکے ہیں اور حیدرآباد میں بھی ان کی تشریف آوری ہو چکی ہے، حسب سابق بڑی محبت سے ملے اور دیر تک ان سے گفتگو ہوئی، جن حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں ادارہ اوقاف کے ذمہ دار شیخ خالد خلیلی اور ہندوستان کے علماء میں مولانا ظل الرحمن صدیقی مرحوم کے صاحبزادہ مولانا عطاء الرحمن صاحب، مولانا عبداللہ مبارک ندوی، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے فضلاء مولانا رضی الرحمن قاسمی، مولانا ہارون ندوی، اور مولانا محمد معین الدین، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ جہاں بھی جائے، وہاں سے نصح وموعظت کی سوغات اپنے ساتھ لانے کی کوشش کرے، یہی سوغات قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

☆ کسی قوم کی خوش نصیبی اور بلند اقبالی کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ اس میں جدوجہد کی کتنی صلاحیت ہے، وہ کامیابی کا سفر طے کرنے کے لئے کس قدر مشقت برداشت کرنے کو تیار ہے، اس کی صلاحیتیں کس حد تک علم وتحقیق کے معرکے سر کرنے میں کام آرہی ہیں؟ جو قوم کم نصیب اور آمادۂ زوال ہوتی ہے، وہ جدوجہد کے بجائے عیش وعشرت کا راستہ اختیار کرتی ہے اور اپنی بہترین صلاحیتوں اور قیمتی اثاثوں کو فضول کاموں میں ضائع کر دیتی ہے اس وقت عالم عرب کی عمومی صورت حال یہی ہے، وہ ٹکنالوجی اور فنی ماہرین کے لئے دوسروں پر منحصر ہے اور پٹرول کی شکل میں قدرت نے ان کو جو بغیر محنت کا پھل عطا کیا ہے، اس کو ایسے کاموں میں خرچ کر رہی ہے، جس سے ملک وقوم کو کوئی فائدہ

نہیں، یہ منظر جہاں دوسرے خلیجی ملکوں میں دیکھنے کو ملتا ہے، اس آب وتاب کے ساتھ قطر میں بھی موجود ہے،قطر اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ ۲۰۲۲ء میں اس کے یہاں فٹ بال کا ورلڈ کپ منعقد ہو، اس کی اس کو منظوری بھی حاصل ہو چکی ہے، اس کی تیاری اس پیمانے پر ہو رہی ہے کہ گویا کوئی بڑی جنگ ہونے والی ہے، عالیشان بلند وبالا اور وسیع وعریض اسٹیڈیم تعمیر ہو رہے ہیں، میٹرو ٹرین اور عمارتوں کی ایک طویل قطار بھی تیار کی جا رہی ہے، معلوم ہوا کہ ایسا ماسٹر پلان بنا ہے کہ دوحہ شہر کی بیشتر قدیم عمارتیں منہدم کر دی جائیں گی، اور ان کی جگہ نئی خوبصورت اور جاذب نظر عمارتیں تعمیر کی جائیں گی، عرب ممالک میں شہر کی آرائش اور بے مقصد تعمیر کی طرف ان کی توجہ دیکھ کر بے ساختہ شاد عظیم آبادی کا شعر نوک زبان پر آتا ہے:

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

یہ واقعی کھلونے ہیں، جو مغربی طاقتوں نے دولت مند خلیجی ریاستوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ وہ پٹرول کی قدرتی دولت کا بیشتر حصہ تو امریکی اور یورپی بینکوں میں محفوظ کر دیں؛ تا کہ اس کے ذریعہ مغربی ملکوں کی معیشت مضبوط ہو، اور جو کچھ رقم ان کے ہاتھوں میں دے دی جائے، اسے ایسے کاموں میں خرچ کرا دیا جائے، جس سے کوئی فائدہ نہیں، نہ ان کو دفاعی ٹکنالوجی دی جائے اور نہ دوسری صنعتوں کو ترقی دینے کا موقع فراہم کیا جائے، وہ سوئی سے لے کر جہاز تک ہر چھوٹی بڑی چیز میں ترقی یافتہ ملکوں کے محتاج بنے ہوئے ہیں، اور وقتی عیش وعشرت کی چیزوں میں کھو کر اپنی بہترین صلاحیتوں کو ضائع کر رہے ہیں، علامہ اقبال کی زبان میں قوم کی تقدیر یہی ہوتی ہے کہ اپنے عہد عروج میں اس کے ہاتھ میں ''شمشیر وسنان'' کی جھنکار ہوتی ہے اور جب ان کا عہد زوال آتا ہے تو ان کے ہاتھوں میں ''چنگ ورباب'' آتا ہے اور ان کی صلاحیتیں عشرت کدوں کو سجانے اور عیش وآرام کے نقشے بنانے میں خرچ ہو جاتی ہیں۔

یہ کیفیت صرف مسلم حکومتوں ہی میں نہیں؛ بلکہ ملت اسلامیہ میں بھی پیدا ہو چکی ہے کہ ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے، یا معاشی ترقی حاصل کرنے اور تعمیری کاموں میں صرف ہونے کے بجائے بلڈنگوں کی سجاوٹ، تقریبات میں اسراف اور دعوتوں میں تکلفات کی

نذر ہو جاتی ہے، مسلمانوں کا مزاج بنانے کی ضرورت ہے کہ وہ محنت سے حاصل کئے ہوئے سرمایہ کو اپنی نئی نسل کی تعمیر میں صرف کریں اوران کی قدر کریں۔

☆ دوسری بات جو اس سفر کے درمیان محسوس ہوئی، وہ مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان اور قدم قدم پر اختلاف وانتشار کا وجود ہے، یہ کیفیت عالم اسلام میں بھی ہے، اور مسلمان اقلیتوں میں بھی، بیسویں صدی میں مسلم ممالک کو ٹکڑے ٹکرے کیا جا چکا ہے؛ لیکن مغربی ممالک چاہتے ہیں کہ اس کے اتنے ٹکڑے کر دیے جائیں کہ یہ مستقبل میں کبھی بھی اٹھنے کی کوشش نہ کریں، یہ ہمیشہ ایک مجبور ومقہور قوم کی حیثیت سے زندگی گزاریں، یہ آزاد ہو کر بھی مغربی ملکوں کے غلام بنے رہیں، اوران کے چشم وابرو کے اشارے پر کام کرتے رہیں، قرآن مجید نے مسلمانوں کی یہ تصویر کھینچی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحم دل اور دشمنوں کے مقابلہ سخت تھے: ﴿ أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (الفتح:۲۹)

علامہ اقبال نے اس آیت کا خوب ترجمہ کیا ہے:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق وباطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

لیکن افسوس کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کی صورت حال ٹھیک اس کے برعکس ہے، ان کی صورت حال قرآن کی تعلیم کے برعکس ''**اشداء بينهم و رحماء على الكفار**'' کی ہے یعنی آپسی معاملات میں جنگ وجدال پر آمادہ جیسا کہ مختلف مسلم ملکوں کی داخلی صورت حال ہے اور دشمنوں کے مقابلہ میں جھکے ہوئے، جیسا کہ صہیونی اور صلیبی طاقتوں کے مقابلہ میں عالم اسلام کا رویہ ہے، — پھر کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ملت اسلامیہ اپنے گریبانوں میں جھانک کر اس صورت حال کو سمجھے، فراست ایمانی سے کام لے کر اعداء اسلام کی سازشوں کا ادراک کرے، اور اپنی صفوں کو ٹوٹ پھوٹ سے بچائے؟ **فيا أسفاه يا عجباه!**

❁

سفر برطانیہ کے کچھ تجربات

راقم الحروف ۲۰۰۵ء میں مسلمانانِ برطانیہ کی دعوت پر برطانیہ گیا تھا، اس کے بعد سے ہی وہاں کے علماء کا تقاضہ تھا کہ دوبارہ اس ملک کا سفر ہو؛ لیکن یہاں کی مصروفیات اور اس کے ساتھ ساتھ ویزا کی مشکلات کی وجہ سے پانچ سال تک دوبارہ سفر کی نوبت نہیں آسکی، آخر احباب کے بار بار کے اصرار پر ۵/مئی ۲۰۱۰ء کو میں برطانیہ کے سفر پر روانہ ہوا، جیسے جیسے جہاز آگے بڑھتا گیا، ایسا لگا کہ اوقات بھی آگے بڑھتے جارہے ہیں، حیدرآباد سے ساڑھے گیارہ بجے دوپہر جہاز اڑا اور تقریباً سولہ سترہ گھنٹہ کا سفر طے کرنے کے بعد جب برمنگھم ایرپورٹ پر اترا تو معلوم ہوا کہ ابھی عصر کا وقت ہے، حدیث میں آتا ہے کہ جب دجال کا ظہور ہوگا تو دنوں کی مسافت بہت بڑھ جائے گی، اس کے چھوٹے چھوٹے نمونے دنیا میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

۶/مئی سے ۱۶/مئی تک اس حقیر کا برطانیہ میں قیام رہا، آئس لینڈ میں آتش فشاں کے پھٹنے اور اس کی راکھ کے فضا میں بکھر جانے کی وجہ سے ٹھنڈک بہت زیادہ تھی، اللہ تعالیٰ کے مظاہر قدرت میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ہی شئ سے اس کی متضاد شئ وجود میں آتی ہے، زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کی پیدائش ہوتی ہے، پھیکے اور کڑوے درخت سے میٹھے پھل وجود میں آتے ہیں، بدرنگ ٹہنیوں میں خوش رنگ پھول نکلتے ہیں، اسی طرح برف کے تودے؛ بلکہ پہاڑ میں سے یہ آتش فشاں پھوٹ پڑا ہے اور اس کی راکھ ہوا کے دوش پر سوار ہوکر دور دور تک یورپ کی فضاؤں میں پھیل رہی ہے، فضا میں پہنچ کر یہ برف بن جاتی ہے اور شیشہ کی طرح سخت ہوجاتی ہے، جب جہاز اڑتے ہیں اور اس کی پنکھیوں میں یہ ٹکڑے داخل ہوجاتے ہیں تو یہ جہاز کے لئے بہت خطرناک چیز بن جاتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماحول کا تحفظ ہمارے لئے کس قدر اہم ہے؛ اسی لئے اسلام نے فضائی، آبی اور صوتی؛ بلکہ ہر طرح کی آلودگی کے اسباب کو اختیار کرنے سے منع کیا ہے، افسوس کہ قدرتی طور پر پیدا ہونے والی آلودگی چوں کہ اچانک اور بڑی مقدار میں آتی ہے؛ اس لئے اس کے نقصان کا تو ہمیں

احساس ہوتا ہے؛ لیکن خود انسان اپنے ہاتھوں ماحول کو نقصان پہنچانے کی جو حرکتیں کر رہا ہے، اس سے بچنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کرتا، ترقی یافتہ ممالک تحفظ ماحولیات کا نعرہ تو بہت لگاتے ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شب و روز ایسی ایجادات کا تجربہ بھی کرتے جا رہے ہیں، جو ماحول کو تباہ کر دینے والے ہیں۔

انسان کی زندگی میں سفر کی بڑی اہمیت ہے، سفر کے ذریعہ انسان کو نئے نئے تجربات حاصل ہوتے ہیں اور اچھے تجربات انسانی سماج کے لئے امانت ہیں، انہیں دوسروں تک پہنچانا چاہئے اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے، گذشتہ زمانہ میں بعض بڑے بڑے سیاحوں نے اپنے سفرنامے مرتب کئے ہیں، یہ صرف دلچسپ داستانیں ہی نہیں ہیں؛ بلکہ نقوش عبرت و موعظت بھی ہیں اور انسان اگر اپنی عملی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھائے تو وہ اس کے ذریعہ خود اپنی زندگی کو روشن اور تابناک بنا سکتا ہے اور سماج کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے، اسی جذبہ کے تحت اس سفر سے راقم الحروف نے بھی کچھ پھول چننے کی کوشش کی ہے۔

اس سے پہلے سفر میں بھی مجھے مختلف دینی جامعات میں جانے اور کچھ عرض کرنے کا موقع ملا تھا، اس سفر میں نسبتاً زیادہ مواقع حاصل ہوئے اور قریب سے برطانیہ کی بڑی دینی جامعات کو دیکھنے اور ان کے نظامِ تعلیم کو سمجھنے کی سعادت حاصل ہوئی، برطانیہ میں بارہویں جماعت تک تمام بچوں کے لئے تعلیم لازمی ہے؛ اسی لئے وہاں ۹۹ فیصد باضابطہ تعلیم کی شرح ہے، دینی مدارس اس قانون کے تحت اس بات کے پابند ہیں کہ وہ لازمی طور پر اس حد تک تعلیم دیں، اس سلسلہ میں گورنمنٹ کی طرف سے نہ صرف تعلیم کی نگرانی ہوتی ہے؛ بلکہ تعلیم اور رہائش کے لئے مطلوب پورے انفرااسٹرکچر کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے؛ اسی لئے میں نے ایک دارالعلوم میں خطاب کرتے ہوئے مزاحاً عرض کیا کہ یہاں کی دینی جامعات برصغیر کے مقابلہ ''فائیو اسٹار مدارس'' ہیں اور ذمہ داروں کے لئے یہ بات اس لئے دشوار نہیں ہوتی کہ طلبہ و طالبات سے خاصی معقول فیس لی جاتی ہے؛ بلکہ ان کی فیسیس عصری پرائیوٹ درس گاہوں کی فیس سے کہیں زیادہ ہیں، ماشاء اللہ دینی تعلیم حاصل کرتے ہوئے ان مدارس کے طلبہ گورنمنٹ کے امتحانات بھی دیتے ہیں اور اچھے نمبرات سے کامیابی حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد بہت سے طلبہ یونیورسیٹیوں میں بھی داخلہ لیتے ہیں اور وہاں بھی وہ کامیاب ہوتے ہیں، اگر ہندوستان

میں بھی دینی مدارس سرکاری مداخلت سے اپنے آپ کو آزاد رکھتے ہوئے یہ طریقۂ کار اختیار کریں تو ایک بہتر تجربہ ہوگا، اس طرح ایک ایسی نسل تیار ہو سکے گی، جو بہ یک وقت دینی تعلیم اور عصری تعلیم دونوں سے آراستہ ہو اور بہتر طور پر اس عہد میں پیدا ہونے والے فکری اور فقہی مسائل کو حل کر سکے گی، ہندوستان میں اس طرح کی بعض کوششیں ہوئی ہیں؛ لیکن زیادہ تر وہ عدم توازن کا شکار ہیں، یا تو ان درسگاہوں میں عصری تعلیم برائے نام ہے یا عصری تعلیم اتنی زیادہ رکھ دی گئی ہے کہ طلبہ کے لئے یہ ناقابل برداشت بوجھ بن گیا ہے۔

ایک اور بات جو تعلیم کے سلسلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے پیروی کے لائق ہے، وہ مکاتب کا نظام ہے، برطانیہ میں آباد گجراتی مسلمانوں نے ماشاء اللہ ہر جگہ مکاتب کا بڑا عمدہ نظم کر رکھا ہے، تمام طلبہ وطالبات پوری پابندی اور اہتمام کے ساتھ اس میں شریک ہوتے ہیں؛ اس لئے قرآنِ مجید اور بنیادی دینیات ہی سے وہ واقف نہیں ہوتے؛ بلکہ بہت سے بچے قرآنِ مجید بھی حفظ کر لیتے ہیں، برطانیہ جیسا ملک — جس میں تیسری چوتھی جماعت سے بچوں کو جنسیات کی تعلیم دی جاتی ہے اور گویا ان کے اخلاق کو بگاڑنے کی منصوبہ بند کوشش کی جارہی ہے، — میں ان مکاتب کی خاص طور پر بڑی اہمیت ہے، ضرورت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس کو اپنے لئے نمونہ بنائیں، اس طرح وہ اپنی نسلوں کو ذہنی ارتداد سے بچا سکتے ہیں۔

بعض ایسی باتیں بھی دیکھنے میں آئیں، جو قابل افسوس اور لائق اصلاح ہیں، ان میں سے ایک علماء اور مختلف مذہبی گروہوں کا ایک دوسرے سے شدید اختلاف اور ان کے درمیان فاصلے کی وسعت ہے، ایک ہی مسلک کے ماننے والے لوگوں میں بھی اختلافات کی وسیع خلیجیں ہیں اور وہ بھی معمولی مسائل پر، جیسے یہ کہ رمضان، عید وغیرہ میں سعودی عرب کی رؤیت کا اعتبار ہوگا یا قریب ترین مقام کی رؤیت کا؛ کیوں کہ بدلی چھائے رہنے کی وجہ سے مقامی رؤیت نہیں ہو پاتی ہے؟ اسی طرح یہ کہ جب دن طویل ہو جائے اور راتیں دو ڈھائی گھنٹہ کی رہ جائیں تو نمازیں کن اوقات کے لحاظ سے ادا کی جائیں گی؟ ان معمولی مسائل کی وجہ سے ایک ہی گھر میں دو دنوں عید ہوتی ہے، کچھ لوگ فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آتے ہیں اور کچھ لوگ ابھی سحری کھانے کی تیاری کرتے ہیں، اس اختلاف سے باہمی دل شکنی تو پائی ہی جاتی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کا نقصاندہ پہلو یہ ہے کہ اس وقت اسلام کو بدنام

اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کی جو کوششیں مغرب میں ہو رہی ہیں، ان کی طرف سے علماء نہ صرف غافل ہیں؛ بلکہ اس کا شعور بھی نہیں رکھتے اور برطانوی معاشرہ میں اسلام اور مسلمانوں کے تئیں جو نفرت کے لاوے ابھی زیر زمین ابل رہے ہیں، ان کے بارے میں سوچنے کا انہیں موقع نہیں ملتا۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد اب یہودیوں کے برابر ہو چکی ہے؛ بلکہ شاید مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو؛ لیکن ابھی بھی الیکشن میں مسلمان یہودیوں کی طرح ایک مؤثر طاقت نہیں بن پائے ہیں؛ کیوں کہ ان کا کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں ہے، جس میں دیوبندی، بریلوی، غیر مقلد اور شیعہ ایک ساتھ مل بیٹھیں اور مشترکہ مقاصد کے لئے مشترک تدابیر اختیار کریں، اگر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی طرح وہاں تمام مسلمان مل کر اپنا کوئی پلیٹ فارم بنالیں تو وہ نہ صرف سیاست میں؛ بلکہ اپنے مذہبی اور سماجی اقدار کے تحفظ میں بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں؛ لیکن افسوس کہ نہ فکر میں اتنی گہرائی ہے اور نہ قلب میں اتنی وسعت؛ کہ لوگ اس بات کو سمجھ سکیں کہ ان اختلافات سے اسلام دشمن طاقتیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

اسی اختلاف کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ برطانیہ میں مختلف ممالک کے مسلمان آباد ہیں، عرب، افریقہ، برصغیر کے افراد زیادہ بڑی تعداد میں ہیں؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں نہ ارتباط ہے اور نہ اشتراک، اکثر مسجدیں بھی الگ الگ ہیں، حد تو یہ ہے کہ ایک علاقہ کے لوگوں کے زیر انتظام جو مکاتب چلتے ہیں، دوسرے علاقہ کے بچوں کو وہاں داخلہ تک نہیں دیا جاتا ہے؛ اس لئے وہ تعلیم سے محروم ہیں، پھر لوگ ان کی بے دینی کی شکایت بھی کرتے ہیں، ایک صوبہ اور دوسرے صوبہ یہاں تک کہ ایک ضلع اور دوسرے ضلع کی تفریق بھی قائم ہے اور یہ بھی اختلاف کی خلیج کو بڑھانے میں بڑا کردار ادا کر رہی ہے، واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے دینداری اور تقویٰ کا مفہوم بہت محدود کر دیا ہے اور سمجھ لیا گیا ہے کہ صرف نماز پڑھنا اور مخصوص وضع قطع اختیار کر لینا تقویٰ ہے، دوسرے مسلمانوں کی عزت و آبرو کا لحاظ، مخالف نقطۂ نظر کے حامل اشخاص و افراد کے بارے میں زبان کی احتیاط، اپنے آپ کو تعصب اور تنگ نظری سے بچانا، اسلامی اخوت اور بھائی چارہ کو تقویت پہنچانا، برادران وطن تک دین کی امانت پہنچانا اور امت جن مسائل سے دوچار ہے، ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا، نیز ہر سطح پر اسلام کی سر بلندی اور مسلمانوں کی سرفرازی کے لے سعی و کوشش جو دینی واجبات میں سے ہے، ان کو دینداری کی

فہرست سے نکال دیا گیا ہے اور کچھ مستحبات اور انفرادی افعال کو اصل دین سمجھ لیا گیا ہے، اس سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے؛ اسی لئے اسلامی تاریخ دیکھئے! ایک شخص مدرسہ میں مدرس بھی ہوتا تھا، خانقاہ میں مصلح بھی، جہاد کا مردِ میدان بھی، خلق اللہ کا خادم بھی، علم وتحقیق کا آفتاب و ماہتاب بھی، وہ ہر سطح پر اسلام کی خدمت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا اور اصل تقویٰ اور دینداری یہی ہے، غرض کہ بنیادی سوچ میں تبدیلی کی ضرورت ہے، خاص کر برطانیہ جیسے ممالک میں اس کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور خود جنوبی ایشاء کے ملکوں کی صورتِ حال بھی اس سے بہت مختلف نہیں ہے۔

❁

مولانا قاسم نانوتویؒ ایوارڈ — جنوبی افریقہ میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ کسی شخص کی تعریف میں مبالغہ اور چاپلوسی سے کام لیا جائے؛ کیونکہ عموماً ایسی تعریف جھوٹ، نفاق اور بے ضمیری پر مبنی ہوتی ہے؛ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے کہ جو لوگ اچھے کام انجام دیں، قوم وملت کے لئے قربانیاں پیش کریں، انسانیت کو نفع پہنچائیں، اور دین حق کو سر بلند کرنے کے لئے زبان وقلم یا دوسرے وسائل کے ذریعہ کوششیں کریں، ان کی خدمات وکمالات کا اعتراف کیا جائے؛ چنانچہ حدیث میں ایک مستقل باب ''مناقب'' کا ہے، اسی باب میں ان تعریفی کلمات کو نقل کیا جاتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائے ہیں، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں فرمایا کہ وہ میری امت کے معاملہ میں سب سے زیادہ مہربان اور رحم دل ہیں (ترمذی، حدیث نمبر: ۳۷۹۱) حضرت عمرؓ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے (ترمذی، حدیث نمبر: ۳۶۸۶) حضرت عثمانؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رفقاء میں سب سے زیادہ حیادار قرار دیا (ترمذی، حدیث نمبر: ۳۷۹۰) اور حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ صحابہ میں سب سے زیادہ معاملہ فہم اور قوت فیصلہ کے حامل ہیں، (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۵۴) اسی طرح متعدد صحابہ سے متعلق انفرادی یا اجتماعی حیثیت میں آپ نے تعریفی کلمات ارشاد فرمائے۔

یہ اس بات کا سبق ہے کہ انسان کو دوسرے انسانوں کی خوبیوں اور کمالات کا اعتراف کرنا چاہئے، نہ یہ درست ہے کہ آدمی بے جا خوشامد کرنے لگے اور نہ یہ صحیح ہے کہ سچائی کے اعتراف میں بخل سے کام لے، خدمات کے اعتراف سے کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھتا ہے، ان میں بہتر کام انجام دینے کی امنگیں پیدا ہوتی ہیں، اور وہ نفسیاتی اعتبار سے اپنے اندر طاقت وقوت محسوس کرتا ہے، موجودہ دور میں اسی مقصد کے لئے ایوارڈ دیئے جاتے ہیں، کبھی تو یہ ایوارڈ علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کی نذر کئے جاتے ہیں، جیسے سائنس دانوں کو، اشیاء کی ایجاد کرنے والوں کو، اچھے اساتذہ اور محنتی طلبہ کو،

خدمت خلق میں نمایاں کام انجام دینے والوں کو، یہ یقیناً بجائے خود ایک قابل تعریف عمل ہے؛ لیکن آج کل بڑے بڑے ایوارڈ کھیل کود کرنے والوں اور ناچنے گانے والوں کو دیئے جاتے ہیں، اس کو قوم کی بدبختی اور اجتماعی شعور وآگہی کا فقدان ہی کہا جاسکتا ہے، ایک سائنس داں یا ایک مدرس کی خدمت سے انسانیت کو یقیناً بڑا فائدہ پہنچتا ہے؛ لیکن کھیل اور فلمی اداکاری کا فائدہ قوم کو کیا پہنچتا ہے؟ یہ قابل غور ہے؛ بلکہ اس کے برعکس نوجوانوں میں یہ مزاج پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے متأثر ہو کر سنجیدہ کاموں کے بجائے غیر سنجیدہ کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

دنیا میں حکمرانوں، تاجروں، اور کمپنیوں کے نام سے تو بہت سے ایوارڈ دیئے جاتے ہیں؛ لیکن دین وملت کے حقیقی خادموں کے نام سے شاذ ونادر ایوارڈ دیا جاتا ہے، اسی پس منظر میں حیدرآباد کے معروف تعلیمی وتحقیقی ادارہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد نے بعض عرب دوستوں کے تعاون سے امام محمد قاسم نانوتویؒ بین الاقوامی اسلامی ایوارڈ کی بنیاد رکھی، مولانا نانوتویؒ صرف ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے بانی نہیں ہیں؛ بلکہ وہ تحریک مدراس اسلامیہ کے بھی بانی ہیں، انہوں نے حکومت کے اثر سے آزاد ایسی دینی درسگاہوں کے قیام کی تحریک چلائی، جس کا مقصد تعلیم کے ذریعہ حصول روزگار نہ ہو؛ بلکہ تعلیم کو دین کی حفاظت واشاعت کا ذریعہ بنانا مقصود ہو، اور مسلمان خود دو دو چار چار پیسوں کے ذریعہ ان اداروں کو چلائیں، یہ تحریک نہ صرف برصغیر میں کامیاب رہی؛ بلکہ اس وقت پوری دنیا مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک میں اس کے گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، آج پورے ملک میں مدارس ومکاتب کا جو جال بچھا ہوا ہے، یہ اسی تحریک کی برکت ہے۔

اسلام کے خلاف فتنوں کے کتنے ہی طوفان اٹھے، اور ان اداروں کے پروردہ علماء نے ان کے منھ موڑ دیئے، ڈرایا دھمکایا بھی گیا، مگر دھمکیاں ان کو خوف زدہ نہ کرسکیں، لالچ بھی دی گئی، مگر کوئی لالچ انہیں اپنے دام میں پھنسا نہ سکی، شہر سے لے کر دیہات تک انہوں نے دینی تعلیم کے چراغ روشن کئے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان جیسے مسلم اقلیت ملک میں گاؤں گاؤں علماء اور حفاظ موجود ہیں، قصبہ قصبہ میں مدارس قائم ہیں، اور ہر چھوٹے بڑے شہر میں دینی جامعات برسر خدمت ہیں، اگر کہا جائے کہ یہ گذشتہ صدی کی ایک تجدیدی خدمت ہے تو بے جا نہ ہوگا؛ اسی پس منظر میں ارادہ کیا گیا کہ لوگ بادشاہوں کے نام سے ایوارڈ دیتے ہیں، اب ایک ایسے درویش کے نام سے ایوارڈ دیا جائے، جس

کے پاس سیم وزر کا اثاثہ تو نہیں تھا؛ لیکن اخلاص، جذبۂ دروں، تقویٰ وللّٰہیت، استقامت علی الحق اور اسلام کی حفاظت کے لئے جوش جنوں کا سرمایہ تھا۔

یہ بات بھی طئے کی گئی کہ یہ ایوارڈ ہر دو سال پر کسی ایسی شخصیت کو دیا جائے، جس نے دین کی حفاظت واشاعت اور علم دین کی ترقی وفروغ میں نمایاں خدمت انجام دی ہو؛ چنانچہ ۲۰۱۱ء میں ترکی کے ایک بڑے عالم مقتدی شیخ طریقت اور شیخ محمود آفندی مجددی کو یہ ایوارڈ عثمانی دور کے دارالخلافہ 'استنبول' میں پیش کیا گیا تھا، اس وقت لادینیت سے اسلام کی طرف ہجرت کرنے والی مسلم مملکت ترکی کے علماء اور دینی حلقوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ آج کا دن ان کے لئے عید کا دن ہے۔ ابھی گذشتہ ماہ جنوری ۲۰۱۴ء میں جنوبی آفریقہ کے مشہور تجارتی شہر جوہانسبرگ میں ایوارڈ کی دوسری دوسالہ تقریب منعقد ہوئی، اس بار خانوادۂ قاسمی کے چشم وچراغ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم (نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ و مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند) کو ایوارڈ پیش کیا گیا، جو یقیناً ''حق بہ حقدار رسید'' کے مصداق ہے، مولانا محترم مسلمانوں کے معتبر قائد، علماء کی کم سے کم تین پشتوں کے استاذ، بالغ نظر، وسیع الفکر اور بلند نگاہ عالم وخطیب ہیں، اعتدال فکر، زبان وقلم میں احتیاط، اور حالات پر دوررس نگاہ کے اعتبار سے ہر حلقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، یہ یقیناً نہ صرف مولانا موصوف کا بلکہ پوری ملت اسلامیہ ہند کا اعزاز ہے، اس پروگرام کی میزبانی جنوبی افریقہ کی ایک بڑی دینی درسگاہ دارالعلوم آزادویل نے قبول کی تھی۔

۲۰ رجنوری کو ایوارڈ کی اس تقریب کے منعقد ہونے سے پہلے چارروزہ سیمینار بھی رکھا گیا تھا، اس سیمینار میں بنیادی طور پر دو موضوعات زیر بحث تھے، ایک مسلم اقلیتوں کا مسئلہ، اس عنوان کے تحت یورپ، امریکہ، کناڈا، جنوبی امریکہ، افریقی ممالک، چین، برما، قفقاز کے علاقے، اور عراق میں اہل سنت اقلیت کے مسائل وغیرہ پر گفتگو ہوئی، اور ان کے حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی، اس حقیر کا عنوان تھا ''مسلم اقلیتوں کے لئے لائحۂ عمل''، جس میں مسلمانانِ ہند کے طریقہ کار کو بطور نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی، اور اس کے ذیل میں امارت وقضاء کے نظام، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، تحریک مدارس، اسلامک فقہ اکیڈی انڈیا، اور ملی ودعوتی تنظیموں کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی، اور یہ بات واضح کی گئی کہ ہندوستانی مسلمان اپنے دین کی حفاظت، اسلام کی اشاعت، مسلمانوں کے شرعی امور کی

انجام دہی، مسلم اقلیتوں کو درپیش فقہی مسائل اور مسلمانوں کی سماجی وسیاسی رہنمائی کے سلسلہ میں کیا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں، اس کا شرعی ماخذ کیا ہے، اور اس کے نتائج کیا ہیں؟ اس مقالہ میں خاص طور سے دو باتوں پر توجہ دلائی گئی، ایک: مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور اختلافی امور میں اعتدال ومیانہ روی، دوسرے: غیر مسلم اکثریت سے اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں اہل مکہ کے ساتھ اور مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ کوشش کی تھی، سیمنار میں پیش کئے گئے مقالات میں بطور خاص برما کی مسلمان اقلیت، اور عراق کی اہل سنت اقلیت پر جو مظالم ڈھائے جارہے ہیں، ان کو سن کر شاید کوئی آنکھ ہو جو نم نہ ہوئی ہو۔

دوسرا موضوع اہل سنت والجماعت کے مسلک کی تشریح، غلط فہمیوں کے ازالے اور بے اعتدالیوں کے سدباب سے متعلق تھا، اس مرکزی عنوان کے تحت صحابہ کی عظمت، امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابومنصور ماتریدیؒ (جو عقائد وایمانیات میں اہل سنت والجماعت کے امام ہیں) کے نقطۂ نظر کی اہمیت، حدیث کی حجیت، تقلید کی ضرورت، تزکیہ واحسان کا لازم ہونا وغیرہ جیسے موضوعات پر بڑے اہم مقالات پیش کئے گئے، خاص کر سعودی عرب کے ایک عالم اور وہاں کی ایک جامعہ کے استاذ نے تقلید سے متعلق غلط فہمیوں پر بڑا بصیرت افروز وچشم کشا مقالہ پیش کیا، افریقہ کے ایک ملک گنیا کے ایک نوجوان فاضل نے اپنے ملک کا المیہ پیش کیا کہ ایک طرف عیسائی مشنری مسلمانوں میں ارتداد پھیلا رہی ہے اور دوسری طرف عالم عرب سے پڑھ کر آنے والے بعض فضلاء نے مسلمانوں میں ایسا انتشار پیدا کردیا ہے، جس سے تمام فکرمند علماء پریشان ہیں، اور انہوں نے طے کیا ہے کہ ملک کے اندر ہی دینی جامعات میں نوجوانوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور انہیں خلیجی ممالک جانے سے روکا جائے؛ تاکہ مسلمانوں میں افتراق کی اور ایک دوسرے کو کافر ومشرک کہنے یا بدعتی کہنے کی فضاء پیدا نہ ہو، وہ اس صورت حال کو پیش کرتے ہوئے رو پڑے اور تمام ہی حاضرین ان کی گفتگو سے بے حد متأثر ہوئے۔

سیمینار میں مختلف تجاویز منظور ہوئیں، جن میں ایک نکتہ یہ تھا کہ مسلمان اقلیتوں کو اپنی نئی نسل کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دینی چاہئے، اس کے بغیر وہ دین کی امانت آئندہ نسلوں تک پہنچا نہیں سکیں گے، مسلمانوں کے لئے یہی سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہے، مسلمانوں سے اس بات کی بھی خواہش کی گئی کہ وہ اپنے ہم وطنوں سے برادرانہ تعلقات پر خصوصی توجہ دیں، اسلامی اخلاق کو برتنے کی یوں تو ہر جگہ

ضرورت ہے؛ لیکن جب مسلمان غیر مسلموں کے درمیان ہوں تو اس پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، مسلم اقلیت ممالک کے لئے مقامی زبان میں لٹریچر کی اشاعت اور ذرائع ابلاغ کے قیام سے متعلق منصوبہ بندی کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی؛ تاکہ ان دور افتادہ مسلمانوں تک اسلامی تعلیمات کو پہنچایا جاسکے۔

اس وقت مغربی طاقتیں مسلمانوں میں مسلکی اختلافات کو بڑھاوا دینے کی منصوبہ بند کوشش کررہی ہیں، مسلمانوں کو اس بات سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے کہ جو اختلاف مسلمانوں کے درمیان ہے، اس سے زیادہ شدید اختلاف یہودی اور عیسائی فرقوں کے درمیان ہے؛ لیکن موجودہ دور میں انہوں نے ان اختلافات کو اپنی صفوں میں انتشار کا سبب بننے نہیں دیا، اور خاص کر مسلمانوں کے مقابلہ وہ پوری طرح متحد اور بنیان مرصوص ہیں، مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں؛ اس لئے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اس صورت حال کا ازالہ کریں، ایک دوسرے کو کافر و فاسق اور گمراہ و بدعتی قرار دینے میں احتیاط سے کام لیں، باہمی احترام کا لحاظ رکھیں، اور ایک دوسرے کے پیشواؤں کو برا بھلا کہنے سے بچیں، جب ان معبودان باطل کو برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا، جن کی اہانت سے غیر مسلم بھائیوں کی دل آزاری ہوسکتی ہے تو مسلمانوں کے لئے ایک دوسرے کے بزرگوں کی شان میں گستاخی کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے؟

اس پروگرام میں اسّی ممالک سے دوسو معروف صاحبِ نظر علماء، اصحاب قلم، تنظیموں کے ذمہ دار، اور قائدین شریک ہوئے، نامور محدث شیخ محمد عوامہ (مدینہ منورہ)، ان کے صاحب زادے ڈاکٹر محی الدین، سابق وزیر اعظم ملایشیاء ڈاکٹر احمد بداوی، عراق، لبنان اور ترکی کے مفتی اعظم اہل سنت مولانا محمد رفیع عثمانی (پاکستان) وغیرہ شرکاء میں شامل تھے، ہندوستان سے دار العلوم دیوبند، دارالعلوم وقف دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جمعیۃ العلماء ہند، اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی نمائندگی تھی، نیز جنوبی افریقہ کے تمام علاقوں سے تقریباً تین سو علماء و مشائخ نے شرکت فرمائی، خدا کرے اتحاد ملت اور برادران وطن کے ساتھ بہتر روابط استوار کرنے کا جو پیغام جنوبی افریقہ سے بلند کیا گیا ہے، وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے قلب و ذہن تک رسائی حاصل کرے، اور اسلام اور ملت اسلامیہ کا وسیع تر مفاد ان کو ایک ایسی تبدیلی پر آمادہ کرے، جو دین حق کی سربلندی اور امت کی سرفرازی کا باعث بنے۔

❁

طوفانِ نوح سے گذر کر

(سفر کشمیر)

یہ حقیر ۳۰/اگست سے ۷/ستمبر ۲۰۱۴ء تک جموں اور کشمیر میں بعض پروگراموں کے لئے مدعو تھا، پروگرام کے داعی بنیادی طور پر دارالعلوم سبیل الہدیٰ (لمبنہ کالونی) اور اس کے فعال ناظم مولانا محمد اعجاز باٹلے قاسمی تھے؛ چنانچہ پروگرام کے مطابق ۳۰/اگست ۲۰۱۴ء کی دوپہر کو سری نگر پہنچا، یہاں ''دل جھیل'' کے کنارے شہر کا سب سے بڑا اور نہایت خوبصورت آڈیٹوریم واقع ہے، اس کے ایک نسبتاً چھوٹے ہال میں سری نگر کے مختلف شعبوں کے بڑے تاجروں کے ساتھ تجارت اور سرمایہ کاری کے جدید مسائل پر سوال و جواب کی نشست رکھی گئی، میرے علاوہ ڈاکٹر شارق نثار (ممبئی) اور مولانا ظفر عابدین ندوی (شعبۂ اسلامک فائنانس، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملیشیا) بھی بحیثیت مہمان اس میں شریک تھے، کشمیر کے ممتاز عالم وداعی مولانا محمد رحمت اللہ قاسمی نے اجلاس کی صدارت کی، شرکاء کی تعداد کو محدود رکھا گیا تھا، اس لئے پچاس، ساٹھ لوگ رہے ہوں گے، بیشتر سوالات سود اور سودی قرض سے متعلق تھے، لوگوں نے بتایا کہ تقریباً ۹۵ فیصد لوگ یہاں سودی لین دین میں مبتلا ہیں، اگلے دن دوپہر سے شام تک اسی آڈیٹوریم کے بڑے ہال میں جو تمام جدید سہولتوں سے آراستہ ہے ''اسلامک بینکنگ اور ہندوستان میں اس کے مواقع'' کے موضوع پر سیمینار تھا، جس میں تجارت اور بینکنگ سے متعلق اہم شخصیات، نیز کشمیر کے اکابر علماء اور اربابِ دانش شریک تھے، شرکت دعوت نامہ کے ذریعہ تھی، لگ بھگ ۲۵۰ سے ۳۰۰/افراد سامعین رہے ہوں گے، اس پروگرام میں مولانا ظفر عابدین ندوی نے مروجہ بینکنگ اور اسلامی بینکنگ کے درمیان بنیادی فرق پر روشنی ڈالی، ایک مقامی نوجوان فاضل نے اسلام میں سود کی شناعت پر مقالہ پیش کیا، ڈاکٹر شارق نثار نے بینک، مالیاتی کمپنی اور کوآپریٹیو سوسائٹی کے قوانین کو واضح کرتے ہوئے اس بات پر روشنی ڈالی کہ موجودہ قوانین کے دائرے میں کس حد تک اسلام کے اُصولِ سرمایہ کاری کو نافذ کیا جاسکتا ہے، اس حقیر

نے وہاں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ہوم فائنانس، وھیکل فائنانس، زرعی پیداوار اور تھوک اشیاء کی خریدی میں سرمایہ کاری کے اسلامی طریقہ اور تاجروں، کاشتکاروں اور باغ بانوں کے لئے بوقت ضرورت سرمایہ کے حصول کے متبادل شرعی طریقہ پر گفتگو کی۔

وہاں سودی معاملات کی کثرت کو دیکھتے ہوئے اس ارشاد نبوی ﷺ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا، جس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ سود ان گناہوں میں ہے، جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا اجتماعی عذاب نازل ہوتا ہے، بہر حال اجلاس حاضرین کے اچھے تاثرات کے ساتھ ختم ہوا اور سری نگر کے ایک چوٹی کے تاجر نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں اب تک گناہ میں ملوث رہا ہوں؛ لیکن اب آج سے میں سودی لین دین سے مکمل پرہیز کروں گا، چاہے اس کے لئے ہمیں کتنا ہی مالی نقصان اُٹھانا پڑے اور میں دوسرے ساتھیوں سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ بھی اس سے توبہ کرلیں، میں نے اخیر میں یہ تجویز رکھی کہ چند ممتاز تجار، بینکرس اور بینکنگ قانون سے واقف قانون دانوں کی کمیٹی بن جائے اور اس میں بعض اربابِ افتاء بھی شریک ہوں، جو مرکزی اور ریاستی قوانین کی روشنی میں غیر سودی سرمایہ کاری کا جائزہ لیں، سبھوں نے اس کو قبول کیا؛ البتہ مجھ سے اور ڈاکٹر شارق نثار صاحب سے خواہش کی کہ آپ دونوں حضرات بھی اس میں ہماری مدد کریں، بعد میں ہوٹل آکر بھی بعض کاروباری حضرات نے درخواست کی کہ ہم اپنے کاروبار کو شرعی اُصول کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، آپ حضرات کا تعاون مطلوب ہے، اس سلسلہ میں وہاں کی ایک اہم تجارتی کمپنی ''خیبر'' کے ذمہ داران خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یکم ستمبر ۲۰۱۴ء کو دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ میں وکلاء اور ججس کے ساتھ نشست رکھی گئی، جس کا موضوع تھا ''مسلم پرسنل لاء'' — اس نشست میں بحمد اللہ سری نگر اور بارہ مولہ سے وکلاء اور ججس کی اچھی خاصی تعداد شریک تھی، حاضرین کے سامنے مسئلہ کی وضاحت کی گئی اور ان کے سوالات کے جوابات دیئے گئے، دودنوں کے وقفہ کے ساتھ ۳-۴ر ستمبر ۲۰۱۴ء کو جموں کا سفر ہوا، یہاں دو اہم پروگرام پہلے سے طے تھے، ایک علماء کے لئے، دوسرا وکلاء، ڈاکٹرس، خواص اور دانشوروں کے لئے، ان دونوں پروگراموں میں بڑی تعداد نے شرکت کی، اور احساس ہوا کہ علاقہ میں لوگوں کے اندر بڑی پیاس پائی جاتی ہے، ۵ر ستمبر ۲۰۱۴ء کو شہر کی جامع مسجد میں جمعہ سے پہلے عوامی خطاب ہوا اور وہیں سے ہم لوگ ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوگئے، بارش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور دریاؤں کی

سطح بلند ہورہی تھی، ۶، ۷ر ستمبر ۲۰۱۴ءکو سری نگر میں پہلے سے کچھ پروگرام طے تھے؛ اس لئے پھر سری نگر واپسی ہوئی، کیا معلوم تھا کہ یہاں ایک قیامت آنے والی ہے، ۵ر ستمبر ۲۰۱۴ء کی شب سے ہی شہر کے مختلف علاقوں میں پانی کا پھیلاؤ شروع ہوگیا، ۶ر ستمبر کی شام کو بعد مغرب ایک مدرسہ میں پروگرام تھا، واپسی میں دیکھا کہ لوگ پریشان اور حیران ہیں، میں اپنی قیام گاہ پر واپس آیا اور گھنٹہ دو گھنٹہ بعد اطلاع ملی کہ اس مدرسہ کی پہلی منزل زیر آب آچکی ہے، اگلے دن اطلاع ملی کہ دوسری منزل میں بھی پانی گھس چکا ہے اور اساتذہ وطلبہ نے مسجد کی بلند و بالا چھت پر پناہ لے رکھی ہے، ایئر پورٹ کا راستہ بند ہو چکا تھا، اس لئے فی الفور واپسی ممکن نہیں تھی؛ لیکن پورے شہر میں ایک ہاہا کار مچی ہوئی تھی اور نفسی نفسی کا عالم تھا، پاور ہاؤس زیر آب آگیا اور الیکٹرک منقطع ہوگئی، پھر فون کے ٹاور پر پانی نے ہلا بولا اور اس کے جنریٹر بھی ڈوب گئے، اس طرح فون کا سارا رابطہ منقطع ہوگیا، اب صرف ریڈیو شہر کی خبروں کا ذریعہ تھا، ۷ر ستمبر ۲۰۱۴ء کی صبح ہم لوگ ریڈیو سے خبر سن رہے تھے، اناؤنسر نے سیلاب کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اب ریڈیو اسٹیشن میں پانی اتنا اونچا ہو چکا ہے کہ شاید کچھ لمحات میں اس سروس کو بند کر دینا پڑے، انجینئر سے مشورہ جاری ہے، آخر چند ہی منٹ بعد خبر نشر ہوتے ہوئے ریڈیو بند ہوگیا، عجیب بات یہ ہے کہ سب سے پہلے کنٹرول روم ہی ڈوب گیا اور حکومت کا پورا نظام مفلوج ہو کر رہ گیا، مرکزی بس اسٹینڈ میں بسوں کی چھتوں سے اوپر پانی جارہا تھا، شہر کا سب سے اہم مارکیٹ 'لال بازار' کی تمام دکانوں میں کافی اونچی سطح تک پانی گھس چکا تھا، شہر کا سب سے پاش علاقہ 'راج باغ' پورا کا پورا ڈوب چکا تھا، شہر کے بہت سے محلوں میں پانی تیسری منزل کی چھت کے اوپر سے بہہ رہا تھا اور ریاست کے چپہ چپہ سے انسانوں اور جانوروں کی ہلاکت اور مکانات کے انہدام کی خبریں آرہی تھیں۔

میرا قیام جس علاقہ میں تھا، اس کے چاروں طرف ہائی وے واقع ہے، اس لئے پانی دیر سے پہنچا اور چوں کہ سڑک ٹوٹی نہیں، سڑک سے اوپر بہنے والا پانی ہی یہاں پہنچ پایا، اس لئے نسبتاً کم مقدار میں پانی پہنچا؛ لیکن ۷ر ستمبر ۲۰۱۴ء کو نماز مغرب کے فوراً بعد جب پانی آنا شروع ہوا تو اتنی تیز رفتاری کے ساتھ کہ پوری کالونی ایک جھیل کا منظر پیش کر رہی تھی اور ۱۸ فٹ اونچا پانی آچکا تھا، سڑک سے گذر کر سیڑھیوں اور سیڑھیوں سے آگے بڑھ کر مکان کی پہلی منزل میں پانی کو داخل ہونے میں کچھ دیر نہیں

لگی اور تمام مکینوں کو تیزی کے ساتھ دوسری منزل میں منتقل ہونا پڑا، نیز پانی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے پیش بندی کے طور پر کچھ ضروری سامان چھت پر منتقل کرلیا گیا؛ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی، اب عجیب صورت حال تھی کہ اوپر سے بارش ہے، نیچے تیز بہاؤ کے ساتھ پانی ہے، بجلی نہ ہونے کی وجہ سے موم بتیوں پر گزارا ہے، ایک طرف جانوروں کی چیخ و پکار کی آواز ہے، دوسری طرف دور و قریب سے انسانوں کی آہ واویلا ہے، جانوروں کی آواز تو صبح ہوتے ہوتے خاموش ہوگئی اور دیکھا گیا کہ جھنڈ کے جھنڈ چیل پورے علاقہ میں پرواز کررہے ہیں، شاید وہ مردار جانوروں سے استفادہ کررہے تھے، کشمیر کے موسم کے لحاظ سے وہاں لوگ مہینوں کا غلہ محفوظ رکھتے ہیں؛ اس لئے چاول، دال عام طور پر لوگوں کے پاس موجود تھا، ایندھن کی کمی کو لوگوں نے گھر میں محفوظ لکڑیوں کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کی؛ لیکن سب سے بڑا مسئلہ پینے کے پانی اور دودھ کا تھا کہ بڑے ایک ایک بوند پانی کے لئے اور بچے دودھ کے لئے ترس رہے تھے۔

فوج نے اس موقع پر کسی قدر تاخیر کے ساتھ؛ لیکن بڑا اچھا کام کیا اور سنجیدہ، سمجھ دار لوگوں نے عام طور پر اس کی تعریف کی؛ البتہ ریاستی حکومت کے نمائندے کہیں نظر نہیں آئے، بالآخر فوجی گروپ کی مدد سے یہ حقیر اور اس کے ساتھ موجود گجرات اور اتر پردیش کے بعض علماء فوجی بوٹ کے ذریعہ نکالے گئے اور ہمیں ایئرپورٹ کے واقع قریب ایک مدرسہ ''مدرسہ اشرف العلوم حیدر پورہ'' میں پہنچایا گیا، جو اس سیلاب کی زد سے محفوظ تھا، یہاں علماء، شہر کی اہم شخصیات اور ریلیف کارکنوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، اطلاع ملنے کے ساتھ ہی یہ حضرات ہم لوگوں کے انتظار میں تھے، حقیقت یہ ہے کہ ان کی محبت اور گرم جوش استقبال نے سفر میں پہنچنے والی مشقتوں کو ہلکا کردیا اور اس کے اگلے دن براہِ دہلی اس حقیر کی واپسی ہوئی، ریلیف کیمپ کے نزدیک واقع مسجد میں لوگوں نے خطاب بھی رکھا اور میں نے اس طوفان کی مناسبت سے سبق آموز پہلوؤں پر گفتگو کی، ان سطور کا مقصد سیلاب کی داستان بیان کرنا نہیں ہے؛ بلکہ ان ہی سبق آموز پہلوؤں کو پیش کرنا مقصود ہے۔

کم سے کم چار گناہوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی وجہ سے اجتماعی عذاب نازل ہوتا ہے، سود کی کثرت، زکوٰۃ کا ادا نہ کرنا، زنا اور فحاشی — میں نے سیلاب کی مصیبت سے دو چار کشمیری بھائیوں سے عرض کیا کہ آپ کے یہاں سود کے بارے میں مجھے بخوبی

اندازہ ہے کہ لوگ اس میں مبتلا ہیں، زکوٰۃ پھلوں میں بھی واجب ہوتی ہے، اس لئے سیب، بادام، آخروٹ اور زعفران وغیرہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، آپ خود اپنا احتساب کریں کہ کیا ان کی زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے؟ اور نکاح کو یہاں جتنا مشکل بنا دیا گیا اور جس تاخیر کے ساتھ نکاح کرنے کا رواج ہے، کہیں اس کی وجہ سے معاشرہ میں دبے پاؤں بے حیائی تو داخل نہیں ہو رہی ہے؟ —بعض حضرات نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں باتیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں اور واقعی یہ اللہ کی طرف سے ہماری پکڑ ہے، یہ بات ہر مسلمان کے لئے قابل فکر ہے، یوں تو بہت سے مفاسد ہیں جو مسلم معاشرہ میں درآتے ہیں؛ لیکن وہ اسباب جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دیتے ہیں، ان سے معاشرہ کو محفوظ رکھنے کی بطور خاص فکر کرنی چاہئے، جو لوگ ایمان کے دائرہ میں نہیں آتے ہیں، ان کے ساتھ زیادہ تر ''امہال'' یعنی مہلت دینے کی صورت اختیار کی جاتی ہے؛ کیوں کہ ان کی سزا کی جگہ آخرت ہے؛ لیکن جو لوگ ایمان کے دائرہ میں ہیں، اللہ کی طرف سے ان کی تنبیہ کی جاتی ہے اور دنیا ہی میں انھیں امتحانات سے گزارا جاتا ہے؛ تا کہ اپنے آپ کو اللہ کے احکام پر قائم رکھیں۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب سارے رابطے منقطع ہو گئے تو جو چودہ، پندرہ افراد ہماری قیامگاہ میں پھنسے ہوئے تھے، میں نے ان سب سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات میں دو نظام رکھے ہیں، ایک: مادی نظام، دوسرا: غیبی نظام، مادی نظام کی بنیاد ظاہری اسباب پر ہوتی ہے، غیبی نظام کی اساس براہِ راست اللہ تعالیٰ کے احکام پر ہوتی ہے، اب مادی اسباب سے ہم لوگوں کا رشتہ کٹ چکا ہے، اس لئے اب ہمیں غیبی نظام ہی کے ذریعہ اپنی نجات کا راستہ تلاش کرنا چاہئے، اس لئے ہم لوگ تلاوتِ قرآن، ذکر، دُعا، درود شریف، نمازِ حاجت اور استغفار کی کثرت رکھیں اور اللہ کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلائیں؛ چنانچہ تمام ساتھیوں نے اس کا خوب اہتمام کیا، خاص کر جب رات کے سناٹے میں ہر طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آتی رہتی تھیں، یہاں بیشتر وقت موم بتی کی روشنی میں بیٹھ کر اللہ سے مانگنے اور گڑگڑانے میں صرف ہوتا تھا، اس کا سب سے فائدہ جو ہم لوگوں نے محسوس کیا، وہ ہے اطمینانِ قلب، قرآن مجید کی آیت بار ہا پڑھی تھی کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو طمانینت حاصل ہوتی ہے ''أَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب''، لیکن اس کا عملی مشاہدہ اس موقع پر ہوا کہ پہلے ہی دن جب ہم لوگ مصیبت کی گھڑی میں اِن اعمال سے فارغ ہوئے، تو دل میں کوئی گھبراہٹ باقی نہیں تھی،

اور بے حد طمانینت محسوس کر رہے تھے، اس طمانینت ہی کا نتیجہ تھا کہ آزمائش کے ان اوقات میں اس حقیر نے اپنے مختلف مسودات کے تقریباً ۵۰۰ صفحات پر نظر ثانی کی، اور پون پارہ قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا، اور جب ذہن پڑھنے لکھنے میں مشغول ہوجاتا ہے تو دوسرے افکار کا دباؤ کم ہوجاتا ہے، اس لحاظ سے بھی دل ودماغ کو سکون حاصل ہوا۔

دوسرا ظاہری فائدہ یہ ہوا کہ ٹنکی میں پانی بہت کم تھا، وہ ختم ہوگیا، سیلاب کا پانی ناقابل استعمال تھا، ہمارے میزبان نے کہا کہ پانی کے اندر ڈوبے ہوئے پائپ میں سرکاری نل ہے، جس کو ہم نے بند کردیا تھا اور اس میں پائپ لگا ہوا ہے جو اوپر تک آسکتا ہے، اگر وہ نل کھل جائے اور پائپ اوپر آجائے تو شاید پانی ملنے لگے، میں نے دوستوں سے کہا کہ پہلے ہم لوگ اذکار، دُعا اور نمازِ حاجت کا اہتمام کریں، پھر دو ساتھیوں کو پانی میں تیرنا آتا تھا، ان سے گذارش کی کہ وہ اللہ کا نام لے کر نیچے اُتریں، ان کی مدد کے لئے بانس کی بڑی سیڑھی بھی رکھ دی گئی، وہ کسی طرح وہاں پہنچے اور نل کے پائپ کو گھمانے میں کامیاب ہوگئے، اللہ کا شکر ہے کہ پانی آنے لگا، ظاہر ہے کہ اس وقت پانی کی سپلائی بند تھی اور بظاہر پائپوں میں رُکا ہوا پانی تھا، جو آرہا تھا؛ لیکن کئی دنوں یہ پانی چلتا رہا اور بوتل میں بھر بھر کر پڑوسیوں کے گھر میں بھی پھینکا جاتا رہا؛ تاکہ وہ بھی اپنا حلق تر کرسکیں، افسوس کہ آج ہم مادی اسباب تک پہنچنے کے لئے سوجتن کرتے ہیں؛ لیکن اللہ کے غیبی نظام سے فائدہ اُٹھانے اور براہِ راست اپنے خالق ومالک سے مانگنے کی کوشش نہیں کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کے اس سیلاب نے گویا طوفانِ نوح کی جھلک دکھادی؛ لیکن مسلمانوں کو چاہئے وہ دینی نقطۂ نظر سے اس حادثہ پر غور کریں اور اپنے معاشرے کو اللہ کی نافرمانی سے بچانے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کریں، ایسی مشکل گھڑیوں میں اپنے بھائیوں کی فکر کریں اور ان کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھائیں، یہ بات بھی اہم ہے کہ ابھی سیلاب ختم نہیں ہوا ہے؛ لیکن عیسائی مشنریاں حرکت میں آچکی ہیں، اگر ملت کی طرف سے خاطر خواہ مدد نہیں پہنچے تو اندیشہ ہے کہ جان ومال کو تو کھو ہی چکے ہیں، کہیں کچھ لوگ ایمان سے بھی ہاتھ نہ دُھو بیٹھیں، جیسا کہ کشمیر میں اس سے پہلے ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔

تعلیم وتربیت

مسلکی تشدد اور اس کا حل

ابھی چند دنوں پہلے آندھرا پردیش کے ایک شہر کے بارے میں یہ اطلاع آئی کہ یہاں مسجد میں مسلکی بنیاد پر دو گروہ کے درمیان ایسے تصادم کی نوبت آگئی کہ جس میں دو افراد شدید زخمی ہو گئے، جن کی حالت بہت ہی نازک ہے اور ان کے علاوہ بھی کئی افراد زخمی ہیں، اس واقعہ کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں میں اب اس طرح کے واقعات پیش آنے لگے ہیں، پولیس کو مسجد کے اندر داخل ہونا پڑتا ہے، امن قائم رکھنے کے لئے پولیس پیکٹ مقرر کی جاتی ہے اور یہ سب خبریں اردو، انگریزی اور مقامی اخبارات کی زینت بنتی ہیں؛ بلکہ بعض دفعہ ذرائع ابلاغ اس کو زیادہ نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں۔

مذہبی اختلافات ہر مذہبی گروہ میں موجود ہیں، عیسائی دنیا میں کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈوکس کے اختلافات تو سب پر عیاں ہیں؛ لیکن ان کے علاوہ بھی ان کے چھوٹے چھوٹے کم وبیش ایک درجن سے زیادہ فرقے موجود ہیں، جن میں سے بہت سے عرب ملکوں میں آباد ہیں، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقے کے درمیان ایسے شدید اختلافات رہے ہیں کہ بیشمار لوگ اس اختلاف کے نتیجے میں زندہ نذرِ آتش کر دیئے گئے، عیسائی مذہب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے؛ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کے بارے میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے، ہندو مذہب اپنے متبعین کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کے بڑے مذاہب میں سے ایک ہے، ان میں بھی بے شمار فرقے موجود ہیں، جن میں بعض ایک خدا کو مانتے ہیں، بعض تین کو اور بعضوں کے نزدیک ان کی تعداد بے شمار ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہندو مذہب کے مختلف فرقوں میں کوئی مشترک عقیدہ نہیں پایا جاتا، مورتی پوجنے والا بھی ہندو ہے اور مورتیوں کا مذاق اڑانے والا بھی ہندو ہے، ہندوؤں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو رام کی پوجا کرتے ہیں اور راون کا پتلا جلاتے ہیں، وہ لوگ بھی جو راون کے ثنا خواں ہیں اور رام کا پتلا جلاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو کہتے ہیں کہ رام محض ایک فرضی کردار ہے، تاریخی طور پر ان کا کوئی وجود نہیں۔

مسلمانوں میں اگر چہ اعتقادی اور فقہی جہتوں سے اختلاف رہا ہے؛ لیکن ان میں افکار اور اعمال کے اعتبار سے اختلاف کم ہے، اور اشتراک زیادہ ہے اور جن امور پر کسی کے مسلمان ہونے کی بنیاد ہے، عام طور پر ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے پر سب متفق ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسول ہونے اور آپ پر سلسلہ نبوت کے ختم ہونے پر سب کا اتفاق ہے، قرآن مجید پر سب کا ایمان ہے، سبھوں کا قبلہ کعبۃ اللہ ہے، اسی طرح عبادات اور حلال وحرام کے احکام میں بھی بنیادی باتوں پر تمام اہل علم متفق ہیں، نماز، روزہ، حج وزکوۃ کی فرضیت میں کوئی اختلاف نہیں، نکاح وطلاق وغیرہ کے بنیادی مسائل بھی متفق علیہ ہیں، مگر یہ بات حد درجہ قابل افسوس ہے کہ دیگر مذاہب کے ماننے والے ہم سے زیادہ اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود موجودہ حالات میں ایک دوسرے کے قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہیں اور خاص طور پر اسلام دشمنی نے ان کو متحد کر رکھا ہے؛ لیکن مسلمان ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں۔

مسلمانوں کے درمیان بعض اختلافات اعتقادی ہیں، ابتدائی ادوار میں تو اعتقادی فرقے بہت زیادہ تھے؛ لیکن اب دو بڑے فرقے باقی رہ گئے ہیں، اہل سنت اور اہل تشیع، جو پوری دنیا میں اور خاص کر اکثر مسلم ملکوں میں پائے جاتے ہیں، ان کے علاوہ یمن میں زیدیہ ہیں، جن کے عقائد اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان ہیں اور مسقط میں ''اباضیہ'' ہیں، جن کو فکر کے اعتبار سے خوارج کے قریب قرار دیا جاتا ہے؛ لیکن ان کی تعداد محدود ہے، دنیا میں بحیثیت مجموعی ۸۰ سے ۹۰ فیصد مسلمان اہل سنت کی مکتب فکر سے وابستہ ہیں، اکثر مسلم ممالک میں غالب اکثریت اہل سنت کی ہے، ایران شیعہ اکثریت ملک ہے، عراق اور لبنان میں قریب قریب مساوی آبادی ہے، جہاں دونوں فرقوں کی قابل لحاظ آبادی ہے، وہاں کے لئے صحیح طریقۂ کار یہ ہے کہ منصفانہ انتخاب ہو، جس طبقہ کو اکثریت حاصل ہو، حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہو؛ لیکن اقلیت کی بھی ان کی تعداد کے تناسب سے حکومت میں نمائندگی ہو، ان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو، سب کی جان ومال، عزت وآبرو کے تحفظ کی ضمانت ہو، کسی کو دوسرے کی دل آزاری کی اجازت نہ دی جائے، مگر افسوس کہ مسلمانوں نے بقائے باہم کے اصول پر زندگی گذارنے کے اس آسان اور منصفانہ طریقہ کو نظر انداز کر دیا، شام میں ایک ظالم، درندہ صفت ڈکٹیٹر اقتدار کی کرسی پر براجمان ہے جس نے پورے شام کو اہل سنت کے مذبح میں تبدیل کر دیا

ہے؛ حالانکہ وہ جس فرقے سے تعلق رکھتا ہے، اس کی آبادی صرف دس فیصد ہے، عراق میں پہلے ایسے کمیونسٹ ڈکٹیٹروں نے حکومت کی، جو خاندانی طور پر اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے اور اس نے اہل تشیع کے ساتھ بڑی ناانصافیاں کیں، اور اب اہل تشیع کو اقتدار حاصل ہے، جنہوں نے طئے شدہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اہل سنت پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے، یہاں تک کہ ملک کے منتخب سنی نائب صدر کے خلاف گرفتاری کا پروانہ جاری کر دیا ہے، بحرین میں شیعوں کو اکثریت حاصل ہے؛ لیکن وہاں ایک ایسی شاہی حکومت قائم ہے، جن کا فکری تعلق اہل سنت سے ہے اور اہل تشیع مساویانہ حقوق سے محروم ہیں۔

اگر چہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان گہرے فکری اختلافات پائے جاتے ہیں؛ لیکن دو ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ایک یہ کہ دونوں اہل قبلہ میں سے ہیں، حدیث وفقہ کی بہت سی شخصیتیں دونوں کے درمیان مشترک ہیں اور قدیم زمانے سے دونوں طبقوں کے افراد واشخاص یہاں تک کہ اہل علم کے درمیان روابط رہے ہیں، دوسرے یہ کہ ان دونوں فرقوں کا وجود ایک حقیقت ہے، یہ ممکن نہیں کہ ایک فرقہ کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں کو دنیا سے ناپید کر دیں، اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے بنیادی حقوق کا احترام کریں، اپنے نقطۂ نظر پر رہتے ہوئے کوئی ایسی بات نہ کریں، جس سے دوسروں کی دل آزاری ہو، یہی نسخہ ان ملکوں کے لئے بھی قابل عمل ہے، جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے اور ان ملکوں کے لئے بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے درمیان اعتقادی اور فقہی دونوں پہلوؤں سے اختلاف رائے رہا ہے، پھر صحابہ کے درمیان بھی بعض امور میں اختلاف تھا جیسے اس بات میں کہ مردے سنتے ہیں یا نہیں؟ اور اس سلسلے میں کہ معراج کے موقع سے رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوا تھا یا نہیں؟ بعد کے ادوار میں کچھ اور اعتقادی مسائل میں خاص کر صفات باری کی تشریح وتوضیح میں اختلاف رائے پیدا ہوا اور اسی بنیاد پر اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ کے مکاتب فکر پیدا ہوئے؛ لیکن کبھی ان اعتقادی اختلافات کی وجہ سے لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر نہیں کہا، نہ قتل وخون کی نوبت آئی اور نہ حکومت کو امن وامان کے لئے دخل دینا پڑا، اب بھی اعتقادی جہت سے جو اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں عملی تصادم کا کوئی سبب نہیں ہے؛ کیونکہ عقیدہ کا تعلق ضمیر سے ہے، اگر کوئی شخص دوسرے کی دل آزاری

کے بغیر جس موقف کو درست سمجھتا ہے، اس پر قائم رہے تو لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آئے۔

بعض مسائل عملی ہیں؛ لیکن اس لحاظ سے اس کا تعلق اعتقاد سے جڑ گیا ہے کہ بعض فکر وعقیدہ کے حاملین اس کے قائل ہیں اور بعض نہیں؛ لیکن جو لوگ قائل ہیں، ان کے نزدیک بھی وہ واجب یا فرض کے درجہ میں نہیں ہیں، وہ اس کو مباح یا زیادہ سے زیادہ مستحب سمجھتے ہیں؛ اس لئے اس کا بہتر حل یہ ہے کہ جو مسجد کسی ایک نقطہ نظر کے حاملین نے بنائی ہوں وہاں، ان کی فکر کے مطابق عمل ہو اور دوسرے گروہ کے لوگ اس کو گوارہ کریں، اور جو مسجد پہلے سے چلی آرہی ہے، یا جس کو دونوں گروہوں نے مل کر بنایا ہو، اس میں دونوں کو اپنے اپنے نقطہ نظر پر عمل کرنے کی اجازت ہو، ایک دوسرے کے عمل میں رکاوٹ بننے سے گریز کریں۔

جہاں اتفاق واتحاد کے لئے ہمیں قرآن وحدیث اور اسوۂ نبی سے روشنی ملتی ہے، وہیں اگر اختلاف کی صورت پیدا ہوجائے، اور کسی ایک نقطہ نظر پر اتفاق نہ ہو پائے تو شریعت میں اس کے لئے بھی اصول موجود ہے، جس کو ہم بنیادی طور پر تین نکات میں بیان کر سکتے ہیں:

اول یہ کہ جن امور میں اتفاق رائے نہ ہو، ان میں ہر گروہ کے لوگ اپنی اپنی رائے پر عمل کریں، قرآن مجید میں تو اصول غیر مسلموں کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے، ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (کافرون: ٦) جب غیر مسلموں کے حق میں یہ بات قبول کی جاسکتی ہے جب کہ وہاں ایک طرف کھلا ہوا حق ہے اور دوسری طرف کھلا ہوا باطل ہے اور جب کہ وہاں ایک نقطہ نظر کا حق ہونا اور دوسرے کا باطل ہونا قیاس وگمان اور تخمین وظن پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ وحی الٰہی پر مبنی ہے، پھر مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے بارے میں تو مفاہمت کا یہ طریقہ بدرجۂ اولیٰ قابل عمل ہے۔

دوسرے: دو مختلف نقاط نظر کے حاملین ایک دوسرے کے پیشواؤں اور مذہبی رہنماؤں کو برا بھلا نہ کہیں، قرآن مجید نے تو ان دیویوں اور دیوتاؤں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے، غیر مسلم حضرات جن کی پرستش کرتے ہیں: ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (الانعام: ١٠٩) جب کہ ان کا معبود باطل ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر اور بے غبار ہے اور انبیاء کی بنیادی تعلیم ہی یہی ہے کہ بندوں کو ان معبودان باطل کی پرستش سے بچایا جائے، پھر بھی دنیا میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے ان کی بے احترامی سے منع کیا گیا، مسلمانوں کا کوئی بھی

طبقہ جن شخصیتوں سے اپنی نسبت کرتا ہو، وہ بہر حال علم وفضل اور اعمال واخلاق کے اعتبار سے امت میں امتیازی حیثیت کے حامل رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان کے بعض افکار اور بعض تحریروں سے کچھ لوگوں کو درست یا نادرست اختلاف رہا ہو؛ لیکن بہر حال یہ ایسی شخصیتیں تھیں، جنہوں نے قرآن وحدیث کی خدمت کی، احکام شریعت کی رہنمائی کی اور ہزاروں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی تو ان کے بارے میں بدرجہ اولی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ چاہے آپ ان کا احترام نہ کریں؛ لیکن کم سے کم ان کی بے احترامی سے تو اپنے آپ کو باز رکھیں۔

تیسرا اصول قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ جہاں اتفاق کی صورت نہ بن سکے، وہاں کم سے کم اشتراک کا راستہ اختیار کیا جائے، یعنی جن امور میں اتفاق ہو ان کے لئے مل جل کر کوششیں کی جائیں، قرآن مجید میں اہل کتاب کو اسی اصول پر مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ﴿تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ﴾ (آل عمران: ۶۴) حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے نبی ہونے اور قرآن مجید کے کتاب الٰہی ہونے کا انکار کرتے تھے تو کیا مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر دین کے تمام بنیادی عقائد اور اہم فروعی احکام میں متفق ہونے کے باوجود ایک ایسے ملک میں اس فارمولے پر عمل نہیں کر سکتے، جہاں بہت سارے ملی مسائل ہمارے سامنے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند فسادات، نوجوانوں کی بے قصور گرفتاریاں، پولیس کے مظالم، معاشی نابرابری، تعلیمی پسماندگی، مغربی تہذیب کا مقابلہ، مسلم سماج کو بے حیائی سے بچانا، سود کے جال سے انہیں محفوظ رکھنا، قادیانیت اور عیسائیت کے فتنے سے مسلمانوں کی حفاظت، مسلمان نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی بے روزگاری کا سدباب، تقریبات نکاح میں فضول خرچی کو روکنا اور نہ جانے کتنے مسائل ہیں جن میں کسی کا اختلاف نہیں اور جن سے وہ تمام لوگ دوچار ہیں، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اور اگر ایسے مسائل پر مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر مل کر مشترکہ جدوجہد کریں تو باہمی نفرتیں کم ہوں گی اور اختلافِ رائے بھی ایک حد پر رہے گا۔

مسلکی تشدد کم کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے کا ماحول بنانے میں سب سے اہم کردار علماء اور مشائخ ادا کر سکتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کے صلاح وفساد میں امراء اور علماء کے کردار کو نہایت اہم قرار دیا ہے، امراء سے مراد ہیں اصحاب اقتدار، اور علماء سے مذہبی

پیشوا، جن مما لک میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں پر چونکہ امراء کا وجود نہیں؛ اس لئے مسلم سماج کے صلاح وفساد میں پورا رول علماء ومشائخ کا ہے؛ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اپنے خطابات وبیانات میں اختلافی مسائل کے بجائے اصلاحی مضامین کو بیان کریں، اختلافی مسائل کو اپنی نجی مجلسوں تک محدود رکھیں، پھر اختلاف کو بیان کرتے ہوئے اپنے دلائل پیش کردیں، دوسروں پر طعن و طنز اوران کی اہانت سے احتراز کریں، ایسی باتیں نہ کہیں، جن سے تشدد پیدا ہوا، اور حقیقی مسائل کی طرف سے مسلمانوں کی توجہ ہٹ جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مدعی ایمان کو کافر قرار دینے میں جس احتیاط کا حکم دیا ہے اور فقہاء نے جو اصول بیان کئے ہیں کہ اگر کسی بات کی تشریح میں ننانوے وجوہ کفر ہوں اور اس کی ایک توجیہ بھی ایسی ہوسکتی ہو جس کی بناء پر اس کو تکفیر سے بچایا جاسکے تو اس ایک پہلو کو اختیار کرنا چاہئے، اس کو ملحوظ رکھیں، اور سارے معاملات اپنی عدالت میں فیصل کرنے کے بجائے کچھ اللہ کی عدالت کے لئے بھی چھوڑ دیں، موجودہ حالات میں مسلکی اختلافات کو ہوا دینا کسی خاص فرقہ کو نقصان پہنچانا نہیں ہے؛ بلکہ پوری امت کو نقصان اور اعداءِ اسلام کو فائدہ پہنچانا ہے!

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

رسول اللہ ﷺ جس وقت دنیا میں تشریف لائے، یہ دنیا ہر طرح کی برائیوں کی آماجگاہ تھی، کوئی برائی نہ تھی جو عرب کے سماج میں نہ پائی جاتی ہو، لوگوں کی جان محفوظ تھی نہ مال اور نہ عزت وآبرو، بے حیائی کا یہ حال تھا کہ اور مواقع تو کجا، کعبہ کا طواف بھی بے لباس کرتے تھے، مرد بھی عورت بھی، ظلم وجور کی کوئی حد نہ تھی اور سماج کے تمام فیصلے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول پر ہوا کرتے تھے، مذہبی پہلو سے دیکھئے تو بدترین شرک تھا، جس میں عرب گرفتار تھے اور عرب سے لے کر چین تک پوری مشرقی دنیا علانیہ شرک میں مبتلا تھی، سلطنتِ روم کا مذہب گو عیسائیت تھا؛ لیکن یہاں بھی توحید کے پردہ میں شرک ہی کی حکمرانی تھی اور ایک خدا کے بجائے تین افراد پر مشتمل خدا کا کنبہ تشکیل پا چکا تھا اور ان سب کی پرستش کی جاتی تھی۔

ان حالات میں رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے اور جب عمر مبارک چالیس سال ہوئی تو نبوت کا تاج گہر بار سر مبارک پر رکھ دیا گیا، بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان حالات میں جو پہلی وحی نازل ہوتی، وہ اصلاحِ عقیدہ کے پہلو سے توحید کے اثبات اور شرک کے رد میں ہوتی، یا انسانی نقطۂ نظر سے ایسی آیت ہوتی جس میں ظلم وجور سے منع کیا گیا ہو اور انسانی اُخوت وہمدردی اور محبت ومروت کی طرف دعوت دی گئی ہو، یا سماجی اصلاح سے متعلق کوئی آیت ہوتی، جس میں بے شرمی اور بے حیائی سے روکا گیا ہو۔

آپ ﷺ پر سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی، اس میں ان میں سے کسی بات کا تذکرہ نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِقْرَا بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَا وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق:۱-۵)

اپنے رب کے نام سے پڑھ جو سب کا خالق ہے، جس نے آدمی کو جمے ہوئے لہو سے بنایا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، آدمی کو وہ سکھایا جو وہ

نہ جانتا تھا۔

یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تعلیم اور پڑھنے کی طرف متوجہ فرمایا؛ اس لئے کہ علم کی مثال روشنی کی سی ہے، اگر کسی تاریک کمرہ میں سانپ بھی ہو، بچھو بھی اور دوسرے تکلیف دہ کیڑے مکوڑے بھی، آپ ان سب کو مارنے اور بھگانے کے لئے الگ الگ محنت کریں، تو وقت بھی زیادہ لگے گا اور شاید کامیابی بھی نہ ہو؛ لیکن اگر آپ ایک چراغ جلا کر رکھ دیں، تو خود بخود یہ کیڑے مکوڑے اپنا بسیرا اٹھالیں گے؛ کیوں کہ تاریکی ہی ان کی پناہ گاہ ہے، یہی کیفیت انسانی سماج میں علم کی ہے، عقیدہ وعمل اور معاشرت و اخلاق کی تمام برائیاں جہالت کا نتیجہ ہیں، جہالت کی تاریکی ہی میں یہ تمام مفاسد پرورش پاتے ہیں، تعلیم کی روشنی جتنی پھیلے گی، یہ بگاڑ بھی خود بہ خود دور ہوتا جائے گا، تعلیم کے بغیر سماج کی برائیوں کو دور کرنے کی مثال جڑوں کے بجائے ٹہنیوں اور پتوں پر پانی دینے کی ہے کہ اس سے وقتی فائدہ تو ہوسکتا ہے؛ لیکن کسی دیرپا تبدیلی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔

اسی لئے تعلیم کی بڑی اہمیت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے صرف مذہبی تعلیم ہی کو اہمیت دی ہو؛ بلکہ اسلام نے علم کی تقسیم علم نافع اور علم غیر نافع سے کی ہے، جو علم انسان کو دینی یا دنیوی اعتبار سے نفع پہنچائے اور ان کے مسائل کو حل کرے وہ علم نافع ہے اور جو علم انسانیت کے لئے ہلاکت اور مضرت کا سامان ہو وہ علم غیر نافع ہے، رسول اللہ ﷺ علم نافع کے لئے دُعاء کیا کرتے تھے اور جو علم نافع نہ ہو، اس سے پناہ چاہتے تھے، اس اُصول پر غور فرمایئے تو اکثر عصری علوم وفنون علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں، طب انسانی جسم کے لئے نفع بخش ہے، انجینئرنگ انسانی ضروریات کی تکمیل میں مفید ہے، علم قانون میں انسان کی عزت وآبرو کی حفاظت ہے، ادب وصحافت کے ذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام ہوتا ہے، جس پر سماج کی اخلاقی اور روحانی اقدار کا تحفظ موقوف ہے، تجارت اور معاشیات سے متعلق علوم کا مقصد فرد اور سماج کی معاشی ضروریات کو پورا کرنا اور اس کے صرف کے جائز اور مناسب مواقع کی رہنمائی کرنا ہے، جس کے مفید اور نافع ہونے سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ اس لئے یہ تمام علوم اسلام میں مطلوب ہیں اور ان کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔

اسلام نے کبھی علم وتحقیق سے عداوت نہیں رکھی؛ بلکہ لوگوں کو کائنات کی مخفی حقیقتوں میں غور وفکر اور تدبر کی دعوت دی اور حکمت ودانائی کی ہر بات کو مؤمن کی متاعِ گم گشتہ قرار دیا، علم کے اعتراف میں

اپنے اور بے گانے کا فرق نہیں کیا، حضور ﷺ نے اُمیہ بن صلت کے اشعار کی تعریف فرمائی، جو زمانۂ جاہلیت کا شاعر تھا اور علم کی تحصیل میں بھی آپ ﷺ نے کبھی دوست اور دشمن کا فرق نہیں کیا، غزوۂ بدر میں جو لوگ قید ہو کر آئے، ان کے بارے میں آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ ان میں جو لوگ پڑھے لکھے ہوں، وہ دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں، یہی ان کا فدیۂ رہائی ہوگا، ظاہر ہے کہ وہ دشمن تھے نہ کہ دوست اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ مشرک تھے، علم دین تو ان سے حاصل ہو نہیں سکتا تھا، اگر آپ ان سے تعلیمی فدیہ وصول کرنے کے بجائے مالی فدیہ ہی وصول کرنے پر اصرار کرتے تو معاشی نقطۂ نظر سے اہل مدینہ کے لئے یہ مناسب ہوتا؛ کیوں کہ اس وقت مسلمان سخت غریب اور افلاس کی حالت میں تھے اور فاقہ کشی کے ساتھ گذر بسر عام تھی؛ لیکن آپ ﷺ نے ان حالات میں بھی تعلیم کو ترجیح دی، یہ گویا اس بات کا سبق ہے کہ تعلیم کا حاصل کرنا بہر حال ضروری ہے، چاہے اس کے لئے پیٹ کاٹنا پڑے، یا فاقے برداشت کرنے پڑیں؛ لیکن بچوں کی تعلیم کو کسی قیمت پر نظر انداز نہ کیا جائے۔

آج مسلمانوں کو یہی سمجھانے کی ضرورت ہے کہ وہ معمولی کھائیں، معمولی کپڑے پہنیں، عیش وعشرت کے دوسرے اسباب سے اپنے آپ کو بچائیں، معاشی تنگی کو گوارا کریں؛ لیکن ہر قیمت پر اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں، ہمارے سماج کا کوئی بچہ ایسا نہ ہو جو تعلیم سے محروم رہے۔ عام طور پر غریبو ں کی مدد اور تعاون کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وقتی طور پر کچھ پیسے دے دئے جائیں، کچھ کھانے پینے کی چیز مہیا کر دی جائے، عید کا موقع ہو تو کپڑے دیئے جائیں، ہم اسی کو بڑی خدمت سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ خدمت کا زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اس کے لئے روزگار اور معاشی سطح کو مستقل طور پر اونچا اٹھانے کی تدبیر ہو، جیسے کوئی دوکان لگا دی جائے، کہیں ملازمت دلا دی جائے، اس کی فضیلت زیادہ ہے اور رسول اللہ ﷺ سے ایسی تدابیر کا اختیار کرنا ثابت ہے، ایسی ہی تدابیر میں ایک یہ ہے کہ کوئی شخص اگر خود اپنے بچہ کو پڑھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو اس کے بچوں کو تعلیم دلا دی جائے، یہ صدقۂ جاریہ ہوگا اور اس بچہ کے ذریعہ خود اس کی، اس کے والدین کی اور خاندان وسماج کی جو کچھ خدمت ہوگی، یہ اس کے اجر میں شریک ہوگا، یہ انسانی خدمت کا سب سے اہم اور مفید طریقہ ہے، اگر کسی شخص کے دو بچے ہوں تو اس کو خیال کرنا چاہئے کہ گویا اس کے تین بچے ہیں اور وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ اپنی قوم کے ایک اور بچہ کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول کر لے،

یقیناً یہ بہت بڑی خدمت ہوگی اور اس طرح سماج کی بہت سی مشکلات حل ہوسکیں گی، جب تک پورا سماج نہ بڑھے اور پوری قوم ترقی نہ کرے، یقیناً ہماری ترقی ادھوری اور نا تمام ہوگی۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان بچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پرائمری کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہے، بہت سے طلبہ ہائی اسکول کی سطح پر تعلیم ترک کر دیتے ہیں اور اعلیٰ فنی تعلیم میں تو ہمارے بہت ہی کم بچے پہنچ پاتے ہیں، یہ نہایت افسوس ناک بات ہے، ترکِ تعلیم کی وجہ کبھی معاشی ہوتی ہے، کبھی طالب علم کی پست ہمتی اور بہت سے گھروں میں والدین کی جہالت اور سرپرستوں کی ناواقفیت، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان رہنما اور اہل دانش نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر گاؤں گاؤں اور شہر کے مختلف محلوں میں چند پڑھے لکھے رضا کاروں کی ایک کمیٹی بنائیں، جو سلسلۂ تعلیم منقطع کرنے والے بچوں اور ان کے سرپرستوں کے حالات کا جائزہ لیں، اگر طالب علم پست ہمتی کا شکار ہو رہا ہے تو اس کے لئے کچھ کوچنگ کا انتظام کریں اور ان کی ہمت بڑھائیں، اگر سرپرستوں کی غفلت اور ناسمجھی ہو تو ان کا شعور بیدار کریں اور جو مواقع گورنمنٹ کی طرف سے حاصل ہیں، ان کو ان سے استفادہ کی راہیں بتائیں اور جو بچے معاشی پسماندگی کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہو رہے ہوں، ان کی تعلیمی وسائل میں مدد کریں اور اہل خیر کو اس جانب متوجہ کریں، کسی کو کتابوں کی ضرورت ہو تو کتاب دلا دیں، کسی کو اسکولوں کی داخلہ فیس کا مسئلہ ہو تو اس میں تعاون کر دیں، اس طرح ہم تھوڑی سی کوشش اور فکرمندی کے ذریعہ بہت سے طلبہ کے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ایک اہم مسئلہ زبان کا بھی ہے، اسلام کسی زبان کا مخالف نہیں؛ بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، خود آپ ﷺ کے حکم سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کئی زبانیں سیکھیں اور ان میں مہارت حاصل کی؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مضمون کی تعلیم کے لئے سب سے بہتر ذریعہ ''مادری زبان'' ہے، اجنبی زبان میں طالب علم کو دوہری مصیبت پیش آتی ہے، ایک زبان کو سمجھنے کی اور دوسرے اس مضمون کو اپنے گرفت میں لانے کی، مادری زبان ایک دشواری کو آسان کر دیتی ہے اور طالب علم کو اپنا ذہن اس مضمون کے سمجھنے پر مرکوز رکھنے کا موقع ملتا ہے، اس لئے ہر سال اچھے رینک لانے والے اور مقابلاتی امتحان میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے والے بچے وہ ہوتے ہیں، جو مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بناتے ہیں، اس حقیقت کو تمام ماہرین تعلیم تسلیم کرتے ہیں؛ بلکہ کہا

جا سکتا ہے کہ مادری زبان کی اہمیت کی طرف خود قرآن مجید میں بھی اشارہ ملتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے ہر قوم میں اس قوم کی زبان میں پیغمبر بھیجا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾ (ابراہیم: ۴)

بدقسمتی سے مسلمان اُردو زبان کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہیں، جو لوگ اُردو زبان کے تحفظ کی تحریک چلاتے ہیں؛ بلکہ اردو ہی کی روٹی کھاتے ہیں، وہ خود بھی اپنے بچوں کے لئے اُردو ذریعہ تعلیم کو پسند نہیں کرتے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت اُردو اقامتی اسکول قائم کرتی ہے؛ لیکن بچے دستیاب نہیں ہوتے، یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے ہیں؛ لیکن طلبہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ وہ بند ہو جائیں، یہ نہایت تکلیف دہ صورتِ حال ہے اور اس سلسلہ میں قومی سطح پر شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ آہستہ آہستہ ہم سے ہماری زبان بھی چھن جائے گی۔

قوم سے صحیح محبت یہی ہے کہ ہم اپنی نسلوں کو تعلیم میں آگے بڑھائیں اور جس شرمناک تعلیمی پسماندگی سے ہم دوچار ہیں، پوری قوم کو اس سے باہر نکالنے کی کوشش کریں، مسلم جماعتیں ایک لائحۂ عمل مرتب کریں اور ایک محدود مدت کا پروگرام بنائیں کہ ہم اس مدت میں مکمل طور پر ناخواندگی کو مٹادیں گے اور ہمارے سماج کا کوئی لڑکا یا لڑکی ایسا نہ ہوگا جو تعلیم سے محروم ہو!

تعلیم کے بعض اہم شعبوں کی طرف توجہ کی ضرورت!

اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں انسان کو جن امتیازی صلاحیتوں سے نوازا ہے، ان میں سے ایک اہم صفت یہ ہے کہ اس کے اندر علم کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے، علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود اپنی صفت علم کا کم سے کم دوسو بارہ مواقع پر ذکر فرمایا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو جو اس دنیا کی خلافت عطا کی گئی ہے، وہ اسی لئے کہ ان کے اندر معلومات کو اخذ کرنے کی صلاحیت تھی؛ چنانچہ حق تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کے ساتھ ان کا امتحان لیا گیا اور بارگاہِ الٰہی میں ہونے والے اس امتحان میں پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کامیابی سے ہمکنار ہوئے، حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کی جانب سے کن کن چیزوں کا علم عطا فرمایا گیا تھا؟ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں مختصر لیکن جامع بات کہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء (ناموں) کے علم سے نوازا گیا تھا﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (بقرہ:۳۱) اسم کے معنی تو صرف نام کے ہیں جو کسی شئ کی نشاندھی کرتی ہے؛ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد صرف نام نہیں ہے؛ بلکہ کائنات کی وہ تمام چیزیں ہیں، جن کے نام رکھے جاسکتے ہیں، گویا علم کا جو مخفی خزانہ جہالت کے پردے سے نکل نکل کر باہر آرہا ہے اور جو قیامت تک آتا رہے گا، جن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے انسان مختلف ناموں سے موسوم کرتا ہے، ان ساری چیزوں کا علم حضرت آدم علیہ السلام کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے، جن کا ہر دور کی ضرورت کے اعتبار سے ظہور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

اسلام کی نظر میں بنیادی طور پر علم کی دو قسمیں ہیں، ایک: وہ علم جو انسان کے لئے نفع بخش ہو، خواہ دنیا کے لئے ہو یا آخرت کے لئے اور دوسرے: وہ علم جو بے فائدہ ہو، پہلا علم مطلوب ہے اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور دوسری قسم کا علم مذموم اور ناپسندیدہ ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دُعا کیا کرو اور بے فائدہ علم سے اللہ کی پناہ چاہو: ''**سلوا اللہ علماً نافعاً وتعوذوا باللہ من علم لا ینفع**'' (سنن ابن ماجہ، عن عبد اللہ بن جابرؓ، حدیث نمبر:

۳۸۴۳) — آج کل انسان کی ہلاکت و بربادی اور دنیا کو تباہ و تاراج کرنے کے جو ہتھیار تیار کئے جارہے ہیں، یہ یقیناً بے فائدہ علم میں شامل ہیں اور سوائے اس کے کہ کوئی ملک دفاع کے لئے اس پر مجبور ہو جائے، اس کو اپنے وسائل تعمیری مقاصد کے بجائے ایسے تخریبی کاموں میں خرچ نہیں کرنا چاہئے، مغربی طاقتیں جس طرح اپنی بہترین صلاحیتیں مہلک ہتھیاروں کے بنانے میں خرچ کررہی ہیں، یقیناً ان کو بدبختی کہا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے علم کی خصوصیت یہ رکھی ہے کہ جیسے ایمان انسان کے لئے بلندی کا ذریعہ ہے، اسی طرح علم بھی افراد اور قوموں کی سربلندی و سرخروئی کی کلید ہے: ﴿يَرْفَعِ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ (مجادلہ: ۱۱) جو لوگ علم سے آراستہ ہوں یا جو قوم علم و دانش کی دولت سے مالا مال ہو، وہ اور جو افراد اور قومیں علم سے محروم ہوں، دونوں برابر نہیں ہوسکتے: ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر: ۹) علم کی ضرورت جہاں آخرت کی کامیابی کے لئے ہے، وہیں دنیا میں باعزت زندگی گزارنے اور بہتر مرتبہ و مقام حاصل کرنے کے لئے بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو نبوت کے ساتھ ساتھ حکومت اور حکمرانی کے سلیقہ سے بھی نوازا تھا اور مخلوقات سے متعلق بعض ایسے علوم دیئے گئے تھے، جہاں تک عام انسانوں کی رسائی نہیں ہوتی، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ علم کی اس دولت سے نواز کر اللہ نے ہمیں بہت سارے مسلمان بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے: ﴿وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰي كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (النمل: ۱۵)

دنیا میں اقتدار میں شرکت، کاروبارِ حکومت میں شمولیت اور نظم و نسق کی انجام دہی میں بھی علمی بصیرت اور معلومات کا مہیا ہونا ضروری ہے، اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب مصر کے حکمراں سے پیشکش کی کہ جو اقتصادی بحران مستقبل میں آنے والا ہے اور جو بظاہر پورے ملک کو دانہ دانہ کا محتاج بنا دے گا، اس سے نبرد آزما ہونے کے سلسلہ میں، میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں اور آپ کے خزانہ کی ذمہ داری سنبھال سکتا ہوں، تو اس پیشکش کے ساتھ آپ نے یہ دلیل دی کہ میرے اندر سرکاری خزانے کی حفاظت و نگہداشت کی صلاحیت بھی ہے اور میں علم کی دولت سے بہرہ ور بھی ہوں:

﴿اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ (یوسف:۵۵)

حکومت و اقتدار کی اہمیت ہر ملک میں ہے؛ لیکن جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہوں، وہاں اقتدار میں ساجھے داری اور سرکاری نظم و نسق میں شمولیت مسلمانوں کے ملی بقاء کے لئے بے حد ضروری ہے؛ کیوں کہ عام طور پر اکثریت چاہتی ہے کہ وہ اقلیت کو ہضم کر جائے، اس کے تشخص کو مٹا دے، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے اس کو پنپنے کا موقع نہیں دے، ہندوستان میں مسلمان اس وقت اسی صورت حال سے دو چار ہیں، ان کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی ضرب المثل بن چکی ہے، جس قوم نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی، وہ آج ایک بے توقیر گروہ کی حیثیت سے زندگی کا سفر طے کر رہی ہے، اس صورت حال سے نکلنے کے لئے جہاں دین سے گہری وابستگی اور باہمی اتحاد ضروری ہے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اُمت علم و تحقیق کے میدان میں آگے بڑھے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لائق بن جائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ مسلمان مختلف حادثات سے سبق حاصل کرتے رہے ہیں اور جب بھی کوئی مصیبت اس پر آئی ہے، غم زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک نئے حوصلہ کے ساتھ قدم بڑھایا ہے، تقسیم ہند کے بعد سے جب فرقہ وارانہ حملہ شروع ہوا، پولیس اور فسادیوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا سلسلہ شروع کیا، تو ۱۹۷۱ء تک مسلمانوں کی یہ کیفیت رہی کہ لوگ فسادیوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرتے اور بہت سی دفعہ ان کی منزل موجودہ بنگلہ دیش کی سرزمین ہوتی، وہ اس کو اپنے لئے ایک گوشہ عافیت تصور کرتے؛ لیکن جب پاکستان کی ناعاقبت اندیشی کے نتیجہ میں بنگلہ دیش بن گیا تو انھوں نے محسوس کر لیا کہ بہر حال ان کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے؛ اس لئے انھوں نے حوصلہ و ہمت کو جمع کیا اور اس کی وجہ سے فسادات کے نتائج اور آبادی کے ارتکاز میں ایک مثبت تبدیلی ظاہر ہونے لگی، پھر ۱۹۷۲ء میں جب حکومت ہند نے متبنّٰی سے متعلق ایک ایسا قانون لانے کی کوشش کی جو شریعت اسلامی سے متصادم تھا اور مسلمانوں نے محسوس کیا کہ حکومت جان و مال کے بعد اب مسلمانوں کے دین و شریعت پر بھی ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے، تو انھوں نے اپنے باہمی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ساتھ بیٹھنے اور مشترکہ مسائل کے لئے متحدہ جدو جہد کرنے کا سبق سیکھا اور اس طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا متحدہ پلیٹ فارم وجود میں آیا۔

۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت کا وہ اندوہ ناک واقعہ پیش آیا، جس نے پوری ملتِ اسلامیہ کو ہلا کر رکھ دیا، ان حادثات کے بعد مسلمانوں نے ایک نئی کروٹ لی، انھوں نے محسوس کیا کہ ان کو قصداً انصاف سے محروم رکھا جاتا ہے اور وہ خود اپنی جدوجہد کے ذریعہ ہی اس ملک میں ایک باوقار اُمت کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں؛ چنانچہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیمی اور معاشی جدوجہد شروع ہوئی، مسلمانوں نے سرکاری ملازمت پر تکیہ کرنے کے بجائے تجارت، چھوٹی صنعت اور بیرون ملک ملازمت پر توجہ دی، غیر سودی قرض کے ادارے قائم کئے اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو روزگار کے اعتبار سے خود مکتفی بنانے کی کوششیں کی گئیں، بحمداللہ ان کوششوں کے بہتر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

تعلیم کی طرف بھی مسلمانوں کی توجہ بڑھی ہے، انھوں نے پرائمری سے لے کر ڈگری اور پی جی کی سطح کے ہزاروں ادارے قائم کئے ہیں، ملک کے مختلف حصوں میں اور خاص کر جنوبی ہند میں پیشہ ورانہ تعلیم کے بہت سے ادارے قائم کئے، اب ہزاروں کی تعداد میں مسلمان طلبہ میڈیکل، انجینئرنگ، ایم بی اے، ایم سی اے اور آئی ٹی وغیرہ کی سندیں لے کر نکل رہے ہیں، اگرچہ اعلیٰ تعلیم کے بیشتر ادارے ملک کے جنوبی علاقہ میں قائم ہیں؛ لیکن ان کا فائدہ پورے ملک کے نوجوان مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے، یہ یقیناً ایک خوش آئند بات ہے اور اُمید ہے کہ مستقبل میں اس کے بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔

لیکن غور کرنے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ عصری تعلیم کے جن شعبوں کی طرف مسلمانوں کی توجہ بڑھی ہے، عام طور پر اس کا فائدہ ان کی ذات یا ان کے خاندان کو پہنچ سکے گا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں خاندان کا تصور بہت محدود ہو گیا ہے، بیوی بچوں کے سوا بمشکل والدین کو اس میں شامل کیا جاتا ہے، بھائی بہن کا تو ذکر ہی کیا ہے، تعلیم کے ان شعبوں سے فارغ ہونے والے نوجوان اپنے آپ کو سکہ ڈھالنے کی مشین سمجھتے ہیں، قومی و ملی مسائل سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا؛ اس لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی تعلیم ملت کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا رہی ہے؛ بلکہ جو لوگ ایسے نوجوانوں پر بطور تعاون اپنا سرمایہ خرچ کرتے ہیں، وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ملک کا جو سرمایہ ان پر خرچ کیا جا رہا ہے، ملت کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے اور ایک ایسا گروہ تیار ہو رہا ہے جس کی اکثریت خود غرضی اور مادہ پرستی میں مبتلا ہو جاتی ہے، کاش کہ جو تنظیمیں تعلیم کے ان شعبوں میں

نوجوانوں کو امداد فراہم کرتی ہیں، وہ ان کی اخلاقی اور فطری تربیت کی طرف بھی توجہ دیں۔

لیکن اس وقت ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ عصری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو ان شعبوں میں لایا جائے، جو فکر سازی، ملت کے مسائل کی ترجمانی، انصاف کے حصول اور ان کے نظم ونسق میں شمولیت کو آسان بنا سکیں، اس سلسلہ میں خصوصی طور پر بعض شعبوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، جیسے قانون کا شعبہ ہے، سپریم کورٹ میں اچھے مسلم وکلاء جن کا عدالت میں وزن محسوس کیا جائے نہ کے برابر ہیں، ہائی کورٹوں کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے؛ اسی لئے عدالتوں میں مسلمان ججس کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے، بعض لوگوں کا احساس ہے کہ ملک کا یہ سب سے معزز ترین ادارہ فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم ہوتا جارہا ہے اور بعض دفعہ انصاف کو شرم سار ہونا پڑتا ہے، اگر قانون کے شعبہ میں ہماری مؤثر نمائندگی نہیں رہے گی تو ہمارے لئے انصاف کی جنگ جیتنا دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا جائے گا۔

اسی طرح موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ، بالخصوص انگریزی اور مقامی زبان کے میڈیا کی بڑی اہمیت ہے، اس کے بغیر پروپیگنڈہ کی جنگ میں عزت وآبرو کا بچانا مشکل ہے، ایسے انگریزی دانوں کی بھی ضرورت ہے، جن کو انگریزی کے معتبر ادیب اور مصنف کا درجہ حاصل ہو اور قومی سطح پر ان کو پذیرائی حاصل ہو، ڈاکٹر جسم کا علاج کرسکتا ہے، انجینئر بلڈنگیں اور مشینیں بنا سکتا ہے؛ لیکن فکر سازی کا کام اچھے جرنلسٹ اور باصلاحیت مصنف اور ماہر تاریخ داں کے ذریعہ ہی انجام پا سکتا ہے؛ لیکن ان شعبوں سے مسلمان طلبہ کٹے ہوئے ہیں اور اسی لئے مسلمانوں میں عصری علوم کے حامل ایسے ماہرین نہیں رہے، جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو دلیل، زبان وبیان کی قوت، منطقیت ومعقولیت اور خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کرسکیں، ذرائع ابلاغ مسلمانوں کے تئیں ایسا کردار ادا کرتے ہیں کہ گویا وہ مسلمانوں کے بالمقابل اپوزیشن ہوں، تاریخ ایسی مرتب کی جارہی ہے جس میں مسلمانوں سے متعلق نفرت کے جذبات اُبھارے جارہے ہیں، زبان وبیان کے اعتبار سے معیاری اور مقبول کتابیں اس انداز کی آرہی ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہیں۔

خاص طور پر سول سروسیز کا ذکر کروں گا، جس میں مسلمانوں کا تناسب نہایت حقیر ہے اور یہ تعداد کی کمی اس لئے نہیں ہے کہ مسلمان کی زیادہ تعداد شریک ہوتی ہو اور نسبتاً کم تعداد کامیاب ہوتی ہو؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امتحان میں شریک ہونے والے مسلمان اُمیدواروں ہی کی تعداد کم ہوتی ہے

اور شرکت کے اعتبار سے کامیابی کا تناسب عام طور پر وہی ہوتا ہے، جو اکثریت کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ ''کم صلاحیت'' ہونے کا نہیں ہے؛ بلکہ کم ہمتی، پست حوصلگی اور جد وجہد میں کمی کا ہے، نیز مزاج یہ بن گیا ہے کہ اعلیٰ ترین منزل پر پہنچنے کے بجائے اسی مرحلہ پر اکتفا کرلیا جائے، جس سے کمائی ہونے لگے اور مرفہ الحالی حاصل ہوجائے؛ حالاں کہ جو لوگ اس مقام تک پہنچتے ہیں، وہ ملت کو انصاف دلانے میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں اور سیاسی نمائندوں سے بھی بڑھ کر وہ قوم وملت کے لئے اپنی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

اس لئے ضرورت ہے کہ اب تعلیم کے ان شعبوں کی طرف توجہ دی جائے، نوجوانوں کی اس سلسلہ میں حوصلہ افزائی کی جائے اور انھیں اس لائق بنایا جائے کہ ان کی صلاحیت کا فائدہ صرف ان کی ذات یا ان کے خاندان تک محدود نہ رہے؛ بلکہ پوری ملت کو ان کا نفع پہنچے، وہ صرف نوٹ چھاپنے والی مشین بن کر نہ رہ جائیں؛ بلکہ وہ ملت کی سرفرازی وسرخروئی کا ذریعہ بنیں۔

لڑکیوں کی دینی تعلیم وتربیت

انسانی سماج کی تشکیل میں مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ ہے، دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بعض انفرادی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور وہ صلاحیتیں ان سے متعلق فرائض کی ادائیگی کے لئے ناگزیر ہیں، چنانچہ خواتین کو دو خاص صلاحیتیں دی گئی ہیں: ایک مت اُثر ہونے کی، دوسرے مت اُثر کرنے کی، مت اُثر ہونے کے لئے جذبات کی فراوانی مطلوب ہوتی ہے، جو شخص جتنا زیادہ جذباتی ہوگا وہ اتنا ہی جلد اور اتنا ہی زیادہ کسی واقعہ سے متاثر ہوگا، روزمرہ کی زندگی میں بآسانی اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، بچوں کے لئے ماں کی ممتا باپ کی شفقت پر غالب رہتی ہے؛ اسی لئے جو بچے باپ کے سامنے اپنی زبان نہیں کھول سکتے، وہ ماں سے اپنا دکھ درد بیان کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے؛ بلکہ قدم قدم پر ماں سے اپنی ناز برداری کراتے ہیں، اگر ماں باپ سوئے ہوئے ہوں اور کوئی چھوٹا بچہ ساتھ ہو، رات کے وقت بچہ بیدار ہوگیا اور اس نے رونا شروع کیا یا پیشاب، پائخانہ کردیا تو باپ کی اگر آنکھ کھل بھی جائے تو کروٹ بدل کر سوجاتا ہے؛ لیکن ماں کتنی بھی بیمار ہو، تھکی ہوئی ہو، اس کی ممتا اس کو چین نہیں لینے دیتی، وہ جب تک اٹھ کر بچے کو استنجاء نہ کرادے اور دودھ نہ پلائے اور سلا نہ دے، اسے آرام نہیں ملتا؛ اسی لئے آپ ﷺ نے ماں کا حق باپ سے زیادہ رکھا ہے، (**صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب من أحق الناس بحسن الصحبۃ**، حدیث نمبر: ۵۹۷۱، **صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآدب، باب بر الوالدین وأنھما أحق بہ**، حدیث نمبر: ۶۶۶۴) یہ دراصل جذبات کی فراوانی اور اثر پذیری کی بڑھی ہوئی کیفیت کا نتیجہ ہے!

ماں تو بہرحال ماں ہے، اس کی محبت کا تو جواب نہیں؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی محبت کو ماں کی محبت کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ اللہ کی محبت ستر ماؤں کی محبت سے بڑھ کر ہے؛ لیکن بیوی جس طرح اپنے شوہر کے لئے جاں نثاری کا ثبوت دیتی ہے، اس کی خوشنودی کی طلب گار رہتی ہے اور اپنا سب کچھ اپنے شوہر پر نچھاور کردیتی ہے، یہ بھی یقیناً اس کے جذبۂ محبت کا مظہر ہے، ایسے ہی بہن اور

بیٹی اپنے بھائی اور اپنے باپ سے جو محبت رکھتی ہیں، وہ دلداری اور غمگساری کی بہترین مثال ہے، غرض کہ عورت کے ماں، بیوی، بیٹی کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں جذبات کا عنصر زیادہ ہو اور جہاں جذبات کی فراوانی ہوتی ہے، وہاں کسی بات سے جلد متأثر ہونے کا مزاج پایا جاتا ہے، خود مردوں میں بھی جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے، جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے، چھوٹے بچے اور نوجوان زیادہ جذباتی ہوتے ہیں اور اسی جذباتیت کا نتیجہ ہے کہ وہ کسی بات سے جلد متاثر ہوتے ہیں اور ان میں اشتعال بھی جلد پیدا ہوجاتا ہے۔

عورتوں کو جو فطری صلاحیتیں دی گئی ہیں، اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مردوں سے اپنی ضد منوانے اور اپنی خواہش کے مطابق کاموں کو انجام دینے میں مردوں پر حاوی ہو جاتی ہیں؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے خواتین سے فرمایا: کہ میں نے ناپختہ عقل ہونے کے باوجود تمہارے اندر یہ عجیب بات دیکھی ہے کہ تم قوی الارادہ مردوں پر بھی حاوی ہوجاتی ہو اور ان کی عقل پر تسلط حاصل کر لیتی ہو: **"ما رأيت من ناقصات عقل ودين أذهب للب الرجل الحازم إحداكن" (صحيح البخاری، کتاب الحيض، باب ترک الحائض الصوم، حدیث نمبر: ۳۰۴)** چنانچہ عملی طور پر ہر گھر میں فیصلے عورتوں کے ہی زیر اثر رہتے ہیں، یہاں تک کہ خود عورتوں پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں وہ بھی خاص طور پر عورتوں ہی کی وجہ سے، ساس کے ساتھ بہو اور بہو کے ساتھ ساس، نند کے ساتھ بھاوج اور بھاوج کے ساتھ نند زیادتیاں کرتی ہیں، مرد تو زیادتر ان کے آلۂ کار کے طور پر استعمال ہو تے ہیں، غرض کہ یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ خاندانی زندگی میں سب سے اہم کردار عورتوں کا ہوتا ہے، یہاں تک کہ اب تو سیاسی جماعتوں میں عورت کی طاقت محسوس کی جاسکتی ہے، جن جماعتوں میں خواتین سربراہ ہیں وہ ایک آمر اور ڈکیٹر کی طرح اپنی پارٹی کو چلاتی ہیں، ان کا انداز اقتدار یہ ہے کہ کوئی پتہ ان کے اشارے کے بغیر ہلنے نہ پائے، یہ اسی صلاحیت کا مظہر ہے کہ وہ قوی الارادہ مردوں پر حاوی ہوجاسکتی ہیں۔

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے عورت کو شیطان کی رسی قرار دیا ہے: **"والنساء حبالة الشيطان" (المقاصد الحسنه للسخاوی: ۱/۴۰۱، کشف الخفاء: ۱/۳۴۵، ۲/۴، ۲/۳۱۶)** یعنی شیطان اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے عورتوں کو آلہ کار بناتا ہے، کیوں کہ عورتیں

جلد متاثر بھی ہوتی ہیں، اور دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں، اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس امت کے لئے سب سے بڑا فتنہ عورتیں ہوں گی: "**ما ترکت بعدی في الناس فتنة أضر علی الرجال من النساء**" (**سنن الترمذی، کتاب الأدب، باب ما جاء في تحذیر فتنة النساء، حدیث نمبر: ۲۷۰۴**) عورت کو فتنہ یا شیطان کی رسی قرار دینا ان کی توہین نہیں ہے؛ بلکہ عورت کی اسی صلاحیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وہ کسی چیز سے بہت جلد متاثر ہوتی ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے آپ سے متاثر کرتی ہیں۔

مغرب اس کی واضح مثال ہے، مغرب میں خاندانی نظام بکھر چکا ہے، لوگوں کی شناخت گم ہوتی جارہی ہے، بے باپ کی اولاد کی کثرت ہے، بدکاری کی کثرت کی وجہ سے نئی نئی بیماریاں جنم لے رہی ہیں، حیا جو ایک اخلاقی جوہر ہے، سماج اس سے محروم ہوتا جارہا ہے، عمر گزرنے کے بعد عورتوں کے لئے خود ان کی زندگی ایک بوجھ بن جاتی ہے، جرائم کی کثرت ہے اور مغربی ممالک سائنس اور ٹکنالوجی میں جس قدر آگے ہیں، جرائم میں ان کی پیش قدمی شاید اس سے بھی بڑھ کر ہے، اگر غور کیا جائے تو ان سب کے پیچھے یہودیوں کا شیطانی منصوبہ ہے اور انہوں نے اپنے اس منصوبہ کے لئے خواتین کو آلۂ کار بنایا ہے، کلب ہوں یا شراب خانے یا فسق وفجور کے دوسرے اڈے ان سب میں خواتین کو ہی آلۂ کار بنایا جاتا ہے، انہیں سے دوسری تمام برائیاں جنم لیتی ہیں، مغرب میں کچھ لوگوں نے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت آزادیٔ نسواں کی تحریک چلائی، عوتوں کو گھر سے باہر لائے، ان کے لباس اتارے، شرم وحیا کا فطری جذبہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر رکھا ہے، اس سے ان کو خالی وعاری کیا، چند پیسوں کے بدلے ان کے ناموس کو تجارت کے فروغ کے لئے استعمال کرنا شروع کیا اور پھر جو کچھ مفاسد وہ پھیلانا چاہتے تھے، ان میں وہ کامیاب ہوگئے۔

اس لئے خواتین کی دینی واخلاقی تعلیم وتربیت بہت بڑی ضرورت ہے، جس راستے سے بگاڑ آتا ہے، وہیں سے اس بگاڑ کو دور کرنا ہوگا، مگر افسوس کہ لوگوں نے اس پر بہت کم توجہ دی ہے، اسلام کے ابتدائی ادوار میں تعلیم اور دعوت میں عورتوں کا خاص کردار رہا ہے، وہ تفسیر وحدیث، فقہ وادب اور دعوت اسلام میں کارہائے نمایاں انجام دیتی رہیں؛ لیکن ایک طویل عرصہ ایسا بھی گزرا ہے، جس میں کھانا پکانا، مردوں کی خدمت کرنا اور ان کے بچوں کی پرورش کرنا عورتوں کی ڈیوٹی قرار پائی، اگر انہوں

نے ناظرہ قرآن اور دینیات پڑھ لیا تو اسی کو کافی سمجھ لیا گیا، اور ستم یہ ہے کہ اس طرز عمل کو اسلام کی طرف منسوب کر دیا گیا، یہ اللہ کا شکر ہے کہ تقریباً پچیس تیس سال سے لڑکیوں کے دینی مدارس کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اور اب پورے ملک میں اس کا جال بچھ چکا ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ جو لڑکیاں مخلوط ماحول میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور دین سے اس قدر بیگانہ ہیں کہ عصری تعلیم کے اعتبار سے تو انہوں نے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں، لیکن ناظرہ قرآن بھی نہیں پڑھ سکتیں اور ضروری مسائل سے بھی نابلد ہیں، ان کی بھی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت ضروری ہے۔

اس وقت ہمار ملک میں مسلمان لڑکیوں کے دینی تعلیم سے نابلد ہونے کی وجہ سے نہایت منفی اثر پڑ رہا ہے، خاندانی تعلقات میں دراڑ آ رہی ہے، بے حیائی روز افزوں ہے، رشتوں میں بے اعتمادیاں بڑھ رہی ہیں، اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مسلمان لڑکیوں کے غیر مسلم لڑکوں کے ساتھ جانے اور شادی بیاہ کرنے کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں، بڑے شہروں میں یہ چیز ایک وبا کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، اس کا بنیادی سبب دو ہے: دینی تعلیم و تربیت سے ان کی محرومی اور لڑکیوں کے لئے جداگانہ تعلیمی اداروں کا فقدان، پہلے سبب کا تعلق بنیادی طور پر والدین سے ہے، والدین کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت کا نظم کریں، ان کی نگرانی کرتے رہیں، عفت و پاکدامنی کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات سے انہیں آراستہ کریں، انہیں آخرت کے عذاب سے ڈرائیں، انہیں سمجھائیں کہ غیر محرم لڑکوں کی قربت ان کے لئے تباہی کا باعث ہے، اوباش لڑکے بھولی بھالی لڑکیوں کا استحصال کرتے ہیں اور جب لڑکی اپنے سماج سے کٹ جاتی ہے تو ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتی ہے جسے کوئی بھی لوٹ لیتا ہے۔

اس وقت موسم گرما کی تعطیل عصری درسگاہوں میں زیر تعلیم لڑکیوں کی تربیت کے لئے ایک بہترین موقع ہے، جو ادارے اور تنظیمیں گرمائی کورس کا اہتمام کرتی ہیں، انہیں چاہئے کہ وہ چالیس سے پچاس دنوں کا کورس خاص طور پر ہائی اسکول اور کالج کی لڑکیوں کے لئے شروع کریں اور اس میں ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت پر خوب توجہ دیں؛ کیوں کہ جب تک ہم دل و دماغ کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہوں گے، بے راہ روی کو روکنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتے، والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس موقعہ کو گھر میں بھی لڑکیوں کی تربیت کے لئے استعمال کریں اور ایسے جز وقتی درسگاہوں سے بھی فائدہ اٹھائیں۔

اسی طرح جو لوگ تعلیمی ادارے قائم کرتے ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ مخلوط تعلیم کی بجائے پرائمری سے اوپر جداگانہ تعلیم کا نظم کریں، اس سے انشاء اللہ تعلیم گاہوں کے معاشی مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اخلاقی اعتبار سے یہ بہت ہی مفید قدم ہوگا، ہر مسلمان کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ برائیوں کے تذکرہ سے برائیاں ختم نہیں ہوتیں، برائیوں کو دور کرنے کی تدبیر اختیار کرنا اور اس کے لئے مل جل کر کوشش کرنا بھی ضروری ہے!

کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ؟

(علماء و اہل دین کے زیر نگرانی عصری نظامِ تعلیم کی ضرورت)

اس حقیر کو مئی ۲۰۱۲ء کا آخری ہفتہ کشمیر میں گذارنے کا موقع ملا، کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ہندوستان کا تاج ہے، جو بھی نو وارد کشمیر کی وادی میں اترتا ہے، وہ بے حد فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے، خوبصورت طویل القامت پہاڑ اور اس کے اوپر برف کی چادریں، گویا کسی پری پیکر نے شیشہ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہو، دراز قد، سرو قامت چنار اور دیودار کے درخت، گویا سبز یونیفارم میں سنتریوں کی ایک فوج آپ کے سامنے صف بستہ کھڑی ہے اور زبان حال سے آپ کو خوش آمدید کہہ رہی ہے، پہاڑ کی چوٹیوں سے گرتے اور اچھلتے کودتے آبشار اور وادیوں میں مچلتی ہوئی لہریں، صاف و شفاف اور کچھ اس طرح نغمہ ریز کہ جیسے آپ کو اپنے حسن و جمال کا قصیدہ سنا رہی ہوں، میدانی علاقہ میں قدم رکھیں تو ایسے سبزہ زار گویا قدرت نے اپنے ہاتھوں سے سبز مخمل بچھا دیا ہو، جھیلیں ایسی پُر کیف کہ انسان نظارہ کرتا رہ جائے اور پارک ایسے خوبصورت، جاذب نظر اور دلفریب، جو آنکھوں کے لئے تر و تازگی کا باعث بھی ہیں اور مشام جان کو معطر بھی کرتے رہتے ہیں، غرض یہ دنیا کا ایک ایسا خطہ ہے جو جمالِ فطرت کا شاہکار اور نمونہ ہے اور یہ حسن نظر پہاڑوں، وادیوں، درختوں اور سبزہ زاروں ہی تک محدود نہیں؛ بلکہ کشمیر کے لوگ بھی خوش شکل ہونے کے اعتبار سے پوری دنیا میں شہرہ رکھتے ہیں، دراز قد و قامت، سرخ و سفید رنگ اور چہرے پر تر و تازگی، کشمیر میں ہر شخص کا یہی رنگ وروپ نظر آتا ہے، اسی لئے شاعر نے اس خطہ کے بارے میں کہا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

— یعنی اگر دنیا میں جنت موجود ہو تو وہ یہی خطہ ہے۔

بحیثیت مسلمان اس ریاست میں پہنچ کر مزید خوشی اس لئے ہوتی ہے کہ ہندوستان میں یہ واحد

ریاست ہے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور صرف اسی ایک ریاست کی سرکاری زبان اردو ہے، مسلم تہذیب وثقافت کے اثرات بھی یہاں بے حد نمایاں ہیں، قدم قدم پر مسجدیں ہیں، اللہ کے نیک بندوں کے مقابر ہیں، ڈاڑھی رکھنے کا اوسط بمقابلہ دوسرے علاقوں کے زیادہ ہے، نمازوں کے وقت ہر چہار طرف سے اذاں کی آواز گونجتی ہے، تجارت اور کاروبار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور شہر میں بسنے والے مسلمانوں کی معیشت بھی اچھی ہے، خاص کر جب جگموہن نے وہاں ظلم کے پہاڑ ڈھائے تو ایک طرف مسلمان نوجوانوں میں ہندوستان کے خلاف نفرت بڑھی، دوسری طرف پنڈتوں نے وہاں سے راہ فرار اختیار کی، جس کے نتیجے میں تجارت اور کاروبار پر مسلمان حاوی ہو گئے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اب ریاست میں امن امان بحال ہو رہا ہے، معمول کی زندگی لوٹ رہی ہے، تعلیمی اور معاشی سرگرمیاں بحال ہو چکی ہیں ؛ بلکہ ادھر کے چند سالوں میں ملک کے اعلیٰ ترین ''سیول سرویز'' کے امتحانات میں بھی کشمیری مسلمان اپنا جوہر دکھار ہے ہیں، ان تمام خوش آئند جہتوں کے ساتھ ساتھ ایک تکلیف دہ بات جو اس سفر میں دیکھنے اور سننے کو ملی، وہ یہ ہے کہ یہاں ارتداد کا فتنہ دبے پاؤں ایک کینسر کی طرح مسلم سماج میں نفوذ کرتا جار ہا ہے، ایک طرف قادیانیت کا فتنہ ہے، یہ فتنہ بہت قدیم ہے، مرزا غلام احمد قادیانی کا خاص رفیق حکیم نور الدین تھا، یہ شخص بڑا معقولی، اور منطقی تھا، جو مسلم دشمن فرماں روا مہاراجہ کشمیر کا خصوصی معالج تھا، مرزا صاحب اپنی جس تضاد بیانی کا جواب نہیں دے پاتے تھے، حکیم نور الدین اس کی تاویل کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ سخن سازی، حیلہ بازی اور بے جا تاویل وتوجیہ میں اس کو ید طولی حاصل تھا، اسی شخص نے سب سے پہلے کشمیر میں قادیانیت کا شجر خبیث لگایا، اور لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر اپنے مذہب کی تبلیغ کی، یہاں تک کہ وہاں حضرت عیسی علیہ السلام کی ایک فرضی قبر بھی تلاش کر لی، جس کی حقیقت سے علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ نے مقدمہ بھاول پور میں پردہ اٹھایا اور بتایا کہ اس قبر کے کتبہ میں لکھا ہوا تھا ''هذا قبر رسول رسول الله مسيح ابن مريم'' یعنی یہ اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ کے قاصد کی قبر ہے''، مگر قادیانیوں نے پہلے ''رسول'' یعنی ''قاصد'' کے لفظ کو حذف کر کے کتبہ کا مضمون یوں ظاہر کیا تھا کہ یہ حضرت عیسیٰ رسول اللہ کی قبر ہے۔ حالاں کہ حضرت عیسیٰ کی تو وفات ہی نہیں ہوئی، وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے، اور وہ دوبارہ قیامت کے قریب اتارے جائیں گے، غرض کہ قادیانیت کا فتنہ کشمیر

کے لئے ایک قدیم فتنہ ہے، جس نے کشمیری مسلمانوں کی جہالت و پسماندگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں اپنے بال و پر نکالے، علماء کی کاوشوں سے یہ بہت کمزور پڑ چکا تھا؛ لیکن افسوس کہ کشمیری مسلمان پچھلے بیس سالوں میں جن حالات سے گذرے، اور اس کے نتیجے میں وہ جس پریشان کن صورت حال سے دوچار ہوئے، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قادیانی دوبارہ سرگرم ہو چکے ہیں اور ناواقف مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

دوسرا فتنہ جو اس سے بڑھ کر ہے، وہ ہے عیسائیت کا فتنہ، گذشتہ بیس سالوں میں جو پُرتشدد تحریک برپا رہی، اس کے نتیجے میں ہزاروں عورتیں بیوہ ہوگئیں اور ہزارہا ہزار بچے یتیم ہوگئے، دوسری طرف تجارت ٹھپ پڑ گئی، کاروبار بند ہوگیا، لوگوں کو بنیادی ضروریات کے لئے محتاج ہوجانا پڑا، اس وقت سہارا دینے اور سر پر محبت کا ہاتھ رکھنے والے لوگ بھی باقی نہ رہے، عیسائی مشنریز — جس کا جال پورے کشمیر میں بچھا ہوا ہے اور مشنریز کے اسکول کشمیر میں بہت بڑے پیمانہ پر ہیں اور علماء دین سے لے کر سیاسی قائدین تک سب انہیں درسگاہوں کے پڑھے ہوئے ہیں — نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ مسلمانوں کو مرتد بنانے میں لگ گئے، چنانچہ کشمیر کی ۲۰۰۵ء کی مردم شماری کے مطابق مسلم اکثریت علاقوں میں پہلے کے مقابلہ عیسائیوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے، یہاں تک کہ بعض ائمہ مساجد کے گھر کے لوگ بھی ارتداد کا شکار ہوگئے ہیں اور یہ سب کچھ ایسی منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا کہ بھائی کو اپنی بہن، چچا کو اپنے بھتیجے، ماموں کو اپنے بھانجے یہاں تک کہ بعض اوقات ماں کو اپنے بچوں کے بارے میں بھی بھنک نہیں لگ سکی۔

افسوس کہ کشمیر کے مسلم سیاسی قائدین کو اس سے کوئی سروکار نہیں؛ البتہ اللہ کا شکر ہے کہ وہاں کے بعض علماء نے فتنۂ ارتداد کے مقابلہ کے لئے کمر ہمت کس لی ہے، وہ نہایت حکمت، بالغ نظری، بلند ہمتی اور غیرت ایمانی کے ساتھ اس کام کو کر رہے ہیں، اور مختلف دینی درسگاہیں باہمی منافست کے باوجود اس مہم میں دوش بدوش اور قدم بہ قدم ہو کر خدمت انجام دے رہی ہیں، انہوں نے تشدد کی بجائے نصح و محبت کا راستہ اختیار کیا ہے اور امید ہے کہ اگر مستقل مزاجی کے ساتھ وہ اس کام کو کرتے رہے تو نہ صرف ماضی قریب میں مرتد ہونے والے لوگ دامن اسلام میں واپس آجائیں گے؛ بلکہ جو لوگ پہلے سے عیسائی ہیں اور جن کے آباء واجداد یقیناً مسلمان رہے ہوں گے، وہ بھی ایمان کی طرف

واپس آجائیں گے۔

اس حقیر کو پوری وادی کشمیر کے منتخب علماء اور ذمہ دارانِ مدارس کے اجتماع سے بھی خطاب کا موقع ملا، ریاست کے دانشوران اور مذہبی تنظیموں کے ذمہ داروں سے بھی کچھ عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، سری نگر ہائی کوٹ کی بار کونسل نے اس حقیر کے اعزاز میں ایک بڑا پروگرام رکھا، جس میں وکلاء اور ججس کی بڑی تعداد شریک ہوئی، بار کونسل کا پروگرام تو مسلم پرسنل لا پر تھا؛ لیکن اس کے علاوہ جتنے اجتماعات ہوئے، ان میں فتنہ ارتداد پر توجہ دلائی گئی اور خاص طور پر تین باتیں کہی گئیں:

اول یہ کہ جب باہر کا دشمن سامنے ہو تو اندرونی اختلافات میں اتنا غلو نہ ہوجانا چاہئے کہ اصل مسئلہ سے توجہ ہٹ جائے، یہ صہیونی، صلیبی اور زعفرانی طاقتوں کی سازش ہے کہ مسلمان آپسی اختلافات میں اس طرح الجھ جائیں کہ اپنے حقیقی مسائل کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ جائے، افسوس کہ بعض لوگوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ اپنی پسند کا مسلک اختیار کرلیں؛ بلکہ وہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنے لگے، لوگوں کو اس کی دعوت دینے لگے، یہاں تک کہ دوسروں کو کافر ومشرک کہنے میں بھی انہیں اللہ کا خوف نہیں رہا؛ حالاں کہ حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کے بقول مسلک قابل ترجیح ہے نہ کہ قابل تبلیغ، تبلیغ تو صرف دین کی ہے، اس حقیقت کے نظر سے اوجھل ہوجانے کی وجہ سے علماء کے درمیان عمل اور ردعمل کا ایسا سلسلہ چل پڑا ہے کہ گویا یہی دین کی سب سے اہم اور ضروری خدمت ہے۔

دوسرا مسئلہ باخبری کے فقدان کا ہے، صورت حال یہ ہے کہ شہر کے لوگ اہل دیہات سے بے خبر ہیں، شہر کے ایک محلہ میں کیا واقعات پیش آرہے ہیں۔ دوسرے محلہ کے لوگوں کو اس کی خبر نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے پڑوس میں عیسائی اور قادیانی آپ کے بھائیوں کا ایمان لوٹنے پر کمربستہ ہوتے ہیں؛ لیکن آپ کو اس کی خبر نہیں ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کو ایک جسم کی طرح قرار دیا ہے، جس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایک عضو کی تکلیف پورے جسم کو بے چین کردیتی ہے اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر تلوے میں بھی کانٹا چبھے تو دماغ کو خبر ہوجاتی ہے اور دماغ پورے جسم کو مطلع کردیتا ہے، امت کا نظام زندگی ایسا ہی ہونا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے باخبر رہیں، کفر وارتداد اور فسق وفجور کا کوئی کانٹا کہیں چبھے، پوری امت اس کے لئے بے قرار ہوجائے۔

تیسرا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ علماء اور دیندار طبقہ نے عصری تعلیم کو پوری طرح یا تو غیر مسلم تنظیموں کے حوالے کر دیا ہے یا ایسے مسلمانوں کے، جن کے لئے تعلیم ایک تجارت ہے نہ کہ خدمت، جو اسلام کا نام صرف اس لئے لیتے ہیں کہ مسلمان بچے ان کے اسکول میں آئیں، اس سے آگے ان کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بچوں کے یونیفارم، ان کے ثقافتی پروگرام، ان کی اخلاقیات اور ان کے معمولات پوری طرح مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے اور مغربی دماغ کے سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں۔

یہ وقت کی ایک بڑی ضرورت ہے کہ علماء اور دین دار لوگ عصری تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لیں، وہ ان کے لئے ایسا نصاب بنائیں جس میں اسلامی تعلیمات رچ بس جائیں، ایسا تربیتی نظام وضع کیا جائے، جس میں ان کی فکر کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ معیار تعلیم میں سمجھوتہ نہ ہو، بہتر سے بہتر اساتذہ ہوں، انگریزی زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کیا جائے اور یہ مسلم اسکول اس کی تعلیم میں عیسائی مشنریز کے اسکولوں کا ہم عنان بن جائے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں دو بڑی تحریکیں شروع ہوئیں، ایک کا مرکز دیوبند بنا اور دوسرے کا علی گڑھ، پہلی تحریک نے اپنے لئے دینی تعلیم کو ہدف بنایا اور تحریک مدارس کی بنیاد رکھی، اور دوسری تحریک نے مسلمانوں کے لئے عصری تعلیم کے فروغ دینے کو بنیادی ایجنڈا بنایا، اس طرح دونوں تحریکوں نے اپنے اپنے مقصد کے اعتبار سے غیر معمولی نتائج حاصل کئے، آج مسلمانوں میں دین کا بقاء تحریک مدارس کا رہین منت ہے اور عصری تعلیم کی طرف جو کچھ توجہ ہے وہ علی گڑھ تحریک کا ثمرہ ہے؛ لیکن شاید اس وقت ایک تاریخی بھول ہوئی کہ علماء نے عصری تعلیم کے نظام کو مکمل طور پر ان لوگوں کے حوالہ کر دیا، جو دین سے غافل ہی نہیں؛ بلکہ اس کے باغی بھی تھے، دوسری طرف جن لوگوں نے عصری تعلیم کو اپنی محنت کا میدان بنایا، وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یورپ سے آنے والے علوم وفنون یقیناً قابل قدر ہیں؛ لیکن یوروپ سے آنے والی فکر و ثقافت قند و نبات کے درمیان چھپا ہوا زہر ہے، مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس زہر سے بچتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے علوم وفنون سے آراستہ کریں، افسوس کہ یہ غلطی مسلسل دہرائی جاتی رہی ہے اور اب بھی دُہرائی جا رہی ہے، مگر وقت آگیا ہے کہ اس غلطی کو درست کیا جائے، یہ بات تو ہرگز درست نہیں ہوگی کہ دینی مدارس عصری تعلیم کے ادارے بنادئے جائیں؛ کیوں کہ یہ امت کی شہ رگ ہیں اور انہیں کے ذریعہ دین کے تمام شعبوں کو

غذا ملتی ہے؛ لیکن وقت کی ضرورت ہے کہ علماء اور دین دار طبقہ آگے بڑھ کر عصری تعلیم کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لے، اسے اسلامی رنگ میں رنگ دے، اس کا اسلامائزیشن کرے اور اگلے دس بیس سالوں میں بڑی تعداد میں ایسے افراد تیار ہوں، جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی سوچ اور اسلام شناخت لے کر داخل ہوں، ورنہ وہی ہوگا جو اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

میں نے سمجھا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلائے گا الحاد بھی ساتھ؟

بس ایک سخن بندۂ عاجز کی رہے یاد!

(نصاب تعلیم میں اخلاقیات کی ضرورت)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن اوصاف و امتیازات سے نوازا ہے، ان میں دو باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ایک: علم، دوسرے: اخلاق، علم کا تعلق دماغ سے ہے اور اخلاق کا تعلق دل سے، علم کے معنی جاننے کے ہیں، یہ جاننا کبھی اپنے آپ ہوتا ہے، اس کے لئے نہ واسطے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ محنت کی، جیسے ایک شخص کے سر میں درد ہو، اسے اپنے آپ اس تکلیف کا ادراک ہوجاتا ہے، کبھی علم کسی واسطہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے؛ لیکن اس میں انسان کو محنت کرنی نہیں پڑتی، جیسے صبح کا سورج طلوع ہوا، سنہری دھوپ کائنات کے نشیب و فراز پر چھاگئی، اور ہر دیکھنے والے نے جان لیا کہ یہ دن کا وقت ہے، کسی جانے پہچانے شخص کو دیکھا اور فوراً معلوم ہوگیا کہ یہ فلاں شخص ہے، یہ بھی علم کے حاصل ہونے ہی کی صورتیں ہیں؛ لیکن ان میں کوئی محنت ہے نہ مشقت اور نہ فکری تگ و دو کی ضرورت ہے، اس لئے یہ علم اور واقفیت تو ہے؛ لیکن اسے تعلیم نہیں کہا جاتا۔

علم کی ایک اور صورت یہ ہے کہ انسان کو کسی واسطہ سے بات معلوم ہو، اور اس بات تک رسائی کے لئے محنت بھی کرنی پڑے، اس کو ''تعلیم و تعلّم'' کہتے ہیں، یہ صرف جاننا نہیں ہے؛ بلکہ جانکاری حاصل کرنا ہے، جو باتیں معلوم ہیں، ان کے ذریعہ نامعلوم باتوں تک اور جانی ہوئی حقیقتوں کے ذریعے انجانی حقیقتوں تک پہنچنا علم کا وہ اعلیٰ مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمایا ہے؛ اسی لئے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو ان کے لئے تعلیم کا انتظام کیا گیا اور خود حق تعالیٰ نے ان کو تعلیم دی ﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ: ۳۱) تعلیم ایسی چیز ہے، جس کے ذریعہ دور رس انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے اور انسانی تاریخ میں ہمیشہ انسان کے اندر فکری انقلاب لانے کے لئے اسی ہتھیار کا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

عربی زبان میں ''خلق'' کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، انسان جب پیدا ہوتا ہے، تو جہاں وہ

ایک ظاہری شکل وصورت لے کرآتا ہے، وہیں کچھ باطنی صفات بھی اس کے اندر موجود ہوتی ہیں، ظاہری شکل وصورت بالکل واضح ہوتی ہے، اس کا رنگ وروپ، ناک نقشہ، چہرہ مہرہ اور ہاتھ پاؤں، وغیرہ، جنہیں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے اور اگر ان میں کوئی کمی محسوس کی جائے تو ڈاکٹروں کے ذریعہ علاج بھی ہوتا ہے، اس کو ''خَلق'' یعنی جسمانی ہیت وشکل کہتے ہیں، انسان کی باطنی اور اندرونی صفات آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی ہیں، تواضع یا کبر، غصہ یا بردباری، محبت یا نفرت، ایثار یا خودغرضی وغیرہ، ان کو ''خُلق''، یعنی اخلاق کہتے ہیں، جیسے جسم کی ظاہری بیماریوں کا علاج ہوا کرتا ہے، اسی طرح اخلاقی بیماریاں بھی لا علاج مرض نہیں ہیں، یہ بھی قابلِ علاج ہیں، اللہ کے پیغمبروں اور رسولوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اخلاقی امراض اور روحانی بیماریوں کا علاج ہو سکے۔

اخلاق کو سنوارنے اور قلب وروح کو بیماریوں سے شفایاب کرنے کا ایک اہم ترین ذریعہ ''تعلیم'' بھی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تزکیہ اخلاق، آیاتِ قرآنی کی تلاوت اور کتاب وحکمت کی تعلیم کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے ذکر فرمایا ہے ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)، —انسان کے اندر خیر اور شر دونوں کی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، بھلائی کا جذبہ بھی اس کے اندر پنہاں ہے اور برائی کی خواہش بھی اس کے اندر کروٹ لیتی رہتی ہے، انسان کی پوری زندگی اسی کشمکش میں گذرتی ہے اور وہ اس امتحان میں جس درجہ کامیابی حاصل کرتا ہے، یا ناکامی سے دوچار ہوتا ہے، اسی لحاظ سے وہ آخرت میں جزا یا سزا کا مستحق ہوگا۔

تعلیم انسان کو نیکی اور بدی کی اس کشمکش میں نیکی پر راغب اور بدی پر فتح یاب کرتی ہے، پھر جب انسان کے اندر اچھے اخلاق پیدا ہوجاتے ہیں تو وہ اپنے علم کو بہتر طور پر استعمال کرتا ہے، پس علم کے ساتھ اخلاق ضروری ہے، اچھی تعلیم انسان کو اچھے اخلاق کی طرف لے جاتی ہے اور اخلاق کی وجہ سے انسان کا علم حقیقی معنوں میں نافع بنتا ہے، جس کی رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی ہے، **''اللهم أسئلک علما نافعا''** (**ابن ماجه: كتاب إقامة الصلاة، باب ما يقال بعد التسليم، حديث نمبر: ۹۲۵**) اگر علم کے ساتھ اخلاق نہ ہوتو اکثر اوقات اچھا سے اچھا علم انسان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے انسانیت کے لئے نقصان اور ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے، اس کی واضح مثال جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ وجود میں آنے والی چیزیں ہیں، انسان نے ایٹم کو دریافت کیا اور ایٹمی طاقت تک رسائی

حاصل کی، اگر انسان اپنی صلاحیت کا استعمال اچھے مقاصد کے لئے کرتا تو آج پوری دنیا میں شہر سے لے کر دیہات تک کوئی گھر روشنی سے محروم نہیں ہوتا، ہر گھر میں بجلی کی وافر سہولت مہیا ہوتی؛ لیکن ہوا یہ کہ انسان نے اپنی صلاحیت کو ہلاکت خیز اور انسانیت سوز ہتھیارروں کے لئے استعمال کیا اور دنیا میں ناگاسا کی اور ہیروشیما جیسے حادثات پیش آئے کہ انسان اس پر جس قدر آنسو بہائے کم ہے، ذرائعِ ابلاغ میں غیر معمولی ترقی ہوئی، ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل نے انسان کے لئے یہ ممکن بنا دیا کہ وہ لمحوں میں اپنی بات ہزاروں میل دور تک پہنچا دے، وہاں کے حالات کو سر کی آنکھوں سے دیکھے، ان ذرائع کو بہترین دینی اور دنیوی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، سماج تک اخلاق ومحبت کا پیغام پہنچایا جاسکتا ہے، تعلیم کو عام کیا جاسکتا ہے، دور دراز علاقوں سے معلومات کا تبادلہ ہوسکتا ہے، تجارت اور کاروبار کو فروغ دیا جاسکتا ہے، مظلوموں تک اپنی مدد پہنچائی جاسکتی ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ ان مقاصد کے لئے بھی ان وسائل کا استعمال کیا جارہا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معاشرہ میں بے حیائی اور عریانیت کو جو فروغ حاصل ہوا ہے، جرائم کی جو کثرت ہوئی ہے، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے کی جو کوشش ہوئی ہے، ان میں بھی ان ذرائعِ ابلاغ کا بہت بڑا رول ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جیسے جیسے تعلیم کی روشنی پہنچتی، ویسے ویسے جرائم کم ہوتے اور برائیاں مٹتی چلی جاتیں؛ لیکن عملی صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے، حقیقت یہ ہے کہ تعلیم یافتہ مجرمین کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے، ۱۶/دسمبر ۲۰۱۲ء کو دھلی میں زنا بالجبر کا جو تکلیف دہ واقعہ پیش آیا، اس میں جرم کا ارتکاب کرنے والے کالج کے طلبہ ہی تھے، اس کے بعد سے آئے دن اس طرح کے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں، زیادہ تر واقعات میں ان نوجوانوں کا نام آتا ہے، جو اسکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں، امریکہ دنیا کا سپر پاور ہے اور نہ صرف دفاعی قوت اور معاشی بالادستی میں پوری دنیا کے لئے نمونہ تقلید بنا ہوا ہے؛ بلکہ جدید ٹیکنالوجی کی ایجاد میں بھی اسی کی برتری تسلیم شدہ ہے، تعلیمی اعتبار سے بھی امریکہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے؛ یہاں تک کہ ہمارے ملک میں جس نئے نظامِ تعلیم کو فروغ دیا جارہا ہے، اسی میں بھی امریکہ کے نقوشِ قدم کو سامنے رکھا گیا ہے۔

لیکن امریکہ میں طلبہ وطالبات کے اندر جرائم کی شرح میں جو روز افزوں اضافہ ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نیشنل کرائم سروے ۲۰۱۲ء کی رپورٹ کے مطابق صرف ایک سال

میں جنسی تشدد اور ہراسانی کے واقعات چھ لاکھ باون ہزار آٹھ سو، چوری کے واقعات تین لاکھ اکہتر ہزار تین سو، تشدد کے واقعات ایک لاکھ سینتیس ہزار تین سو ہیں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنسی تشدد اور ہراسانی کے واقعات میں دو لاکھ بہتر ہزار تین سو معاملات لڑکیوں کی طرف سے پیش آئے ہیں اور یہ اعداد وشماران طلبہ وطالبات کے ہیں، جو بارہ سے اٹھارہ سال کے درمیان ہیں، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں جرائم کی شرح کس رفتار سے بڑھ رہی ہے، ہندوستان میں غالباً اسکولوں اور یونیورسیٹیوں میں جرائم کی سروے رپورٹ موجود نہیں ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جرائم کی رفتار اس سے زیادہ تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے، جو رفتار شرحِ تعلیم میں اضافہ کی ہے، مثلاً ۱۹۵۲ میں قتل کے نو ہزار آٹھ سو دو اور اغواء کے پانچ ہزار دو سو اکسٹھ واقعات پیش آئے اور ۲۰۰۶ء میں قتل کے بتیس ہزار چار سو اکیاسی اور اغواء کے تیس ہزار نو سو اکیانوے واقعات پیش آئے، کم وبیش یہی حال دوسرے جرائم کا ہے، یعنی ملک میں تعلیم کے بڑھنے کی وجہ سے جرائم کم ہونے چاہئیں؛ لیکن جرائم میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے؛ بلکہ بعض برائیاں تو ایسی ہیں جو تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی میں پائی جاتی ہیں، جیسے کرپشن، کرپشن کے نوے فیصد واقعات اعلیٰ سیاسی قائدین، اونچے درجہ کے سرکاری و پرائیوٹ عہدیداران اور صنعت کاروں میں پائے جاتے ہیں، جنھوں نے ملک کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے، شاید انگریز بھی اس ملک سے اتنی دولت سمیٹ کر نہیں لے گئے تھے جتنی رشوت خور سرکاری عہدیداروں نے لوٹ لوٹ کر اپنی تجوریوں اور سوئز بنکوں میں محفوظ کر رکھی ہے۔

یہ بیماری اس قدر روز افروں ہے کہ جن شعبوں کو خدمتِ خلق کا شعبہ سمجھا جاتا ہے، ان میں بھی اب یہ بیماری سرایت کر چکی ہے، اساتذہ امتحان میں پیسہ لے کر نمبر دیتے ہیں، تعلیمی ماہرین رشوت لے کر اساتذہ کی تقرری کراتے ہیں، ڈاکٹر مریض سے فیس لینے کے علاوہ فارمیسی سے، پیتھالوجسٹ سے اور ہسپتالوں سے کمیشن وصول کرتے ہیں، بلاوجہ ٹیسٹ لکھتے ہیں، بلا سبب دوائیں تجویز کرتے ہیں اور بلاضرورت آپریشن کا کیس بناتے ہیں، انجینئرس تعمیری میٹریل کے بارے میں غلط رپورٹ دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں پلوں اور اور عمارتوں کے گرنے کے حادثات پیش آتے رہتے ہیں، یہ سب جاہل وناخواندہ لوگوں کی طرف سے نہیں؛ بلکہ پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے پیش آتا ہے، پس یہ حقیقت ہے کہ کتنا بھی مفید علم ہو، اگر اخلاق سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے تو وہ نافع

کے بجائے مضر اور مفید کے بجائے نقصان دہ بن جاتا ہے۔

اسی لئے اسلام کا تصور یہ ہے کہ صرف تعلیم کافی نہیں ہے؛ بلکہ تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو اس میں فرمایا گیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ﴾ (العلق:۱) یعنی اپنے پروردگار کے نام سے پڑھئے، گویا پڑھنا کافی نہیں ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ پڑھائی اللہ کے نام سے جڑی ہوئی ہو؛ کیوں کہ جب پڑھنے والا اپنی تعلیم کو اللہ کے نام سے جوڑے رکھے گا تو خشیت پیدا ہوگی اور وہ اخلاق سے آراستہ ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے علم کی دعاء اس طرح فرمائی ہے:

”اللهم أغنني بالعلم، وزيني بالحلم، وأكرمني بالتقوى، وجملني بالعافية“ (**کنز العمال: ۲/ ۱۸۵، حدیث نمبر: ۳۶۶۳**)

اے اللہ! مجھے علم کی دولت عطا فرمائیے، حلم وبردباری سے آراستہ فرمائیے، تقوی کے ذریعہ عزت عطا کیجئے اور عافیت کے ذریعہ میرے حالات کو بہتر رکھئے۔

اس دعا میں آپ ﷺ نے علم کی دعاء کے ساتھ ساتھ حلم وبردباری کا ذکر فرمایا ہے، جو بہتر اخلاق کی بنیاد اور اساس ہے، آپ ﷺ نے لڑکیوں کو تعلیم دینے کے بارے میں فرمایا کہ باپ اپنی بیٹی کو تعلیم دے اور بہتر تعلیم دے اور ادب واخلاق سکھائے اور بہتر ادب واخلاق سکھائے: **”علّمها فأحسن تعليمها و ادّبها فأحسن تأديبها“** (**بخاری: کتاب النکاح، باب اتخاذ السراری، حدیث نمبر: ۵۰۸۳**) غرض کہ رسول اللہ ﷺ نے حصول علم کو کافی نہیں سمجھا؛ بلکہ اس کے ساتھ اخلاق کو بھی ضروری قرار دیا؛ کیوں کہ جب علم کا رشتہ اخلاق سے ٹوٹ جاتا ہے، تو علم جیسی قیمتی شئی کا استعمال صلاح کے بجائے فساد اور بناؤ کے بجائے بگاڑ کے لئے ہونے لگتا ہے۔

یہ بات یقیناً باعث مسرت ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کی طرف توجہ بڑھ رہی ہے، قانونی طور پر بھی تعلیم کو ہر بچہ کا بنیادی حق تسلیم کرلیا گیا ہے؛ تعلیمی ترقی کی وجہ سے ہمارے ملک کے ہنرمندوں کو پوری دنیا خراجِ تحسین پیش کرتی ہے؛ لیکن یہ بات اسی قدر افسوسناک ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم اخلاقی اقدار سے خالی ہوتی جارہی ہے، اس پر حکومت کو بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے، پرائیوٹ تعلیمی اداروں کو بھی اور خاص کر مسلمانوں کے زیر انتظام اداروں کو؛ کہ وہ تعلیمی ترقی کے ساتھ

ساتھ اپنے اداروں میں اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کی طرف توجہ دیں، بقول شاعرِ حقیقت شناس اکبر الہ آبادی:

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں جھولو
ممکن ہے فضاؤں میں اڑو، عرش کو چھوؤ
بس ایک سخن بندۂ عاجز کی رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ملالہ ہی پر ملال کیوں؟

(اسلام عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں)

پاکستان کے صوبہ پختونخواہ میں افغانستان و پاکستان کی سرحد پر ضلع سوات واقع ہے، وادیٔ سوات کا - جو سیاحتی مقام کے اعتبار سے عالمی شہرہ رکھتی ہے - کا ایک خوبصورت شہر ''مینگورہ'' ہے، یہاں کے مشہور قبیلہ یوسف زئی کی ایک اہم شخصیت ضیاء الدین ہیں، جو متعدد مقامات پر اسکول چلاتے ہیں اور ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کی شناخت ہے، ان کے گھر ١٤ر جولائی ١٩٩٧ء کو ایک لڑکی پیدا ہوئی، جو ملاّلہ یوسف زئی کے نام سے آج شہرت کے افق پر چھائی ہوئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستانی طالبان نے اس علاقہ پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد لڑکیوں کے اسکول بند کرادیئے اور بہت سے اسکولوں کو نذر آتش کردیا، ملالہ خود بھی ایک اسکول کی طالبہ تھی، اس نے طالبان کے اس طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا، اور علاقہ کے اندرونی حالات کو ٢٠٠٩ء سے ڈائری کی شکل میں لکھنا شروع کیا، جسے بی بی سی ''گل مکئی'' کے فرضی نام سے نشر کیا کرتی تھی، ٩ر اکتوبر ٢٠١٢ء کو طالبان نے ملالہ پر قاتلانہ حملہ کیا، جب وہ بس کے ذریعہ اسکول سے گھر واپس ہورہی تھی، اس حملہ میں اس کے سر اور گردن میں کئی گولیاں پیوست ہوگئیں، علاج کا ہنگامی مرحلہ پاکستان میں تمام ہونے کے بعد اسے برمنگھم (برطانیہ) کے کوئن ایلزبتھ ہاسپیٹل میں منتقل کردیا گیا، جہاں اب وہ تیزی کے ساتھ صحت یاب ہورہی ہے۔

ملالہ یوسف زئی کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ یقیناً قابلِ افسوس اور لائق مذمت ہے؛ چنانچہ پاکستان کی حکومت، اپوزیشن اور وہاں کے سیاسی و مذہبی قائدین کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، یورپ کے دوسرے ممالک یہاں تک کہ اقوام متحدہ سبھی نے اس واقعہ کی مذمت کی ہے اور خود ملالہ پر ایوارڈز اور انعامات کی تو گویا بارش ہورہی ہے، وادیٔ سوات کے ایک اسکول کو اسی کے نام سے موسوم کردیا گیا ہے اور حکومت پاکستان نے وہاں کے سب سے بڑے سیویلین اعزاز ''ستارۂ شجاعت'' سے نوازے جانے کا بھی

اعلان کیا ہے، حالیہ کئی دہائیوں میں غالباً ملالہ پہلی مسلمان لڑکی ہے، جس کے درد کو مغرب نے بھی محسوس کیا ہے اور جس کی مذمت کرنے میں امریکہ و یورپ نہ صرف شریک ہیں؛ بلکہ آگے آگے ہیں۔

ملالہ پر حملہ کے اس واقعہ کو ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے؛ لیکن اس معاملہ میں میڈیا کی فیاضی اس قدر اتھاہ ہے کہ اب تک یہ موضوع الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں شاہ سرخی بنا ہوا ہے، دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمان خواتین ایسی مصیبتوں سے دوچار کی جاتی ہیں کہ جن کو الفاظ کا پیکر نہیں دیا جا سکتا؛ لیکن ان کے غم میں میڈیا کی آنکھ ذرا بھی نم نہیں ہو پاتی؛ مگر ملالہ کے واقعہ پر اسے اتنا ملال ہے کہ آنسوؤں کا سیل رواں جاری ہے اور یہ سیلاب تھامے نہیں تھمتا۔

اس واقعہ کے پس منظر میں مختلف جہتیں قابلِ توجہ ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ اس واقعہ کے ذریعہ غیر مسلم بھائیوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کا مخالف ہے، اس طرح بیک وقت دوہرا تصور ابھرتا ہے، ایک یہ کہ اسلام علم کا دشمن ہے اور دوسرا یہ کہ اسلام عورتوں کا دشمن ہے؛ حالاں کہ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس میں دو بار تعلیم کا اور دو وسائل تعلیم کا ذکر موجود ہے، ایک وسیلہ قراءت یعنی ''پڑھنا'' جس کا تعلق زبان سے ہے، اور دوسرا وسیلہ قلم، ہر زمانہ میں تعلیم و تعلم کے بنیادی ذرائع یہی رہے ہیں۔

اسلام نے طبقہ و خاندان اور مرد و عورت کی تفریق کے بغیر ہر ایک کو تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''**طلب العلم فریضة علی کل مسلم**'' (**سنن ابن ماجة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم**، حدیث نمبر: ۲۲۴) یعنی ہر مسلمان پر خواہ وہ مرد ہو یا عورت، علم کا حاصل کرنا فرض ہے، یہ بلا امتیاز مرد و عورت پر ضروری حد تک لازمی تعلیم کا تصور ہے، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، اسلام نے مردوں اور عورتوں کے احکام میں ان کی فطری صلاحیتوں اور صنفی ضرورتوں کے لحاظ سے فرق ضرور کیا ہے؛ لیکن وہ کچھ مسائل کی حد تک ہے، جن کی صراحت قرآن و حدیث میں موجود ہے، بقیہ احکام میں مرد و عورت مساوی ہیں، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصول بیان فرما دیا ہے: ''**إنما النساء شقائق الرجال**'' (**سنن أبي داؤد، کتاب الطهارة، باب في الرجل یجد البلة في منامه**، حدیث نمبر: ۲۳۶)، یعنی مرد و عورت دونوں مل کر گویا ایک وحدت ہیں؛ لہٰذا ان دونوں کے لئے احکام بھی یکساں ہوں گے، تعلیم بھی ان امور میں

ہے، جن میں شریعت نے بنیادی طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے؛ البتہ شریعت میں پردہ اور مرد وعورت کے اختلاط کے جو احکام ہیں، ان کی رعایت ضروری ہے۔

حالاں کہ تعلیم کی عمومی ترغیب کافی تھی اور اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے؛ لیکن چوں کہ قدیم زمانہ میں تعلیم کی طرف سے بڑی غفلت تھی اور عورتوں کی تعلیم کو تو بالکل ہی بے فائدہ تصور کیا جاتا تھا؛ اس لئے خاص طور پر آپ نے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی، آپ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے بیٹی دی، وہ اس کی تربیت کرے، اسے بہتر تعلیم دلائے، اللہ کی جو نعمتیں اسے میسر ہیں، اسے لڑکی پر فراخدلی کے ساتھ خرچ کرے، تو یہ اس کے حق میں جہنم سے ڈھال بن جائے گی: "**من كانت له ابنة فأدبها وعلمها فأحسن تعليمها وأوسع عليها من نعم الله التي أسبغ عليه كانت له منعة وسترة من النار**" (**المعجم الكبير**، حدیث نمبر: ۱۰۴۴۷) یہاں تک کہ باندیاں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھی جاتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی تعلیم دینے اور ان کی تربیت کرنے کا حکم فرمایا: "... **ورجل كانت عنده أمة يطأها فأدبها فأحسن تأديبها وعلمها فأحسن تعليمها الخ**" (**صحيح البخاري، عن أبي بردة، كتاب العلم**، حدیث نمبر: ۹۷)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ہفتہ میں ایک دن مخصوص فرما دیا تھا، (دیکھئے: **صحيح البخاري، كتاب العلم، باب عظة الإمام النساء**) گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے Weeken class کا تصور دیا، جو اُس زمانہ کی تعلیمی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے کافی تھا، مشہور محدث وفقیہ علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ جو مسائل خواتین سے متعلق ہیں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہر عورت پر فرض ہے: "**وفرض على كل امرأة التفقه فيكل ما يخصها كما ذلك للرجل**" (**الإحكام في أصول الأحكام**: ۳/ ۳۷۴) اس لئے یہ تصور بالکل غلط ہے کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کا مخالف ہے؛ بلکہ تعلیم کے بعض شعبے تو عورتوں کے لئے از حد ضروری ہیں، اگر خاتون ڈاکٹر موجود نہ ہو تو عورتیں مردوں سے علاج کرانے پر مجبور ہوں گی، اور جسم کے قابل ستر حصے بھی ان کے سامنے کھولنے پڑیں گے، جو قطعاً شریعت کے مزاج کے مغایر ہے، لڑکیوں کے تعلیمی اداروں کے لئے خاتون معلمات کی ضرورت ہوتی ہے، مالیاتی اداروں میں خواتین کے لئے الگ کاؤنٹر رکھا جانا مناسب ہے، اس کے لئے ایسی خواتین کی ضرورت ہوگی، جنہوں نے معاشیات کو پڑھا ہو، وغیر ذلک؛

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ چوں کہ شریعت اسلامی میں مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط کی ممانعت ہے؛ اس لئے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق تعلیم خواتین کے لئے اسلام کی نظر میں زیادہ ضروری ہے؛ تا کہ عورتوں کو اجنبی مردوں سے اختلاط کی ضرورت نہ پڑے۔

اس واقعہ میں دوسری قابل غور جہت یہ ہے کہ شریعت نے جہاں انسانی زندگی کے لئے قوانین دیئے ہیں، وہیں قوانین کی تنفیذ کا طریقہ بھی بتایا ہے، طریقۂ تنفیذ کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ شریعت کے کسی قانون کو بہ جبر نافذ کرنے کا حق یا تو نابالغ بچوں اور بچیوں پر ان کے اولیاء کو ہے، یا عام لوگوں پر حکومت کو، ہر شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اگر وہ کسی خلاف شریعت کام کو دیکھے تو لاٹھی لے کر پہنچ جائے، نیز خود حکومت کے لئے بھی سزا کی حدیں مقرر ہیں، ایک مسلم حکومت بھی اپنے مسلمان شہری کے لئے سزائے موت دینے کا حکم اسی وقت دے سکتی ہے، جبکہ اس نے قصداً کسی کو قتل کر دیا ہو، یا شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنی رضامندی سے زنا کا ارتکاب کیا ہو، یا بغاوت اور رہزنی کا مجرم ہو، اور یہ جرائم شرعی اصولوں کے مطابق عدالت کے پاس ثابت ہو چکے ہوں، اگر کہیں مخلوط تعلیم ہوتی ہو یا لباس میں شرعی اصولوں کا لحاظ نہ کیا جاتا ہو، تو اس کی وجہ سے اسکول جلا ڈالنے یا کسی طالبہ کو مار ڈالنے کی اجازت نہیں ہوسکتی، جو لوگ صدق دل سے اس کو روکنا چاہتے ہوں، ان کے لئے ایک ہی راستہ ہے، اور وہ ہے دعوت وتبلیغ، حتی الامکان انسان اس کے لئے کوشش کرے اور اگر اس کی کوشش کارگر نہ ہو، تو اللہ کے حوالہ کر دے، قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا زمین میں فساد برپا کرنا ہے قطعاً جائز نہیں۔

میڈیا کی اطلاع کے مطابق طالبان نے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول کی ہے؛ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ واقعی یہ طالبان کی حرکت ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور ڈرون حملوں کی وجہ سے پاکستان میں جو مخالف امریکہ فضا بن گئی تھی، اس کو تبدیل کرنے کے لئے ایک منصوبہ کے ساتھ یہ واقعہ وجود میں لایا گیا ہے؛ لیکن بہرحال، یہ بات ضروری ہے کہ دینی جماعتیں اور تنظیمیں شریعت کے مقاصد اور اس کی روح کو پیش نظر رکھیں، اسی کی ایک مثال مصر کی صورت حال ہے، وہاں کئی دہائیوں کے جبر و استبداد کے بعد ابھی جمہوریت کا سورج طلوع ہوا ہے اور اخوان المسلمون کے قائد محمد مرسی ملک کے صدر منتخب ہوئے ہیں، نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے جو دین بیزار ماحول بنایا گیا، نیز فوج اور حکومت کی مشنری میں اسلام دشمن لوگوں کو شامل کیا گیا، ان کی چند ماہ یا

سال دو سال میں تطہیر نہیں ہوسکتی، ضروری ہے کہ اس کام کو بتدریج انجام دیا جائے؛ لیکن مصر کی بعض مسلم تنظیموں نے صدر کے خلاف تحریک شروع کر دی ہے کہ وہ مکمل اسلامی نظام نافذ کر دیں اور اہرام مصر کو زمین بوس کر دیں، ظاہر ہے کہ یہ ایک نا قابل عمل بات ہے اور اس سے مصر کو اسلامیانے کی کوشش کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچے گا، مسلم یا غیر مسلم ممالک میں جن جماعتوں نے احیاء اسلام کو اپنا ہدف بنایا ہے، یقیناً وہ قابل تعریف ہیں؛ لیکن انہیں حکمِ دین کے ساتھ ساتھ حکمتِ دین کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور ایسے عمل سے بچنا چاہئے، جن سے بدخواہوں کو اس پروپیگنڈے کا موقع مل جائے کہ مسلمان شدت پسند اور نارواداد ہوتے ہیں۔

اس واقعہ کی تیسری جہت یہ ہے کہ بوسینیا میں کتنی ہی مسلمان عورتیں اور معصوم بچیاں تہہ تیغ کر دی گئیں اور سورج کی روشنی میں عورتوں کو بے آبرو کیا گیا، عراق میں امریکی فوجیوں کے کئی ایسے واقعات سامنے آئے کہ امریکی فوجیوں نے عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کی اور پھر انہیں جلا دیا، خود وادیٔ سوات کی صورت حال یہ ہے کہ ۲۰۰۴ء سے اب تک چار سو چوہتر ڈرون حملے ہو چکے ہیں، ان میں ۸۸۴ شہری مارے جا چکے ہیں، مرنے والوں میں ۱۷۶ بچے اور بچیاں شامل ہیں؛ لیکن ان مظلوموں اور معصوموں کے قتل پر امریکہ سے لے کر یورپ تک کسی نے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرایا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مغرب کا یہ شور اور میڈیا کا یہ زور خلوص پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنا، مسلمانوں کے بارے میں مخالفانہ ذہن تیار کرنا، نیز ڈرون کی خوں آشامیوں اور آزادیٔ اظہار کے نام پر مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی طرف سے توجہ کو ہٹانا ہے، مسلمان دانشوروں کو ایسے واقعات کی مذمت کرتے ہوئے اس کے پس پردہ کارفرما محرکات پر بھی نظر رکھنی چاہئے اور اسی درجہ ان کی بھی مذمت کرنی چاہئے، ورنہ یہ ایک غیر منصفانہ عمل ہوگا، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کے ذرائع ابلاغ اور خود ہندوستان کے مسلم وغیر مسلم دانشوروں اور قلم کاروں کے ذہنوں کو یہودی اور صلیبی طاقتوں نے اغواء کر لیا ہے اور وہ حقیقت پسندی کے ساتھ مسائل پر غور کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں، یہ فکری افلاس اور ذہنی مرعوبیت کی بات ہے کہ انسان پروپیگنڈوں کے سامنے اس طرح ہتھیار ڈال دے کہ وہ کسی بات کا ناقدانہ جائزہ بھی نہ لے سکے، وہ انصاف کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ہاں میں ہاں ملاتا رہے اور جھوٹ کا مقابلہ کرنے کی بجائے اس کے سامنے ہتھیار

ڈالدے، قرآن مجید نے کہا ہے کہ جب فاسق شخص کسی بات کی خبر دے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کرو اور اس کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرو:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ﴾ (الحجرات:۶)

مگر افسوس کہ مسلمان حکمرانوں سے لے کر دانش وروں اور عوام تک کی صورت حال یہ ہے کہ وہ دشمنوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی بے بنیاد باتوں پر بلا تحقیق بھروسہ کر لیتے ہیں!

میٹھا زہر

(قانون لازمی تعلیم اور دینی مدارس)

اسلامی تاریخ میں میرے علم کے مطابق دو ایسے مما لک ہیں، جہاں مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی اور مدتوں اس ملک کے بام ودر پر مسلمانوں کے اقتدار کا سورج چمکتا رہا؛ لیکن اس کے باوجود مسلمان اقلیت ہی میں رہے، ایک: اسپین، دوسرے: ہندوستان، اسپین میں مسلمان تقریباً ۹۳ھ میں داخل ہوئے اور ۸۹۲ھ میں مسلمانوں کے آخری حکمران محمد بن علی (حادی عشر) نے کلید اقتدار عیسائیوں کے حوالہ کردی، اور ہلالی پرچم کی جگہ صلیب نصب کردی گئی، ہندوستان میں یوں تو خلافت فاروقی ہی سے اسلام جنوبی ہند کے ساحلی علاقہ میں داخل ہو چکا تھا؛ لیکن فوجی قوت کے ساتھ وہ ۹۲ھ میں سندھ کے راستہ سے داخل ہوا اور ایک خدا ترس نوعمر فوجی محمد بن قاسمؒ کے ذریعہ مسلمان غیر منقسم ہندوستان میں داخل ہوئے، انہوں نے اپنے عدل وانصاف اور انسانیت دوستی کے ذریعہ زمین کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں کو فتح کیا، پھر غزنوی، غوری اور مختلف خاندانوں کی پیش قدمی کے ذریعہ اسلامی مملکت کی سرحدیں وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ مغلوں کے عہد میں کابل سے لے کر برما تک ہندوستان کی سرحدیں جا پہنچیں اور اکبر اور اورنگ زیب نے ایسے وسیع تر ہندوستان سے ہندوستانیوں کو روشناس کردیا، جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کی آخری علامت بھی ۱۸۵۷ء میں مٹادی گئی، جب بہادر شاہ ظفر قید کئے گئے اور برطانوی جھنڈا لال قلعہ کی فصیلوں پر لہرانے لگا، اس کے بعد کچھ چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں ضرور باقی رہ گئیں؛ لیکن وہ برائے نام ہی آزاد تھیں، انگریزوں نے انہیں سونے کے پنجروں میں رکھا تھا؛ تاکہ وہ رہیں تو غلام؛ لیکن انہیں اپنی غلامی کا زیادہ احساس نہ ہو، ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصہ مسلمانوں کا اقتدار پر قائم رہنے کے باوجود مسلمانوں کا اقلیت میں رہنا، دعوت دین کی طرف سے ان کی غفلت اور ایک داعی امت کی حیثیت سے زندگی گذارنے کے جذبہ سے محرومی کا

نتیجہ تھا، اور انجام کار انہیں ان خطوں میں جن مظالم سے دو چار ہونا پڑا، وہ بھی اپنے فریضۂ منصبی سے غفلت ہی کی پاداش ہے۔

لیکن اسپین اور ہندوستان کی صورت حال میں اس کے بعد ایک فرق ہمیں ضرور نظر آتا ہے، اور وہ فرق یہ ہے کہ اسپین سے جب مسلمان رخصت ہوئے تو اسلام کا نام ونشان بھی مٹ کر رہ گیا، مسجد کے مینارے اذان کی آوازوں کے لئے ترس گئے اور یورپ کی فضاؤں میں نغمۂ توحید کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی؛ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہندوستان کا معاملہ ہمیشہ اس سے مختلف رہا، آج بھی مسلمان یہاں نہ صرف اپنی مسجدوں اور عبادتوں کے ساتھ محفوظ ہیں؛ بلکہ مسلمان اپنی پوری شناخت، اپنی تہذیب، مذہبی اداروں اور معاشرتی قوانین کے ساتھ زندہ ہیں اور مسلمان جس قدر اپنے دین سے مربوط ہیں، یہاں کی اکثریت بھی اپنے مذہب سے اس درجہ مربوط نہیں ہے۔

ہندوستان میں جب مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہونے لگا اور یہاں کے بزرگوں نے محسوس کیا کہ اب اللہ کے فیصلہ کے مطابق اس خطہ کی تقدیر بدلنے والی ہے اور ﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران ۱۴۰) کے تحت کلید اقتدار دوسری قوموں کے ہاتھوں میں جانے والی ہے تو انھوں نے نہایت بالغ نظری کے ساتھ دور رس اثر کا حامل ایک فیصلہ کیا، انھوں نے اس بات پر توجہ دی کہ چاہے مسلمانوں کی حکومت اس ملک سے ختم ہوجائے؛ لیکن اسلام کی وہ حکمرانی ختم نہ ہونے پائے جو دلوں کی زمین پر ہے، اور جس کی اہمیت سیاسی اقتدار سے کہیں بڑھ کر ہے؛ چنانچہ اس مقصد کے لئے ۱۸۵۷ء کے کچھ ہی عرصہ کے بعد دینی مدارس ومکاتب کی تحریک چلائی گئی اور ملک کے مختلف گوشوں میں مدارس کی بنیاد رکھی گئی؛ بلکہ کوشش کی گئی کہ ملک کے چپہ چپہ پر اس کا جال بچھ جائے۔

پھر ان مدارس کے نظام میں اس بات کی ملحوظ رکھا گیا کہ معمولی انفرا اسٹریکچر کے ساتھ تعلیم و تربیت کا انتظام ہو، لوگ مٹی کی دیواروں، پھوس کے چھپروں اور کھجور کی چٹائیوں پر بیٹھ کر بھی اس مشن کو چلاسکیں، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ کم سے کم اخراجات میں اس تحریک کو آگے بڑھایا جاسکے گا اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ان درسگاہوں سے جو لوگ پڑھ کر نکلیں گے، ان میں قناعت کا جذبہ ہوگا اور مجاہدانہ اسپرٹ ہوگی، — دوسرا بنیادی طریقۂ کار یہ رکھا گیا کہ ان اداروں کو عام مسلمانوں کے تعاون سے چلایا جائے اور خاص کر گورنمنٹ کی مداخلت سے بچایا جائے، اس طریقہ کا ایک مفید پہلو یہ ہے

کہ قوم میں اپنے مسائل خود حل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ دوسروں کے سامنے کاسہ گدائی پھیلانے کے بجائے خود اپنے دو دو چار چار پیسے جمع کرکے اپنے مسائل کو حل کرتی ہے، نیز جب گورنمنٹ سے فنڈ نہیں لیا جائے گا تو اس کے لئے مداخلت کا راستہ بھی نہیں رہے گا؛ چنانچہ ہندوستان میں بڑی حد تک مدارس کا نظام انہیں اصولوں پر آج بھی قائم ہے۔

علماء ومشائخ اور عام مسلمان تو دینی مدارس کی اہمیت کا پہلے سے ادراک رکھتے ہیں اور انہیں اندازہ ہے کہ اسلام کے بقاء وتحفظ کے لئے یہ بنیاد واساس کے درجہ میں ہیں؛ لیکن جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے اور حالات میں تبدیلی آتی جاتی ہے، مدارس کی اہمیت بھی بڑھتی جاتی ہے اور جو لوگ کل تک ملاؤں اور مولویوں کا مذاق اڑاتے تھے اور ان اداروں کو غیر اہم اور غیر مفید تصور کرتے تھے، وہ بھی ان کی اہمیت کو محسوس کررہے ہیں، اشتراکیت کے خاتمہ کے بعد اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ پوری دنیا فکری اور تہذیبی اعتبار سے مغرب کی غلام بن جائے، اخلاقی اقدار اور مذہبی تصورات کو سمندر کی ایسی گہرائی میں دفن کردیا جائے، جہاں سے خود ان کا باہر نکلنا ممکن نہ ہو، حیوان کو بھی شرمندہ کردینے والی بے شرمی پر کوئی ٹوکنے والی زبان باقی نہ رہے، چنانچہ اس کے لئے نئے عالمی نظام اور گلوبلائزیشن کا نعرہ لگایا گیا، جس کا خصوصی ہدف عالم اسلام اور مسلمان ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب لا مذہبیت کے اس طوفان کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں، اگر کوئی امت اس کے سامنے سرنگوں ہونے کے لئے تیار نہیں ہے تو یہ امت مسلمہ ہے، اور مغربی مفکرین نے صورت حال کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد اندازہ کرلیا ہے کہ مسلمانوں کی اپنے دین پر استقامت اور مغربی ایجنڈوں کو قبول کرنے سے انکار کا اصل سبب دینی مدارس کی تعلیم وتربیت کا نظام ہے، یہ ایک ایسا سرچشمہ ہے، جس سے اسلام کے تمام شعبوں کو آب حیات ملتا ہے اور یہاں سے پیدا ہونے والا گروہ ایسا گروہ ہے، جو ستائش سے بے پرواہ اور ملامت سے غیر متأثر ہوکر اسلام کی حفاظت واشاعت کا فریضہ اس طرح انجام دیتا ہے کہ گویا وہی اس کا مقصد زندگی ہے؛ اس لئے اب مغرب سے لے کر مشرق تک مدارس تنقید واعتراض کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔

ہمارا ملک ہندوستان تو آج کل معاشی ترقی اور سوپر طاقت بننے کے جذبہ کے تحت مغرب کے سامنے سر جھکانے ہی کو نہیں؛ بلکہ بچھ جانے اور لیٹ جانے کو بھی تیار ہے، چاہے اس کے لئے اس ملک

کی اخلاقی روایات کو پس پشت ڈالنا پڑے اور اپنی پہچان کو گم کرنے کی نوبت آجائے؛ اسی لئے مغربی طاقتوں کے اشارہ پر یہاں بھی مدارس کو خصوصی نشانہ بنایا جارہا ہے، پہلے تو دینی درسگاہوں کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دینے کی کوشش کی گئی؛ لیکن آج تک دہشت گردی کے ایک واقعہ کے سلسلہ میں بھی اس بات کا ثبوت نہیں مل سکا کہ اس کا تعلق مدارس سے تھا، اس کے بعد ڈرانے کے بجائے لالچ دینے اور ترہیب کے بجائے ترغیب کا راستہ اختیار کیا گیا اور مرکزی مدرسہ بورڈ کا تصور پیش کیا گیا، مدارس سے کہا گیا کہ اساتذہ کے لئے تنخواہیں فراہم کی جائیں گی اور ماڈرن ایجوکیشنل لئے انفرااسٹریکچر کا نظم کیا جائے گا؛ لیکن حکومت کے عزائم کو بھانپتے ہوئے اور بعض ریاستوں میں پہلے سے قائم 'سرکاری مدرسہ بورڈ' کی صورتحال کو دیکھتے ہوئے مدارس نے اسے رد کردیا اور کسی قابل ذکر ادارہ نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا تو اب حکومت نے مدارس کو ختم کرنے کا بالواسطہ طریقہ کار اختیار کیا ہے، جو مدرسہ بورڈ سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور وہ ہے حق تعلیم سے متعلق پاس ہونے والا حالیہ قانون۔

یہ قانون اپنے نام کے اعتبار سے اتنا خوبصورت اور پرکشش ہے کہ جس کسی نے سنا، اس کی داددی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قانون نہ صرف دینی مدارس؛ بلکہ عصری تعلیم کی اقلیتی درسگاہوں کے لئے بھی سخت نقصان دہ ہے؛ بلکہ عمومی طور پر بھی تعلیمی معیار کے اس سے متأثر ہونے کا اندیشہ ہے، تاہم اس وقت صرف دینی مدارس اور دینی تعلیم کے پہلو سے چند نکات پیش کئے جاتے ہیں، جن پر گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ قانون چھ سال سے لے کر چودہ سال کی عمر تک کے بچہ کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرتا ہے، تعلیم سے مراد وہ تعلیم ہے، جو حکومت کی نظر میں قابل قبول ہو، جس کی تشریح ایک الگ شیڈول میں کی گئی ہے، سائنس، ریاضی، سوشل سائنس، زبانیں، آرٹ، جسمانی صحت اور حرفت کی تعلیم اس میں شامل ہے، گویا پوری عصری تعلیم، پھر باب (۱) دفعہ ۳ کی شق (این) کے تحت تعلیم گاہ سے مراد گورنمنٹ کا تسلیم شدہ اسکول ہے، پھر مذکورہ شیڈول میں تمام سہولتوں کی تفصیل بھی موجود ہے کہ عمارت کیسی ہو، کھیل کا میدان کس طرح کا ہو، طلبہ کی کتنی تعداد پر کتنے ٹیچر ہوں اور کن کن مضامین کے لئے الگ الگ اساتذہ مقرر کئے جائیں؟ اس بات کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ داخلہ کے لئے بچوں کے امتحان اور صلاحیت کو ضروری نہ قرار دیا جائے؛ بلکہ ان کی عمر کے لحاظ سے ان کی کلاس متعین کی جائے، —اب

صرف ان ہی قواعد کے پس منظر میں دینی مدارس کے نظام کو دیکھئے، دینی مدارس بحیثیت ایک تعلیم گاہ کے حکومت کے تسلیم کردہ نہیں ہیں، دینی مدارس میں یہ سارے عصری مضامین نہیں پڑھائے جاسکتے، ورنہ طلبہ پر نا قابل برداشت بوجھ ہوجائے گا، اور مدارس کا اصل مقصد فوت ہوکر رہ جاے گا، گورنمنٹ جو انفرااسٹرکچر پرائیوٹ اداروں کے لئے متعین کرتی ہے؛ حالاں کہ گورنمنٹ خود اپنے اداروں کے لئے اس کا نصف بھی مہیا نہیں کرتی، یہ بات عصری درسگاہوں کے لئے ایک حد تک قابل قبول ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ یہ کمرشیل بنیاوں پر چلتے ہیں اور طلبہ وطالبات سے نہ صرف معقول فیسیں وصول کی جاتی ہیں؛ بلکہ ڈونیشن کے نام پر خطیر رقوم بھی حاصل کی جاتی ہیں، دینی مدارس جو خیراتی بنیاد پر کام کرتے ہیں اور مفت تعلیم فراہم کرتے ہیں، ان کے لئے اتنے وسائل کا مہیا ہونا آسان نہیں ہے، غرض کہ اس قانون کے لحاظ سے دینی مدارس کی تعلیم لازمی حق تعلیم کے معیار کو پورا نہیں کرسکے گی اور اگر ایک طالب علم یا سرپرست بھی گورنمنٹ کو اپنی شکایت پیش کردے تو ان اداروں کا چلانا جرم متصور ہوگا اور ذمہ داران خطیر جرمانہ اور سزائے قید کے مستحق قرار پائیں گے، اس صورت حال سے کوئی بھی ایسا ادارہ مستثنیٰ نہیں ہے، جو چھ سال سے چودہ سال تک کے بچوں کو تعلیم دیتا ہو۔

دینی مدارس کے ذمہ داران، سیاسی قائدین، دانشوروں اور ملی تنظیموں کو پوری گہرائی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کرنے اور اس کا تدارک کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ ''میٹھا زہر'' ہے، اس کے عنوان کی مٹھاس نے لوگوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر رکھا ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ مسلمانوں کی شناخت کے لئے جان لیوا ہے!

❁

لازمی حق تعلیم قانون اور اقلیتی عصری تعلیمی ادارے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعلیم ہی انسان کو حقیقی انسان بناتی ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک ساتھ انسان کی تخلیق اور اس کی تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ (علق: ۱-۵) گویا انسان کے وجود میں آنے کے بعد وہ مکمل اس وقت ہوتا ہے، جب علم سے بہرہ ور ہو، اور علم سے مراد وہ علم ہے، جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو، اس میں دینی ضرورت کا علم بھی شامل ہے اور دنیاوی ضروریات کا علم بھی، مغرب نے علم کا مقصد یہ متعین کیا ہے کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے پیٹ کی پرورش کرسکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکتا ہے؛ لیکن یہ ایک حقیر مقصد ہے، علم کا اصل مقصد شخصیت کی تعمیر ہے، علم انسان کے اندر شرافت پیدا کرتا ہے، علم سے اخلاقی سطح بلند ہوتی ہے، علم سے نیک و بد کا شعور پیدا ہوتا ہے، علم تہذیب و شائستگی لاتا ہے، علم بولنے کا سلیقہ سکھاتا ہے، علم کے ذریعہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ سلوک اور رویہ کو سیکھتا ہے اور علم انسان کو پابند قانون شہری بناتا ہے، علم کا حقیقی مقصد انسان کو انسان بناتا ہے، علم کے ذریعۂ معاش حاصل کرنا ایک ضمنی چیز ہے، آج مغربی تصورات کے تحت چوں کہ تعلیم کا مقصد ہی پیسے کمانا ہو گیا ہے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم کو ایک تجارت بنالیا گیا ہے اور تعلیم کو حاصل کرنے والے اپنی صلاحیت، اپنے فن اور اپنے ہنر کو اس طرح بیچنے لگے ہیں، جیسے دکان دار اپنی دکان کا سامان بیچتا ہے اور سماج کی خدمت کا جذبہ مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔

حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی عوام کے لئے بنیادی ضرورتیں فراہم کرے، بنیادی ضرورتیں صرف روٹی، کپڑا اور مکان نہیں ہے؛ بلکہ تعلیم بھی ہے، خود ہمارے دستور کے رہنما اصول میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو مفت تعلیم فراہم کی جائے، یہ بات یقیناً خوش آئند ہے کہ موجودہ حکومت نے ''لازمی حق تعلیم قانون'' لا کر عوام کے اس حق کو ادا کرنے کی کوشش شروع کی ہے اور آٹھویں جماعت تک تمام بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا نظم کیا ہے، اگرچہ اسے نامکمل ہی کہا جائے گا؛ کیوں کہ کم سے کم بارہویں جماعت تک تمام لوگوں کی تعلیم کا نظم ہونا چاہئے؛ لیکن ایک ایسا ملک

جس میں شرح خواندگی بہت کم ہے اور عوام تعلیمی وسائل سے محروم ہیں، اس کوشش کو بھی قابل تحسین ہی کہا جائے گا؛ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ قانون بہت سرسری طور پر پاس کیا گیا ہے، اور تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے میں چوک ہوئی ہے، اس قانون کا ایک پہلو تو دینی مدارس سے متعلق ہے، جس پر یہ حقیر چند ہفتہ پہلے ''میٹھا زہر'' کے عنوان سے روشنی ڈال چکا ہے، اندیشہ ہے کہ یہ قانون اقلیتوں کے عصری تعلیم سے متعلق اداروں پر بھی اثر انداز ہو، چنانچہ چند نکات یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

☆ قانون کی دفعہ ۲: (B.C): اقلیتی تعلیمی اداروں کو بھی اس بات کا پابند بناتی ہے کہ وہ پچیس فیصد بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے — یہ دفعہ اقلیتوں کے تعلیمی اداروں میں مداخلت کا راستہ فراہم کرتی ہے؛ کیوں کہ ایک تو مسلمان معاشی اعتبار سے اتنے پسماندہ ہیں کہ وہ زیادہ فیس ادا نہیں کر سکتے، پھر جب پچیس فیصد بچوں کو مفت تعلیم دینی ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پچہتر فیصد طلبہ وطالبات بقیہ پچیس فیصد بچوں کے تعلیمی اخراجات کو بھی برداشت کریں، اس طرح اقلیتوں کے لئے یہ تعلیم مزید گراں ہو کر رہ جائے گی، پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بقیہ پچیس فی صد بچے مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مسلم بھی، اقلیت کے بھی ہو سکتے ہیں اور اکثریت کے بھی، تو اقلیتیں اسکول کے لئے انفرااسٹرکچر فراہم کریں، مسلمان اپنے غریب بھائیوں سے پیسے وصول کریں اور وہ اکثریتی فرقہ کے بچوں کو تعلیم دینے پر مجبور ہوں، کیا یہی انصاف کا تقاضہ ہے؟ اگر حکومت ان پچیس فی صد بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری خود قبول کرتی تب یہ بات قابل عمل بھی ہوتی اور قرین انصاف بھی۔

تعلیمی نفسیات اور اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ بات مناسب ہوتی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے الگ الگ درسگاہیں قائم ہوں، آج کل پانچویں جماعت تک بچے خاصے باشعور ہو جاتے ہیں اور صنفی مسائل کے بارے میں بھی وہ بے خبر نہیں رہتے؛ اس لئے چھٹی جماعت سے بہت سے مقامات پر گرلس اسکول الگ کر دئے جاتے ہیں، یہ گرلس اسکول اسکولوں میں بڑھتے ہوئے مجرمانہ افکار سے بچاؤ کے لئے بھی ایک مفید، مناسب اور ضروری تدبیر ہے؛ لیکن اس قانون کی دفعہ: ۳، شق ۱، چھ سال سے چودہ سال تک کی عمر کے ہر بچہ کو اپنے قریبی اسکول میں مفت اور لازمی تعلیم حاصل کرنے کا حق دیتی ہے، اس میں لڑکے اور لڑکی کا کوئی امتیاز نہیں، یعنی قانون کے اطلاق کے لحاظ سے اگر کسی گرلس اسکول میں کچھ لڑکے داخلہ کے لئے اصرار کریں، یا بوائز اسکول میں کچھ لڑکیاں داخلہ کے لئے بضد

ہوں تو اسکول کی انتظامیہ انہیں روک نہیں سکتی، اور ہماری عدالتیں جس طرح آج کل الفاظ کا کھیل کھیل رہی ہیں اور اپنے فیصلوں کے ذریعہ ہندوستان میں مغربی معاشرت کو تقویت پہنچا رہی ہیں، اس کے تحت یہ بات چنداں قابل تعجب نہیں کہ اگر اس طرح کا کوئی مقدمہ عدالت میں پہنچ جائے تو وہ بھی اسکول انتظامیہ کو ایسے داخلوں کو قبول کرنے کا پابند بنائے، اس طرح وہ مقاصد فوت ہوکر رہ جائیں گے، جن کے لئے علیحدہ گرلس یا بوائز اسکولس قائم کئے جاتے ہیں۔

دفعہ: ۶، شق: ۱ میں کہا گیا ہے کہ ان اداروں میں وہی نصاب پڑھایا جائے گا جو گورنمنٹ کا مرتب کردہ ہے — عام طور پر مسلم اسکولوں میں قرآن مجید اور دینیات کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، یا سیرت نبوی اور تاریخ اسلام پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے، جو مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے نہایت ضروری ہے؛ لیکن یہ دفعہ انہیں کسی زائد مضمون کے پڑھانے میں رکاوٹ بن سکتی ہے اور اگر معاملہ عدالت تک پہنچ جائے تو یہ حکم دیا جاسکتا ہے کہ اسکول زائد از نصاب مضمون پڑھانے سے اجتناب کرے، نیز اس کے لئے بچوں پر زیادہ تعلیمی بوجھ کا بہانہ بھی تراشا جاسکتا ہے۔

دفعہ: ۱۳ میں اسکول کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اسکول میں داخل کئے گئے بچوں کے والدین اور سرپرستوں سے کوئی عطیہ یا فیس وصول نہیں کرسکتا، اسی دفعہ کی شق: A میں اس کو مزید مؤکد کیا گیا ہے اور اس کی خلاف ورزی پر جرمانہ کی مقدار متعین کی گئی ہے — یہ بات قابل غور ہے کہ حکومت نے اساتذہ اور انفرا اسٹریکچر کے لئے جو معیار بنایا ہے، اگر چہ کہ حکومت خود اپنے اسکولوں میں اس کو پورا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی ہے؛ لیکن پرائیوٹ اسکولوں میں سختی کے ساتھ اس کو نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہے، اب اگر اقلیتی اسکولوں پر یہ پابندی ہو کہ وہ کسی طالب علم سے عطیہ نہیں لیں گے، تو آخر وہ اس معیار کو کیسے پورا کرسکیں گے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے تعلیمی اداروں کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا، اس لئے عطیہ کے سلسلہ میں کوئی حد متعین کردینا تو واجبی عمل ہوگا؛ لیکن اس سے مطلق روک دینا بہت سے اداروں کے وجود کے لئے خطرہ پیدا کردے گا۔

دفعہ: ۲۰ میں ایک مضحکہ خیز بات یہ کہی گئی ہے کہ اسکول کی کمیٹی میں تین چوتھائی ممبران طلبہ و طالبات کے والدین اور سرپرستان ہوں گے، ان میں پچاس فی صد عورتیں ہوں گی اور محروم و پسماندہ طبقات کی بھی مناسب نمائندگی ہوگی — غور کیجئے یہ ''معجون مرکب'' قسم کی کمیٹی اسکول کا کیا حشر کرے

گی؟ اسکول کے لئے ایسی انتظامیہ مطلوب ہوتی ہے، جو تعلیمی امور سے واقف ہو، انتظام کی صلاحیت رکھتی ہو اور اسکول کے مفاد کو مقدم رکھتی ہو، بچوں کے اولیاء کا ان صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری نہیں اور خاص کر خواتین کے ممبر ہونے اور نہ ہونے سے اسکول کا کوئی نفع ونقصان متعلق نہیں، ایسی انتظامیہ درحقیقت اسکول کے تعلیمی نظام کو برباد کر کے رکھ دے گی اور جیسے ہماری مجالس قانون ساز کے ممبران کرسیوں سے ایک دوسرے کی تواضع کرتے ہیں اور مکے اور لاتوں سے بھی اپنے ساتھیوں کی خبر گیری میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے، وہی صورت حال اسکولوں کی جاہل انتظامیہ میں پیدا ہوگی اور یہاں تو کوئی مارشل بھی میسر نہیں ہوگا، جو بوقت ضرورت ان کو نکال باہر کرے۔

دفعہ: ۲۳ کی شق: ا میں اساتذہ کے لئے معیار مقرر کیا گیا ہے اور اسی کے مطابق اساتذہ کا تقرر ضروری قرار دیا گیا ہے — اس سے یہ مسئلہ کھڑا ہوسکتا ہے کہ مسلمان تعلیمی ادارے بعض دفعہ کسی حافظ یا عالم کو مدرس مقرر کرتے ہیں؛ تاکہ وہ بچوں کو قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم دے سکیں؛ حالاں کہ وہ گورنمنٹ کے تعلیمی نظام کے اعتبار سے سرٹیفکٹ یافتہ نہیں ہوتے، ایسی صورت میں انگلی اٹھ سکتی ہے کہ انہیں استاذ مقرر کرنے کا قانونی جواز کیا ہے؟ اس لئے گورنمنٹ کے مقرر کئے ہوئے مضامین کے لئے تو اساتذہ کا وہ معیار قابل قبول ہوسکتا ہے، زائد مضامین کے لئے نہیں، اور قانون میں اس کی صراحت ہونی چاہئے۔

دفعہ: ۲۹، شق: (f) میں کہا گیا ہے کہ ''جہاں تک ممکن ہوگا، بچہ کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے گی'' — یہ دفعہ اردو زبان کے لئے خطرہ کی گھنٹی ہے، ماہرین تعلیم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مادری زبان سے بہتر کوئی اور ذریعۂ تعلیم نہیں اور ملک میں زیادہ تر مسلمانوں کی —— سوائے چند صوبوں کے —— مادری زبان اردو ہے، اردو ذریعہ تعلیم پر حکومت کے توجہ نہ دینے کی وجہ سے آج اردو قارئین کا دائرہ کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے، زبانیں مشاعروں اور کچھ ادباء کی پذیرائی سے زندہ نہیں رہتی ہیں؛ بلکہ تعلیم سے زندہ رہتی ہیں؛ اس لئے حکومت کو ذمہ داری قبول کرنی چاہئے کہ وہ بچوں کے لئے ان کی مادری زبان میں تعلیم کا نظم کرے — ''جہاں تک ممکن ہوگا'' کے الفاظ پہلوتہی برتنے اور لسانی اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی روا رکھنے کا راستہ فراہم کرتے ہیں۔

غرض کہ یہ قانون اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے لئے بے حد نقصاندہ بھی ہوسکتا ہے؛ اس لئے مسلمان اقلیتی اداروں کو خصوصا اور مسلمان مذہبی اور سیاسی تنظیموں کو عموما بلا تاخیر اس بات کی مہم چلانی چاہئے کہ جو ادارے دستور کی دفعہ: ۳۰ میں اقلیتوں کو دئے گئے، حقوق کے دائرہ میں قائم کئے گئے ہیں، انہیں اس قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جائے؛ تاکہ وہ اپنے مذہبی، تہذیبی اور لسانی تشخص کے ساتھ اپنے ادارے چلاسکیں، اپنے آپ کو مداخلت سے محفوظ رکھ سکیں اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے اداروں کو اپنے منشاء کے مطابق چلانے میں انہیں کوئی رکاوٹ درپیش نہ ہو۔

لازمی حق تعلیم قانون اور تعلیم وتربیت

'لازمی حق تعلیم قانون' جہاں دینی مدارس اور اقلیتی تعلیمی اداروں کے لئے نقصاندہ ہے، وہیں دوسرے پرائیوٹ اسکولوں اور عمومی طور پر ہمارے ملک کے معیار تعلیم اور اخلاقی قدروں کے لئے بھی مضر ثابت ہوسکتا ہے۔

ملک میں بعض ایسے تعلیمی ادارے بھی ہیں، جو ایک خاص معیار کے تحت قائم کئے گئے ہیں، ایسی درسگاہوں میں محض امتحان پاس کر لینے والے طلبہ کا داخلہ نہیں ہوتا؛ بلکہ ایک خاص معیار کے طلبہ کو لیا جاتا ہے، جیسے ۸۰ فیصد یا ۹۰ فیصد نمبر لانے والے طلبہ، اس معیار کو برتنے سے طلبہ وطالبات میں مسابقت پیدا ہوتی ہے، وہاں سے ممتاز صلاحیت کے بچے قوم کو ملتے ہیں اور یقیناً ایسے طلبہ کی ملک کو ضرورت ہے، اگر کمزور بچے بھی یہاں داخل ہوجائیں تو جذبۂ مسابقت کم ہوجائے گا اور تعلیم کا معیار متاثر ہوکر رہ جائے گا، اس قانون کی دفعہ: ۳، شق: ۱، چھ سال سے چودہ سال کی عمر کے ہر بچہ کو اپنے ''قریبی اسکول'' میں مفت اور لازمی تعلیم حاصل کرنے کا حق دیتی ہے، — اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بچے ایسے اسکولوں کے تعلیمی معیار کو پورا نہ کرتے ہوں؛ لیکن قریب میں واقع ہوں، ان کو بھی ایسے اسکولوں میں داخلہ دینا پڑے گا، اس طرح باصلاحیت افراد کی پیدائش کم ہوجائے گی اور یہ ملک وقوم کے حق میں اچھی بات نہیں ہوگی۔

دفعہ: ۴ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ''بچہ نے کوئی تعلیم حاصل کی ہو یا نہیں کی ہو؛ لیکن اس کو عمر کے لحاظ سے کلاس میں داخلہ دینا پڑے گا'' — اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک بچہ چودہ سال کا ہو اور اس نے کچھ نہ پڑھا ہو تو اسے براہ راست آٹھویں کلاس میں داخل کردیا جائے، غور کیجئے کہ یہ مبتدی طالب علم آٹھویں کلاس کے معیار کو کس طرح پوری کرسکتا ہے؟ قانون میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ایسے بچوں کے لئے خصوصی تعلیم کا بھی نظم کیا جائے گا؛ تاکہ وہ اس کلاس کے لائق ہوجائے؛ لیکن اس بات کا کہنا تو آسان ہے، عمل دشوار ہے؛ کیوں کہ تھوڑی بہت کمی تو اس طرح پوری کی جاسکتی ہے، بہت

زیادہ نقصان کی تلافی اس طریقہ پر ممکن نہیں ہے، اس کا اثر بھی یقینی طور پر معیارِ تعلیم پر پڑے گا، ہاں اگر حکومت کی طرف سے یہ ہدایت ہو کہ اس کی عمر اور صلاحیت دونوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو، اس کی عمر کے لحاظ سے قریبی کلاس میں داخلہ دینے کی کوشش کی جائے، تو یہ بات قابل قبول ہوسکتی ہے۔

دفعہ ۱۶ میں کہا گیا ہے: ''کسی بھی بچہ کو جسے اسکول میں داخلہ دیا گیا ہو، اسے اگلی کلاس میں جانے سے روکا نہیں جائے گا اور نہ اسکول سے خارج کیا جائے گا، جب تک وہ اپنی پرائمری تعلیم مکمل نہ کرلے'' — اس دفعہ کا مطلب یہ ہوا کہ بچے امتحان میں کامیاب ہوں یا ناکام، بہرحال ان کو ترقی دی جائے اور پرائمری تعلیم مکمل ہونے تک اس کی ترقی روکی نہ جائے، جب فیل ہونے والے بچوں کو بھی اگلی جماعت میں منتقل کردیا جائے تو اول تو خود اس بچہ میں کیا استعداد پیدا ہوسکے گی؟ دوسرے: آئندہ جماعت کا معیارِ تعلیم بھی متأثر ہوگا؛ کیوں کہ کمزور اور تعلیم میں دلچسپی نہ لینے والے بچوں سے ان کے ہم سبق ساتھیوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور جماعت میں مسابقت کا جذبہ کم ہوجاتا ہے، غفلت برتنے والے بچوں کو جب یہ معلوم ہوجائے کہ یہ ہر صورت ترقی ہی ان کا مقدر ہے تو اس سے ان کی غفلت اور سستی میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے؛ اس لئے یہ دفعہ معیارِ تعلیم کو بہت نقصان پہنچائے گی۔

دفعہ: ۱۷، شق: ۱ میں ہے: ''کسی بچہ کو جسمانی سزا یا ذہنی اذیت کا شکار نہیں بنایا جائے گا'' — اس میں دو باتیں قابل توجہ ہیں: ایک مسئلہ سرزنش کا ہے، اس سلسلہ میں ہمارے یہاں افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے، ایک طرف بچوں کو سخت تکلیف دہ سزائیں دی جاتی ہیں، بعض اوقات اس کی وجہ سے جان جانے کی نوبت آجاتی ہے، طلبہ وطالبات کو ذلیل بھی کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کے کپڑے اتروا دیئے جاتے ہیں، یہ نہایت بیہودہ طریقہ ہے، افسوس کہ دینی درس گاہوں میں بھی بہت سی دفعہ سزائیں حدِ اعتدال کو پار کرجاتی ہیں، اور اس کی وجہ سے بعض بچوں میں ایسی نفرت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ تعلیم ہی کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، یقیناً اس کی ممانعت ہونی چاہئے اور اس کے لئے قانون بھی بننا چاہئے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ طلبہ کی اصلاح کے لئے ان میں ایک گونہ خوف کا باقی رہنا بھی ضروری ہے، بعض دفعہ اخلاق کے دائرہ میں رہتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ اور ہلکی پھلکی جسمانی

سرزنش خود ان بچوں کے مستقبل کے لئے مفید ہوتی ہے، سمجھدار ماں باپ بھی اس حد تک اپنے بچوں کی سرزنش کرتے ہیں، اور بعض دفعہ تو اساتذہ سے بھی اس کا مطالبہ کرتے ہیں؛ اس لئے اس کو بالکل ممنوع قرار دینا خود بچوں کے مستقبل کے لئے بہتر نہیں، مغربی معاشرہ میں اس کا انجام دیکھا جاسکتا ہے، جہاں اساتذہ ہی نہیں والدین بھی بچوں کو چھونے کی ہمت نہیں کر پاتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کی غالب تعداد کلبوں اور شراب خانوں کو اپنی آماجگاہ بنالیتے ہیں اور ان میں ایسا اخلاقی بگاڑ آجاتا ہے، جسے بیان نہیں کیا جاسکتا؛ اس لئے سرزنش سے بالکل منع کردینا بچوں کے حق میں مفید نہیں ہے؛ البتہ اس کے لئے حدود متعین کی جاسکتی ہیں۔

دوسرے یہ بات کہ ''ذہنی اذیت کا شکار نہیں بنایا جائے گا''— بہت ہی مبہم تعبیر ہے، اور اس میں اتنی لچک ہے کہ اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے طلبہ سے کوئی استفسار اور پوچھ گچھ پر بھی ذہنی اذیت کا الزام لگ سکتا ہے، جیسے استاذ نے جماعت میں کسی بچہ سے پوچھا کہ تم نے ہوم ورک کیوں نہیں کیا؟ تم کل کیوں نہیں آئے تھے؟ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس سوال سے مجھے ذہنی تکلیف پہنچی ہے اور مجھے میرے ساتھیوں کے سامنے ذلیل کیا گیا ہے، وغیرہ؛ اس لئے قانون کی تعبیر کو واضح ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ لوگ پیشہ تدریس کو اختیار کرنے ہی سے خوف کھانے لگیں۔

دفعہ: ۲۱ جو مجلس منتظمہ کی ہیئت کو واضح کرتی ہے، تمام ہی پرائیوٹ اداروں کے لئے خواہ وہ اقلیت کے ہوں یا اکثریت کے، نہایت قابل غور ہیں، گویا اسکول کی مجلس منتظمہ نہ ہوئی، ریلوے کی جنرل بوگی ہوگئی، جس میں ۷۵ فیصد اولیاء طلبہ و طالبات ہوں گے، بہ حیثیت مجموعی ۵۰ فیصد خواتین ہوں گی، اور پسماندہ طبقات کو بھی مناسب نمائندگی دی جائے گی، اس طرح اسکول کی اصل انتظامیہ نظم ونسق میں بے بس ہوکر رہ جائے گی؛ اس لئے یہ دفعہ صرف اقلیتی اداروں ہی کے لئے نقصاندہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ پرائیوٹ اسکولوں کے لئے بھی دشواری کا باعث ہوگی۔

اس قانون کے اخیر میں شیڈول A اور شیڈول B کے دو ضمیمے بھی ہیں، شیڈول B میں ان مضامین کا ذکر ہے، جن کی تعلیم دی جائے گی، اس میں ایک شق ہے ''صحت اور جسمانی صحت کی تعلیم'' — یہ ایک بڑے خطرہ کی گھنٹی ہے، اس وقت ہمارا ملک جس طرح مغرب کے نقش قدم پر آگے بڑھ رہا ہے، اس کے تحت ضروری ہے کہ ہم ان مضامین کو مغربی نظام تعلیم کے پس منظر میں دیکھیں، یوروپ

اور امریکہ وغیرہ میں صحت کے ذیل میں خاص طور پر طلبہ وطالبات سے تیراکی کرائی جاتی ہے، یہ تیراکی مخلوط اور مشترک طور پر ہوتی ہے، اور مختصر بلکہ مختصر ترین لباس میں ہوتی ہے، پھر تمام لڑکے ایک ساتھ اور تمام لڑکیاں ایک ساتھ بے لباس ہوکر غسل کرتے ہیں، امریکہ میں ایک صاحب کو اپنے بچہ کو اس بے شرمی سے باہر رکھنا تھا تو انہیں باضابطہ اس کے لئے کوشش کر کے خصوصی منظوری حاصل کرنی پڑی، تب جاکر ان کے لڑکے کو چڈی پہن کر غسل کرنے کی اجازت دی گئی، اس طرز عمل سے جس طرح بے حیائی پھیلے گی وہ ظاہر ہے۔

اسی طرح ''تعلیم صحت'' کے نام پر مغرب میں جو چیز پڑھائی جاتی ہے، وہ ہے جنسیات کی تعلیم، اور بچے ابتدائی جماعت سے ہی اس مضمون کو پڑھتے ہیں اور اس کے لئے خاص طور پر مصوّر کتابیں شائع کی جاتی ہیں، ابھی چند سال پہلے ہماری حکومت نے ہندوستان میں بھی اس کو نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس سلسلہ میں جو کتاب مرکزی حکومت اور حکومت مہاراشٹر کی طرف سے شائع ہوئی تھی، وہ نہایت فحش اور حد درجہ بے ہودہ تھی، اسی زمانہ میں مدھیہ پردیش کے شہر ''برہان پور'' میں ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کا سترہواں فقہی سیمینار منعقد ہو رہا تھا، وہاں ایک موضوع ان حالات کے پس منظر میں جنسی تعلیم کا بھی رکھا گیا تھا، ایک ماہر تعلیم سے خواہش کی گئی کہ وہ حکومت کی مرتبہ کتاب کے مشمولات پر روشنی ڈالیں، اور اس کے بارے میں بتائیں؛ تاکہ صحیح صورت حال واضح ہوسکے، انھوں نے سیمینار میں کہا کہ میں چاہتا تھا کہ اس کے بعض مصور اور بعض غیر مصور صفحات اسکرین پر حاضرین کو دکھائے جائیں؛ لیکن وہ اتنے شرمناک ہیں کہ آپ جیسے مہذب لوگوں کے سامنے اسے رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی؛ کیوں کہ یہ ایسی کتاب ہے، جسے کوئی شخص اپنے بزرگوں اور عزیزوں کے سامنے نہیں دیکھ سکتا، — اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس کروے گھونٹ کو ہندوستان کے لوگوں نے پینے سے انکار کر دیا تھا، اب حکومت دوسرے عنوان سے اس کو ہماری تعلیم کا حصہ بنانا چاہتی ہے، اور یہ اخلاق کے لئے کس قدر تباہ کن تعلیم ہوگی، اس کے لئے نہ صرف مغرب میں مروجہ سیکس ایجوکیشن کا نصاب ہمارے لئے غور وفکر کی جہت فراہم کرتا ہے؛ بلکہ خود ہمارے ملک کے اندر ماضی قریب کی یہ مثال بھی موجود ہے؛ اس لئے یہ عنوان بظاہر پرکشش ہے، مگر اپنے اندر بے حد فساد کو چھپائے ہوا ہے، اور ضرورت ہے کہ اس طرح کی تعلیم کی بجائے حفظان صحت کے اصول کو داخل نصاب کیا جائے؛ تاکہ

اس سے بچوں کو فائدہ ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اندر مجرمانہ رجحان بڑھتا جارہا ہے، اخلاقی انارکی تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی داخل ہوگئی ہے، اور وہ جرائم کو انجام دینے میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال کررہے ہیں؛ اس لئے حکومت کو چاہئے کہ مضامینِ تعلیم میں اخلاقیات کو بھی شامل کریں، سچائی، دیانت داری، خدمت خلق، انسانیت سے محبت، بڑوں کی توقیر، چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور عورتوں کا احترام وغیرہ، ایسی باتیں ہیں، جو ایک انسان کو مہذب شہری بنانے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس کو خاص طور پر شامل نصاب کیا جائے، اور اس مضمون کے تحت مختلف مذاہب سے اخلاقی واقعات کا انتخاب کیا جائے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اس طرح شاید ہم بتدریج مادیت اور اخلاقی بحران کے اس سیلاب پر باندھ سکیں گے، جو اس وقت ہمارے معاشرہ کو اندر سے کھوکھلا کرتا جارہا ہے، اور جس نے مغربی تہذیب کو خودکشی کے مقام پر پہنچادیا ہے۔

نصاب تعلیم کا مسلسل جائزہ — ایک اہم ضرورت!

انسانی فکر کی تعمیر میں دو باتوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے: ایک: ماحول ل دوسرے: تعلیم — انسان جس ماحول میں پلتا ہے، اس کے بزرگوں کی جو سوچ ہوتی ہے، اور وہ اپنے گرد و پیش جس عمل کو دیکھتا ہے اور جو باتیں شب و روز اس کے کانوں سے ٹکراتی ہیں، ان کا اس پر غیر معمولی اثر ہوتا ہے، یہ سنی اور دیکھی ہوئی چیزیں کانوں اور آنکھوں سے گزر کر دل و دماغ تک پہنچ جاتی ہیں اور ان باتوں کا سچ اور حق ہونا اس کے ذہن پر ایسا نقش ہو جاتا ہے جیسے پتھر کی لکیر ہو؛ اسی لئے ہمیں قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی انبیاء کسی قوم کی طرف بھیجے گئے، انہوں نے توحید کی طرف بلایا، کفر و شرک سے منع کیا، بت پرستی اور مخلوق پرستی سے روکا، اچھے اخلاق کی دعوت دی اور بری عادتوں سے انہیں منع کیا تو زیادہ تر لوگوں نے ان کی مخالفت ہی کی، اس مخالفت کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں تھی اور دلیل ہوتی بھی کیسے، کفر و شرک کی بھی کیا کبھی کوئی دلیل ہو سکتی ہے؟ اور اچھی باتوں پر بری باتوں کو ترجیح دینے کے لئے کوئی اساس مل سکتی ہے؟؟ لیکن ہوتا یہ تھا کہ ہر دلیل کے مقابلہ ان کی ایک ہی بات ہوتی تھی کہ جو کام ہمارے یہاں پشتوں سے ہوتا آیا ہے، ہمارے آباء و اجداد جس کے قائل رہے ہیں اور جن افکار و اعمال پر ہم نے ان کو پایا ہے، ہم انہیں کس طرح چھوڑ سکتے ہیں؟ ﴿قَالُوْا بَلْ نَتَّبِــعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾ (البقرۃ: ۱۷۰، نیز دیکھئے: مائدہ: ۱۰۴، اعراف: ۲۸، یونس: ۷۸، انبیاء: ۵۳، شعراء: ۷۴، لقمان: ۲۱، زخرف: ۲۲-۲۳)، یہ اسی ماحول کا اثر ہے۔

غور کیجئے کہ انسان کی فطرت میں آزادی ہے؛ لیکن انسانوں نے صدیوں ایک فرد یا ایک خاندان کی غلامی قبول کی ہے، اور یہ قبولیت بھی ایسی جس میں بتدریج دل کی آمادگی بھی شامل ہو جاتی تھی، خود ہندوستان میں برہمنوں نے ذات پات کا اور خاندانی اونچ نیچ کا ایک نامنصفانہ فلسفہ ایجاد کر لیا اور اسے سماج کا حصہ بنا دیا، اگرچہ دراوڑیوں نے ابتداءً اس کی مخالفت کی؛ لیکن آہستہ آہستہ مزاحمت

ختم ہوتی گئی اور شودر کے نام سے ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا، جس کو خود اپنے آپ کے حقیر ہونے کا، خدا کی طرف سے اونچی ذات والوں کی خدمت کے لئے پیدا کئے جانے کا اور اسی بات کے ان کے لئے وجہ سعادت ہونے کا یقین ہو گیا تھا، پورے سماج نے اس کو اس طرح تسلیم کرلیا تھا کہ اس کے خلاف احتجاج کی کوئی صدا بلند نہ ہو پاتی تھی اور جور وستم کے اس رویہ کو بالکل حق بجانب خیال کرلیا گیا تھا، غور کریں تو یہ سب اس سماجی ماحول کا اثر تھا، جو اس وقت قائم تھا جب بچہ پیدا ہوتا اور اپنی آنکھیں کھولتا تو وہ صبح وشام اور دن ورات اسی تصور کے مظاہر کو سر کی آنکھوں سے دیکھتا، خود ان کے بزرگوں کو اس پر مطمئن پاتا، بالآخر آہستہ آہستہ خود بھی اس کی خوئے غلامی پختہ سے پختہ تر ہو جاتی۔

دوسری چیز جو انسان پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ ہے تعلیم، علم ایک روشنی ہے جو انسان کے دماغ پر چھائی ہوئی فکر ونظر کی تاریکی کو دور کرتی ہے، جیسے صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی رات کے اندھیرے رخت سفر باندھ لیتے ہیں، اسی طرح تعلیم کی روشنی انسان کے رویہ کو تبدیل کر دیتی ہے اور دل ودماغ پر اس کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے، چوں کہ تعلیم کے ذریعہ جو فکری انقلاب رونما ہوتا ہے، اس کی بنیاد دلیل پر ہوتی ہے، اس لئے ماحول اور روایت کی بنیاد پر فکر کی جو عمارت کھڑی ہوتی ہے، جب تعلیم کے ذریعہ اس پر ضرب لگائی جاتی ہے تو اگرچہ ابتداء میں مزاحمت پیش آتی ہے؛ لیکن بالآخر تعلیم کو فتح حاصل ہوتی ہے اور وہ انسان کی فکر ونظر کی مملکت کی بادشاہ بن جاتی ہے، خاص طور پر کم عمر بچے اور نوجوان اس سے جلد متأثر ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت پر ہمیشہ نوجوانوں نے لبیک کہنے میں سبقت کی، پرانے لوگ انہیں دیکھ کر کہتے تھے کہ اِن نوعمر اور ناتجربہ کار لوگوں کی رائے کا کیا اعتبار ہے؟ (ہود: ۲۷)

اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ بچپن سے لے کر عنفوان شباب تک کی عمر بغاوت کی عمر ہوتی ہے، اس عمر میں انسان کا دماغ روایتی باتوں پر قناعت کرنا نہیں چاہتا؛ بلکہ اس میں غیر معمولی جذبۂ تحقیق وتلاش پایا جاتا ہے، جب متضاد باتیں اس کے سامنے آتی ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ دلیل کی قوت سے فیصلہ کرے کہ کون سی بات درست ہے اور کون سی بات غلط ہے؟ اسی جذبۂ تحقیق کی وجہ سے انبیاء کو اپنی مشرک اور سرکش قوم میں سے وہ لوگ مل جاتے تھے، جو سارے مفادات کو پس پشت رکھ کر ان کی دعوت پر لبیک کہتے تھے اور نوجوان ہونے کی وجہ سے ان میں جد وجہد اور اپنی تحریک کے لئے کچھ

کرگزرنے کا غیر معمولی جذبہ کارفرما ہوتا تھا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہم اس منظر کو دیکھنا چاہیں تو ہمیں ہجرت کا واقعہ اپنی نظر میں رکھنا چاہئے کہ مکہ سے جو راہ حق کے مسافر لٹے پٹے اور اسباب زندگی سے محروم مدینہ پہنچے، راوی کہتے ہیں کہ ان سب کی داڑھیاں سیاہ تھیں، سوائے حضرت ابوبکر صدیق کے، جن کی ریش مبارک میں کالے اور سفید ملے جلے بال تھے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ تعلیم و تعلم کے ذریعہ کسی فکر کو قبول کرتے ہیں، وہ اس پر ثابت قدم رہتے ہیں، نہ خوف ان کے قدموں میں تزلزل پیدا کرتا ہے اور نہ لالچ دے کر ان کی متاع فکر کو خریدا جاسکتا ہے، قوموں کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جن لوگوں نے علم و معرفت کی بنا پر کسی نظریہ کو اپنایا اور دلیل کو سامنے رکھ کر کسی بات کو قبول کیا، انہیں اس کے لئے کتنی بھی مشقت اٹھانی پڑی اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا، ان کی ثابت قدمی پر آنچ نہیں آئی، اس کے برخلاف ماحول اور روایت کی بنیاد پر جو فکر قائم ہوتی ہے، وہ بظاہر بہت مضبوط نظر آتی ہے اور اپنے ماننے والوں کے اندر اس سے ایک جذباتی وابستگی پائی جاتی ہے؛ لیکن وہ مخالف نقطۂ نظر کا مقابلہ نہیں کرسکتی، جب دلیل اور علم و معرفت کی شہادت کے ساتھ دوسرا پہلو سامنے آتا ہے تو وہ مکڑی کے جالوں کی طرح بکھر کر رہ جاتی ہے۔

اسی لئے نظام تعلیم کو بے حد اہمیت حاصل ہے، اسکولوں میں جو بچے آتے ہیں، اگرچہ اپنے خاندانی اور گھریلو ماحول کی وجہ سے ان میں اپنے مذہب سے لگاؤ اور اپنی قوم سے محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں؛ لیکن ان کے دل و دماغ کی حیثیت ایک سادہ کاغذ کی ہوتی ہے، استاذ اس پر جو کچھ لکھ دیتا ہے، وہی اس پر نقش ہوجاتا ہے، یہی عمر نئے افکار کو قبول کرنے کی ہوتی ہے، اور جب اِن افکار کو علم و تحقیق کا لباس پہنا کر پیش کیا جاتا ہے تو طالب علم بتدریج اس سے کچھ اس طرح متأثر ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے اپنے خاندانی ماحول میں سنا تھا اور اپنے بزرگوں کو کرتے ہوئے دیکھا تھا، اسے دقیانوسیت اور نامعقولیت خیال کرنے لگتا ہے؛ اسی لئے اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جنہیں پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اب اگر تعلیم سچائی پر مبنی ہو تو اس سے بچوں کے ذہن کی تعمیر ہوتی ہے اور وہ صحیح فکر کے ترجمانی

اور نمائندہ بنیں گے اور اگر انہیں وہ تعلیم دی گئی جس کا مقصد سچائی کو مسخ کرنا اور حقیقت پر سیاہی پھیرنا ہو تو پھر ان ہی غلط افکار پر اس کے ذہن وفکر کی تعمیر ہوگی، پھر جب تک اس کا شعور کافی پختہ نہ ہو جائے، اس کے اندر اس موضوع کی تحقیق کا بھرپور جذبہ پیدا نہ ہو جائے اور پھر وہ علمی جد و جہد کا سفر طے کر کے سچائی کو پانے میں کامیاب نہ ہو جائے، اپنی اسی فکر پر قائم رہے گا — مغربی ممالک میں یہودیوں کی دور رس سازش کے مطابق اسلام کو بدنام کرنے، مسلمانوں کو تنہا کرنے عیسائی دنیا کو مسلمانوں سے ڈرانے، مغرب میں اسلام سے متعلق غلط فہمیاں کرنے اور ان کو باقی رکھنے کے لئے جہاں دوسرے ذرائع اختیار کئے جا رہے ہیں، وہیں تعلیم وتصنیف کو بھی اس کا ایک اہم وسیلہ بنایا جا رہا ہے، تصنیف کا حال یہ ہے کہ مستشرقین کی ایک بڑی جماعت اسلام کے خلاف زہر اگلنے کے لئے تیار ہو چکی ہے، قرآن، حدیث، سیرت، فقہ اسلامی، قانون شریعت اور اسلام کا کوئی شعبہ نہیں، جو ان کے حملے سے محفوظ ہو، ایسے اعتراضات بھی دہرائے جاتے ہیں جن کے لئے کوئی بنیاد نہیں، انتہائی نامعتبر اور موضوع روایتوں کو بنیاد بنا کر اس پر اعتراض کی پوری عمارت کھڑی کی جاتی ہے، جس بات کا جواب دیا جا چکا ہے، اسی کو بار بار دہرایا جاتا ہے؛ کیوں کہ ہتھیار اگر کند بھی ہو تو نہتھے آدمی کو نقصان پہنچا سکتا ہے، اسی طرح اگر دلیل کمزور بھی ہو تو ناواقف اور بے خبر شخص کو متأثر کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

مغربی درسگاہیں بھی اس زہر سے محفوظ نہیں، اکثر یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز، مشرقی علوم اور عربی زبان کے جو شعبے قائم ہیں، وہ شب و روز اسی مہم میں لگے ہوئے ہیں، عجیب بات ہے کہ مغرب علم وتحقیق کے میدان میں بڑی بڑی مہمیں طئے کر رہا ہے اور اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے؛ لیکن اسلام کے مطالعہ میں اصل مآخذ تک پہنچنے کے بجائے بالواسطہ مآخذ پر بھروسہ کیا جاتا ہے، مستشرقین کی تحریروں کو بنیاد بنایا جاتا ہے؛ حالاں کہ ان میں سے بہت سے لوگ وہ تھے، جو براہ راست عربی زبان سے واقف نہیں تھے، یہاں تک کہ پی ایچ ڈی ان لوگوں کی منظور کی جاتی ہے، جو اسلام کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں، مشہور مصری فاضل ڈاکٹر مصطفی سباعی کے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''**السنة و مكانتها في التشريع الإسلامي**'' کو یورپ کی ایک یونیورسٹی نے صرف اس لئے رد کر دیا کہ اس میں مستشرقین کی طرف سے حدیث کے مستند ہونے پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، پوری قوت اور دلیل کے ساتھ ان کا جواب دیا گیا ہے اور اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی گئی ہے،

اس سے علم و تحقیق کے نام نہاد قدر داں مغربی اہل علم کی کم ظرفی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

یہ وبا آہستہ آہستہ مشرقی ملکوں میں بھی آ رہی ہے، ہندوستان چوں کہ کثیر آبادی، ماہرین کی کثرت، ٹکنالوجی کی ترقی، معاشی پیش رفت اور مستحکم جمہوریت کی بنا پر ایشیاء کی ایک نمائندہ طاقت بن کر ابھر رہا ہے اور مستقبل کی سپر طاقت چین کو زیر کرنے کے لئے مغربی ممالک کی نظر میں ہندوستان کی بہت اہمیت ہے؛ اس لئے مغربی طاقتیں اپنی فکری دہشت گردی کو یہاں درآمد کرنے کے لئے بے چین ہیں اور بد قسمتی سے سنگھ پریوار کی صورت میں ایک ایسا گروہ یہاں موجود ہے، جس کی فکری قیادت کرنے والی شخصیتیں برطانوی دور میں بھی انگریزوں کی بہی خواہ تھیں، ان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کے لئے انگریزوں نے استعمال کیا، برسر اقتدار یو پی اے کی اہم جماعت کانگریس پارٹی ایک نیشنل پارٹی ہے اور اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے، اس پارٹی کے معماروں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا خواب دیکھا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ یہاں تمام مذاہب کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے؛ لیکن بد قسمتی سے سنگھ پریوار کا ذہن رکھنے والے بہت سے لوگ شروع سے ہی اس پارٹی کا حصہ بنتے رہے ہیں اور موجودہ سیاست کا ایک مسلّمہ اصول ہے کہ اقتدار کی بڑھی ہوئی خواہش کے آگے اقدار کو قربان کر دینا چاہئے۔

ہندوستان میں شروع سے ہی سنگھ پریوار کے لوگوں نے نصاب تعلیم کو زہر آلود بنانے کی کوشش کی ہے اور کانگریس اس قدم کو کیا روکتی کہ خود ہی ان کا آلۂ کار بنتی رہی ہے، سنگھ پریوار کے نزدیک شعبۂ تعلیم پر اثر انداز ہونے کی کتنی زیادہ اہمیت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنتا پارٹی دور سے لے کر آج تک جہاں بھی بی جے پی حکومت میں شامل رہی، وزارت تعلیم کو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور جہاں ان کی حکومت قائم ہوئی، وہاں تو انہوں نے پوری طاقت کے ساتھ اس شعبہ کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی، اس کا نتیجہ ہے کہ تدریسی مواد تیار کرنے والے اکثر مصنّفین اسی فکر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں؛ اس لئے مرکزی بورڈ سے لے کر مختلف ریاستوں کے تعلیمی بورڈ کی مرتب کردہ کتابوں تک ہر جگہ نصاب میں قابل اعتراض باتیں آتی رہتی ہیں۔

ریاست آندھرا پردیش میں ریاستی تدریسی پروگرام SSC سے موسوم ہے، ابھی چند دنوں پہلے سرکاری اسکول کے دو مسلمان اساتذہ اس پروگرام کے تحت سوشل اسٹڈیز پر پڑھائی جانی والی

نویں اور ساتویں جماعت کی کتابیں لے کر آئے، جو انگریزی میں بھی ہیں اور ان کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، ان کتابوں کے زیادہ تر مرتبین اور نظر ثانی کرنے والے غیر مسلم حضرات ہیں، نویں جماعت کی کتاب میں اسلام کا تعارف کراتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اسلام کے چھ ارکان ہیں اور چھٹے رکن کی حیثیت سے ''جہاد'' کا ذکر کیا گیا ہے، یہ غلط بھی ہے اور اس کا مقصد اسلام کے بارے میں لوگوں کو بدگمان کرنا بھی ہے؛ غلط اس لئے کہ اگر چہ جہاد ایک اہم ترین عبادت ہے؛ لیکن اسلام کے جو پانچ ارکان حدیث میں ذکر کئے گئے ہیں، جہاد ان میں شامل نہیں ہے، اور بدگمان کرنے والی بات اس لئے ہے کہ جہاد کا اصل مقصد تو ظالموں کو ظلم سے روکنا اور مظلوموں کی مدد کرنا ہے؛ لیکن آج غیر مسلم بھائیوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ جہاد نام ہے کافروں سے لڑنے کا، اب ظاہر ہے کہ جب غیر مسلم طلباء اسلام کا یہ تعارف پڑھیں گے تو ان میں مسلمانوں سے متعلق ضرور نفرت انگیز سوچ پیدا ہوگی۔

ساتویں جماعت کی کتاب میں اسلام کا تعارف کراتے ہوئے صوفیاء کی خدمات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ انہوں نے شریعت کو مسترد کر دیا تھا، وہ شدت پسندی کے قائل نہیں تھے اور اسی میں یہ بات بھی ہے کہ صوفیاء گانے اور ڈانس کو جائز قرار دیتے تھے، — اس سے صاف ظاہر ہے کہ گویا اسلام شدت پسندی کا مذہب ہے اور صوفیہ کے نزدیک شریعت معتبر نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ بہت سے صوفیہ نے سماع کو جائز قرار دیا ہے اور اگر کسی پر بے اختیاری کے عالم میں وجد کی کیفیت طاری ہو جائے تو انہوں نے اس کی اجازت دی ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ حمدیہ اور نعتیہ اشعار کو سننا الگ چیز ہے اور گانا بجانا الگ چیز، کسی شعر سے متاثر ہو کر اللہ اور اس کے رسول سے عشق کی ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ وہ وارفتگی کے عالم میں آجائے، یہ الگ بات ہے، ناچنا تھرکنا دوسری چیز ہے، اس طرح کی اور بھی قابل اعتراض باتیں کتاب میں لکھی گئی ہیں، چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ جن ریاستوں میں بی جے پی کی حکومت ہے یا جہاں حکومت میں بی جے پی شامل ہے، وہاں سرکاری طور پر ''سوریہ نمسکار'' کرنے کی ہدایت جاری کی گئی، جس کا حاصل سورج کی پرستش ہے، اسی طرح بعض ریاستوں میں اسکولوں کے اندر سرسوتی جی کی مورتی رکھی گئی ہے اور تمام طلبہ وطالبات کو اس پر پانی ڈالنا اور پھول چڑھانا پڑتا ہے، وندے ماترم ملک کے مختلف اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے اور افسوس کی بات ہے کہ

یہ سب کچھ سرکاری اسکولوں میں بھی ہورہا ہے،غرض کہ اسکولوں میں نصاب تعلیم اور ماحول کے ذریعہ طلبہ وطالبات کو نہ صرف ہندوانہ تصورات سے قریب کیا جارہا ہے؛ بلکہ اسلام کے خلاف غلط فہمیاں بھی پیدا کی جارہی ہیں۔

یہ تو وہ باتیں ہیں،جنہیں دیکھا اورمحسوس کیا جاسکتا ہے؛لیکن اساتذہ کی گفتگو اور درس کے دوران ان کی طرف سے پیش کی جانے والی وضاحتیں سننے پڑھنے کے لئے موجود نہیں ہوتیں،اگر استاذ کا ذہن صاف نہ ہواور وہ درس کے دوران اس قسم کی باتیں کہےتو اس کا نقصان کتابوں سے بھی بڑھ جاتا ہے، مجھ سے کچھ عرصہ پہلے بی اے کی ایک مسلمان طالبہ نے برقعہ کے بارے میں سوال کیا اور ایک معروف کالج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہاں معلمہ نے مسلمان طالبات سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ برقعہ اسلام میں نہیں ہے،مغل دورحکومت میں عورتوں کوزبردستی اٹھالیا جاتا تھااوران کے ساتھ زیادتی کی جاتی تھی؛اس لئے عورتوں نے چہرہ ڈھکنا شروع کیا،آج کے دور میں تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے،سوچئے کہ یہ کتنی خطرناک بات ہے،اس سے ایک طرف مسلمان لڑکیوں کا ذہن بنے گا کہ اسلام میں سر سے پاؤں تک پردہ کا حکم نہیں،دوسری طرف مسلمانوں کی یہ تاریخ سامنے آئے گی کہ وہ ایسے چوراورلٹیرے تھے کہ نہ لوگوں کی جان ومال ان کے ہاتھ محفوظ تھی اور نہ عزت وآبرو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ چند واقعات جو سامنے آئے ہیں،ان بے شمار واقعات میں سے چند ہیں، جو پیش آتے رہتے ہیں،کوشش کی جارہی ہے کہ ہمارے ملک کے پورے نظام تعلیم کوزعفرانی رنگ دیا جائے اور ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جائے جومسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مواد پر مشتمل ہو اور مسلمان یکا وتنہا ہوجائیں،اگر اس مسئلہ کوحل نہیں کیا گیا تو نہ صرف غیر مسلم بھائیوں پر بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل پر بھی بڑے منفی اثرات مرتب ہوں گے؛اس لئے ضرورت ہے کہ مختلف ریاستوں میں ریاست گیر سطح پر بھی اور ہندوستان کی سطح پر بھی ایک ایسا ادارہ قائم ہو،جس میں کچھ لوگ اسی کام پر مامور ہوں کہ وہ پرائمری کی سطح سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک نصاب تعلیم کا جائزہ لیتے رہیں،حکومت کی طرف سے آنے والی ہدایات پر نظر رکھیں،ذرائع ابلاغ تک اِن معلومات کو پہنچائیں،ملت کی اہم شخصیتوں اورنمائندہ لوگوں کو باخبر رکھیں،حکومت کے صیغۂ تعلیم سے ربط رکھتے ہوئے ایسی باتوں کی اصلاح کرائیں،اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں،عوامی نمائندوں اور سیکولر سیاسی پارٹی کے قائدین تک ان

کی تفصیلات کو پہنچائیں اور پوری توجہ اسی کام پر یکسو رکھیں، اگر کچھ افراد یا مختلف ملی تنظیمیں مل کر باہمی اشتراک سے ایسا کوئی ادارہ قائم کرنے میں کامیاب ہوں، اور اس کی رپورٹ کی روشنی میں تمام مسلم تنظیمیں صدائے احتجاج بلند کریں، مسلم ممبران پارلیامنٹ و اسمبلی اس رپورٹ کی بنیاد پر ایوان قانون تک اپنی بات پہنچائیں اور مسلمان وکلاء حسبِ ضرورت عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹائیں، غرض کہ اس فتنہ کا مقابلہ کرنے میں ہمہ جہت کوششیں کی جائے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہم فسطائی سازشوں کا مقابلہ کرسکیں گے، یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اگر اس سے غفلت برتی گئی تو اس کے نقصانات اتنے گہرے اور دوررس ہوں گے کہ شاید ان کی تلافی ممکن نہ ہو۔

بچوں کی سرزنش کا مسئلہ

انسان کے کسی عمل کوانجام دینے کے سلسلہ میں عام طور پر چار محرکات ہوتے ہیں: ایک اس کی عقل کی رہنمائی، دوسرے: آخرت میں جواب دہی کا احساس، تیسرے: شوق و رغبت، اور چوتھے: خوف، یہی وہ امور ہیں، جو عام طور پر انسان کو نیک عمل پر آمادہ کرتے ہیں اور برائیوں سے بچاتے ہیں، بچپن کی عمر میں انسان کی عقل ناپختہ ہوتی ہے اور یہ ناپختگی اسے اپنے انجام کے بارے میں بے پروا بنادیتی ہے، اس کے اندر بھلے اور برے کی تمیز کم ہوتی ہے؛ اسی لئے وہ بھلائی کے بجائے برائی کی طرف زیادہ رجحان رکھتا ہے، وہ پڑھنے کے مقابلہ نہ پڑھنے کو ترجیح دینا چاہتا ہے، نماز اور تعلیم سے زیادہ اس کی رغبت کھیل کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح آخرت میں جواب دہی کا احساس بچوں کے اندر یا تو نہیں ہوتا، یا بہت کم ہوتا ہے؛ اسی لئے تو شریعت میں ان کو احکام کا مکلف نہیں بنایا گیا ہے، اگر ان کے عقل وشعور میں پختگی ہوتی اور جواب دہی کا احساس ان میں موجود ہوتا تو وہ بھی احکام شریعت کے مکلف ہوتے؛ لیکن شریعت نے انہیں مکلف قرار نہیں دیا اور فرائض وواجبات ان سے متعلق نہیں کئے گئے۔

البتہ شریعت میں بچوں کے لئے ''نظام ولایت'' رکھا گیا ہے، یعنی چوں کہ اس میں نفع ونقصان کا کماحقہ ادراک نہیں ہے؛ اس لئے ایسا شخص جو اس کے مفاد کا تحفظ کرسکتا ہو، اور جس کے اندر اس کے لئے فطری طور پر شفقت ومحبت رکھی گئی ہو، وہ اس کے مفادات کی نگہبانی کرے، اس کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دے، اس کی طرف سے اس کے مال میں تصرف کرے اور اگر کسی مصلحت کے تحت نابالغی کی حالت میں نکاح کردینا بہتر ہو تو اس کا نکاح کردے، بچوں سے قریبی تعلق کے اعتبار سے درجہ بدرجہ اولیاء متعین کئے گئے ہیں، پہلا درجہ باپ کا ہے، پھر دادا کا، پھر دوسرے رشتہ داروں کا، ان رشتہ داروں کو ان تدابیر کے اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا، جو بچوں کے لئے اصلاح کا ذریعہ ہوں اور جن کے ذریعہ بچوں کو غلط راستوں سے دور رکھا جاسکے، اسی سلسلہ میں انہیں ان کی تادیب یعنی ہلکی پھلکی سرزنش کی اجازت دی گئی ہے، جب اولیاء بچوں کو تعلیم کے لئے استاذ کے حوالہ کردیں تو اب گویا تعلیم و

تربیت کی حدتک وہ اپنی ولایت اساتذہ کی طرف منتقل کرتے ہیں۔

بچوں کی سرزنش کا مسئلہ ان کی تربیت سے متعلق ہے، اس سلسلہ میں لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، بعض لوگ سرزنش میں بڑے مبالغہ سے کام لیتے ہیں، اس طرح بچوں کو زدوکوب کیا جاتا ہے کہ گویا ان کی اصلاح مقصود نہ ہو؛ بلکہ انتقام لینا مقصود ہو، گذشتہ چند مہینوں میں کئی واقعات تو ایسے پیش آئے کہ استاذ کی سرزنش کی وجہ سے بچے کی موت ہوگئی یا انہیں اس قدر ذلیل ورسوا کیا گیا کہ تنگ آکر انہوں نے خودکشی کرلی، کلاس میں دوسرے ساتھیوں کے سامنے ان کے کپڑے تک اتروا دیئے گئے، یہ ایسا بیہودہ طریقہ ہے کہ اس کی وجہ سے بعض طلبہ تعلیم سے متنفر ہوجاتے ہیں اور ان میں مجرمانہ نفسیات اور منتقمانہ جذبات پروان چڑھنے لگتے ہیں، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ کا ذکر مناسب ہوگا، میں ایک دینی درسگاہ میں تعلیمی امور کا ذمہ دار تھا اور میرے سامنے ہی دوسری جانب حفظ قرآن کی جماعتیں تھیں، اکثر میں اساتذہ سے گذارش کیا کرتا تھا کہ وہ بچوں کی سرزنش میں اعتدال سے کام لیں، اس کے نتیجے میں بعض لوگوں نے مار پیٹ کرنے کے بجائے بچوں کو مرغا بنانا شروع کردیا، ایک دن میں نے ایک معصوم کمسن بچہ کو دیکھا کہ کافی دیر سے مرغا بنا ہوا ہے، آخر مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے اس بچہ کو بٹھادیا اور استاذ صاحب کو دفتر میں بلاکر ان سے عرض کیا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی برکت سے اس امت پر مسخ کا عذاب نازل نہ ہوگا، اگر لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے کہ خود دینی مدارس میں مسخ کا عذاب باقی ہے اور انسان کو مرغا بنادیا جاتا ہے؛ اس لئے ایسی باتوں سے بچنے کی کوشش کیجئے، مگر اتنی نرمی سے جو بات کہی گئی، وہ بھی انہیں گوارا نہ ہوئی اور انہوں نے برا مان لیا کہ مار پیٹ بھی نہ کریں اور مرغا بھی نہ بنائیں تو آخر انہیں کیسے پڑھایا جائے؟ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کا اندازِ فکر یہ ہے کہ بچے مار پیٹ ہی سے پڑھ سکتے ہیں اور جتنی مار پیٹ ہوگی، اتنی ہی پڑھنے میں دلچسپی ہوگی، وہ اس بات کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ یہی مار پیٹ میں بے اعتدالی تعلیم سے نفرت اور کوچۂ علم سے فرار کا سبب بھی بن جاتی ہے اور یہ کہ کسی شخص کو اس کی ذہنی صلاحیت و استعداد سے زیادہ عمل پر مجبور کرنا نہ اصول صحت کے اعتبار سے درست ہے اور نہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔

اس کے برعکس دوسری سوچ یہ ہے کہ بچوں کو بالکل سزا نہ دینی چاہئے، نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کیا

جائے، کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہ ہو، آج کل مغرب میں اس تصور کو قبول عام حاصل ہے، گذشتہ دنوں سپریم کورٹ نے بھی اس سلسلہ میں ہدایت دی ہے کہ بچوں کی کسی قسم کی سرزنش نہیں کی جائے، ابھی 'جولازمی حق تعلیم قانون' آیا ہے، اس میں بھی باضابطہ یہ بات شامل کی گئی ہے کہ بچوں کی جسمانی سرزنش یا ان کو ذہنی اذیت پہنچانے کی اجازت نہیں ہوگی اور ''ذہنی اذیت'' کا لفظ اتنا عام ہے کہ معمولی ڈانٹ ڈپٹ بھی اس کے زمرہ میں آسکتی ہے، یہ نقطۂ نظر بھی پہلے نقطۂ نظر سے کچھ کم غلط نہیں ہے؛ کیوں کہ اصلاح کے جن محرکات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے پہلے دو محرکات، یعنی عقل و شعور کی پختگی اور آخرت میں جواب دہی کا احساس عام طور پر بچوں میں نہیں پایا جاتا، اب دو محرکات رہ جاتے ہیں، ایک: شوق اور دوسرے: خوف، شوق ترغیب دینے سے پیدا ہوتا ہے، جب کسی بات کی بار بار ترغیب دی جاتی ہے تو شوق کے جذبات کروٹ لیتے ہیں، ترغیب کے مختلف طریقے ہوسکتے ہیں، انعام دینا، اعزاز دینا، اچھے نمبرات دینا، تعریف وتحسین کے کلمات کہنا، طلبہ میں مسابقت کے جذبات کو پیدا کرنا وغیرہ، جہاں تک ممکن ہو طلبہ کو تعلیم کی طرف راغب کرنے اور ان میں تہذیب وشائستگی پیدا کرنے کی غرض سے ان وسائل کو اختیار کرنا چاہئے، مغربی ملکوں میں عام طور پر ان سے کام لیا جاتا ہے اور اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے ہمارے ملک میں بھی عیسائی مشنریز کے اسکولوں میں ترغیبات کی طرف توجہ دی جاتی ہے اور یہ اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو دعوت دین کی مہم پر بھیجا تو ہدایت دی: **''بشروا ولا تنفروا ویسروا ولا تعسروا''** (**صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب في الأمر بالتيسير وترك التنفير**، حدیث نمبر: ۴۶۲۲، **سنن أبي داؤد**، حدیث نمبر: ۴۸۳۷، **عن أبي موسى** رضی اللہ عنہ) یعنی دین کو آسان بنا کر پیش کرو نہ کہ دشوار، اور خوش خبری اور ترغیب سے کام لو، ایسی بات نہ کہو جو تنفر اور دوری کا سبب ہو۔

لیکن بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے لئے شوق دلانا بے سود ہوتا ہے، ترغیبات ان کے لئے کافی نہیں ہوتیں، ایسے موقع پر ترہیب کی اور ایک گونہ خوف پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اگر انسان میں یہ عنصر نہیں ہوتا تو شریعت میں سزائیں مقرر نہیں کی جاتیں اور انسانی سماج میں جرم وسزا سے متعلق قانون کی ضرورت نہیں ہوتی؛ لیکن مہذب انسانی معاشرہ میں بھی امن وامان کو قائم رکھنے، ظلم و تعدی پر قابو رکھنے اور برائیوں کے سد باب کے لئے ایسے قانون کی ضرورت پڑتی ہے، جو مجرموں کے

ہاتھ تھام سکے؛اس لئے ضروری ہے کہ حسب ضرورت بچوں کی فہمائش اور حد اعتدال کے اندر سرزنش کی اجازت دی جائے، جیسے مریض کا آپریشن اس کے ساتھ دوستی ہے نہ کہ دشمنی، اور جیسے بیماروں سے پرہیز کرانا اور انہیں معمولی غذا کھلانا خود ان ہی کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہے نہ کہ نقصان پہنچانا مقصود ہے، اسی طرح بچوں کی سرزنش؛ تا کہ وہ صحیح طور پر تعلیم حاصل کر سکیں، وہ بہتر اخلاق کے حامل ہوں، ان میں تہذیب وشائستگی پیدا ہو اور بدتمیزی اور بے ادبی سے اپنے آپ کو بچائیں، یہ خود ان کی اصلاح کا اور ان کے مستقبل کو سنوارنے کا ذریعہ ہے اور اس سے پہلو تہی برتنا ان کے ساتھ دوستی نہیں ہے، دشمنی ہے اور حسن سلوک نہیں ہے، بدسلوکی ہے۔

اسلام اسی نقطۂ اعتدال کا قائل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں نماز کا حکم دو اور دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر تھوڑی بہت مار پیٹ بھی کرو، نیز ان کے بستر الگ کر دو: ''مُرُوْا أَوْلاَدَ كُمْ بِالصَّلاَةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشَرَ سِنِيْنَ'' (سنن أبي داؤد، عن أبي هريرة ؓ، حدیث نمبر: ۴۹۵) اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''**لا ترفع العصا عن أهلك وأخفهم في الله عز وجل**'' (**المعجم الأوسط للطبراني**، حدیث نمبر: ۱۸۶۹، **المعجم الصغير للطبراني**، حدیث نمبر: ۱۱۴) یعنی ''بال بچوں سے لکڑی بالکل ہٹا ہی نہ دو اور انہیں اللہ سے ڈراتے رہو''، اسی طرح ایک اور روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسی جگہ کوڑا لٹکا کر رکھ، جہاں بچے دیکھ سکیں کہ یہ ان کے لئے ادب ہے: ''**علقوا السوط حيث يراه أهل البيت فإنه لهم أدب**'' (**المعجم الكبير للطبراني**، حدیث نمبر: ۱۰۶۷۱، ۱۰۶۶۹، ۱۰۶۷۰)

اسی لئے فقہاء نے والدین کو تعلیم وتربیت کے لئے اعتدال میں رہتے ہوئے سرزنش کی اجازت دی ہے؛ بشرطیکہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ چلے: ''**وللأب والوصي ضرب الصغير للتأديب... لأن التأديب قد لا يقع بالزجر والتحريك**'' (**البحر الرائق**: ۷/۳۰۹، **باب ما يجوز من الإجارة**) اور جب والد بچے کو کسی استاذ کے حوالہ کرے اور اسے اجازت دے کہ وہ تربیت کے لئے اس کی سرزنش بھی کر سکتا ہے تو وہی حق استاذ کو بھی حاصل ہوگا، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے: ''**لأن الضرب لإصلاح الصغير متعارف، وفيه منفعة له، فكان كضرب**

المعلم، بل أولی" (**البحر الرائق**:۸ / ۱۷)—— البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ سرزنش حد اعتدال سے بڑھنے نہ پائے، حد اعتدال سے مراد یہ ہے کہ جسم پر ورم نہ آئے، نشان نہ پڑ جائے، چمڑے کے چھل جانے یا ہڈی کے ٹوٹ جانے کی نوبت نہ آئے، جسم کے نازک حصوں پر مارا نہ جائے، ایسی سزا نہ دی جائے جو بچہ کی عمر اور اس کی صحت کے لحاظ سے ناقابل برداشت ہو، گالی گلوج نہ کیا جائے، بچوں کی تذلیل اور توہین نہ ہو، فقہاء نے کتاب وسنت کی روشنی میں تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ شوہر کو کس حد تک بیوی کی تادیب کا حق حاصل ہوگا اور لکھا ہے کہ کپڑے یا مسواک سے مار سکتا ہے اور وہ بھی چہرے وغیرہ پر نہیں، نیز یہ اجازت بھی آخری درجہ میں ہے، جب کہ پند وموعظت سے کام نہ چلے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بچوں کو کس حد تک سزا دی جاسکتی ہے؟

غرض کہ اس مسئلہ میں اعتدال اختیار کرنے کی ضرورت ہے، نہ ایسی بے رحمانہ سزا ہو جو جذبۂ انتقام کو ظاہر کرتی ہو، نہ استاذ کے ہاتھ اس قدر باندھ دئے جائیں کہ شریر بچوں کو کنٹرول کرنا اور ان کو تعلیم پر لگانا ان کے لئے دشوار ہو جائے۔

❁

دعوت وتبلیغ دین

راستے بند ہیں سب کوچۂ دعوت کے سوا!

قرآن مجید کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کا یہ مقام ومرتبہ رکھا ہے کہ وہ دوسرے تمام افکار ومذاہب پر غالب رہے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصّف: ۹) مخالف اسلام طاقتیں اسلام کے رخ روشن پر کتنا بھی غبار ڈالنا چاہیں، اللہ تعالیٰ اسلام کی روشنی کو مکمل کر کے رہیں گے: ﴿ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (الصّف: ۸) یہ یقیناً اللہ کا نوشتہ ہے، جو ماضی میں بھی پورا ہوتا رہا ہے اور مستقبل میں انشاء اللہ بھی پورا ہوتا رہے گا؛ لیکن کسی چیز کے غالب آنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: ایک: اندرونی طاقت، دوسرے: وہ ہتھیار، جس کو وہ استعمال کرتا ہے — سوال یہ ہے کہ وہ طاقت کیا ہے جو اسلام کو غلبہ عطا کرتی ہے؟ اور وہ ہتھیار کیا ہے، جس کو اسلام کے غلبہ کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے؟

اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام کی سب سے بڑی طاقت اس کی فطرت اور عقل سے ہم آہنگ تعلیمات ہیں، جن کو قرآن مجید میں ﴿ اٰيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾ یعنی کھلی ہوئی دلیلوں سے تعبیر کیا گیا ہے، اسلام کے بنیادی افکار نہایت سائنٹفک اور منطقی ہیں، مثلاً توحید اور آخرت کے تصور ہی کو لے لیجئے، وہ ایسے خدائے واحد کی طرف انسانیت کو بلاتا ہے، جو بے حد طاقتور، مہربان اور باخبر ہے، وہ ان بتوں کی پرستش سے منع کرتا ہے، جن کو انسان اپنے ہاتھوں سے بنالیتا ہے اور بہت سی دفعہ اپنے ہاتھوں سے پانی میں ڈال بھی دیتا ہے، ایسی خود ساختہ چیزوں کو خدا کہنا خود اپنے بیٹے کو باپ، اور اپنے غلام کو مالک کہنے کے مترادف ہے، اس لئے توحید کا عقیدہ سو فیصد عقل کے مطابق ہے، اسی طرح انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ انسان کو اس کے اچھے اور بُرے عمل کا بدلہ ملے؛ اسی لئے زمانۂ قدیم سے ہر مہذب سماج میں عدالتی نظام قائم رہا ہے، قرآن نے اس سلسلہ میں آخرت کا تصور پیش کیا ہے، یہ تصور پوری طرح فطرت انسانی کے مطابق ہے، اس کے علاوہ یہ عقیدہ انسان کو اس وقت بھی ظلم سے بچاتا ہے، جب کوئی دیکھنے والی آنکھ اور ٹوکنے والی زبان موجود نہیں ہوتی، غرض کہ عقیدہ وایمان کا مسئلہ

ہو یا عبادات کا، معاشرتی زندگی کے قوانین ہوں یا معاشی نظام سے متعلق اصول، یا بین ملکی و بین قومی تعلقات، ہر جگہ اسلامی تعلیمات عدل واعتدال پر مبنی، انسانی فطرت سے ہم آہنگ، اور سماجی مصلحتوں سے مطابقت رکھنے والی ہیں، اسلام کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ کے عہد کے کفار ومشرکین اس دور کے اور اس دور کے یہود ونصاریٰ یا دوسری اسلام دشمن طاقتوں کو کبھی یہ ہمت نہیں پڑی کہ وہ اپنے مذہبی اور قومی افکار کا مقابلہ اسلامی تعلیمات سے کریں؛ بلکہ انہوں نے ہمیشہ ہارے ہوئے حریف کی طرح پروپیگنڈے سے کام لیا، عہد نبوی ﷺ کے دشمنان اسلام پیغمبر اسلام ﷺ کے جادوگر اور شاعر ہونے کا پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے، صلیبی جنگوں کے درمیان عیسائیوں نے یہاں تک پروپیگنڈہ کیا کہ کعبۃ اللہ میں ایک بت ہے اور محمد ﷺ اس کی پرستش کرتے ہیں، صلیبی جنگوں کے بعد چونکہ اس طرح کے پروپیگنڈے خود عیسائی عوام کے نزدیک مضحکہ خیز اور ناقابل قبول ہوئے؛ اس لئے مستشرقین نے کچھ نئی افترا پردازیاں کیں، اور موجودہ دور میں بلا دلیل اسلام کے شدت پسند، اور دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے، اور صورت حال یہ ہے کہ عالم اسلام کی بزدلی، کم حوصلگی، ہوس اقتدار، غیرت دینی، اور حمیت ملی سے محرومی کی وجہ سے مغرب اس مقدمہ میں مدعی بھی ہے، اور منصف بھی؛ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کی اندرونی طاقت جو کل تھی وہی آج بھی ہے، مسلمانوں کی اپنے دین کی طرف رغبت، اور مختلف ملکوں میں قبول اسلام کی طرف رجحان یہ اسی طاقت کا اثر ہے، ورنہ تو ذرائع ابلاغ نے اسلام کو اس درجہ بدنام کر رکھا ہے کہ کوئی شخص پلٹ کر بھی اسلام اور مسلمانوں کی طرف نہیں دیکھتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کون سا ہتھیار ہے جو غلبۂ اسلام کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرسکتا ہے؟

آج کا دور صبح وشام ہتھیاروں کی تیاری کا دور ہے، ایسے آتشیں ہتھیار تیار ہو چکے ہیں کہ لمحہ بھر میں ایک شہر تو کیا ایک ملک کو جلا کر خاکستر کردے، پانی کو تھامے ہوئے کسی ڈیم پر ایک بم گرادیا جائے اور پورا پورا شہر طوفان نوح کی طرح غرقاب ہوجائے، ایسے کیمیائی ہتھیاروں سے اسلحہ کا گودام بھرا ہوا ہے کہ لمحہ بھر میں آبادی کی آبادی چھلنی ہوجائے اور شہر کا شہر زندہ لاشوں کا قبرستان بن جائے، آج مغرب سے مشرق تک ان خوں آشام ہتھیاروں کی نمائش ہورہی ہے، اور نہ جانے کب تک انسان کشی کا یہ کھیل کھیلا جاتا رہے گا؛ لیکن اسلام کو کبھی ایسے ہتھیاروں سے غلبہ حاصل نہیں ہوا، جب مکہ کے افق

سے ایمان کا سورج طلوع ہوا اس روشنی کا سرچشمہ صرف ایک ہستی تھی، پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ہستی، پھر اس قافلہ میں کچھ خوش نصیب شامل ہوتے گئے؛ لیکن ہجرت تک یہ ایک نہایت کم تعداد اقلیت تھی، پھر مدنی زندگی کے ابتدائی پانچ سال اس طرح گذرے کے بعض صحابہ جب سوتے تھے تو اپنے بستر میں تلوار رکھ کر سوتے تھے کہ مبادا دشمن حملہ آور ہوجائیں، قرآن مجید نے مسلمانوں کی صورت حال کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ وہ خوف زدہ رہتے تھے کہ کہیں انہیں اچک نہ لیا جائے؛ اس لئے ہے کہ حقیقت یہ اسلام کو کہیں بھی اپنی سربلندی اور غلبہ وظہور کے لئے ہلاکت خیز ہتھیاروں کی ضرورت نہیں پڑی، دنیا کے جس خطے میں مسلمان پہنچے کم وبیش ان کی یہی صورت حال رہی، وہ ایک مختصر سے قافلہ کی صورت میں پہنچے، اور دیکھتے دیکھتے وہ اس ملک پر ابر رحمت بن کر چھا گئے۔

یہ کون سا ہتھیار تھا، اور اس کو کس کارخانے میں ڈھالا گیا تھا؟ یہ ہتھیار دعوت دین کا تھا، جسے حسن اخلاق سے صیقل کیا جاتا تھا، یہ ہتھیار زمینوں کو نہیں دلوں کو فتح کرتا تھا، یہ ملکوں کا نہیں دماغوں کا خریدار تھا، اس کا تخت اقتدار خاک و سنگ کی زمین سے پہلے قلب ونظر کی زمین پر بچھا کرتا تھا، مردوں اور عورتوں کو قیدی نہیں بناتا تھا؛ بلکہ محبت کا سوداگر تھا، اور دل ونگاہ کو اپنا اسیر بنالیتا تھا، اسی ہتھیار سے اسلام نے جزیرۃ العرب کو فتح کیا تھا، ہجرت کے آٹھویں سال جب آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے ساتھ صرف دس ہزار جان نثار تھے، مکہ کو خون بہا کر فتح نہیں کیا گیا؛ بلکہ محبت کی سوغات بانٹ کر جیتا گیا، کسی کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا؛ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کے عفو ودرگزر اور انسانیت نوازی سے متاثر ہوکر قریب قریب پورا مکہ مسلمان ہوگیا، اس کے بعد مسلمانوں نے یکسو ہوکر دعوت اسلام کی طرف توجہ کی اور صرف دو سال کے بعد جب حجۃ الوداع کے موقع سے آپ ﷺ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو تقریباً سوا لاکھ رفقاء آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے، اسی طرح اسلام کی روشنی مشرق اور مغرب میں پھیلتی گئی، گھٹائیں چھٹتی گئیں اور ظلمت کفر کی دبیز چادر اسلام کے رخ روشن کے سامنے تار تار ہوتی گئی، یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ نہ اسلام کے پیچھے تلوار تھی، نہ توپ وتفنگ، نہ جنگی جہاز تھے، نہ بم اور میزائل تھے، یہ صرف دعوت دین کا ہتھیار تھا، جس نے دشمنوں کے جسموں کو نہیں، دلوں کو جیت لیا۔

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کہلایا گیا کہ میرا اور میرے پیروکاروں کا اصل ہتھیار

دعوت ہے، میرا طریق یہی ہے کہ اللہ کے بندوں کو اس کے مالک کی طرف اور کفر کی تاریکی سے ایمان کی روشنی کی طرف بلائیں، اور میری یہ دعوت پورے شعور، گہرے فہم، اور علمی بصیرت پر مبنی ہو ﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ﴾ (یوسف: ۱۰۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکی زندگی میں مخالفین اسلام سے مقابلہ کا یہی گر بتایا گیا کہ آپ حکمت اور دردمندانہ نصیحت کے ساتھ خدانا آشنا لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف بلائیں اور ان سے مذاکرہ بھی کریں اور اس مذاکرہ ومکالمہ میں صرف بہتر طریقہ کا استعمال کافی نہیں؛ بلکہ سب سے بہتر اور خوب تر طریقۂ کار کو برتیں: ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (النحل: ۱۲۵)

اس کے برخلاف اگر امت دعوت کے کام کو چھوڑ دے تو چاہے وہ بظاہر کتنے ہی مظلوم ہوں وہ پیغام حق کو نہ پہنچا کر انسانیت کے ساتھ ظلم کا ارتکاب کرنے والی ہے امت اور قرآن مجید نے واضح اعلان کر دیا ہے کہ ظالموں کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی ﴿ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (الانعام: ۲۱، ۱۳۵، یوسف: ۲۳، القصص: ۳۷) قرآن مجید نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس امت کو بھیجا ہی گیا ہے اور اس کو 'بہترین امت' کے مقام سے نوازا ہی گیا ہے؛ اس لئے کہ وہ بھلائی کا حکم دے، اور برائی سے روکے (آل عمران: ۱۱۰) یہ اس امت کو برپا کرنے کا مقصود ہے، بات خدائی منصوبہ کا حصہ ہے کہ جو کام پچھلے پیغمبروں سے لیا گیا ہے، وہی کام اس امت سے لیا جائے، اب اگر کوئی چیز اپنے اصل مقصد کے لئے کارگر نہ رہے تو کیا وہ باقی رہنے اور عزت پانے کی مستحق ہے؟ انسان کو ماں باپ، بال بچے، شوہر اور بیوی سے کتنا پیار ہوتا ہے؛ لیکن جب وہ موت کے منھ میں چلے جاتے ہیں تو کوئی ان کو اپنے گھر میں نہیں رکھتا ہے، اس کی جگہ قبرستان ہوتی ہے، بلب اور ٹیوب لائٹ کو انسان اپنے دیوار کی زینت بناتا ہے اور اپنے سروں پر رکھتا ہے؛ لیکن اگر یہ خراب ہو جائیں اور روشنی دینا چھوڑ دیں تو پھر اس کی جگہ ڈسٹ بین ہوتی ہے، ملت اسلامیہ کی صورت حال اس وقت یہی ہے، ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے اس کو ڈسٹ بین میں ڈال دیا ہے، جن کا کام اور جن کا نام عالم انسانی کے افق پر عزت وسربلندی کی علامت سمجھا جاتا تھا، اور جن کی فتح وکامیابی کا غلغلہ مشرق سے مغرب تک تھا، وہ آج اس مقام پر ہیں کہ شاید رسوائی اور نامرادی میں کوئی قوم ان کی ہمسر نہ ہو۔

ہندوستان کے موجودہ حالات ہمارے لئے تازیانۂ عبرت ہیں، ایک ہزار سال تک مسلمانوں

نے یہاں اس طرح حکومت کی کہ کوئی طاقت ان کو چیلنج کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی؛ لیکن انہوں نے یہ پورا وقت اقتدار کے محل کو مضبوط کرنے اور بنانے سنوارنے میں صرف کر دیئے اور چند مشائخ ربانی اور ایک دو نیک دل بادشاہوں کے علاوہ کسی نے اشاعت اسلام کی طرف توجہ نہیں دی؛ یہاں تک کہ علماء کی بھی ایک بڑی تعداد مناظرہ بازیوں اور باہمی آویزشوں کے نشہ میں مست رہی، پھر برطانوی استعمار کا ایک کوڑا قدرت کی جانب سے لگایا گیا، جو کم وبیش دوسو سال ہم پر مسلط رہا، تقریباً اس دوسو سال کے عرصہ میں کچھ تو حالات کے تقاضے کے تحت اور کچھ طویل عرصہ سے بنے بنائے مزاج کے تحت دعوت اسلام کی طرف توجہ نہیں دی گئی، غالباً اس سے صرف سید احمد شہیدؒ کے بعض خلفاء کا استثناء ہے، جنہوں نے برادران وطن میں تبلیغ کی خدمت انجام دی، اب ملک کی آزادی کو ساٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے، عیسائی بھائیوں نے اس وقفہ میں عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کی مہم چلائی، اور اس عرصہ میں انہوں نے کئی ریاستوں کے نقشے بدل کر رکھ دیئے؛ لیکن آہ! اور صد آہ! ہماری غفلت کوشی اور خود فراموشی؛ کہ ہم اب بھی بیدار نہیں ہوئے؛ یہاں تک کہ فرائض دین میں دعوتِ اسلام اس کا ذکر تک باقی نہیں رہا، جو مسلمانوں پر عائد ہونے والا سب سے پہلا فریضہ تھا اور جو اس کا مقصد وجود تھا۔

قرآن نے دعوت دین کی ایک خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ یہ نفرت کو محبت سے تبدیل کر دیتی ہے: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ (حم سجدہ: ۳۴) اس لئے مسلمان اس ملک میں جس صورت حال سے دو چار ہیں، اس کا مستقل، مؤثر اور دیر پا حل یہی ہے کہ جیسے سیاست داں الیکشن کے موسم میں الیکشن کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں؛ اسی طرح مسلمان اس کو اپنے لئے اوڑھنا بچھونا بنالیں، اپنے غیر مسلم پڑوسیوں سے باتیں کیجئے، مسلمان ڈاکٹر غیر مسلم مریضوں تک اسلام کو پہنچائے، تاجر ہے تو وہ گاہکوں کو دین حق سے روشناس کرائے، معالج ہو تو مریضوں کو اللہ کے دین کی طرف بلائے، افسر ہو تو اپنے ملازمین کے سامنے اسلام کی حقیقت کو واضح کرنے کسی بھی پیشے سے متعلق ہو، اپنے ہم پیشہ تک دین اسلام کی بات پہنچائے، سفر میں ہو تو مسافر ساتھیوں سے دینی گفتگو کرے، غرض کہ ہم محبت، حکمت، جذبۂ خیر خواہی اور بے لوث خدمت کے سہارے برادران وطن کے دلوں تک پہنچے، اور اس فریضہ کو ادا کریں، جس کے لئے اللہ نے ہمیں نہ صرف انسان کی اس بستی میں بسایا ہے؛ بلکہ اپنے پیغمبر کا جانشیں بنایا ہے، گذشتہ تقریباً دو دہائی سے

خاص کر بابری مسجد کی شہادت کے سانحہ کے بعد سے مختلف تنظیمیں اور مختلف شخصیتوں نے دعوت کے کام کی طرف جوتوجہ دی ہے، بحمد اللہ اس کے بڑے مثبت اثرات ظاہر ہورہے ہیں؛ اس لئے اگرچہ یہ کام بظاہر دشوار گزار معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اتنا مشکل بھی نہیں کہ جتنا لوگوں نے سمجھ لیا ہے، وقت آگیا ہے کہ ہر مسلمان اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے اور غور کرے کہ کیا اس نے اس فریضۂ منصبی کو ادا کرنے کی ذرا بھی کوشش کی ہے؟ اور عزم کرے کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اس فراموش کردہ فریضے کو انجام دے گا، اگر مسلمانوں کی آبادی اس ملک میں بیس فیصد ہے اور ہر شخص اپنے چار غیر مسلم بھائیوں تک اسلام کو پہنچائے تو جن کے لئے ہدایت مقدر ہوگی، ان کو ہدایت نصیب ہوگی، جن کے لئے ہدایت مقدر نہیں تو کم سے کم نفرت اور دشمنی کا ٹمپریچر تو کم ہوگا ہی، اور اگر بالفرض ایسا بھی نہ ہوسکا تو پھر مسلمانوں کے ساتھ نصرت غیبی کا ظہور ہوگا، اور جو لوگ ضد اور بے جا عداوت پر مصر ہوں گے، ان کے ساتھ اللہ کی پکڑ ہوگی، یہ خدا کا غیبی نظام ہے جس پر انبیاء اور ان کی اقوام کے واقعات اور قرآن مجید کی واضح تعلیمات گواہ ہیں، کاش! ہمیں ایسے کان میسر ہوں جو اس ندائے غیبی کو سن سکیں، اور ایسے دل میسر ہوں جو بندگان خدا کے دوزخ کی طرف بڑھتے ہوئے قدم پر اسی طرح بے چین ہوجائیں، جیسے اللہ کے نبیوں اور پیغمبروں کے ہوجایا کرتے تھے، وباللہ التوفیق۔

ایک اور ریلیف کی ضرورت!

(برادرانِ وطن میں دعوت)

گذشتہ ایک دو ماہ میں دو ایسے واقعات پیش آئے ہیں، جنھوں نے بجا طور پر ہندوستان میں سب سے زیادہ لوگوں کی توجہ حاصل کی ہے، دونوں واقعات کی نوعیت بالکل الگ الگ ہے، ایک کا تعلق آسام سے ہے، جہاں اس وقت چار لاکھ پینتالیس ہزار مرد وعورت اور بوڑھے، بچے کیمپوں میں پناہ گزیں کی زندگی گذار رہے ہیں، ان میں زیادہ تر مسلمان ہیں یا ان کے ساتھ کچھ غیر بوڈو بنگالی اور سنتھالی ہندو ہیں؛ لیکن ایک لاکھ سے زیادہ بوڈو قبیلے کے لوگ ہیں، جن میں مذہبی اعتبار سے بیشتر عیسائی ہیں، بارش کے اس موسم میں اپنے مکانات سے محرومی، غذائی اشیاء کی قلت، اشیاء ضروریات کی عدم فراہمی اور سب سے بڑھ کر بے سہارگی اور بے اطمینانی ان پر جو قیامت ڈھا رہی ہوگی، وہ محتاج بیان نہیں ہے، قتل وخون کا بازار بھی گرم کیا گیا اور کچھ درندہ صفت لوگوں کی طبیعت چراغوں اور قمقموں سے سیر نہیں ہوتی؛ اس لئے انھوں نے مکانات کو جلا کر اور در ودیوار کو سلگا کر دیوالی منائی ہے، شاید اس لئے کہ اگر انسانوں کے لہو سے کھیل کر اور پوری پوری بستی جلا کر جشن طرب نہ منایا ہوتا تو اس کو کوئی شہرت حاصل نہیں ہوتی اور ''بدنام نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟'' کے مصداق اخبار کی سرخیوں میں ان کا نام نہ آپاتا، آہ یہ مظلوموں کا لہو، ہائے بیواؤں کے گرم آنسو اور معصوم بچوں کا نالہ وفغاں، مگر جب انسان انسانیت کا لباس اتار پھینکتا ہے اور اس میں درندگی سما جاتی ہے تو اس کے ظلم و جور کو دیکھ کر درندے بھی پانی پانی ہوجاتے ہیں اور شاید شیاطین بھی اس کے کارناموں پر دم بخود رہ جاتے ہوں گے۔ ﴿وَإِلَى اللهِ الْمُشْتَكَى﴾

دوسرا واقعہ گجرات سے متعلق ہے، یوں تو نریندر مودی نے ۲۰۰۲ء میں پورے گجرات کو مسلمانوں کا مقتل بنا دیا تھا اور ابھی بھی اس سلسلہ میں کئی مقدمات چل رہے ہیں؛ لیکن حال ہی میں 'نروڈہ پاٹیا' قتل عام کیس کا فیصلہ ہوا ہے، جس میں اکتیس (۳۱) مجرمین کو عمر قید کی سزا دی گئی ہے، خاص

بات یہ ہے اس وقت کی وزیر اور موجودہ بی جے پی رکن اسمبلی مایا کوڈنانی کو ۲۸؍سال کی اور بجرنگ دل کے لیڈر بابو بجرنگی پوری زندگی کے لئے جیل کی سزا دی گئی ہے، نیز معزز عدالت نے نروڈہ پاٹیا سانحہ کو ہندوستانی آئین کی تاریخ کا سیاہ ترین دن قرار دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ۹۷ بے قصور اور نہتے مسلمانوں کے قتل کے مقابلہ یہ سزا ابھی ناکافی ہے، دراصل ان سب کو پھانسی پر لٹکایا جانا چاہئے تھا، اور جن کو شبہ کا فائدہ دے کر بری کیا گیا، انہیں بھی مناسب سزائے قید ملنی چاہئے تھی؛ لیکن ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے مجرموں کے ساتھ جو پہلو تہی کی جاتی رہی ہے، اس لحاظ سے یقیناً یہ فیصلہ خوش آئند ہے اور اس سے عدالت پر مظلوموں کا اعتماد بڑھا ہے۔

ان دونوں واقعات پر اخبارات میں خوب لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے، جہاں اردو اور سیکولر اخبارات آسام کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و جور کا ذکر کر رہے ہیں اور گجرات فسادات سے متعلق فیصلے کا خیر مقدم کر رہے ہیں، وہیں بعض فرقہ پرست ہندی اخبارات آسام کی صورت حال کا قصوروار بنگلہ دیش سے آئے ہوئے مسلمانوں کو قرار دے رہے ہیں اور گجرات فسادات فیصلہ پر بھی انہیں اعتراض ہے، یہ فسادات منصوبہ بند تھے یا اتفاقی طور پر فساد کی آگ بھڑک اٹھی؟ یہ حالات کا رد عمل تھے یا پروگرام کے تحت فساد کرایا گیا؟ ان فسادات میں حکومت کی غفلت اور پولیس کی جانبداری اور ناکارگی کا کتنا دخل تھا؟ اس کے پیچھے کیا سیاسی محرکات کارفرما تھے؟ آئندہ الیکشن میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے اور کونسی سیاسی پارٹیاں انسانی لاشوں پر کھڑی ہو کر اپنا قد اونچا کریں گی؟ اس پر تبصروں کا سلسلہ جاری ہے اور مختلف تجزیے سامنے آرہے ہیں، ریلیف کا کام بھی جاری ہے اور بحمد اللہ ملک کے کونے کونے سے مظلومین آسام کیلئے امداد پہنچ رہی ہے، مسلمان تو اسلامی اخوت کے تقاضے سے اس ملی فریضہ کو ادا کر ہی رہے ہیں؛ لیکن بعض دوسری رفاہی تنظیمیں بھی اس سلسلہ میں سرگرم ہیں۔

مگر اس وقت ایک دوسری جہت پر غور کرنے کی ضرورت ہے، گجرات میں مسلمان کوئی پچاس، سو دو سال سے نہیں ہیں؛ بلکہ کم وبیش ایک ہزار سال سے یہاں مسلمان آباد ہیں، گجرات میں اسلام عربوں کے ذریعہ پہنچا، قدیم عرب سیاحوں اور مؤرخوں کے یہاں بھڑوچ اور گجرات کے مختلف شہروں کے نام ملتے ہیں، ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ گجرات کے سلاطین میں انصاف پرور اور دیندار شخصیتیں زیادہ تھیں، آسام میں اگرچہ اسلام بعد کو اور غالباً خلجیوں کے عہد میں پہنچا؛

لیکن یہاں بھی کئی صدیوں سے مسلمان آباد ہیں اور اس وقت بھی کشمیر کے بعد مسلمانوں کی آبادی کا تناسب سب سے زیادہ آسام میں ہے؛ لیکن کیا بات ہے کہ اتنا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود مسلمان ایک مظلوم اقلیت کی حیثیت سے جی رہے ہیں اور ان کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں، اس پر ٹھنڈے دل اور گہری سوچ کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

نبوت محمدی کا سورج مکہ میں طلوع ہوا، ایک بہت ہی کم تعداد اقلیت کی صورت میں اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا، ان پر ظلم وجور کے پہاڑ توڑے گئے اور اذیت رسانی کی کوئی صورت نہ تھی، جو ان پر روا نہ رکھی گئی ہو؛ لیکن مسلمان اخلاق ومحبت کے ذریعہ دلوں کو فتح کرتے چلے گئے اور ایک صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ تک مسلمانوں کے قدم پہنچ گئے، اسپین، ہندوستان اور ایک دو چھوٹی موٹی جگہوں کے علاوہ مسلمان جہاں بھی گئے یا تو وہ پورا خطہ دامن اسلام میں آ گیا یا کم سے کم وہ مسلم اکثریت علاقہ بن گیا، موجودہ ایران اور افغانستان وہ علاقے ہیں، جو شرک کی آماجگاہ تھے اور جنہوں نے تاریخ میں اسلام سے پہلے کبھی کسی الہامی مذہب کو قبول نہیں کیا؛ لیکن اسلام نے ان کے دل ودماغ اس طرح فتح کئے کہ ہمیشہ کے لئے ان کی تقدیر اسلام سے وابستہ ہوگئی، یہ فوجی طاقت، اسلحہ کی قوت اور عسکری مہارت کا نتیجہ نہیں تھا؛ بلکہ یہ نتیجہ تھا اسلام کی دعوت اور حق کی شہادت کا، جس پر اس امت کو مامور کیا گیا ہے، طاقت کے ذریعہ زمینیں فتح کی جاسکتی ہیں، قلعوں کو مسخر کیا جاسکتا ہے، مال وزر چھینے جاسکتے ہیں، انسانی خون کی ندیاں بہائی جاسکتی ہے اور شہر اجاڑے جاسکتے ہیں؛ لیکن اس کے ذریعہ دل کی دنیا کو فتح نہیں کیا جاسکتا۔

دل کو جس چیز کے ذریعہ جیتا جاسکتا ہے اور مخاطب کی محبت جس طریقہ پر حاصل کی جاسکتی ہے، وہ ہے دین حق کی دعوت اور اس کے لئے سنجیدہ، نیز مخاطب کا احترام رکھتے ہوئے اور اس کے ساتھ محبت کا سلوک کرتے ہوئے باہمی مکالمہ ومذاکرہ، قرآن مجید نے اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے:

> ''اس سے بہتر بات کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے، نیک عمل کرے اور کہے میں تو سر تسلیم خم کردینے والوں میں سے ہوں O اچھی بات اور بری بات برابر نہیں ہوسکتی؛ لہٰذا (دشمن کو بھی) بہتر طریقہ پر جواب دو، عجب نہیں کہ جس سے تمہاری عداوت ہے وہی گہرا دوست بن جائے'' (حم سجدہ: ۳۳-۳۴)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اولاً تو کرنے کے بہت سے کام اور کہنے کی بہت سی باتیں ہیں؛ لیکن سب سے بہتر کام اللہ کی طرف انسانیت کو دعوت دینا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دعوت دینے کے اس عمل میں جن باتوں کی ضرورت ہے، ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مسلمان اپنے کردار کو بہتر بنائے: ''وَعَمِلَ صَالِحًا'' دوسرے: اس راستہ میں جو بھی حالات پیش آئیں، ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم پر راضی رہے: ''وَقَالَ إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ'' تیسرے: جس کو دعوت دی جاتی ہے، اکثر اوقات اس کی طرف سے منفی ردعمل سامنے آتا ہے؛ کیوں کہ انسان کے لئے آبائی عقیدہ چھوڑنا آسان نہیں ہوتا، بعض دفعہ اس سے جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں، مخاطب زیادتی پر اتر آتا ہے؛ لیکن داعی کا کام یہ ہے کہ کانٹے پھینکنے والوں کو پھول کا ہار پہنائے، وہ نفرت کی چنگاری کو محبت کی شبنم سے بجھادے، وہ لعن طعن کرنے والوں پر محبت کے بول نثار کرے، وہ گالیاں دینے والوں کا دعاؤں سے جواب دے، آنکھیں چڑھانے والوں کو محبت ریز مسکراہٹوں کا تحفہ پیش کرے؛ کیوں کہ نفرت کا رویہ (سیئہ) اور محبت کا رویہ (حسنہ) برابر نہیں ہوسکتا؛ اس لئے برائی کا جواب بھلائی سے دیا جائے: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ — آگے قرآن مجید نے کہا ہے کہ دعوت الی اللہ اور برائی کا جواب بھلائی سے دینے کا فائدہ کیا ہوگا؟ فائدہ یہ ہے کہ تمہارے جانی دشمن جگری دوست بن جائیں گے، نفرت کی آگ کی جگہ محبت کے چراغ جلنے لگیں گے: ﴿فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ یعنی دعوت محبت کا ایک نسخۂ کیمیا ہے، یہ تو ہوسکتا ہے کہ جیسے یرقان کے مریض کو میٹھی چیز کڑوی محسوس ہوتی ہے، اسی طرح کسی کی فطرت مسخ ہوگئی ہوتو اس پر اس کا اثر نہ ہو؛ لیکن ایک سلیم الفطرت انسان میں قدرت کی طرف سے یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ محبت کے ساتھ دی جانے والی دعوت پر یا تو لبیک کہہ دے یا کم از کم اس کی دشمنی اور نفرت کا ٹمپریچر کم ہوجائے۔

مسلمانوں کو اپنے آپ کو دوسرے گروہوں پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، دنیا کی دوسری قومیں یا تو پیغام ربانی سے محروم ہیں یا انہوں نے اسے گم کردیا ہے؛ اس لئے دعوت الی اللہ کی ذمہ داری ان سے متعلق نہیں ہے؛ لیکن امت مسلمہ پیدا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو حق کی طرف بلائے اور باطل سے بچائے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰) حق تو یہ ہے کہ

پوری امت اپنی اپنی صلاحیت اور بساط کے مطابق اس فریضہ کوانجام دے؛لیکن اگرایسا نہ ہوسکے توکم از کم امت میں ایک گروہ ضرور اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے: ﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ﴾ (آل عمران: ۱۰۴) اور قدرت کا نظام یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے مقصد تخلیق کو پورا نہیں کرتی تو یا تو اپنا وجود باقی نہیں رکھتی یا اپنی اہمیت کھودیتی ہے، خود انسان بھی اپنی زندگی میں اسی اصول پر قائم ہے، جو درخت پھل دینا چھوڑ دیتا ہے، اسے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، جو بلب روشنی دینے کے لائق باقی نہیں رہتا، اسے کوڑے دان میں ڈالا یا جاتا ہے، یا تو اس کی جگہ سر کے اوپر تھی یا قدموں میں روندا جاتا ہے، اسی طرح اگر یہ امت اپنے مقصد سے ہٹ جائے تو خطرہ ہے کہ عادۃ اللہ کے مطابق قومیں اسے پامال کرتی رہیں، مسلمان اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے رہیں کہ ان کا خون ناحق بہایا جارہا ہے؛ لیکن وہ خدا کی نظر میں ظالم قرار پائیں؛ کیوں کہ وہ اپنے ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی برت رہے ہیں اور اپنے فریضۂ منصبی سے غافل ہیں۔

آج مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں وہ شاید اسی غفلت وکوتاہی کا خمیازہ ہے اور آج بھی دشمنوں کا دل جیتنے اور نفرت کے کانٹوں کی جگہ محبت کے پھول اگانے کی یہی ایک صورت ہے، ہندوستان میں بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں قبائلی لوگ آباد ہیں، یہ اکثر پہاڑوں، جنگلوں میں بود وباش رکھتے ہیں، ان کا کوئی باضابطہ مذہب نہیں ہے، یہ سادہ لوح بھی ہوتے ہیں اور جو بات سمجھادی جائے، وہ ان کے دل ودماغ پر نقش ہوجاتی ہے، عیسائی مشینریز نے ان قبائلیوں پر تبلیغ عیسائیت کی محنت کی اور انہیں اس میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، بی جے پی اور فرقہ پرست تنظیموں نے اب نیا حربہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ ان سیدھے سادے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اکسا دیتے ہیں، وہ انہیں محرومی کا احساس دلاتے ہیں اور مسلمانوں کو اس کا سبب قرار دیتے ہوئے نفرت انگیز پروپیگنڈے کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں بار بار ایسے فسادات رونما ہوتے ہیں اور خونریزی کا بازار گرم ہوتا ہے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ عیسائیوں سے سبق حاصل کریں، جیسے مسلم تنظیمیں اس وقت مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لئے ریلیف اکھٹا کررہی ہے اور اسے پہنچارہی ہیں وہیں ایک اور ریلیف کی ضرورت ہے اور وہ ریلیف اشیاءِ خورونوش کی نہیں ہے؛ بلکہ پیغام حق وہدایت کی ہے، وہ اجڑی ہوئی دنیا کو بسانے کی نہیں؛ بلکہ اجڑتی ہوئی آخرت کو بسانے کی ہے، یہ ریلیف جسم کی غذا کی نہیں روح کی

غذا کی ہے، یہ ریلیف کاٹن اور پالسٹر کے لباس کی نہیں ہے؛ بلکہ لباس تقوی کی ہے، یہ وہ ریلیف ہے جسے بوڑو بھائیوں اور برادران وطن تک پہنچانے کی ضرورت ہے، ان میں محبت اور پیار تقسیم کرنے کی ضرورت ہے، انہیں اپنے خالق و مالک سے ملانے کی ضرورت ہے، اگر امت اپنے داعیانہ مقام کو پہچان لے اور وہ دعوت اسلام کے فریضہ کو انجام دینے لگے تو برادران وطن کی آنکھوں کا تیر بننے کی بجائے وہ انشاءاللہ ان کی نگاہوں کا نور اور دل کا سرور بن جائے گی۔

کاش ! مسلمان اب بھی جاگیں، جو کچھ کوتاہی ہوچکی ہے، اس کی تلافی کی فکر کریں، وہ برادران وطن کے سامنے مانگنے والا ہاتھ لے کر جانے کی بجائے دینے والا ہاتھ لے کر جائیں، وہ ہدایت سے محروم اور دوزخ کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے بھائیوں کے لئے وہ ریلیف لے کر جائیں، جو خدا نے انہیں اس کے بندوں میں تقسیم کرنے کے لئے عنایت فرمائی ہیں — پھر کیا مسلمان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے مظلوموں اور محروموں تک یہ خدائی ریلیف پہنچانے کو تیار ہیں؟

بے احترامی کا جواب

(غیر مسلم بھائیوں تک قرآن مجید پہنچانا)

اگر کہیں جنگل میں یا کسی آبادی ہی میں مردہ شیر پڑا ہوا ہو اور لوگوں کو اطلاع ہو جائے تو نہ معلوم کتنی بھیڑ وہاں جمع ہو جائے، شاید مجمع کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے پولیس بلانی پڑے، اس تماشہ کو دیکھنے والے ایک سے ایک تبصرے بھی کریں گے، اس کی ہیبت ناکی پر، رنگ و روپ اور خدوخال پر، کچھ من چلے نوجوان چھو کر اور ٹٹول کر بھی دیکھیں گے، ہوسکتا ہے کچھ بچے شیر پر سواری کرنے کا شوق پورا کرنے کے لئے اس کی پشت پر بیٹھ کر تصویریں کھنچانے کی کوشش کریں، اس کے برخلاف اگر کہیں زندہ وسلامت شیر نظر آجائے اور خاص کر کسی آبادی میں گھس جائے تو سوچئے کہ کیا صورتِ حال ہوگی؟ قریب سے دیکھنا اور چھونا تو کجا؟ لوگ دور سے نظارہ کرنے سے بھی گھبرائیں گے، اس کے مقابلہ کے لئے پولیس کو اور اس کو قید کر کے آبادی کو امن سے ہم کنار کرنے کی غرض سے زو (Zoo) کے کارکنوں کو دعوت دی جائے گی، شاید لاؤڈ اسپیکر سے اعلان بھی کرایا جائے کہ لوگ محتاط رہیں اور قریب نہ آئیں۔

یہ فرق اس لئے ہے کہ پہلا شیر مردہ ہے اور دوسرا زندہ، تمام جانداروں میں زندہ و مردہ کے درمیان یہی فرق ہوتا ہے، زندہ گائے ہو تو ہزاروں روپیہ میں فروخت ہوتی ہے، مردار ہو تو وہ مالک کے لئے بوجھ ہو جاتی ہے، وہ خود بھنگی کو پیسے دے کر اسے پھینکواتا ہے، یہاں تک کہ انسان جو اس کائنات کی سب سے قیمتی مخلوق ہے، اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے، اگر وہ مر گیا تو چاہے اپنے ماں باپ، بال بچوں کو کتنا ہی عزیز ہو مگر اس کا گھر میں رہنا گوارہ نہیں کیا جاتا، اسے دفن کر دیا جاتا ہے اور جو لوگ جلانے پر یقین رکھتے ہیں، وہ اسے نذرِ آتش کر دیتے ہیں۔

جو صورتِ حال مادی اعتبار سے زندگی اور موت کی ہوتی ہے، یہی نوعیت معنوی زندگی اور موت کی بھی ہوتی ہے، جن مذاہب کا دور ختم ہو گیا ہے، ان کی مثال ایک مردہ شئ کی ہے، جس میں

تبدیلی اور انقلاب انگیزی کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی، یہی کیفیت ان مذہبی یا الہامی کتابوں کی ہوتی ہے، جو منسوخ ہوچکیں، اب ان کے اندر اس کی طاقت باقی نہیں ہے کہ وہ انسان کے دل و دماغ کو مخاطب بنا سکیں اور اس کے فکر و شعور اور عمل و کردار میں کوئی تبدیلی لاسکیں، اسلام کی مثال پہلے کے مذاہب کے مقابلہ اور قرآن مجید کی مثال گذشتہ مذہبی کتابوں کی نسبت سے یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے مختلف مذاہب کی ماننے والی قوموں نے مذہب کو کچھ رسموں تک محدود کردیا ہے، مذہبی تعلیمات سے اب ان کا کوئی تعلق باقی نہیں۔

مثال کے طور پر سود کھانا، شراب پینا، زنا کرنا اور ہم جنسی کا راستہ اختیار کرنا تمام مذاہب میں ممنوع ہے، عیسائی مذہب میں تو عفت و پاکدامنی کا تصور اتنا عمیق ہے کہ عیسائیت کی آئیڈیل خاتون حضرت مریم کو کسی مرد نے چھوا تک نہیں، حضرت مسیح اور ان کے عزیز حضرتِ یحییٰ علیہ السلام نے شادی بھی نہیں کی؛ لیکن مذکورہ تمام برائیاں آج عالم عیسائیت میں جس کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں، شاید ہی کسی گروہ میں پائی جاتی ہوں اور نہ صرف عملاً وہ اس میں مبتلا ہیں؛ بلکہ انہوں نے قانون کے ذریعہ ان گناہوں کو سندِ جواز بھی دے دیا ہے، یہودی بعض امور میں پابند مذہب سمجھے جاتے ہیں؛ لیکن مغرب میں اکثر بڑے بڑے سودی بینک، شراب خانے اور بے حیائی پر مبنی کلب یہودیوں ہی کے ہیں، ہندو بھائیوں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں، ہندو مذہب بھگوا جھنڈا، پیشانی پر قشقہ، ترشول، کچھ شور شرابہ پر مبنی تہوار اور زیادہ سے زیادہ مورتیوں کی پوجا تک محدود ہوکر رہ گیا ہے، عملی زندگی میں مذہبی کتابوں کی ہدایات اور دھارمک پیشواؤں کی تعلیمات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، بدھسٹوں کا بھی یہی حال ہے؛ بلکہ بدھ دنیا کی اکثریت تو دہریت میں مبتلا ہے، یہ دنیا کے چند بڑے مذاہب کا حال ہے، چھوٹے مذاہب — یعنی جن کے ماننے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے — کی کیفیت بھی اس سے بہت مختلف نہیں ہے۔

اگر اس سے کسی مذہب اور مذہبی کتاب کا استثناء ہے تو وہ ہے شریعتِ محمدی اور قرآنِ مجید، مسلمان باوجود بے شمار کمزوریوں اور کوتاہیوں کے آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ مذہب سے مربوط ہیں، سود کے خلاف اگر کوئی قوم جد و جہد کررہی ہے تو وہ مسلمان ہیں، آج بھی اکثر مسلم ممالک میں قانونی طور پر زنا اور ہم جنسی ممنوع ہے، بہت سے مسلم ملکوں میں شراب پر پابندی ہے، مسلمانوں میں

ان برائیوں کا تناسب بہت کم ہے اور جو لوگ غلبۂ نفس کی وجہ سے اس کے مرتکب ہو جاتے ہیں، ان کی اکثریت اس پر ندامت محسوس کرتی ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل تیزی سے اسلامی اقدار کی طرف لوٹ رہی ہے اور مردوں سے بڑھ کر یہ جذبہ خواتین میں پایا جاتا ہے، نہ صرف مسلمان نوجوانوں میں مذہبی بیداری کا روز بہ روز اضافہ ہوتا جاتا ہے؛ بلکہ مسلمانوں کی طرف سے مطلوبہ حد تک دعوتی کوششوں کے بغیر بھی غیر مسلم بھائیوں میں اسلام قبول کرنے کا رجحان روز افزوں ہے، بہت سے مغربی فوجی افغانستان میں مسلمانوں سے لڑنے کے لئے آئے؛ لیکن خود اسلام نے ان کے دلوں کو فتح کرلیا، یہی صورتِ حال عراق اور فلسطین میں پیش آئی، عیسائی چرچ اپنی تبلیغی مہم پر جتنے وسائل خرچ کرتے ہیں، مسلمان اگر اس کا سوواں حصہ مادی وسائل کا استعمال کرتے تو شاید آدھی سے زیادہ دنیا مسلمان ہو چکی ہوتی، یہاں تک کہ عیسائی دنیا میں مذہبی ادارے اس بات پر ریسرچ کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ کیوں مذہب کی طرف مائل ہے اور اس کے برخلاف ہزار کوششوں کے باوجود ہم اپنے نوجوانوں کو چرچوں کی طرف لانے سے کیوں قاصر ہیں؟

یہ وہ پس منظر ہے، جس کی وجہ سے مشرق سے مغرب تک خدا بیزار اور انسانی زندگی میں مذہب کی حکمرانی کے مخالف لوگ اسلام کی عداوت پر کمر بستہ ہیں اور انہیں بجا طور پر اس بات کا اندازہ ہے کہ یہ قرآن کی انقلاب انگیز صلاحیت کا اثر ہے، نہ صرف اس دور میں یورپ کے ارباب سیاست اور اصحاب تحقیق قرآن کو مذہبی شدت پسندی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں؛ بلکہ ان کے دل میں چھپا ہوا یہ بغض پہلے بھی ان کی زبان پر آتا رہا ہے، آزادی سے پہلے برطانیہ کے ایک وزیر اعظم گیڈ اسٹون نے عام مجمع میں قرآنِ مجید کو ہاتھ میں لے کر کہا تھا:

> ''جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے، دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی'' (خطبۂ صدارت پچاس سالہ اجلاسِ عام، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ: ص: ۱۵، از: مولانا حسین احمد مدنیؒ)

اسی زمانہ میں ایک اور انگریز قائد ہنری طامس کا بیان ہے:

> ''مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو، اچھی رعایا نہیں ہو سکتی؛ اس لئے کہ قرآنی احکام کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں'' (حکومتِ خود اختیاری: ص: ۵۵)

افسوس کہ مغربی دنیا اس بات کے سمجھنے سے قاصر رہی کہ قرآن ایک زندہ کتاب ہے، خود خالقِ کائنات نے قیامت تک ہدایت کو اس سے جوڑ دیا ہے، جب کہ دوسری مذہبی کتابوں کا عہد ختم ہو چکا ہے، جو فرق ایک زندہ اور مردہ انسان یا حیوان کے درمیان ہوتا ہے، وہی فرق ان کتابوں کے درمیان ہے، قرآنِ مجید کو جلا کر، اس کے اوراق کو پھاڑ کر یا اس کی بے احترامی کر کے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا، یہ سورج کے اوپر تھوکنے کے مترادف ہے، ایسے افعال کے ذریعہ اپنے سینہ میں لگی ہوئی حسد کی آگ کو وقتی غذا تو فراہم کی جا سکتی ہے؛ لیکن جو مذاہب مردہ ہو چکے ہیں اور جن کتابوں سے اب خدا نے انسانیت کا نفع متعلق نہیں رکھا ہے، ان میں زندگی کا خون دوڑایا نہیں جا سکتا، مسلمانوں نے نہ کسی مذہبی کتاب کو جلانے کا اعلان کیا اور نہ اس کی بے احترامی کی کہ ایک تو ان کا دین انہیں دوسرے کے جذبات مجروح کرنے سے منع کرتا ہے، دوسرے جو چیز خود مر چکی ہو اس پر کوئی وار کرنا اپنی صلاحیت کو ضائع کرنا اور ایک عبث کام میں اپنی قوت کو خرچ کرنا ہے۔

یہ تو ایک پہلو ہے کہ اس وقت مغربی دنیا کی طرف سے قرآن مجید کی بے احترامی کی جو بات کہی جا رہی ہے، اس کا پس منظر کیا ہے؟ — دوسرا قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ اس پر مسلمانوں کا ردِعمل کیا ہونا چاہئے؟ قرآنِ مجید نے ہمیں جو ہدایت دی ہے، وہ اس طرح ہے:

’’حکمت اور بہترین نصیحت کے ذریعہ اپنے رب کی طرف دعوت دو اور بہتر رویہ کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو، بے شک آپ کے پروردگار راستہ سے بھٹک جانے والوں سے واقف ہیں، اور ان لوگوں سے بھی واقف ہیں، جو ہدایت پر ہیں‘‘ (النحل: ۱۲۵)

مشہور مفسر علامہ فخر الدین رازیؒ نے اس آیت کی روشنی میں لکھا ہے کہ تین طرح کے مخاطب ہوتے ہیں: ایک دانش مند لوگ جو سچائی کے متلاشی ہوں، ان کے ساتھ حکمت یعنی مضبوط دلیلوں کے ذریعہ بات کی جائے تو ان شاء اللہ وہ حق کو قبول کر لیں گے، دوسرا درجہ عوام کا ہے، جن کا شمار اصحابِ علم و دانش میں نہیں ہے؛ لیکن ان میں حق کو قبول کرنے کی استعداد ہے، ان کے لئے خوش اسلوبی کے ساتھ کی جانے والی نصیحت کافی ہے، یعنی پہلے گروہ کو دماغ کی غذا کی ضرورت ہے اور دوسرے کو دل کی، تیسرے: وہ اصحاب علم ہیں جن کا علم ناقص ہے اور انہیں اپنی بات پر اصرار ہے، ان کے لئے بہتر رویہ اور مدلل طریقہ کے ساتھ بحث کرنا، ان کے دلائل کو رد کرنا اور ان کے اعتراضات کا جواب دینا

ضروری ہے، اسی کو قرآن نے جدالِ احسن (بہتر طریقہ پر بحث ومناقشہ) سے تعبیر کیا ہے۔ (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۹ / ۲۶۲-۲۶۵)۔

قرآن مجید نے دوسرے موقع پر دفاع کا اصول بتایا کہ اگر چہ حملہ کرنے والے کا رویہ خراب ہو؛ لیکن ہماری طرف سے دفاع بہتر رویہ کے ساتھ ہو: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ﴾ (المومنون: ۹۶) بہتر طور پر دفاع میں یہ بات شامل ہے کہ ہمارا ردِعمل شرافت، وقار ومتانت، اخلاقی بلندی اور استدلالی قوت کا مظہر ہو، یہاں تک کہ اگر وہ غیر شریفانہ رویہ اختیار کریں تب بھی ہمارے رویہ میں کوئی کڑواہٹ پیدا نہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا طریقۂ کار واضح فرمایا کہ اگر نادان لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں اور ناشائستہ طور وطریق اختیار کرتے ہیں تب بھی مسلمان سلامتی کی ہی بات کرتے ہیں: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (الفرقان: ۶۳)

یہ بات بہت اچھی ہوئی کہ بعض پاگل پادریوں کے جواب میں مسلمانوں نے بائبل کو جلانے اور بے احترامی کرنے کی بات نہیں کہی اور نہ کوئی ایسی حرکت کی؛ البتہ جا بجا احتجاج ضرور ہوا، اسے فطری ردِعمل ہی کہا جا سکتا ہے؛ لیکن کیا یہ احتجاج کافی ہے؟ نہیں؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ حکمت کے ساتھ دنیائے انسانیت کو قرآن مجید کی طرف بلایا جائے، دردمندانہ نصیحت (موعظت حسنہ) کے ذریعہ دلوں کے دروازوں پر دستک دی جائے اور دماغ کو مطمئن کرنے والی دلیلوں کے ذریعہ ان کا رد کیا جائے اور ان کی غلط فہمیاں دور کی جائیں، دعوتِ دین اور دفاعِ دین کے ان مراحل کو پورا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جن بندوں نے قرآن مجید کو نہ دیکھا ہے، نہ سنا ہے اور نہ پڑھا ہے، ان تک قرآن مجید کو پہنچایا جائے، اس بات کو سبھی مانتے ہیں کہ دنیا کا کم سے کم ہر پانچواں شخص مسلمان ہے؛ لیکن باخبر لوگوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا عددی تناسب اس سے زیادہ ہے، حسنِ اتفاق ہے کہ غیر مسلموں کے مقابلہ مسلمانوں کی آبادی کا یہی تناسب ہندوستان میں ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں کم سے کم بیس فیصد (20%) مسلم آبادی ہے، اگر چہ کہ حکومت چودہ فی صد ہی مانتی ہے، اس طرح اگر ہندوستان کا ہر مسلمان شخص چار غیر مسلم بھائیوں تک اور عالمی سطح پر بھی ہر مسلمان شخص کم سے کم چار غیر مسلم بھائیوں تک ان کی زبان میں قرآنِ مجید پہنچا دے تو پوری دنیائے انسانیت تک آسانی سے اللہ کا پیغام پہنچ سکتا ہے۔

اللہ نے اپنی کتاب میں ایسی کشش رکھی ہے کہ یہ کتاب اپنے آپ بے احترامی کرنے والوں سے اپنا احترام کرالے گی اور معاندین کے دلوں کو فتح کر کے چھوڑے گی، جب قرآنِ مجید رسول اللہ ﷺ پر نازل ہورہا تھا تو اس وقت آج کے معاندین سے بھی بڑھ کر اعداءِ دین اور دشمنانِ قرآن موجود تھے؛ لیکن قرآنِ مجید کی کشش تھی کہ وہ چھپ چھپ کر قرآنِ مجید سنتے تھے اور بہت سے وہ تھے جن کو قرآن نے اپنی جاذبیت کی شمشیر سے غلام بے دام بنالیا تھا؛ اس لئے قرآنِ مجید کی بے احترامی کی جو باتیں کہی جارہی ہیں، ان کا حقیقی اور مؤثر جواب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اللہ کی کتاب پہنچائی جائے اور پھر اللہ پر بھروسہ کیا جائے کہ ہدایت اسی کے ہاتھ میں ہے!

پیغمبر اسلام ﷺ کا داعیانہ کردار

رسول اللہ ﷺ کی مختلف حیثیتوں کا کر قرآن مجید میں کیا گیا ہے؛ لیکن آپ ﷺ کی سب سے نمایاں صفت — جس کا اللہ تعالیٰ نے بار بار ذکر فرمایا ہے — یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ کی طرف سے حق اور سچائی کے داعی ہیں، قرآن مجید میں آپ ﷺ کی اس حیثیت کو مختلف الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے، جیسے آپ ﷺ کو ''شاہد'' کہا گیا، (المزمل: ۱۵) — ''شاہد'' کے معنی گواہی دینے والے کے ہیں، گواہی ایسی چیز کی دی جاتی ہے، جو دیکھی ہوئی ہو یا دیکھی ہوئی چیز کی طرح اس کے نزدیک یقینی ہو، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن حقیقتوں کی دعوت دیتے تھے، ان پر آپ ﷺ کا پورا یقین تھا اور آپ ﷺ کو اس میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں تھا، داعیانِ دین کی شان یہی ہے کہ انہیں اسلام پر ایسا گہرا یقین ہو، جیسے انسان دن کے وقت دن ہونے کا یقین رکھتا ہے، — اسی کے ہم معنی ایک اور لفظ ''شہید'' کے ہیں، اس کے معنی بھی گواہ کے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے لئے قرآن مجید میں یہ لفظ بھی بار بار استعمال کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی داعیانہ حیثیت کو قرآن مجید میں ''بشیر'' (البقرۃ: ۱۱۹) اور ''مبشر'' (الاحزاب: ۴۶) کے الفاظ سے بھی ذکر کیا ہے، یہ دونوں الفاظ قریب قریب ہم معنی ہیں، یعنی خوشخبری دینے والا، خوش خبری ایسی خبر کو کہتے ہیں، جو مخاطب کو مسرور اور شاد کام کردے، اس کی خبر انسان کے دل میں امید کے چراغ جلائے اور یاس و نا امیدی سے بچائے، قرآن مجید میں زیادہ تر ایمان کی دعوت دیتے ہوئے جنت کی نعمتوں اور دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی کا ذکر ہے، داعی کا اسلوب یہی ہونا چاہئے کہ اس کی بات لوگوں کو خوشی اور مسرت کے احساس کے ساتھ حق کی طرف لے آئے، آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کی وفات کا وقت ہے، معززینِ قریش جمع ہیں اور چاہتے ہیں کہ ابوطالب کے واسطہ سے آپ ﷺ سے کچھ صلح ہوجائے، اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی گفتگو اس طرح شروع فرمائی: میں ایک کلمہ پیش کرتا ہوں، تم اسے قبول کرلو، تو پورے عرب کے تم مالک ہوجاؤ گے اور عجم

تمہارے سامنے سرنگوں ہوجائیں گے: ,,كلمة واحدة تعطونها، تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم'' (حیاۃ الصحابۃ:۱/۱۸، کتاب الاول) —معلوم ہوا کہ داعی کو دین اس طرح پیش کرنا چاہئے کہ لوگوں کو آسان محسوس ہو اور لوگ اسے بوجھ نہ محسوس کرنے لگیں؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو انہیں تاکید فرمائی: ,,بشرا ولا تنفرا ويسرا ولا تعسرا'' (بخاری عن ابی موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر ۳۰۳۸، مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۲۳) یعنی ''خوش خبری دینا، ایسی بات نہ کہنا جو نفرت پیدا کرنے والی ہو اور دین کو آسان کرکے پیش کرنا نہ کہ دشوار''۔

آپ ﷺ کو ''نذیر'' بھی کہا گیا، (البقرۃ:۱۱۹) اور ''منذر'' بھی (الرعد:۷)، ان دونوں الفاظ کے معنی ہیں ڈرانے والا، بعض انسانوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ شوق اسے کسی اچھے عمل پر آمادہ نہیں کرتا، جب تک کہ اس کے ساتھ خوف کی شمولیت نہ ہو، اگر شوق کا دلانا کافی ہوتا تو دنیا میں تعزیری قوانین کی ضرورت پیش نہیں آتی؛ اس لئے دعوت حق میں یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں کو اس کے عذاب سے ڈرایا جائے، رسول اللہ ﷺ کی کیفیت یہ تھی کہ جب آپ ﷺ لوگوں سے خطاب فرماتے تو آپ ﷺ کے چہرہ انور پر بھی اس کے نقوش نمایاں ہوئے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خطاب کرتے ہوئے آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ ہوجاتیں، آپ ﷺ کی آواز بلند ہوجاتی، ایسا لگتا جیسے آپ ﷺ کسی فوج کو خوف دلا رہے ہوں: ''--- كأنه منذر جيش'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۰۴۲، كتاب الجمعة باب تخفيف الصلاة والخطبة) ایک اور روایت میں ہے کہ جب آپ قیامت وغیرہ کا ذکر کرتے تو آپ ﷺ کے چہرے پر اس کا اثر محسوس ہوتا: ''--- حتى نعرف ذلك في وجهه'' (مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۱۴۳۷) —لیکن ڈرانے کی الگ الگ نوعیتیں ہوتی ہیں، ایک ظالم مظلوم کو اور راہزن راہ رو کو بھی ڈراتا ہے، اس ڈرانے میں صرف نفرت کار فرما ہوتی ہے؛ لیکن ایک ڈرانا والدین کا اپنے بچوں کو اور اساتذہ کا اپنے شاگردوں کو بھی ہے، جس میں محبت اور شفقت ہوتی ہے، ایک باپ اپنے بیٹے کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتا ہے، بسا اوقات سرزنش بھی کرتا ہے، مگر اس وقت بھی اس کا دل اس کی محبت سے معمور ہوتا ہے، پیغمبر کا اپنے مخاطب کو ڈرانا اسی طرح کا ہوتا ہے۔

آپ کو ''داعی الی اللہ'' بھی کہا گیا (الاحزاب:۴۶) یعنی ایسی شخصیت جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتی تھی، جس کا مقصد صرف اور صرف بندوں کو خدا سے جوڑنا تھا، — اسی طرح آپ ﷺ کو ''روشن چراغ'' (سراج منیر) بھی فرمایا گیا، (الاحزاب:۴۶) بظاہر ایسا لگتا ہے کہ چراغ کے بجائے اگر آپ ﷺ کو سورج اور چاند کہا جاتا تو یہ تشبیہ زیادہ مکمل اور آپ ﷺ کی شخصیت کی زیادہ آئینہ دار ہوتی؛ لیکن غور کیا جائے تو چراغ کی تعبیر زیادہ بلیغ اور بڑی ہی بامعنی ہے، ایک سورج سے دوسرا سورج اور ایک چاند سے دوسرا چاند وجود میں نہیں آسکتا؛ لیکن چراغ نہ صرف روشنی پہنچاتا ہے؛ بلکہ ایک چراغ سے ہزاروں چراغ جلائے جاسکتے ہیں، آپ کی حیاتِ طیبہ روشنی بھی تھی، جس سے ایمان کا اجالا ہوا، کفر و شرک کی تاریکیاں چھٹیں اور آپ ﷺ کے اندر شخصیت سازی کی غیر معمولی صلاحیت بھی تھی، جس معاشرہ میں علم ومعرفت، عدل وانصاف اور تمدن کا نام ونشان نہ تھا، ان ہی صحرانشینوں کو آپ ﷺ نے مٹی سے ہیرا بنا کر دکھایا کہ تاریخ انسانیت میں مختلف جہتوں سے ان کی نظیر نہیں ملتی۔

اس کے علاوہ آپ ﷺ کو ﴿مُذَكِّرٌ﴾ ''نصیحت کرنے والا'' (الغاشیہ:۲۱) ﴿مُنَادِی﴾ ''پکارنے والا'' (آل عمران:۱۱۳) ﴿مبلغ﴾ ''پیغام حق پہنچانے والا'' (المائدہ:۶۷) ﴿معلم﴾ ''تعلیم دینے والا'' (آل عمران:۱۶۴) اور ﴿مزکی﴾ ''لوگوں کی زندگیوں کو گناہوں سے پاک کرنے والا'' (آل عمران:۱۶۴) بھی فرمایا گیا ہے، یہ مختلف صفات جو قرآن مجید میں ذکر کی گئی ہیں، آپ ﷺ کی داعیانہ حیثیت کو واضح کرتی ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کا سب سے بڑا فریضہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کو حق وراستی کی طرف بلائے، اسی میں اس کی کامیابی ہے اور یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے کہ جس کے ذریعہ راستہ میں بچھے ہوئے کانٹوں کو ہٹایا اور معاندین کے دلوں میں سلگنے والے شعلوں کو بجھایا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی ایک داعی اور مبلغ کی طرح گذاری ہے، آپ ﷺ نے لوگوں کو انفرادی طور پر بھی دعوت دی، مکی زندگی میں آپ ﷺ ایک ایک شخص کے پاس جاتے اور اسے اسلام کی طرف بلاتے، حضرت ابوطالب کو دعوت دینے کا ذکر حدیث وسیرت کی اکثر کتابوں میں موجود ہے، آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر — جو آپ ﷺ کے دیرینہ دوستوں میں تھے — دعوتِ اسلام پیش فرمائی اور حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بلا تامل اس دعوت کو قبول کیا (البدایہ والنہایہ:۳/۲۷) حضرت عثمان

بن عفان رضی اللہ عنہ، آپ ﷺ کی پھوپھی اروی بنت عبد المطلب کی عیادت کے لئے گئے تھے، آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی، آپ ﷺ نے دعوت پیش کی اور انہوں نے بھی جلد ہی اسلام قبول کرلیا، (الاستیعاب: ۴ / ۲۲۵) آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دعوت دی، وہ چاہتے تھے کہ اپنے والد سے مشورہ کریں؛ لیکن آپ نے ابھی اسلام کو چھپانے کا حکم دیا، تو اگلے ہی دن خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ایمان لے آئے، (البدایہ والنہایہ: ۳ / ۲۲۴)، اہل مکہ نے حضور ﷺ کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ جنون کے مرض میں مبتلا ہیں، مکہ میں ضماد نام کے ایک صاحب آئے، جو آسیب وغیرہ کا علاج کیا کرتے تھے، انہوں نے آپ ﷺ سے خواہش کی کہ وہ آپ کا علاج کرنا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے ان پر اپنی دعوت پیش کی، ضماد صالح طبیعت کے آدمی تھے، انہیں فوراً تنبہ ہوا کہ انہیں غلط باور کرایا گیا ہے اور انہوں نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا (الاصابۃ: ۲ / ۲۱۰) — یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو بھی اسلام کی دعوت دی اور بالآخر وہ دامنِ اسلام میں آ گئے، (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۱۱۴۸۰)۔

آپ ﷺ نے افراد کی طرح مختلف جماعتوں، گروہوں اور قوموں کو بھی اسلام کی طرف بلایا، جب آپ ﷺ کو علانیہ دعوتِ اسلام کا حکم دیا گیا تو آپ ﷺ نے صفا کے دامن میں قریش کو جمع کیا اور ان پر دعوتِ حق پیش فرمائی، آپ ﷺ حج کے موقع سے مکہ، منیٰ اور مقاماتِ مقدسہ پر تشریف لے جاتے اور انہیں اسلام کی طرف بلاتے، آپ ﷺ نے عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلے میں جا کر بھی دعوتِ اسلام پیش فرمائی، متعدد بار سردارانِ قریش کے مجمع سے خطاب کیا، اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو دین کی دعوت انفرادی طور پر بھی دی جاسکتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی، موقع وحال کے لحاظ سے اس کام کو انجام دینا چاہئے۔

آپ ﷺ نے خواتین کو بھی دعوت دی ہے، عیدین کے موقع سے آپ ﷺ مردوں سے خطاب کرنے کے بعد پھر عورتوں کی طرف تشریف لے جاتے اور انہیں نصیحت فرماتے، (مسند احمد، عن عبد اللہ بن قیس، حدیث نمبر: ۱۹۵۰۶) — آپ ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ کی بیٹی فاطمہ اور متعدد خواتین کو بیعت کیا ہے اور بیعت بھی دعوت دین ہی کی ایک صورت ہے، آپ ﷺ نے بنو ہاشم کے بچوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے اس

وقت بیعت لی، جب کہ وہ نابالغ تھے، اس سے معلوم ہوا کہ خواتین میں بھی دعوت کا کام کیا جاسکتا ہے، مگر فتنے سے بچتے ہوئے اور نابالغ ذی شعور بچوں میں بھی دعوت کا کام ہونا چاہئے۔

انسان پر اپنے قرابت داروں کے دوہرے حقوق ہوتے ہیں، ایک انسانی بھائی ہونے کا حق اور دوسرے قرابت داری کا حق، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو پہلے حکم دیا گیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو دین حق کی طرف بلائیں: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ (الشعراء: ۲۱۴)، چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ نے خاندان کے لوگوں کو دعوت دی، تیس افراد جمع ہوئے، آپ ﷺ نے ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش فرمائی؛ لیکن سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس وقت کسی نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا، (تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۳۶۳) — اس سے معلوم ہوا کہ دین کی دعوت میں اپنے رشتہ داروں اور قرابت داروں کا خصوصی حق ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نبوت عالمگیر ہے؛ اس لئے شروع ہی سے آپ ﷺ نے اپنی دعوت کو دور دور تک پہنچایا ہے، روم، ایران، حبش اور مختلف علاقوں میں آپ ﷺ نے دعوتی خطوط روانہ فرمائے اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں اسلام کی روشنی دور دور تک جا پہنچی، یہاں تک کہ بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق اسی زمانہ میں آفتابِ نبوت کی کرنوں نے ہندوستان کو بھی ضیاء بار کیا۔

غرض کہ رسول اللہ ﷺ کی سب سے نمایاں حیثیت یہی تھی کہ آپ ﷺ داعی الی اللہ تھے، آپ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہی یہی تھا، آپ ﷺ کی پوری زندگی درحقیقت دعوت ہی سے عبارت ہے، آپ ﷺ نے مردوں کو بھی دعوت دی اور عورتوں کو بھی، بوڑھوں کو بھی اور بچوں کو بھی، رشتہ داروں کو بھی اور اجنبیوں کو بھی، اپنی قوم کو بھی اور دوسری قوموں کو بھی، افراد کو بھی اور جماعتوں اور قبیلوں کو بھی، نیز اسی راہ میں ہر طرح کی آزمائشوں سے گذرے، آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی امت کو بھی فریضۂ دعوت میں شامل کیا گیا، سوچئے! کیا داعی نبی کی امت بھی آج انسانیت کو دعوتِ حق دینے کے لئے کمر بستہ ہے؟ کہیں اس نے اپنی نبی کی امت کو پس پشت تو نہیں ڈال دیا ہے؟؟

سیرتِ نبویؐ اور داعیانہ اوصاف

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک داعیٔ امت کی حیثیت سے ہمارا کیا کردار ہونا چاہئے ؛ کیوں کہ مخاطب پر سب سے زیادہ اثر انسان کے اخلاق و کردار ہی کا ہوتا ہے، اور آپ ﷺ کا یہی وصف تھا، جس نے سخت عداوت کے ماحول میں بھی لوگوں کو آپ ﷺ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

اس جہت سے آپ ﷺ کا نمایاں وصف صداقت و دیانت ہے، آپ ﷺ جب نبی بنائے گئے اور حکم ہوا کہ اپنی نبوت کا اعلان فرمائیں تو آپ ﷺ صفا کی پہاڑی پر چڑھے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت کا اعلان فرمایا، اس موقعہ پر آپ ﷺ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ چالیس سال سے ہمارے شب و روز تمہارے درمیان گذرے ہیں، بتاؤ کہ تم نے مجھے سچا پایا ہے یا جھوٹا اور امانت دار پایا ہے یا خیانت کرنے والا ؟ لوگوں نے کہا سچا اور امانت دار، آپ ﷺ نے مزید وضاحت کے لئے سوال کیا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کی ایک فوج ہے، جو تم پر یلغار کرنا چاہتی ہے تو کیا تم اسے قبول کرلو گے؟ لوگوں نے کہا: کیوں نہیں؟ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنی دعوت پیش فرمائی، — اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی داعی کے لئے صدق و راستی کی بڑی اہمیت ہے؛ کیوں کہ جو شخص اپنی ذاتی زندگی میں سچا ہوگا، وہ اللہ کے دین کے معاملہ میں بھی یقینی طور پر سچائی سے کام لے گا، اور جو دنیا کے معاملہ میں خیانت سے بچے گا، وہ بدرجۂ اولیٰ دین کے معاملہ میں اپنے آپ کو خیانت سے بچائے گا؛ اسی لئے جب آپ ﷺ کا مکتوب گرامی روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس پہنچا تو اس نے ابوسفیان سے جو وہاں موجود تھے، خاص طور پر پوچھا کہ وہ جھوٹ تو نہیں بولتے، آپ ﷺ کا کردار اتنا روشن تھا کہ ابوسفیان ہزار عداوت و دشمنی کے باوجود آپ ﷺ کی صداقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔

رسول اللہ ﷺ کا بہ حیثیت داعی دوسرا نمایاں وصف یہ ہے کہ آپ ﷺ جس قوم کو دین کی دعوت دے رہے تھے، آپ ﷺ کو اس سے بے حد محبت تھی، رسول اللہ ﷺ نے خود اسے ایک مثال سے سمجھایا

کہ میری مثال تم لوگوں کے مقابلہ ایسی ہے، جیسے کچھ لوگ آگ کے گڑھے کی طرف دوڑ رہے ہوں اور میں ان کی کمر پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا ہوں؛ اسی لئے آپ ﷺ بے چین رہتے تھے کہ کسی طرح لوگوں کو جہنم کی طرف جانے سے بچالیں، آپ ﷺ کی اس کیفیت کو قرآن مجید نے بڑے ہی بلیغ الفاظ میں کہا کہ ''اگر یہ ایمان نہ لائیں تو شاید آپ مارے افسوس کے ان کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے'' (الکہف:٦) — یہی بے قراری آپ کو ایسے لوگوں کے پاس خاص طور پر لے کر جاتی تھی، جو لبِ گور ہوتے تھے؛ تاکہ وہ دوزخ میں جانے سے بچ جائیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا حضور ﷺ کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار پڑا، آپ ﷺ اس کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور اس موقعہ پر آپ ﷺ نے اس سے خاص طور پر فرمایا کہ اسلام قبول کرلو، اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت سے نوازا اور وہ مسلمان ہوگیا، (**صحیح البخاری، باب عیادۃ المشرک، حدیث نمبر: ۵٦۵۷**)— حضرت ابوطالب کی وفات کے وقت آپ ﷺ تشریف لائے، وہاں پر سرغنۂ کفر ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ بھی موجود تھے، آپ ﷺ نے بے قراری کے ساتھ فرمایا: اے چچا جان! آپ ''لَا إِلٰہ إِلَّا اللّٰہ'' پڑھ لیجئے، میں اس کے بدلہ اللہ کے پاس آپ کے حق میں حجت پیش کروں گا (**صحیح البخاری، کتاب التفسیر**، حدیث نمبر: ۴٦۷۵)۔

اسی محبت کا اثر تھا کہ آپ ﷺ غیر مسلموں کے ساتھ بہتر سلوک فرمایا کرتے تھے، بدر کے قیدی مسلمانوں کی جان لینے کے لئے مکہ سے بدر تک آئے تھے، مگر جب یہ قید ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ فرمایا، یہاں تک کہ جب انہیں واپس کیا گیا تو تمام قیدیوں کو اچھے جوڑے پہنا کر رخصت کیا گیا، (صحیح البخاری، کتاب الجہاد۔۔۔۔، حدیث نمبر: ۲۸۴٦) — اسی طرح اہل مکہ پر قحط پڑا تو آپ ﷺ نے مدینہ سے ان کے لئے پانچ سو دینار کی ریلیف بھیجی، جو ایک خطیر رقم تھی، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ریشمی حلہ بھیجا، انہوں نے اسے اپنے مشرک بھائی کو مکہ مکرمہ تحفہ کے طور پر بھیج دیا، (بخاری، باب الہدیۃ للمشرکین، حدیث نمبر: ۲۴۷٦) — آپ ﷺ غیر مسلموں کو ہدیہ عنایت فرمایا کرتے تھے، ان کے ہدایا و تحائف قبول کرتے تھے، ان کی دعوت فرماتے تھے اور ان کی دعوت قبول بھی کرتے تھے۔

آپ ﷺ کے داعیانہ کردار کا ایک پہلو یہ تھا کہ کفر کے باوجود مشرک رشتہ داروں کے ساتھ

قرابت داری کے تقاضوں کا خیال رکھتے تھے، حضرتِ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما کی والدہ — جو ابھی شرک کی حالت میں تھیں — مدینہ آئیں، حضرتِ اسماء رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میری والدہ مشرک ہیں، کیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو، (بخاری، **باب الهدية للمشركين**، حدیث نمبر: ۲۴۷۷) — حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کفر پر تھیں اور حضور ﷺ کو برا بھلا بھی کہتی تھیں؛ لیکن رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی اور ان کا احترام کرنے کی تلقین کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں (**صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي هريرة الدوسي** رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۶۵۵۱) اسی طرح کئی صحابہ رضی اللہ عنہم وہ تھے، جن کے والدین یا قریبی رشتہ دار حالتِ کفر میں تھے اور حضور ﷺ ہمیشہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کی تلقین کرتے تھے یا آپ ﷺ کا اشارہ پا کر صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے ان عزیزوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرتے تھے، یہ حسنِ سلوک دعوتِ دین کے لئے خشت اول کا درجہ رکھتا ہے؛ کیوں کہ اس کی بناء پر خوشگوار تعلقات قائم ہوتے ہیں، رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ راہ و رسم باقی رہتی ہے اور تعلقات میں ہم آہنگی کی بنیاد پر اپنی بات پیش کرنے اور قریب سے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور دعوت کے لئے میدان فراہم ہوتا ہے، آج دنیا میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمان غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانے پر خصوصی توجہ دیں؛ تاکہ معتدل فضا پیدا ہو اور دعوتِ اسلام اللہ کے ان بندوں تک پہنچائی جا سکے، جو ہدایت سے محروم ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ایک اہم وصف دشمنوں کے ساتھ عفو و درگذر کا تھا، آپ ﷺ نے جب مکہ مکرمہ میں دعوتِ اسلام کا آغاز کیا تو اس کی سخت مخالفت ہوئی، کوئی تکلیف نہ تھی، جو آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو نہ پہنچائی گئی ہو، بارگاہ نبوت کے دونوں جانب ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط کے مکانات تھے، وہ اپنے مکان کا کچرا دیواروں سے آپ ﷺ کے گھر میں ڈال دیتے اور ابولہب کی بیوی کچرا اور کانٹے آپ ﷺ کے دروازے کے سامنے رکھ دیتی؛ تاکہ آپ ﷺ کو تکلیف پہنچے، آپ ﷺ ان ناشائستہ حرکتوں کو صبر کے ساتھ سہہ جاتے اور کبھی کبھی صرف اتنا کہنے پر اکتفاء کرتے کہ کیا پڑوس کا یہی حق ہے؟ عین صحن کعبہ میں اونٹ کی اوجھ کے ذریعہ آپ ﷺ کو پھانسی دینے کی کوشش کی گئی اور پشتِ مبارک کو نجاست

سے آلودہ کیا گیا، ابولہب کے بیٹوں سے آپ ﷺ کی دو صاحبزادیوں کا رشتہ ہو چکا تھا، یہ رشتے محض عداوت میں توڑ دئے گئے، صاحبزادیٔ رسول حضرت زینب رضی اللہ عنہا پر دشمنوں نے ایسا تشدد کیا کہ ان کا حمل ساقط ہو گیا، کم وبیش تین سال آپ ﷺ کا پورے خاندان کے ساتھ معاشی بائیکاٹ کیا گیا، آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے رفقاء کو فاقہ مستی سے گذرنا پڑا، طائف کے بازار میں آپ ﷺ پر پتھروں کی بارش کی گئی اور آپ ﷺ خون سے لہولہان ہو گئے، آپ ﷺ کے بارے میں —نعوذ باللہ— پاگل اور جادوگر ہونے کا پروپیگنڈہ کیا گیا، غرض کوئی تکلیف نہ تھی، جو آپ ﷺ کو پہنچائی نہ گئی ہو اور وہ تکلیفیں اور اذیتیں اس کے علاوہ ہیں، جو آپ ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور رفقاء کو پہنچائی گئیں۔

لیکن آپ ﷺ نے ہمیشہ صبر اور برداشت سے کام لیا، کبھی بھی اپنے دشمنوں کی برائی نہیں چاہی، جب مکہ فتح ہوا تو اسلام اور پیغمبر اسلام کے سارے دشمن سامنے موجود تھے اور دس ہزار جاں نثاروں کا لشکر آپ ﷺ کے ہر حکم پر تعمیل حکم کے لئے تیار کھڑا تھا؛ لیکن آپ ﷺ نے صاف اعلان کر دیا کہ آج کا دن رحم وکرم اور عفو ودرگذر کا دن ہے، انتقام لینا تو کجا آپ ﷺ نے ان کو زبان مبارک سے برا بھلا بھی نہیں کہا اور ان کو ان کے کرتوت بھی یاد نہیں دلائے، ان حاضرین میں ابوجہل وابولہب کی اولاد بھی ہیں، اعداء اسلام کے قائدین ابوسفیان اور صفوان بن امیہ بھی ہیں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی اور کلیجہ چبانے والی ہندہ بھی ہیں، کعبہ کے کلید بردار عثمان بن ابوطلحہ بھی ہیں، جنہوں نے ہجرت سے پہلے آپ ﷺ کو خانۂ کعبہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دی تھی؛ لیکن آپ ﷺ نے ان پر ایک نگاہِ غضب ڈالنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور سبھوں کی معافی کا اعلان کر دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک داعی کا قلب کس قدر وسیع اور کشادہ ہونا چاہئے، دعوت اسی وقت مؤثر ہوتی ہے، جب کہ اس کا دل مدعو کی طرف سے کینہ وکدورت سے صاف اور انتقامی جذبہ سے خالی ہو، داعی اور مدعو کا رشتہ ایک طرفہ محبت کا رشتہ ہے، جیسے والدین کے دل میں ہمیشہ اولاد کی محبت ہوتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی نالائق ہو، یہی محبت داعی کے اندر اپنے مدعو کے لئے ہونی چاہئے، یہ محبت ایسی آگ ہے، جو لوہے اور پتھر کے سے سخت دل کو بھی پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔

مدعو سے محبت اور اس کی خیر خواہی ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اعداء اسلام کے

لئے دعا گو رہتے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت سے نوازے، قبیلہ دوس کے نمائندہ طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے قبیلہ کا شکوہ کیا کہ وہ ایمان لانے سے گریزاں ہیں اور آمادۂ سرکشی ہیں، آپ ﷺ ان پر بددعا فرما دیجئے، رسول اللہ ﷺ نے بارگاہ خداوندی میں درخواست کی کہ اے اللہ! دوس کو ہدایت دے اور انہیں ایمان کی توفیق عطا فرما، (**مسلم، باب الدعاء للمشرکین بالهدی لیتألفهم**، حدیث نمبر:۲۷۷۹)۔

قبیلۂ بنوثقیف بڑا اسلام دشمن قبیلہ تھا، فتح مکہ کے بعد اس پر فوج کشی کی گئی؛ لیکن کئی دنوں کے محاصرے اور کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کے باوجود ان کے ماہر تیر اندازوں نے مسلمانوں کی پیش قدمی کو نتیجہ خیز ہونے نہیں دیا، اس موقع پر بھی بعض رفقاء نے ان کے حق میں بددعا کرنے کی درخواست کی، آپ ﷺ نے بددعاء کے بجائے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی، (مسند احمد بن حنبل عن جابر رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۱۴۷۴۳)— مکی زندگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابوجہل اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کی ایذاء رسانی میں پیش پیش تھے، آپ ﷺ نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کا ہاتھ پھیلایا کہ اے اللہ! ان دونوں میں جو آپ کو محبوب ہو، ان کے ذریعہ اسلام کو تقویت پہنچایئے — اس دعاء کے بعد اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایمان سے مشرف فرمایا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کی نظر میں محبوب تھے، (**سنن ترمذی، مناقب عمر بن الخطاب** رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۳۶۸۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ حالتِ کفر میں تھیں اور کفر پر بہ ضد تھیں، جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ انہیں ایمان کی دعوت دیتے تو وہ حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے لگتیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ صورتِ حال آپ ﷺ سے بیان کی، آپ ﷺ نے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان کی سعادت سے بہرہ یاب فرمایا، (مسلم، باب من فضائل ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۲۴۹۱) — غرض کہ آپ ﷺ دن میں بندگانِ خدا کو اللہ کے دین کی طرف بلاتے تھے اور شب میں خدا کی بارگاہ میں ان کے لئے ہدایت کی دعا کا ہاتھ پھیلاتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک داعی امت کی حیثیت سے ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اپنے برادرانِ وطن کے لئے دعاء کا اہتمام کریں، یہ دعا خاص خاص افراد واشخاص کے لئے بھی ہو اور بہ حیثیت مجموعی پوری قوم کے لئے بھی۔

رسول اللہ ﷺ پوری انسانیت کی طرف داعی تھے اور حضور ﷺ کی ختم نبوت کی برکت سے اب

یہ مقام اس امت کو حاصل ہوا ہے، اگر ہم اخلاق وکردار کی بلندی کو اپنا ہدف بنائیں، غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ عفوودرگذر اور رحم دلی کا معاملہ کریں، حسنِ سلوک کے ذریعہ تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کریں، ان کی جانب سے پہنچنے والی تکلیف دہ باتوں پر صبر سے کام لیں اور تحمل کا ثبوت دیں، ان کے ساتھ ایک طرفہ محبت کریں اور ان کی ہدایت کے لئے خدا کے دربار میں عجز ونیاز کا ہاتھ پھیلائیں، تب ہی ہم ایک داعی امت کا کردار ادا کرسکیں گے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقۂ دعوت

شریعت کے بعض احکام وہ ہیں، جن کا مقصد بھی متعین ہے اور طریقۂ کار بھی، جیسے نماز، نماز کا مقصد اللہ تعالیٰ کی یاد کو تازہ کرنا اور برائی اور بے حیائی کی باتوں سے اپنے آپ کو بچانا ہے، نماز کا طریقہ بھی متعین ہے، رسول اللہ ﷺ نے خود نماز ادا فرمائی ہے اور یہ ہدایت بھی کی ہے کہ جیسے میں نماز ادا کرتا ہوں، ویسے ہی تم بھی ادا کرو: **"صلوا کما رأیتمونی أصلی" (صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب الأذان للمسافر إذا کانوا جماعة، حدیث نمبر: ٦٣١، و کتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم، حدیث نمبر: ٦٠٠٨، و کتاب أخبار الآحاد، حدیث نمبر: ٧٢٤٦)**— اور بعض احکام وہ ہیں، جن کے مقاصد تو متعین ہیں، طریقۂ کار متعین نہیں ہے، جیسے: جہاد، جہاد کا مقصد اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا اور ظالم کے ظلم کو روکنا ہے؛ لیکن جہاد کا طریقہ کیا ہو؟ اس کے لئے کون سے ہتھیار استعمال کئے جائیں؟ یہ متعین نہیں ہے، ''دعوت دین'' اسی دوسری قسم کے احکام میں داخل ہے، دعوت کا مقصد لوگوں کی ہدایت ہے؛ لیکن دعوت کا طریقۂ کار متعین نہیں؛ تاہم رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے دعوت کے بنیادی اصول اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے دعوت دین کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے ہیں، سب سے زیادہ جس ذریعہ کا استعمال آپ ﷺ کی حیات میں ملتا ہے، وہ ہے زبان، جب کوئی بات بالمشافہ کہی جاتی ہے تو اس میں صرف الفاظ ہی نہیں ہوتے؛ بلکہ بولنے والے کی آواز، آواز میں شامل اس کے جذبات، اس کے چہرے کے نقوش اور اس کے اعضاء کے حرکات واشارے، یہ ساری چیزیں اس میں شامل ہوتی ہیں، اسی لئے فوری طور پر مخاطب اس کا خصوصی اثر لیتا ہے، آواز کا زیر وبم اور صوتی آہنگ بھی دلوں کے تار کو چھیڑنے میں معاون بن جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے خطابات میں یہ بات پوری قوت کے ساتھ پائی جاتی تھی، اور مخاطب پر اس کا پورا اثر ہوتا تھا، خود رسول اللہ ﷺ اس طرح دعوت دین پیش فرماتے تھے کہ جیسے کوئی مخلص اور ہمدرد قائد فوج کو دشمن سے ڈرا رہا ہو، روئے انور سرخ ہو جاتا اور

سامعین کے دلوں کی دنیا بدل جاتی، پھر آپ ﷺ کے خطاب میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ اس طرح ہوتا تھا کہ گویا ہیرے اور جواہرات چن دیئے گئے ہیں؛ اسی لئے آپ ﷺ کے خطبات کو عربی زبان وادب کا بہترین نمونہ سمجھا گیا ہے۔

آپ ﷺ نے دعوت کے لئے زبان کے ساتھ ساتھ قلم کا وسیلہ بھی اختیار فرمایا ہے، چنانچہ اس وقت جہاں تک خطوط پہنچائے جاسکتے تھے، آپ ﷺ نے دعوتی خطوط روانہ فرمائے، بعض اہل تحقیق کی رائے میں آپ ﷺ نے تقریباً چار سو دعوتی خطوط لکھے ہیں، روم وایران سے لے کر چین تک آپ ﷺ کے دعوتی خطوط پہنچے، یہ خطوط نہ صرف داعیانہ حکمت کا نمونہ ہیں؛ بلکہ زبان وادب کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہیں، حدیث کی متداول کتابوں میں بھی ان میں سے کئی مکتوبات نقل کئے گئے ہیں، اب تو بعض مکتوبات کی اصل بھی دریافت ہوگئی ہیں اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ حدیث میں ان خطوط کا مضمون جس طرح نقل کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح اس دستیاب ہونے والے اصل خط کی عبارت ہے، یہاں تک کہ ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ پر مشتمل مہر مبارک کی جو ترتیب کتب حدیث میں مذکور ہے، وہی ترتیب اس دستیاب ہونے والے خط میں بھی ہے۔

ان دعوتی خطوط کے مضمون کے سلسلہ میں ایک بڑی ہی قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے شاہ روم کو جو خط لکھا، اس میں آپ ﷺ نے ''عظیم الروم'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی ''روم کی عظیم شخصیت'' — ظاہر ہے کہ یہ انتہائی توقیر واحترام کا کلمہ ہے، بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ ایک کافر ومشرک کے لئے اتنا پُرتوقیر کلمہ کیوں کر استعمال کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے لوگ ان کو اسی طرح خطاب کرتے ہیں، یعنی آپ ﷺ نے اپنے ان خطوط میں مدعو کی عزت نفس کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے، اور تعلیم دی ہے کہ اگر دوسرے مذہب اور قوم کے رہنما سے خطاب کیا جائے تو ان کے حلقہ میں ان کا جس طرح نام لیا جاتا ہے، اسی طرح نام لینا چاہئے، سوائے اس کے کہ کوئی مشرکانہ کلمہ ہو؛ کیوں کہ کلمات شرک بہر حال گوارا نہیں کئے جاسکتے، افسوس کہ مسلمانوں کی اخلاقی سطح اتنی گر گئی کہ وہ مسلک ومشرب کے اختلاف کی وجہ سے بھی مخالف دبستان فکر، گروہ یا تنظیم کے ساتھ تنابز بالالقاب کرنے لگتے ہیں، اور اس کو اپنی دین داری کا تقاضا سمجھتے ہیں؛ چہ جائے کہ غیر مسلموں کے ساتھ، کاش! ہم سمجھ سکیں کہ ہمارا یہ عمل دین داری نہیں ہے؛ بلکہ سنت نبوی ﷺ کی

خلاف ورزی ہے۔

دعوت کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اُن دوسرے طریقوں کو بھی اختیار کیا، جو اس زمانہ میں مروج تھے، جیسے آپ ﷺ نے صراط مستقیم اور گمراہی کے راستوں کو واضح کرنے کے لئے ہاتھوں سے لکیر کھینچ کر نقشہ بنایا اور اس کی مدد سے سمجھایا، (**سنن دارمی، باب فی کراھیۃ أخذ الرأی، حدیث نمبر: ۲۰۲**) اس سے معلوم ہوا کہ دعوت کے لئے زبان وقلم کے علاوہ دوسرے وسائل بھی اختیار کئے جاسکتے ہیں، موجودہ دور میں انٹرنیٹ، ای بک، آڈیو کسیٹ، سی ڈی اور ڈی وی ڈی ان وسائل میں داخل ہیں، جن کو خیر کی طرف دعوت دینے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، —— اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی طرف بلانے کے لئے انہیں کھانے پر مدعو کیا اور کھانے کے بعد ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش فرمائی، (**المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث نمبر: ۱۹۷۱**) اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم بھائیوں یا مسلمانوں کو کھانے کی پارٹی دے کر ان سے دین کے بارے میں گفتگو کی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ ایسے موقع پر آنے والوں کا ذہن یکسو ہوتا ہے اور وہ ہر بات کو توجہ سے سنتے ہیں اور اس کو قبول کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔

عرب میں مختلف میلے لگا کرتے تھے، ان میلوں میں شراب و کباب کی مجلسیں بھی جمتی تھیں، لوگ اپنے اپنے قبائل کی تعریف کے پُل باندھتے تھے، ایسے اشعار بھی پڑھے جاتے تھے، جو بے حیائی پر مبنی ہوتے تھے، انہیں میلوں میں ایک ''ذوالمجاز'' کا میلہ بھی تھا، آپ ﷺ اس طرح کے میلوں میں بھی تشریف لے جاتے اور وہاں لوگوں پر دعوت حق پیش فرماتے، چنانچہ بنی مالک بن کنانہ کے ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے ذوالمجاز کے لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ فرماتے جاتے تھے: لوگو! **لا إلہ إلا اللہ** کہو، اس میں تمہاری کامیابی ہے: ''**قولوا لا إلہ إلا اللہ تفلحون**'' اور ابوجہل آپ پر گرد وغبار پھینکتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ یہ شخص تم لوگوں کو تمہارے دین سے دور نہ کردے، (مسند أحمد، حدیث نمبر: ۱۶۶۵۴) اسی طرح طارق بن عبداللہ سے مروی ہے کہ میں ذوالمجاز کے میلے میں تھا کہ ایک نوجوان شخص کا گذر ہوا، جس پر سرخ لکیروں والے کپڑے کا حلہ تھا، وہ کہتا جاتا تھا: اے لوگو! **لا إلہ إلا اللہ** کہو، اور کامیابی پاؤ، پیچھے پیچھے ایک شخص ان پر پتھر وغیرہ پھینکتا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کے ٹخنے اور پنڈلیاں لہولہان تھے، پتھر پھینکنے والا شخص کہتا جاتا تھا، یہ شخص جھوٹا ہے، اس کی

بات نہ مانو، جب میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا، یہ بنی ہاشم کا ایک نوجوان ہے، جس کا خیال ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ اس کا چچا ابولہب ہے، (**المعجم الکبیر للطبرانی**، حدیث نمبر: ۸۱۷۵) اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں حج کے اجتماعات میں بھی بہت سی نا مناسب باتیں مشرکین عرب نے شامل کردی تھیں، یہاں تک کہ مکہ سے باہر کے حجاج — جن کو باشندگانِ حرم کی طرف سے کپڑے نہیں مل پاتے تھے — بےلباس طواف کیا کرتے تھے، دن میں مرد اور رات میں عورتیں، ان سب کے باوجود رسول اللہ ﷺ حج کے اس اجتماع کو دعوت کے لئے خاص طور سے استعمال فرماتے تھے، اور موسمِ حج ہی کی دعوت اہل مدینہ کے دامنِ ایمان میں آنے کا سبب بنی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن وسائل کا استعمال منکرات کے لئے کیا جاتا ہے، اگر فی نفسہ ان کا استعمال جائز ہو تو دعوتی مقاصد کے لئے ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

آپ ﷺ کے طریقۂ دعوت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ اس میں ''تدریج'' کا خیال رکھتے تھے، جب آپ غیر مسلموں کو ایمان کی طرف بلاتے تو پہلے انہیں صرف ایمان کی دعوت دیتے؛ تاکہ وہ آسانی سے اسے قبول کرلیں اور اپنے رفقاء کو بھی اس کو ملحوظ رکھنے کی تلقین فرماتے تھے، آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو انہیں خاص طور پر نصیحت فرمائی کہ تم ایک ایسے گروہ کے پاس جارہے ہو جو اہل کتاب ہیں؛ اس لئے انہیں اس بات کی طرف بلانا کہ وہ اللہ کے ایک ہونے اور میرے رسول ہونے کی شہادت دیں، جب وہ اسے قبول کرلیں تو پھر ان سے کہنا کہ اللہ نے پانچ وقت کی نمازیں بھی فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو مان لیں اور نماز پڑھنے لگیں تو پھر بتانا کہ ان کے مال میں زکوۃ بھی فرض کی گئی ہے، زکوۃ عام طور پر وصول کرکے مدینہ بھیجی جاتی تھی اور پھر یہاں سے اس کی تقسیم عمل میں آتی تھی؛ لیکن آپ ﷺ نے حکمت سے کام لیتے ہوئے انہیں تلقین کی کہ اُن کے مال داروں سے مال وصول کرکے اُن ہی کے فقراء پر اسے خرچ کردینا اور ان کے مال کا بہتر حصہ زکوۃ میں وصول کرنے سے بچنا، (**مسلم، باب الدعاء إلی الشهادتین إلخ**، حدیث نمبر: ۱۹) — اس میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو تلقین فرمائی کہ وہ رفتہ رفتہ احکام شریعت کی طرف بلائیں؛ تاکہ اسلام انہیں بوجھ محسوس نہ ہونے لگے، پھر زکوۃ کے بارے میں آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہیں تقسیم کردیا جائے، اس کی حکمت یہ تھی کہ لوگوں میں غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ اسلام کی طرف دعوت کا مقصد محض

پیسے وصول کرنا ہے، —— غیر مسلموں ہی نہیں؛ بلکہ بعض اوقات مسلمانوں کو بھی دین کی طرف بلانے میں تدریج کی ضرورت پڑتی ہے اور جن کے دلوں میں دین کی عظمت جاگزیں نہیں ہوئی ہے، ان کو یکبارگی شریعت کے تمام احکام کا مکلف بنانا نفرت اور گریز کا سبب بن جاتا ہے۔

دعوت دین میں تدریج کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پہلے غیر مسلم بھائیوں کو ان باتوں کی طرف بلایا جائے جو اسلام اور ان کے مذہب کے درمیان مشترک ہوں؛ چنانچہ قرآن مجید میں حضور ﷺ کی زبان مبارک سے یہ بات کہلوائی گئی کہ ''اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ، جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور اللہ کے بجائے ایک دوسرے کو اپنا رب نہیں بنائیں گے'' (آل عمران: ٦٤) —— موجودہ حالات میں دعوت دین کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے، اللہ کی کتابیں مختلف امتوں میں نازل ہوتی رہی ہیں اور قرآن مجید اس کتاب ہدایت کی آخری اور مکمل صورت ہے، پہلی کتابوں میں ان کتابوں کی حامل امتوں نے بہت ساری آمیزشیں کردی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود بہت سی سچائیاں آج بھی ان میں موجود ہیں، عقیدۂ توحید، نبوت محمدی، جنت و دوزخ، سچ بولنے، وعدہ وفا کرنے، شرم وحیا کی حدود پر قائم رہنے اور انسانیت کی خدمت و مدد کی ترغیبات، نیز زنا، بے حیائی، قتل و غارت گری وغیرہ کی ممانعتیں نہ صرف بائبل میں موجود ہیں؛ بلکہ ہندو بھائیوں کی مذہبی کتابوں —— ویدوں اور پُرانوں وغیرہ —— میں بھی حیرت انگیز حد تک اسلامی تعلیمات کی مماثل باتیں پائی جاتی ہیں، ان قوموں سے خطاب کرتے ہوئے ایسے مضامین کو پیش کرنا نہ صرف درست ہے؛ بلکہ یہ قرآن کی اس ہدایت کی تعمیل ہے کہ غیر مسلموں کو پہلے مشترک تعلیمات کی طرف دعوت دی جائے، رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر یہودیوں سے گفتگو کرتے ہوئے تورات کے حوالہ سے استدلال کیا ہے؛ چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ ایک رات کے بڑے حصہ میں بنی اسرائیل کے بارے میں ہمیں بتاتے رہے اور صرف نماز کے لئے اٹھے، (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۰۰۰۴) اس لئے ان کی مذہبی کتابوں میں جو باتیں قرآن وحدیث سے مختلف نہ ہوں، اگر دعوتی اغراض کے تحت ان کو پیش کیا جائے اور ان سے استدلال کرتے ہوئے انہیں دین محمدی کی طرف بلایا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

غرض کہ دعوت اسلام کے لئے کوئی خاص طریقہ آپ ﷺ نے متعین نہیں فرمایا؛ کیوں کہ دعوت میں اصل اہمیت مقصد کی ہے، لوگوں کے حالات، ان کی نفسیات، ملکی قانون، اور دستیاب وسائل کے اعتبار سے کسی ایک طریقہ کا متعین کر دینا ممکن نہیں تھا؛ لیکن آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں وہ بنیادی اصول ملتے ہیں، جن کو ہم دعوت کے کام کے لئے مشعلِ راہ بنا سکیں۔

داعیان دین کی خدمت میں!

خوشبو کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ پھیلے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، روشنی کی حقیقت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ بکھرے اور جہاں تک اس کی رسائی ہو، تاریکی کا قلع قمع ہوجائے، اسی طرح اسلام کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ پھیلے اور پھیلتا چلا جائے، سمٹ کر رہ جانا اس کی طبیعت کے خلاف ہے؛ اسی لئے قرآن مجید میں دین حق کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے، اور باطل مذاہب کو ظلمات یعنی تاریکیوں کا نام دیا گیا ہے۔ (البقرۃ:۲۵۷) اور دین حق کی حامل اس امت کو داعی امت قرار دیا گیا ہے اور اسی ذمہ داری کی بنا پر اس کو،، خیر امت'' کا لقب دیا گیا ہے۔ (آل عمران:۱۱۰)

اسی لئے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دعوت دین محض ایک استحبابی عمل نہیں ہے؛ بلکہ امت کے فرائض میں شامل ہے، اگرچہ بعض فقہاء نے اسے 'فرض عین' قرار دیا ہے، یعنی یہ ہر مسلمان پر انفرادی حیثیت سے فرض ہے کہ لوگوں کو ایمان کی طرف بلائیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے پوری امت کو دعوت کے حکم کا مخاطب بنایا ہے۔ (آل عمران:۱۱۰) اور بعض نے اس کو 'فرض کفایہ' کہا ہے، یعنی امت کے ہر ہر فرد پر سے یہ فریضہ متعلق نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے، اگر امت کے اتنے افراد اس کام میں لگ جائیں جو اپنے علاقے کے ہدایت سے محروم لوگوں میں دعوت کے کام کے لئے کافی ہوں تو فریضہ دعوت ادا ہوجائے اور دوسرے لوگ بھی اس کام کو نہ کرنے کی وجہ سے گناہ گار نہیں ہوں گے؛ کیوں کہ قرآن میں ایک اور موقع پر فرمایا گیا کہ تم میں ایک ایسا گروہ ہونا چاہئے جو امت کو خیر کی طرف بلانے والا ہو۔ (آل عمران:۱۰۴)

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اسّی فیصد لوگ ایمان سے محروم ہیں، جب تک تمام مسلمان دعوت کے کام میں نہ لگ جائیں، غالباً تمام برادران وطن تک ایمان کی دعوت پہنچانا ممکن نہیں ہوگا؛ اس لئے اگر دعوت دین کا حکم فرض کفایہ کے درجہ میں ہو، تب بھی ہندوستان کے خصوصی حالات میں یہ فرض عین سے کم اہمیت کا حامل نہیں؛ کیوں کہ فرض کفایہ بھی حالات اور ضرورت کے لحاظ سے بعض

اوقات فرض عین کے درجہ میں آ جاتا ہے۔

یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان پہلی صدی ہجری میں آ گئے، انہوں نے ایسی مستحکم حکومت قائم کی کہ اس ملک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، ان کی حکومتوں کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ موجودہ دور کے کئی کئی ممالک اس میں شامل تھے، انہوں نے اس ملک میں مضبوط قلعے تعمیر کئے، خوبصورت باغات کو وجود بخشا، مسجدیں بنائیں، مسافر خانے بنائے، سڑکیں تعمیر کیں، تعلیمی ادارے قائم کئے، فن تعمیر کے اعتبار سے ایسی نازک، دیدہ زیب اور دل کش عمارتیں تعمیر کیں، جن میں سے بعض کا شمار دنیا کے عجائب میں ہوتا ہے، انہوں نے آب پاشی کا عمدہ نظام قائم کیا، زراعت اور صنعت کو فروغ دیا، عوامی فلاح وبہبود اور خدمت خلق کے بہت سے کام انجام دیئے، مختلف مذاہب کے لوگوں کو مل جل کر اور شیر وشکر ہو کر رہنے کا طریقہ سکھایا؛ لیکن جو چیز سب سے ضروری تھی، اس کی طرف توجہ نہیں کی، اور وہ ہے دعوت دین کا کام، ابتدائی دور میں میں جو عرب تجار آئے، یا محمد بن قاسمؒ کے ساتھ جو عرب مجاہدین آئے، انہوں نے اس کام کی طرف توجہ کی اور آج افغانستان سے لے کر سندھ تک جو مسلم آبادی ہے، وہ ان ہی کی دعوتی کوششوں کا نتیجہ ہے، پھر جب ہندوستان میں عجمی نژاد حکومتیں قائم ہوئیں تو دعوت اسلام کا کام ان کی ترجیحات سے باہر ہو گیا؛ اس لئے عملاً مسلمان دعوت کے میدان سے ہٹ گئے؛ البتہ بعض صوفیاء اور علماء نے انفرادی طور پر دعوتی کوششیں کیں، خاص کر راجستھان، کشمیر، دکن، بنگال اور موجودہ بنگلہ دیش وہ علاقے ہیں، جہاں خانقاہوں اور علماء کی انفرادای کوششوں کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی؛ مگر افسوس کہ حکومتیں تو اس فریضہ سے غافل تھیں ہی، خانقاہوں میں بھی اخلاف نے اپنے اسلاف کی دعوتی مہم کو زندہ نہیں رکھا، اور ان کی اصلاحی کوششیں زیادہ تر اپنے متوسلین اور ارادت مندوں تک محدود ہو کر رہ گئیں۔

پھر ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی کہ ہمیں پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرنی چاہئے، اگر مسلمان پوری طرح دین پر آ جائیں اور صدفی صد مسلمان ہو جائیں تو خود بخود جو لوگ اسلام سے باہر ہیں، وہ اسلام کے دائرے میں آ جائیں گے؛ حالانکہ یہ یا تو غلط فہمی تھی یا اپنی ذمہ داری سے فرار تھا، صحابہ کرام سے بڑھ کر دین اور اخلاق کا نمونہ کون ہو سکتا تھا؟ جن کو براہ راست آفتاب نبوت سے فیض یاب ہونے کا موقعہ ملا؛ لیکن کیا اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء عالی مقام کو دعوت دین کے لئے

جدو جہد نہیں کرنی پڑی؟ جب خیر القرون میں دعوت کی ضرورت باقی رہی تو بعد کے ادوار میں تو بہر حال انحطاط وزوال آتا ہی جائے گا، جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ہے، تو کیوں کر ممکن ہے کہ اب اس دور میں دعوت کے بغیر اسلام کی اشاعت کا مقصد پورا ہو جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح پر برادران وطن میں دعوت کے کام کو موقوف کرنا گویا دعوت کو ایک ناممکن شئ پر موقوف کر دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مختلف گوشوں سے دعوت کی جدو جہد شروع ہوئی ہے اور مختلف علاقوں میں مختلف افراد اور ادارے غیر مسلم بھائیوں تک اسلام کی امانت کو پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں، خاص کر ۱۹۹۲ء کے بعد سے اس رجحان میں اضافہ ہوا ہے، بہت سے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ اس وقت مسلمان جن آزمائشوں سے گذر رہے ہیں، اس کا ایک بنیادی سبب مسلمانوں کا اپنی داعیانہ ذمہ داری سے غفلت برتنا اور اس سلسلے میں بے اعتنائی سے کام لینا ہے، پھر تجربہ سے یہ بات بھی سامنے آرہی ہے کہ حالانکہ مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ایک جنون پیدا کیا جا رہا ہے اور اسلاموفوبیا کی لہر پوری دنیا میں چل رہی ہے؛ لیکن اس کے باوجود اسلام کی روحانیت، عقل سے ہم آہنگی، فطرت انسانی سے مطابقت اور اپنی فطری کشش وجاذبیت کی وجہ سے وہ لوگوں کے دل ودماغ کو فتح کرتا جا رہا ہے، جو لوگ نفرت کی تلوار اور عداوت کے تیر ونشتر لے کر آگے بڑھتے ہیں، جب حقیقت حال ان کے سامنے آتی ہے تو وہی اس کے جاں نثار سپاہی اور ترجمان بن جاتے ہیں، اس تجربہ نے بھی دعوتی کام کرنے والوں کے جذبہ کو مہمیز کیا ہے اور ان کے یقین کو بڑھایا ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ مختلف حلقوں سے جو دعوتی کام انجام پا رہے ہیں، ان کی طرف سے بعض ایسی کمزوریاں سامنے آرہی ہیں، جو اس کام پر لوگوں کے اعتماد کو مجروح کر رہی ہیں اور اندیشہ ہے کہ جس جوش کے ساتھ یہ کام شروع ہوا ہے، کہیں اتنی ہی تیز رفتاری کے ساتھ یہ کام بیٹھ نہ جائے …………

دعوتی کام کرنے والے بعض افراد کی طرف سے ایک غلطی یہ سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے میدان سے ہٹ جاتے ہیں، جن حضرات کا اصل میدان مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہے، وہ تفسیر وحدیث اور فقہ وفتاویٰ کے میدان میں بھی رائے زنی کرنے لگتے ہیں، انسان کی ایک فطری کمزوری یہ ہے کہ جب آدمی شہرت کی منزلیں طئے کرنے لگتا ہے اور اس کے گرد لوگوں کا

اژدہام بڑھ جاتا ہے تو پھر وہ توازن کھودیتا ہے اور اسے کسی سوال کے جواب میں یہ کہنا بہت شاق گذرتا ہے کہ یہ میرا میدان نہیں ہے، یا یہ کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے، بڑا سے بڑا قابل اور باصلاحیت شخص بھی جب اپنے میدان سے باہر قدم نکالتا ہے تو بعض اوقات بچکانہ باتیں کہہ جاتا ہے، جن کے ذریعہ عوام سے تو تالیاں بجوائی جاسکتی ہیں؛ لیکن جو واقعی اہل علم ہیں، ان کے لئے ان کی حیثیت ایک لطیفہ سے کم نہیں ہوتی۔

لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ آدمی شہرت و بلندی کے مقام پر پہنچنے کے باوجود اگر اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیتا ہے تو لوگوں کی نظر میں اس کی عزت اور بڑھ جاتی ہے اور یہ دراصل اخلاص اور خشیت الٰہی کی دلیل ہوتی ہے، امام مالکؒ سے مسجد نبوی میں بڑے مجمع کے درمیان اور شاگردوں کے سامنے چالیس سوالات کئے گئے، انہوں نے چھتیس سوالوں کے بارے میں فرمایا: مجھے نہیں معلوم، اس سے امام مالک کا مقام گھٹا نہیں؛ بلکہ اہل علم کی نظر میں بڑھ گیا اور آج بھی ان کے اس عمل کی مثال دی جاتی ہے، اس کی ایک مثال ماضی قریب میں احمد دیدات ہیں جنہوں نے اپنے مناظروں کے ذریعہ بڑے بڑے عیسائی مناظرین کو مہر بلب کر دیا تھا؛ لیکن دوسری طرف اگر کوئی معمولی فقہی مسئلہ بھی پوچھا جاتا یا قرآن وحدیث کے بارے میں سوال کیا جاتا تو وہ صاف کہہ دیتے کہ یہ میرا میدان نہیں ہے، اس کے لئے آپ علماء اور ارباب افتاء سے رجوع کریں، میدان سے ہٹ کر گفتگو کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی شخصیت نزاعی بن جاتی ہے اور اصل دعوتی کاز کو نقصان پہنچ جاتا ہے، جدید تعلیم یافتہ حضرات جن کو اللہ تعالیٰ نے دعوتی کام کی توفیق عطا فرمائی ہے، انہیں اس پہلو پر ضرور غور کرنا چاہئے اور اپنے میدان سے باہر ہرگز نہیں جانا چاہئے، دعوت تو کارِ نبوت ہے، اور یہ اس امت کی بعثت کا خصوصی مقصد ہے، نیز اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اگر سو سال ہزاروں لوگ اس کام کو کرتے رہیں، تب بھی یہ کام ناتمام ہی رہے گا، تو پھر اس وسیع میدانِ کار سے باہر نکلنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بعض دفعہ دعوتی کارکن مسلکی اختلاف میں الجھ جاتے ہیں اور ان امور پر گفتگو کرنے لگتے ہیں، جو دین کا اصل مقصد نہیں ہیں اور جن پر نجات موقوف نہیں ہے، راقم الحروف کو ایک 'دعوہ تربیتی کیمپ' میں شرکت کا موقعہ ملا اور شرکاء کے سوالات کے جوابات میرے ذمہ کئے گئے، ان میں کئی حضرات نے یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟ عرش پر ہیں یا ہر جگہ ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کی دعوتی کوششوں کا ذکر قرآن مجید میں تفصیل سے آیا ہے، ہر نبی نے لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف دعوت دی اور شرک سے منع فرمایا، کیا کسی نبی نے اپنی امت کو اس بات کو ماننے کی طرف دعوت دی کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ قرآن مجید میں یہ بات بھی آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ ہم انسان کی شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، ان دونوں ارشادات کو سامنے رکھ کر سلف صالحین نے اس مسئلہ کی ایسی وضاحت کی ہے کہ اللہ کی توحید پر کوئی حرف نہ آئے، کسی نے لوگوں کو اس تصور کی طرف دعوت نہیں دی، جو اس نے سمجھا ہے، اور اگر کسی نے الفاظ قرآنی کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے مختلف سوچ اختیار کی تو اسے گمراہ بھی نہیں قرار دیا؛ لیکن سوال یہ ہے کہ دعوت اسلام کا اس بحث سے کیا تعلق ہے؟ ہونا تو یہ چاہئے کہ داعی کا ذہن فروعی اختلافی مسئلہ سے بالکل ہٹ جائے؛ کیوں کہ جس کے سامنے کوئی اہم کام نہیں ہوتا ہے، وہ غیر اہم کاموں میں الجھتا ہے، جس کے سامنے اہم کام ہوتا ہے، وہ ایسی غیر اہم باتوں میں نہیں الجھتا ہے، اس کے سامنے اہم کام ہوتا ہے، وہ ایسی غیر اہم باتوں میں نہیں الجھتا ہے، اسی طرح بعض دعوتی کام کرنے والے نماز سے متعلق اختلافی مسائل چھیڑ دیتے ہیں اور دین کی دعوت کو مسلک کی دعوت کا رنگ دینے لگتے ہیں، یہ کسی داعی کو ہرگز زیب نہیں دیتا، ایک بڑے صاحب علم کے بقول مسلک قابل ترجیح تو ہوسکتا ہے، قابل تبلیغ نہیں ہوسکتا؛ لیکن مسلکی تشدد اور فروعی مسائل کے جھگڑوں کی وجہ سے لوگ مسلک کو ''دین'' کا درجہ دیدیتے ہیں، اس کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور کم فہمی سے اسی کو دعوت سمجھنے لگتے ہیں۔

دعوت دین ایسا کام ہے جس سے کسی سلیم العقل مسلمان کو اختلاف نہیں ہوسکتا، یہ امت کو جوڑنے والا عمل ہے، داعی کو ایسی باتوں سے خوب بچنا چاہئے جو اختلاف اور غلط فہمی کا سبب بنے اور جس سے لوگ بدگمان ہوجائیں، ہوسکتا ہے کہ کسی خاص واقعہ یا کسی خاص لفظ کے مفہوم کے سلسلے میں آپ کی رائے الگ ہو اور اس کا تعلق دین کی بنیادی تعلیمات اور ان مسائل سے نہ ہو جو دین میں مدار نجات ہیں؛ لیکن اس رائے کے اظہار سے اختلاف پیدا ہوتا ہو، لوگ قریب ہونے کے بجائے دور ہوجاتے ہوں تو داعی کو اس اظہار سے بچنا چاہئے، اسے نرم خو، روادار اور صابر ہونا چاہئے، قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کہ آپ مسلمانوں کے لئے نرم خو ہیں، اگر آپ سخت مزاج اور

درشت زبان ہوتے تو لوگ آپ سے کھنچ جاتے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا اتنا لحاظ تھا کہ بعض دفعہ آپ اس مقصد کے لئے مستحبات کو بھی ترک فرما دیتے تھے، جیسے آپ چاہتے تھے کہ کعبہ اللہ کو بنائے ابراہیمی پر تعمیر فرمائیں؛ لیکن اس اندیشہ سے کہ جزیرۃ العرب کے مشرکین اور نو مسلمین غلط فہمی میں پڑ جائیں گے، آپ نے زمانہ جاہلیت کی تعمیر کو باقی رکھا، دعوتی کام کرنے والے حضرات جب کسی آیت یا حدیث کی تشریح میں ایسی رائے اختیار کرتے ہیں، جو سلف صالحین کی متفقہ رائے سے ہٹی ہوئی ہو یا کسی واقعہ کی ایسی توجیہ کرتے ہیں جو اس فن کے ماہرین کی وضاحت سے الگ ہو، تو اس سے انتشار پیدا ہوتا ہے اور ان کی ذات سے امت کو جو نفع پہنچ سکتا تھا وہ کم ہو جاتا ہے، پھر دعوتی کام کرنے والوں کی جو ٹیم ان کے ذریعہ وجود میں آسکتی تھی، وہ نہیں بن پاتی ہے؛ اس لئے داعیانِ دین کو اپنے بلند تر مقصد پر نظر رکھنی چاہئے اور غیر اہم مسائل میں الجھنے سے بچنا چاہئے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ داعی کو اپنے مخاطب کے بالمقابل نرم خو ہونا چاہئے، لب ولہجہ بھی نرم ہو، الفاظ میں بھی مٹھاس ہو، مخاطب کے ساتھ توقیر واحترام کا معاملہ کیا جائے، اس کو اس کے معیار کے لحاظ سے عزت دی جائے، اس سے ایسی بات نہ کی جائے، جس سے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو، جیسے وہ جن باطل معبودوں کی پرستش کرتا ہے، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ لیکن یہ بھی درست نہیں کہ مداہنت کا طریقہ اختیار کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ گذشتہ کتابوں سے دعوت اسلام کی تقویت کے لئے اس طرح استدلال کیا جائے کہ یہ کتابیں گویا قرآن کے ہم پلہ ہیں یا مذاہب کی مشترکہ تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ وحدت ادیان کا تصور ابھرنے لگے؛ کیوں کہ حق کے قبول نہ کرنے کے لئے یہ بہت بڑا ہتھیار ہے، اکثر ہندو مذہبی قائدین قبول حق سے بچنے کے لئے اس بات کا سہارا لیتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں، راستے الگ الگ ہیں، منزل الگ الگ نہیں؛ حالاں کہ قرآن نے جو تصور پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ سچا دین صرف ایک ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو دین اتارا جاتا رہا، وہ سب ایک ہی دین ہے، جس کی بنیاد توحید، رسالت اور آخرت پر ہے، اس کے علاوہ جن تصورات کو لوگ ''دین'' کہتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا خالص دین نہیں، اس میں انسانی آمیزشیں اور ملاوٹیں شامل ہیں اور اس لئے وہ آخرت میں نجات کا سبب نہیں بن

سکتے، دعوت کو اس سلسلہ میں بالکل واضح ہونا چاہئے اور قرآن مجید کو اصل بناتے ہوئے دوسری مذہبی کتابوں سے استفادہ کرنا چاہئے۔

دعوت دین کے میدان میں بہت سے فقہی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں، ان میں بعض وہ ہیں جو اجتہاد پر مبنی ہیں اور ان میں معتبر فقہاء کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اگر ان میں کوئی رائے مصلحت سے زیادہ قریب ہو اور اس سے کوئی مسئلہ حل ہوسکتا ہو تو علماء کے مشورہ سے اس سے استفادہ کی گنجائش معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ دین کی مصلحت، کسی خاص مسلک اور کسی مخصوص اجتہاد سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے؛ لیکن جن احکام پر فقہاء کا اتفاق ہے، یا کوئی ایسا اختلاف ہے، جسے اہل علم نے معتبر نہیں مانا ہے، ان کو اختیار کرنا قطعاً مناسب نہیں، مثلاً: بیوی مسلمان ہونے کو آمادہ ہو اور شوہر مسلمان نہ ہو تو یہ درست ہے کہ بیوی سے کہا جائے کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کو شوہر کے مسلمان ہونے پر موقوف نہ رکھے؛ تاکہ کفر کے گناہ سے اسے نجات مل جائے، اگر وہ کسی اور گناہ کی مرتکب بھی ہوئی تو وہ کفر سے کم تر درجہ کا ہوگا؛ لیکن یہ کہنا درست نظر نہیں آتا کہ شوہر چاہے کتنی مدت تک یا موت تک بھی ایمان نہ لائے، نکاح باقی رہے گا؛ کیوں کہ یہ قرآن وحدیث کی واضح صراحتوں اور امت کے اجماع واتفاق کے خلاف ہے۔

یہ بات ضرور ہمارے ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسلام دوسرے مروجہ مذاہب کی طرح موم کی ناک نہیں ہے کہ اس کو جیسے چاہے موڑ دیں؛ بلکہ ایک مستقل دین اور مستقل تہذیب ہے اور کچھ متعین اعمال وافکار کا مجموعہ ہے، اسلام کو عیسائیت اور ہندومت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، جس میں مذہب کی تبدیلی سے کچھ معبودوں کا اضافہ تو ہوجاتا ہے؛ لیکن ان کی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آتی، ان کا رہن سہن، لوگوں سے تعلقات، مذہبی تقریبات میں شرکت، سماجی رسم ورواج یہاں تک کہ پوجا پاٹ ان سب میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا، اسلام ایسی ہمہ رنگی کو قبول نہیں کرسکتا؛ اس لئے ہمیں دعوتی مصالح کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے؛ مگر اس قدر نہیں کہ اس کی سرحدیں مداہنت سے مل جائیں۔

دعوت دین ایک اہم ترین مذہبی فریضہ ہے، یہ ہمارے بہت سے قومی وملی مسائل کا حل بھی ہے اور آخرت میں اس پر بے حد وحساب اجر وثواب بھی ہے؛ لیکن یہ کام اسی قدر نازک بھی ہے، جس میں ایک طرف بے طلب مخاطب کی رعایت بھی کرنی ہے، دوسری طرف اپنی فکری وعملی سرحدوں کی

حفاظت بھی کرنی ہے اور کتاب وسنت کے دائرہ سے باہر بھی نہیں جانا ہے، کام کو پھیلانا بھی ہے اور تشبہ سے بچنا بھی ہے، لوگوں کو کام کی اہمیت اور طریقہ سے واقف بھی کرانا ہے اور اپنے سرمایہ اخلاص کو ریاء ودکھلاوے کی دیمک سے بچانا بھی ہے، جہاں ضرورت دامن گیر ہو، وہاں اسلامی افکار کو ثابت کرنے اور مدلل طریقے پر پیش کرنے کے لئے دوسری مذہبی کتابوں سے استفادہ بھی کرنا ہے؛ لیکن اس بات کو واضح بھی کرنا ہے کہ قرآن مجید گذشتہ کتابوں میں چُھپی ہوئی سچائیوں اور انسان آمیزشوں کو پرکھنے کے لئے کسوٹی ہے، وہ وحدت دین کا قائل ہے نہ کہ وحدت ادیان کا، اس کے نزدیک منزل بھی ایک ہے اور راستہ بھی ایک، — ان امور کی رعایت کے ساتھ دعوت کا کام کرنا اور برادران وطن تک اسلامی تعلیمات کا پہنچانا امت کا اہم ترین فریضہ ہے اور یہی اس دور کا اصل جہاد ہے۔

برادران وطن میں کام کرنے والے بعض داعیوں کے یہاں یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ دعوت کا کام صرف غیر مسلموں میں ہے مسلمانوں میں نہیں؟ پھر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں نیکی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کا جو کام کیا جاتا ہے وہ دعوت نہیں ہے، اس حقیر کا خیال ہے کہ یہ ایک فضول بحث ہے، اس سے اختلاف کا دروازہ کھلتا ہے اور دین کے ایک اہم شعبہ کی اہمیت کم ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا مقصد اللہ کی طرف بلانا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ الخ﴾ (یوسف: ۱۰۸) یا جیسا کہ فرمایا گیا ﴿وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ﴾ (الحج: ۶۷) اب اللہ کی طرف بلانے کی دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں، کفر سے ایمان کی طرف بلایا جائے، یہ غیر مسلموں میں دعوت ہے، یا اللہ کی نافرمانی سے اللہ کی اطاعت کی طرف بلایا جائے، یہ مسلمانوں میں دعوت ہے، دعوت دین کے لئے قرآن مجید میں جو تعبیر سب سے زیادہ اختیار کی گئی ہے، وہ ہے: ''امر بالمعروف'' یعنی معروف وبھلائی کا حکم دینا، اور ''نہی عن المنکر'' یعنی برائی سے روکنا، بھلائی کا سب سے اعلیٰ درجہ ایمان ہے، جس کی طرف غیر مسلموں کو دعوت دینے کی ضرورت زیادہ ہے؛ لیکن تمام اعمال صالحہ بھی معروف میں داخل ہیں، جن کے مخاطب مسلمان ہیں، منکر کا انتہائی درجہ شرک وکفر ہے؛ لیکن تمام گناہ اور سیئات ''منکر'' میں داخل ہیں، جہاں غیر مسلموں کو کفر وشرک سے بچانے کی ضرورت ہے، وہیں مسلمانوں کو گناہوں سے بچانے کی ضرورت بھی کچھ کم نہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کے مخاطب مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، قرآن مجید نے پوری

وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ وہ اپنے بھائی کو معروف یعنی نیکی کی طرف بلائے ﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (توبہ:۱۷)......جس طرح یہ بات درست نہیں ہے کہ غیر مسلموں میں دعوت کے کام کی ضرورت نہیں، جب مسلمانوں کے اعمال درست ہوجائیں گے تو غیر مسلم حضرات خود بخود دائرہ اسلام میں آجائیں گے، اسی قدر غلط یہ بات بھی ہے کہ دعوت غیر مسلموں کے لئے ہے، مسلمانوں کے لئے نہیں، خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں لاکھوں مسلمان کفر کی سرحد پر کھڑے ہیں اور فتنۂ ارتداد کی چنگاری شعلہ بنتی جارہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبے ہیں، یہ تمام شعبے ایک دوسرے کی تقویت کے لئے ہیں، ان میں سے کسی بھی شعبے کی تحقیر یا اس کی اہمیت کو کم کرنا دین کی تحقیر ہے، صحابہ اور سلف صالحین کے دور میں مختلف لوگ اپنی اپنی صلاحیت اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق کام کرتے تھے، کسی پر ایک کام اور کسی پر دوسرے کام کا غلبہ تھا؛ لیکن ہر شخص اپنے بھائی کے کام کو قدر و قیمت کی نظر سے دیکھتا تھا؛ بلکہ خیال کرتا تھا کہ ان کا کام میرے کام سے بہتر ہے؛ لیکن آج کل کم فہمی اور غلو کی وجہ سے صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ اگر اللہ نے کسی کو کسی کام کی توفیق دی تو وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اصل دین یہی ہے اور وہ دوسرے کاموں کو کم نگاہی سے دیکھنے لگتا ہے؛ اس لئے دین کے کاموں میں تقابل صحیح طریقہ نہیں ہے، اس سے تصادم پیدا ہوتا ہے، دلوں کے فاصلے بڑھتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان دین کے بعض کاموں کو کم اہم سمجھنے لگتا ہے؛ حالاں کہ دین و شریعت سے ثابت کسی بھی حکم کو خواہ وہ استحباب کے درجہ ہی کا کیوں نہ ہو، کم تر سمجھنا جائز نہیں؛ بلکہ دینی اعتبار سے یہ بہت ہی خطرہ کی بات ہے، آدمی اپنے مزاج کے مطابق دین کے کسی شعبے میں کام کرے اور دوسرے کام کرنے والوں کی قدر و منزلت اس کے دل میں ہو تو اس سے محبت پیدا ہوتی ہے اور قربت میں اضافہ ہوتا ہے، خاص کر جو لوگ دعوت اسلام کا کام کر رہے ہیں، ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ امت کے زیادہ سے زیادہ افراد کو اس کام سے جوڑ دیں، اور جب اس طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، جن سے دوسرے کاموں پر زد پڑتی ہو تو لوگ جڑنے کے بجائے ٹوٹنے لگتے ہیں۔

اگر اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو مختلف شعبوں کی شخصیات کے احوال اس دور کے اہل علم

نے جمع کئے ہیں، محدثین اور راویان حدیث کے حالات پر توضخیم اور وسیع لٹریچر موجود ہے ہی؛ لیکن ان کے علاوہ مفسرین، فقہاء، ادباء، مؤرخین اور حکماء و مصنفین کے احوال پر بھی کتابیں موجود ہیں، جن کو عام طور پر طبقات یا تراجم کے نام سے جمع کیا گیا ہے، صوفیاء کے احوال پر عام طور پر ابتدائی دور میں کتابیں نہیں ملتیں یا بہت کم ملتی ہیں؛ البتہ برصغیر میں اس موضوع پر ایک حد تک توجہ دی گئی ہے، مگر اس کے باوجود کہ دعوت دین اور تبلیغ اسلام ایک بنیادی خدمت ہے اور ایسا فریضہ ہے جس کا قرآن پاک میں بار بار ذکر آیا ہے، دعاۃ ومبلغین کے طبقات وتراجم پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں ملتی، ہندوستان میں ایک مستشرق نے ''پریچنگ آف اسلام'' کے نام سے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو اس کو ایسی محنت کرنی پڑی، جو واقعی چونٹیوں کے منہ سے شکر جمع کرنے کے مترادف تھی، ادھر عالم عرب میں اس موضوع پر بعض کتابیں آئی ہیں؛ لیکن وہ بھی بہت مختصر اور تشنہ ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟— بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت دین کا جب بھی کام کیا گیا، کسی تشہیر کے بغیر اخفاء اور شہرت سے دوری اختیار کرتے ہوئے کیا گیا، دعوت کے لئے موزوں طریقہ یہی ہے، مکہ سے جن لوگوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، ان کی تعداد تین سو سے کچھ زیادہ یا کچھ کم تھی، یہ سب مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لائے؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کے ایمان لانے کی تفصیل نہیں ملتی، اسی طرح مدینہ منورہ میں صلح حدیبیہ تک کم سے کم ڈیڑھ ہزار لوگ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے؛ کیوں کہ پندرہ سو کے قریب افراد تو اس سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ تھے، فتح مکہ کے موقع سے آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار افراد تھے تو یقیناً ایمان لانے والوں کی تعداد اس سے زیادہ رہی ہوگی، اور حجۃ الوداع میں آپ کے رفقاء سفر کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی اور ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ بہت سے مسلمان وہ ہوں گے، جو اس حج میں شریک نہیں ہو پائے ہوں گے؛ لیکن اتنی بڑی تعداد میں شاید دو چار آدمیوں کے قبول اسلام کی تفصیل حدیث وتفسیر میں مل جائے، پھر اسلام کی کرنیں پھیلتی گئیں، پورا یمن، پورا ایران، برصغیر کا بڑا حصہ اور مشرق بعید کے کئی ممالک میں اسلام کی اشاعت ہوئی، تاتاریوں کے مختلف قبائل نے اسلام قبول کیا، ترک دامن اسلام میں آئے، افریقہ کے ایک بڑے خطہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی، اس پوری تاریخ میں قبول اسلام کے دو چار واقعے ہی ایسے ملتے ہیں، جو تاریخ کے

ریکارڈ میں محفوظ ہیں، خود ہندوستان میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ، شاہ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ عثمان علی ہجویریؒ، سید علی ہمدانیؒ، مولانا کرامت علی جونپوریؒ اور متعدد صوفیاء اور مشائخ رحمہم اللہ نے بڑے پیمانہ پر دعوتِ اسلام کا کیا اور لاکھوں لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے، مگر ان کے اسلام لانے کا باعث کیا ہوا؟ اس سلسلے میں نہ مؤرخین کا بیان ملتا ہے نہ نومسلموں کی آپ بیتی، صرف اِکا دُکا واقعات کہیں آ گئے ہیں۔

دعوت کی تاریخ کا پردۂ خفا میں رہنا اور داعیانِ حق کے تذکرہ کا تاریخی ریکارڈ دستیاب نہ ہونا دراصل اس بات کی شہادت ہے کہ دعوت کا کام بے حد اخلاص اور اخفاء کے ساتھ کرنے کا کام ہے، یہ مدرسہ نہیں جس کے داخلہ کا اعلان اخبارات میں آئے، یہ خانقاہ نہیں جس کے مراسم کا نظام شائع ہو، یہ ایسی تحریک نہیں کہ جس کی کامیابیوں کا خوب چرچا کیا جائے؛ کیوں کہ مدرسہ وخانقاہ اور مسلمانوں کی ملی تحریک سے غیر مسلموں کا کوئی ٹکراؤ نہیں، مگر دعوت کا معاملہ اس سے مختلف ہے، اس میں تشہیر سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے، یہ گھلنے اور مٹ جانے کا کام ہے، یہ چراغ کی لو نہیں جو نظر آتی ہے؛ بلکہ یہ اس کا تیل ہے جو پیچھے رہتا ہے؛ لیکن اس کا ایک ایک قطرہ نذرِ آتش ہو جاتا ہے؛ تاکہ اپنے آپ کو پھونک کر زمانہ کو روشنی بخشے۔

مگر ادھر ایک نئی صورتحال پیدا ہو گئی ہے کہ دعوتی کاموں کی بہت تشہیر ہونے لگی ہے، یہ اگر حلقۂ تربیت تک محدود ہو تو حرج نہیں، مگر عوام الناس میں تقریر وتحریر کے ذریعہ کامیابیوں کا بہ کثرت ذکر کیا جاتا ہے، اور جو لوگ دعوت سے متأثر ہوتے ہیں، وہ بھی اپنی آپ بیتی بیان کرتے ہیں، پھر جب مختلف لوگ واسطہ در واسطہ اس طرح کی باتیں بیان کرتے ہیں تو عام طور پر یہ مبالغہ سے خالی نہیں رہ پاتیں، قلبی واردات اور مبشرات ناممکن نہیں ہیں، مگر ان کو دین میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے، بعض دفعہ ان کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ گویا یہ دلیل اور حجت ہیں، اگرچہ خود داعی اس طرح کی بات نہ کرے؛ لیکن معتقدین اس کو حد تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں، ایسی باتوں سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، آج کی دنیا واقعات کو تولنے کی دنیا ہے؛ لہٰذا جب کوئی بات مبالغہ آمیز محسوس ہوتی ہے تو اس سے بدگمانی جنم لیتی ہے، دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اسلام مخالف طاقتیں فتنۂ ارتداد کو بڑھاوا دینے لگتی ہیں، اور ان واقعات کو سامنے رکھ کر اپنے لوگوں کو اُکساتی ہیں؛ چنانچہ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گذشتہ

دس بارہ سال میں دعوتی کام میں بھی اضافہ ہوا ہے اور فتنہ ارتداد بھی اسی رفتار سے بڑھا ہے؛ بلکہ اگر غور کریں تو جن علاقوں میں برادران وطن میں دعوت کے کام کا زیادہ چرچا ہے، اکثر انہیں علاقوں میں ارتداد کے واقعات بھی زیادہ پیش آئے ہیں، اس سلسلے میں میناکشی پورم کا تجربہ ہمارے سامنے ہے کہ تاریخ میں کئی میناکشی پورم واقع ہو چکے تھے، جہاں لوگوں نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کیا تھا؛ لیکن اس واقعہ کو خود مسلم تنظیموں نے بڑی شہرت دی، آخر دعوت اسلام کی لہر تھم گئی؛ اور فرقہ پرستوں کے کان کھڑے ہو گئے، ہمیں خود اپنے عمل سے اس تاریخ کو دہرانا نہیں چاہئے اور اس کام کو اسی طریق پر کرتے رہنا چاہئے، جیسا کہ سلف صالحین نے کیا تھا۔

دعوت اسلام کا کام بے حد اہم ہے، جو لوگ اس خدمت میں لگے ہوئے ہیں، وہ بے حد تحسین وآفرین کے مستحق ہیں اور امت کی طرف سے فرض کفایہ کو ادا کر رہے ہیں، اس سطور کا مقصد ہرگز ان کے کام کی اہمیت کو کم کرنا اور ان کی خدمت کی ناقدری کرنا نہیں ہے؛ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اتنے عظیم، اہم اور بہتر کام کو ایسی کوتاہیوں سے آلودہ کرنے سے بچا جائے، جس سے اصل مقصد فوت جائے یا جن سے ایسے مفاسد در آئیں کہ کام کے وسیع ہونے کے بعد ان کی تلافی دشوار ہو جائے۔ واللہ ھو المستعان۔

برادرانِ وطن سے ہمارا تعلق

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اُنس اور محبت کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے، وہ محبت کرتا بھی ہے اور محبت چاہتا بھی ہے، اگر تعصب اور عناد کا نشہ اس پر چڑھا ہوا نہ ہو تو فطرت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ محبت سے پیش آئے، اس میں خاندان، زبان، علاقہ اور مذہب رکاوٹ نہیں بنتی، اگر سڑک پر کوئی حادثہ پیش آجائے اور کوئی زخمی تڑپ رہا ہو تو ہر شخص مدد کے لئے اس کی طرف بڑھتا ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، گورا ہو یا کالا، مرد ہو یا عورت، کسی زبان کا بولنے والا یا کسی مقام کا رہنے والا ہو، اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے تو ہر شخص آگ بجھانے کو دوڑتا ہے، اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس میں شامل ہوتا ہے، یہ بات نہیں دیکھی جاتی کہ یہ مکان کس کا ہے، اور اس کا تعلق کس گروہ سے ہے؟ یہی اصل انسانی فطرت ہے، اگر انسان اس جذبہ سے محروم ہوجائے تو پھر انسانی سماج اور اس جنگل کے درمیان کچھ فرق باقی نہیں رہے گا، جس میں درندے رہتے ہیں۔

جیسے انسان خود محبت کرتا ہے، اسی طرح وہ اپنے لئے بھی محبت کا بھوکا ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ماں باپ، بال بچے، شوہر اور بیوی، خاندان کے لوگ یہاں تک کہ سماج کے تمام لوگ اسے محبت کی نظر سے دیکھیں، بعض دفعہ انسان کا دل پتھر کی طرح سخت ہوجاتا ہے؛ لیکن محبت کی آنچ اسے بھی موم بنادیتی ہے، طاقت اور زور زبردستی کے ذریعہ جو بات نہیں منوائی جاسکتی تھی، محبت کے دو بول اور خوش اخلاقی کے اظہار کے ذریعہ وہ بات منوالی جاتی ہے، انسان کی یہ فطرت اسی وقت معطل ہوتی ہے، جب تعصب، تنگ نظری، غلط فہمی و بدگمانی اور پروپیگنڈہ انسان کے دل ودماغ کو نفرت کی آماجگاہ بنادیتا ہے؛ لیکن عام طور پر انسان کے اندر یہ کیفیت وقتی طور پر پیدا ہوتی ہے، جیسے صابن میل کچیل کو صاف کردیتا ہے، اس طرح حسن اخلاق دل کے غبار کو دھودیتا ہے۔

محبت اور حسن اخلاق تو ہر انسان کے ساتھ ضروری ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص یا گروہ آپ کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے تو اس کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، ہندوستان میں

اس وقت برادرانِ وطن کی صورت حال یہی ہے، اس ملک میں صدیوں سے مختلف قومیں آباد رہی ہیں اور انھوں نے شیر وشکر ہوکر اس ملک کی خدمت کی ہے، مختلف مسلمان خاندانوں نے کم وبیش آٹھ سو سال اس ملک پر حکومت کی ہے، ان کی فوج اور رعایا میں ہندو، مسلمان اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے، اگر وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے ہوتے تو کیسے اتنے وسیع ملک میں یہ حکومتیں قائم رہتیں اور امن وامان کا دور دورہ ہوتا؟ اس لئے سچائی یہی ہے کہ انگریزوں کے تسلط سے پہلے تک یہاں محبت اور بھائی چارہ کی عام فضا تھی، بدقسمتی سے بعض فرقہ پرست گروہوں کو یہ بات پسند نہیں ہے؛ اس لئے انھوں نے اس ملک کے طول وعرض میں نفرت کی بیج بونا شروع کردیا ہے اور اب یہ زہریلا پودا دن بدن تناور ہوتا جارہا ہے، بیماری کا علاج عام طور پر اس کی ضد سے ہوتا ہے، گرمی کا اثر دور کرنے کے لئے ٹھنڈی چیز دی جاتی ہے اور ٹھنڈک سے بچاؤ کے لئے گرم چیز استعمال کی جاتی ہے، شوگر کے مریض کو کڑوی غذا دی جاتی ہے، اگر گرمی کے اثر سے بیمار ہونے والے شخص کو مزید گرم چیزیں اور ٹھنڈک کے مریض کو اور بھی ٹھنڈی چیزیں دی جائے، یا شوگر کے مریض کو اور بھی میٹھی چیزیں کھلائی جائیں تو ظاہر ہے کہ اس سے بیماری میں اضافہ تو ہوگا، بیماری دور نہیں ہوسکے گی، اسی طرح اگر نفرت کے ردِ عمل میں نفرت ہی کا اظہار ہو تو ہر طرف نفرت ہی کے کانٹے اُگ آئیں گے، محبت کے پھول کہیں باقی نہیں رہیں گے، اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس نفرت انگیز مہم کا جواب محبت اور اخلاق کے ذریعہ دیں اور اس تدبیر کے ذریعہ ماحول کو بدلنے کی کوشش کریں۔

اس سلسلہ میں روزمرہ کی چند قابل توجہ اور ضروری باتیں یہ ہیں:

(۱) اکثر وبیشتر آپ کے مکان ودوکان کے قریب غیر مسلم پڑوسی ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بہتر سلوک کیجئے، اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر پڑوسیوں کے ساتھ بہتر سلوک کا حکم فرمایا ہے، (النساء: ۶۳) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے بارے میں اس قدر تلقین کرتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہیں ان کو وارث نہ بنادیا جائے، (بخاری، باب الوصاۃ بالجار، حدیث نمبر: ۶۰۱۴، مسلم، باب الوصیۃ بالجار والاحسان إلیہ، حدیث نمبر: ۲۶۲۳) حدیث کے شارحین نے لکھا ہے کہ اس میں مسلمان، غیر مسلم، عبادت گزار، فاسق، اجنبی، ہم وطن، نقصان پہنچانے والا، فائدہ پہنچانے والا، رشتہ دار، غیر رشتہ دار، قریب کے گھر والے اور دور کے گھر والے سب شامل ہیں،

(تحفۃ الاحوذی: ۶/ ۶۲) ایک حدیث میں ہے کہ پڑوسی تین طرح کے ہیں، ایک: ایسا غیر مسلم پڑوسی جس سے رشتہ داری نہ ہو، اس کا ایک حق ہے، دوسرے: مسلمان پڑوسی، اس کے دو حقوق ہیں، تیسرے: مسلمان رشتہ دار پڑوسی، اس کے تین حقوق ہیں۔ (شعب الایمان، اکرام الجار، حدیث نمبر: ۹۱۱۳)

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ آپ کی طرف سے مطمئن ہو، اس کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ آپ کی ذات سے اس کو نقصان پہنچے گا؛ چنانچہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تین بار ارشاد فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، صحابہ نے عرض کیا: کون اے اللہ کے رسول؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کا پڑوسی اس کے شر سے مامون نہ ہو، (بخاری، باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ، حدیث نمبر: ۶۰۱۶، مسلم، باب بیان تحریم ایذاء الجار، حدیث نمبر: ۱۷۰) — پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بھی شامل ہے کہ آپ کے یہاں کوئی اچھی چیز پکے اور غیر مسلم پڑوسی وہ کھاتا ہو، تو اس کے گھر بھیج دیا کریں، حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ کے یہاں ایک بکری ذبح کی گئی تو خاص طور پر اس میں سے پڑوس میں رہنے والے یہودی کو تحفہ بھیجنے کا حکم دیا، (تحفۃ الاحوذی: ۶/ ۶۲) اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ آپ کے کسی عمل سے آپ کے غیر مسلم پڑوسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے؛ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے: ’’من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذي جاره‘‘۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۱۸)

(۲) پڑوسی کی ایک خاص صورت وہ ہے، جس کو قرآن مجید میں ’’صاحب بالجنب‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے ایسے لوگ مراد ہیں، جن سے تھوڑی دیر کا ساتھ ہو، جیسے سفر کا ساتھی، کلاس کا ساتھی، دفتر اور پیشے کا ساتھی وغیرہ، (مفاتیح الغیب: ۱۰/ ۷۷) ان کے ساتھ بھی خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے بہتر سلوک کا حکم فرمایا ہے، جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں قدم قدم پر غیر مسلم بھائیوں کا ساتھ ہوتا ہے، خاص کر جہاز میں، ٹرین میں، بس میں، ان مواقع پر ان کے ساتھ خوش اخلاقی کا ثبوت دیجئے، ان کا سامان اُٹھانے میں، سامان رکھنے میں، یا سامان اُتارنے میں اگر آپ کی مدد کی ضرورت ہو تو خود سے بڑھ کر مدد کرنے کی کوشش کیجئے، اگر ان کے ساتھ کوئی مریض یا بوڑھا شخص ہو، یا خاتون اور بچے ہوں اور آپ کی سیٹ ان کے لئے زیادہ موزوں ہوسکتی ہے تو ایثار سے کام لیجئے، اور خود تھوڑی سی زحمت

برداشت کرلیجئے، چائے یا کھانے پینے کی ہلکی پھلکی چیز منگائیے تو ان کو بھی شامل ہونے کی دعوت دیجئے، ہر قیمت پر جھگڑے تکرار سے بچئے، جو بڑے ہیں ان کو ان کی عمر کے لحاظ سے چچا، نانا، خالہ اور نانی وغیرہ کے لفظ سے، جو برابر عمر کے ہیں ان کو بھائی کے لفظ سے اور جو کافی چھوٹے ہیں، ان کو ان کی عمر کے لحاظ سے مخاطب کیجئے، کسی بوڑھے آدمی کو آپ کے سہارے کی ضرورت ہو تو بڑھ کر سہارا دے دیجئے۔

آپ کا یہی سلوک ان دوستوں کے ساتھ ہونا چاہئے، جو آپ کے آفسوں کے یا کلاس کے ساتھی ہیں، یہ تھوڑا سا حسن سلوک ان کے دل پر گہرا نقش چھوڑے گا اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے ذہن میں ایک اچھی تصویر اُبھرے گی، اور یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ اگر وہ آپ کے کسی بات یا کسی عمل کو پسند کریں تو آپ بتائیں کہ یہ میری ذاتی خوبی نہیں ہے، یہ ہمارے مذہب کی تعلیم ہے، اس لئے ہم نے جو کچھ کیا ہے، اپنا فریضہ ادا کیا ہے۔

(۳) محبت کا ایک اہم ذریعہ تحائف کا لین دین بھی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک دوسرے کو تحفہ دو، اس سے ایک دوسرے سے محبت پیدا ہوتی ہے: ’’تهادوتلحابوا،‘‘ (أدب المفرد، عن ابی ہریرۃ، باب قبول الہدیہ، حدیث نمبر: ۵۹۴) رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کا ہدیہ قبول بھی فرمایا ہے اور ان کو ہدیہ دیا بھی ہے، امام محمدؒ نے لکھا ہے:

> اس میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان کسی حربی یا ذمی غیر مسلم کو تحفہ دے اور اس کا تحفہ قبول کرے؛ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے قحط کے موقع پر پانچ سو دینار مکہ بھیجا اور حکم دیا کہ اسے سفیان بن حرب اور صفوان بن اُمیہ کے حوالہ کیا جائے؛ تاکہ وہ اسے مکہ کے فقراء پر تقسیم کردیں اور اس لئے کہ صلہ رحمی ہر دین میں قابل تعریف ہے اور دوسرے کو تحفہ دینا مکارم اخلاق میں سے ہے۔ (ردالمحتار: ۲/ ۳۵۲، بحوالہ سیر کبیر)

اس لئے وقتاً فوقتاً جان پہچان کے غیر مسلم بھائیوں اور دوستوں کو تحفہ پیش کرنا چاہئے، خاص کر ان مواقع پر جن میں تحائف پیش کئے جاتے ہیں، جیسے: شادی، بچہ کی پیدائش، تعلیم کی تکمیل، کسی اعزاز کا حاصل ہونا وغیرہ، اسی طرح اگر خود آپ کے یہاں کوئی خوشی کی بات پیش آئے، آپ کسی اہم سفر سے واپس آئیں، یا اس طرح کا کوئی اور موقع ہو، جس میں آپ اپنے دوستوں کو تحائف دیتے ہوں تو ایسے موقع پر غیر مسلم دوست کو فراموش نہ کریں، یہ بات انشاء اللہ محبت کی تخم بونے کا ذریعہ بنے گی اور سماجی

زندگی میں خوشگوار تعلقات قائم ہوسکیں گے۔

(۴) اسی طرح کا ایک عمل دعوت اور مہمان نوازی ہے، رسول اللہ ﷺ نے مہمان نوازی کی ترغیب دی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ مہمان کا اکرام کرے: ,,من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه،، (بخاری، عن ابی ہریرۃ، حدیث نمبر: ۶۰۱۸) مہمان کی دونوں شکلیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ آپ کی دعوت کے بغیر کوئی شخص خود آپ کا مہمان بنے، دوسری شکل یہ ہے کہ آپ دعوت دے کر کسی کو اپنا مہمان بنائیں، رسول اللہ ﷺ کے یہاں غیر مسلم بھائیوں کی ضیافت کی دونوں صورتیں ملتی ہیں، آپ نے بدر کے قیدیوں کے ساتھ مہمان جیسا سلوک فرمایا، بنونجران کے عیسائی وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور اپنا مہمان بنایا، اور بھی بہت سے غیر مسلم وقتاً فوقتاً آپ کے مہمان بنا کرتے تھے؛ بلکہ ۹ ھ تو ''عام الوفود'' ہی کہلاتا ہے، جس میں غیر مسلموں کے بہت سے وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ سے تبادلۂ خیال کیا، ایمان لائے، یا معاہدات کئے، یہ سب آپ کے مہمان ہوتے تھے، ۷ ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع آپ ﷺ نے حضرت میمونہؓ سے مکہ مکرمہ میں نکاح فرمایا، اور اہل مکہ کو دعوت دی کہ وہ ولیمہ میں شرکت کریں، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے شرکت سے انکار کردیا۔ (فتح الباری: ۲۳۸/۹)

جیسے آپ نے غیر مسلموں کی دعوت اور ضیافت فرمائی ہے، اسی طرح آپ نے خود بھی غیر مسلموں کی دعوت قبول کی ہے، اس سلسلہ کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی خاتون نے آپ کو مدعو کیا اور کھانے میں زہر ملا دیا، جس کا اثر مرض وفات تک آپ پر رہا، یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ نے بعض غیر مسلم قبائل سے جن شرطوں پر معاہدہ کیا، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو مسلمان اس علاقہ سے گزریں گے، وہ اس کی میزبانی کریں گے؛ کیوں کہ اس زمانہ میں آج کل کی طرح ہوٹل اور بازار موجود نہیں تھے اور عربوں کے رواج میں مقامی لوگوں کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ مسافروں کیلئے کھانے کا انتظام کریں۔

لہٰذا اپنی سماجی تقریبات میں غیر مسلم بھائیوں کو مدعو کیجئے، جیسے ولیمہ، عقیقہ، یا کسی خوشی کے موقع پر جب دعوت کا اہتمام کیا جائے؛ بلکہ افراد کے ساتھ ساتھ اداروں اور تنظیموں کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہئے، مسلمانوں کی مذہبی تنظیموں، دینی مدارس اور دوسرے اداروں کو چاہئے کہ اگر کوئی دشواری نہ ہو تو اپنے جلسوں اور پروگراموں میں غیر مسلم مذہبی قائدین کو بحیثیت مقرر اور عام غیر مسلم بھائیوں کو بحیثیت

سامعین مدعو کریں، اسی طرح اگر غیر مسلم احباب دعوت دیں اور اس دعوت کا تعلق سماجی تقریبات سے ہو تو اس میں شرکت کریں اور مبارکباد دیں، یہ آمد و رفت اور ملاقاتیں فاصلوں کو کم کریں گی اور خوشگوار تعلقات کا ذریعہ بنیں گی۔

(۵) ہدیہ اور تحفہ تو اظہارِ تعلق کے لئے دیا جاتا ہے؛ لیکن اگر کوئی چیز ثواب کی نیت سے دی جائے تو اسی کو ''صدقہ'' کہتے ہیں، صدقہ جیسے مسلمان پر کیا جاسکتا ہے، غیر مسلموں پر بھی کیا جاسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر صحابہ سے فرمایا کہ وہ صرف مسلمانوں ہی پر صدقہ کریں، اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ غیر مسلموں کو ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے اور مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ تم جو بھی خیر کے لئے خرچ کروگے تم کو اس کا پورا پورا جر دیا جائے گا: ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ﴾ (البقرۃ: ۲۷۲)؛ چنانچہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام ہی مذاہب والوں پر صدقہ کیا کرو: ''تصدقوا علی اھل الأدیان'' (نصب الرایہ: ۳۹۸/۲)؛ چنانچہ سعید بن مسیبؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ایک خاندان پر صدقہ فرمایا، (حوالۂ سابق) اسی لئے اس پر تو اتفاق ہے کہ نفل صدقات غیر مسلموں کو بھی دیئے جاسکتے ہیں؛ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں، صرف زکوٰۃ کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ مسلمانوں سے لی جائے اور مسلمانوں پر خرچ کی جائے۔ (تبیین الحقائق: ۳۰۰/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم بھائیوں کو صدقۃ الفطر دیا جاسکتا ہے، ان کو قربانی کا گوشت دیا جاسکتا ہے، اگر کسی چیز کی غریبوں کے لئے نذر مانی گئی ہو تو اس کو غیر مسلموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، عملی زندگی میں اس کا خیال رکھنا چاہئے، بالخصوص قدرتی آفات، جیسے زلزلہ، سیلاب اور طوفان وغیرہ کے لئے ریلیف میں غیر مسلم بھائیوں کو شریک رکھنا چاہئے، اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم بیمار ہو تو اس کی علاج میں مدد کرنا، لڑکی کی شادی میں تعاون کرنا، یتیموں، اور بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، تعلیم میں مدد کرنا، یہ سب کارِ ثواب ہے اور ایسا نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ اگر یہ سلوک کیا جائے تو اس پر اجر حاصل نہیں ہوگا، ہمیں روزمرہ کی زندگی میں اسلام کی ان تعلیمات کا لحاظ رکھنا چاہئے؛ تاکہ برادرانِ وطن محسوس کریں کہ مسلمان صرف اپنے لئے نہیں سوچتا ہے؛ بلکہ وہ پوری انسانیت کے لئے سوچتا ہے۔

(۶) اگر آپ کا کوئی غیر مسلم دوست، آفس کا ساتھی، یا متعارف شخص بیمار ہو جائے تو اس کی

عیادت کیجئے، بیمار کی عیادت کرنے کی بڑی فضیلت ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو بیمار کی عیادت کرتا ہے، گویا وہ جنت میں ہوتا ہے، (مسلم، باب فضل عیادۃ المریض، حدیث نمبر: ۴۲) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کی بنیاد انسانیت پر ہے نہ کہ مسلمان ہونے پر؛ چنانچہ امام محمد بن حسنؒ نے حضرت بریدہؓ سے نقل کیا ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ ہمارے ساتھ چلو کہ ہم اپنے یہودی پڑوسی کی عیادت کرلیں، رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا: اے فلاں شخص! تم کیسے ہو؟ اور اس پر تین دفعہ کلمۂ شہادت پیش کیا، تیسری دفعہ میں اس کے والد نے کہا: میرے بیٹے! تم کلمۂ شہادت پڑھ لو؛ چنانچہ اس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا، آپ نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ جس نے میری وجہ سے ایک شخص کو دوزخ سے بچالیا، (البنایہ: ۱۲/ ۲۴۵، بحوالہ کتاب الآثار) اس مضمون کی روایت بخاری اور ترمذی میں بھی آئی ہے (دیکھئے: بخاری، حدیث نمبر: ۱۲۹۰، ترمذی، حدیث نمبر: ۲۲۴۷)— اس روایت میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آپ کا اس یہودی کے یہاں جانا اصل میں عیادت کے لئے تھا؛ البتہ بطور خیر خواہی کے آپ نے اس پر دعوت اسلام بھی پیش فرمائی۔

یہ حقیقت ہے کہ مریض اپنے ساتھ محبت اور دلداری چاہتا ہے، عام طور پر وہ لوگوں کی توجہ سے محروم ہوجاتا ہے، ایسی صورت حال میں اگر کوئی شخص مزاج پرسی کرے اور اس سے تسلی کی باتیں کہے، تو اس کو بے حد خوشی ہوتی ہے اور اس وقت وہ عیادت کرنے والوں کی بات کو بڑی توجہ اور احسان مندی کے ساتھ سنتا ہے؛ اس لئے اگر اس کے سامنے اسلام کی دعوت رکھی جائے تو وہ اس کو توجہ کے ساتھ سنے گا؛ چنانچہ اوپر جس واقعہ کا ذکر کیا گیا، اس سے رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ معلوم ہوا کہ مریض کی عیادت اور مزاج پرسی کو دعوتِ اسلام کا ذریعہ بنانا چاہئے۔

آج کل عیادت کی ایک اجتماعی شکل یہ ہے کہ ہسپتالوں میں پہنچا جائے، وہاں مریضوں سے ملاقاتیں کی جائیں، حسب گنجائش ان کو پھل، بسکٹ، چائے وغیرہ پیش کی جائے، ان کی جو مدد کی جاسکتی ہے، وہ مہیا کی جائے، جو ہسپتال مسلمان انتظامیہ کے تحت ہو، اس میں غیر مسلم مریضوں کے ساتھ خصوصی حسن سلوک اور رعایت کی کوشش کی جائے اور اس کو اسلام کے تعارف اور دعوتِ دین کا ذریعہ بنایا جائے۔

(۷) جب غیر مسلم بھائیوں کے یہاں کسی کی موت ہوجائے، وہاں آخری مراحل میں شریعت

کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کی مدد کی جائے، جیسے لاش کو ہاسپیٹل سے لانا، اگر ضرورت مند ہوتو پیسوں سے مدد کرنا، یا حسب ضرورت کپڑے وغیرہ فراہم کرنا؛ چنانچہ جب حضرت ابوطالب کی وفات ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ ان کی تدفین کے کام کو انجام دیں، (نسائی، عن علیؓ، حدیث نمبر: ۲۰۰۶) اسی طرح بعض صحابہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ غیر مسلم اہل تعلق کے جنازے میں ساتھ ساتھ گئے، نیز رسول اللہ ﷺ نے منافق کے سردار عبداللہ بن اُبی کے کفن کے لئے اپنا کرتا عنایت فرمایا؛ چنانچہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

> مسلمان اپنے کافر والد کو جس کا انتقال ہو گیا ہو، اس کو غسل دے اور اس کو دفن کرے؛ کیوں کہ غسل دینا بنی آدم میں سے مرنے والوں کے لئے جاری طریقہ ہے اور وہ باوجود کافر ہونے کے بہر حال بنو آدم سے ہیں، اسی طرح مسلمان بیٹے کو اپنے والد کے ساتھ اچھا سلوک اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، گو باپ مشرک ہو......اور حسن سلوک کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کو غسل دینے اور دفن کرنے کا اہتمام کرے۔(المبسوط: ۲/ ۵۰)

البتہ غیر مسلموں کے لئے دُعائے مغفرت، ایصالِ ثواب وغیرہ جائز نہیں؛ کیوں کہ جس شخص کی موت شرک کی حالت میں ہوئی ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے دُعائے مغفرت کرنے سے منع فرمایا ہے۔(توبہ: ۱۱۳)

(۸) انسان کے لئے وہ وقت یقیناً بڑے رنج کا ہوتا ہے، جب اس کا کوئی عزیز اور صاحب تعلق دنیا سے رخصت ہو جائے، اسی لئے شریعت میں تعزیت کی اجازت دی گئی ہے، اور خود آپ نے تعزیت فرمائی ہے؛ کیوں کہ ایک انسان جب دوسرے انسان کا غم بانٹتا ہے تو جو شخص متاثر ہونے والا ہے، اس کا غم ہلکا ہوتا ہے، تعزیت کا حکم جیسے مسلمانوں کے لئے ہے، ویسے ہی غیر مسلموں کے لئے بھی ہے، فقہاء نے لکھا ہے:

> یہودی یا آتش پرست کے بیٹے یا قریبی رشتہ دار کا انتقال ہو جائے تو اس کی تعزیت کرنی چاہئے اور تعزیت کے موقع پر کہنا چاہئے: اللہ تم کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے، اور تمہارے حال کو بہتر بنائے، حال کو بہتر فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو اسلام سے

مشرف فرمائے اور تم کو مسلمان بیٹا عنایت کرے۔(ردالمحتار:۶/۳۲۸)

غرض کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اگر غیر مسلم بھائیوں کے یہاں کسی کی موت واقع ہوجائے تو تعزیت کریں۔

(۹) اگر اللہ نے آپ کو ایمان کی توفیق عنایت فرمائی اور آپ کے خاندان کے بعض افراد ابھی دائرۂ ایمان میں نہیں آئے ہیں تو ان کے ساتھ صلہ رحمی اور اُس حسن سلوک کا خیال رکھئے جس کا رشتہ داروں کے حق میں حکم دیا گیا ہے؛ کیوں کہ رشتہ داروں کے حقوق رشتہ کی بنیاد پر ہیں نہ کہ مسلمان ہونے کی بنیاد پر، اس لئے وہ پوری طرح اس حسن سلوک کا مستحق ہے؛ چنانچہ بعض حضرات نے جب اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ اس لئے حسن سلوک کرنا چھوڑ دیا کہ وہ ایمان نہیں لائے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے ہدایت کا راستہ اختیار کرنے اور نہ کرنے کی ذمہ داری تم پر نہیں، جو بھی خرچ کروگے، تم کو بہر حال اس کا بھرپور اجر ملے گا:﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ﴾(البقرۃ:۲۷۲)

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی والدہ ایمان نہیں لائی تھیں، وہ حضرت اسماء کے پاس آئیں، وہ چاہتی تھیں کہ ان کی مدد کی جائے، تو حضرت اسماءؓ نے آپ ﷺ سے ان کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے فرمایا: ہاں، اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرو، (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۷۷) رسول اللہ ﷺ اور صحابہ عام طور پر اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک فرماتے رہتے تھے، اس حسن سلوک کی انتہا اس وقت ہوگئی، جب کہ مکہ فتح ہوا، اہل مکہ سے عام طور پر آپ کی قریب یا دور کی قرابت تھی، جب آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟ تو انھوں نے اپنی اسی قرابت مندی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ ایک شریف بھائی ہیں، اور ایک شریف بھائی کے بیٹے، آپ ﷺ نے جواب دیا، آج تم سب کے سب آزاد ہو۔(سیرت ابن ہشام:۲/۴۱۱، زادالمعاد:۳/۳۵۶)

اس لئے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ نہ صرف بہتر سلوک کرنا چاہئے؛ بلکہ ایک درجہ بڑھ کر کرنا چاہئے؛ تاکہ آپ کا یہ عمل ان کے دلوں پر اسلام کی اچھی تصویر نقش کرسکے۔

(۱۰) کچھ سماجی قدریں انسان کی فطرتِ سلیمہ کا تقاضہ ہیں اور ہر مذہب اور مہذب سوسائٹی میں اس کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے، ان ہی میں بڑوں کا احترام، چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور عورتوں کی عزت وآبرو کی حفاظت اور اس کا لحاظ وخیال بھی شامل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ویؤقر کبیرنا۔ (ترمذی، باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان، حدیث نمبر:۱۹۲۱)

وہ ہم میں سے نہیں جو چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش نہ آئے اور بڑوں کا اکرام نہ کرے۔

یہ بڑے کے ساتھ اکرام اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا حکم تمام انسانوں کو شامل ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس لئے چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اگر آپ سے زیادہ عمر کا یا بوڑھا اور عمر رسیدہ کوئی غیر مسلم آپ کے ساتھ ہے تو اس کے احترام کا لحاظ رکھنا آپ پر واجب ہے، اسی طرح اگر آپ کے ساتھ آپ سے کم عمر کا کوئی غیر مسلم ہو یا کوئی غیر مسلم بچہ ہو تو وہ آپ کی بھرپور شفقت کا مستحق ہے، اگر آپ نے اس کے ساتھ شفقت اور محبت کا سلوک نہیں رکھا تو آپ نے اس کی حق تلفی کی۔

اسی طرح عورتوں کا احترام اور ان کی عزت وآبرو کا لحاظ رکھنا ہر عورت کا حق ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، قرآن نے اپنی نگاہوں کو پست رکھنے کا حکم دیا ہے، (سورۂ نور:۳۰) یہ حکم کسی خاص طبقہ کے خواتین کے لئے نہیں ہے؛ بلکہ سماج کی تمام عورتوں کے لئے ہے، زنا کی ممانعت کا حکم ہر عورت کے لئے ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اس کو برتا ہے، ایسے بہت سے واقعات آج بھی پیش آتے رہتے ہیں کہ اسلام کے اور انسانیت کے دشمنوں نے مسلمان عورتوں کے ساتھ زیادتی کی ہے؛ لیکن مسلمانوں نے غیر مسلم خواتین کے ساتھ ردِ عمل کے طور پر اس عمل کو دہرایا نہیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ اور آپ کے رفقاء نے عین میدانِ جنگ میں بھی اس کا لحاظ رکھا اور بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ اُٹھانے سے منع کیا۔

بڑوں اور چھوٹوں کے احترام میں یہ بات داخل ہے کہ ان کو اچھے انداز سے مخاطب کیا جائے، ان کو راحت پہنچانے کی کوشش کی جائے، ان کی جسمانی اور مالی مدد کی جائے، اسی طرح خواتین کے ساتھ بہنوں اور بیٹیوں کا سا سلوک کیا جائے اور ہر ایسی بات سے بچا جائے جو ان کو اندیشہ میں ڈالنے والی ہو۔

(۱۱) سماج میں لڑائی جھگڑے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، یہ مسلمانوں کے درمیان بھی ہوتا ہے اور غیر مسلموں کے درمیان بھی اور کبھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی، یوں تو ہر صورت

میں اللہ تعالیٰ نے انصاف کا حکم دیا ہے؛ لیکن یہ صورت کہ ایک طرف مسلمان ہو اور دوسری طرف غیر مسلم، انصاف کی آزمائش کا موقع ہوتا ہے، اگر یہ معاملہ کسی مسلمان کے پاس جائے تو اس کا جھکاؤ مسلمان فریق کی طرف ہونے لگتا ہے؛ لیکن شریعت میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر ارشاد فرمادیا کہ کسی گروہ کا برا ہونا بھی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کرو: ﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ﴾ (المائدۃ: ۸) رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی بعض معاملات مسلم اور غیر مسلم فریقوں کے درمیان جھگڑے کے آئے اور فیصلہ غیر مسلم کے حق میں ہوا، یہاں تک کہ حضرت علیؓ خود خلیفہ ہیں، ان کے مقابلہ میں یہودی فریق ہے؛ لیکن قاضی شریح نے شہادت مہیانہ ہونے کی وجہ سے یہودی کے حق میں اور حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ کیا۔

ہندوستان میں مختلف جگہ دارالقضاء قائم ہیں اور ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کئی مقامات پر غیر مسلم حضرات مسلمان فریق کے خلاف اپنے مقدمات لائے اور وہ فیصلوں سے مطمئن ہوکر واپس ہوئے، خود اس حقیر کے پاس بھی ایسا معاملہ آیا، میں نے غیر مسلم فریق سے کہا کہ اگر آپ سرکاری عدالت یا پنچایت میں فیصلہ کراتے تو شاید آپ کو زیادہ اطمینان ہوتا، مگر انھوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ میں یہاں سوچ سمجھ کر آیا ہوں، مجھے یقین ہے کہ مجھے یہاں سے سچا فیصلہ ملے گا اور میں جانتا ہوں کہ یہاں کسی کی طرفداری نہیں کی جاتی— لہٰذا اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اگر آپ ایسے کسی معاملہ میں حکم یا گواہ بنائے جائیں تو مسلمان ہونے کی بنا پر ہرگز کسی فریق کا ساتھ نہ دیں؛ بلکہ جو بات سچی ہو وہ کہیں اور جو حق ہو اسی کے مطابق فیصلہ کریں، خواہ یہ فیصلہ مسلم اور غیر مسلم فرد کے درمیان ہو یا مسلم اور غیر مسلم گروہ کے درمیان ہو۔

(۱۲) بہت سے معاملات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان پیشہ وارانہ اور کاروباری تعلق ہوتا ہے، جیسے ایک آجر ہے، دوسرا مزدور و ملازم، ایک کاریگر ہے اور دوسرا گاہک، ایک استاذ ہے دوسرا شاگرد، ایک ڈرائیور ہے دوسرا سوار، ایسے معاملات کی بنیاد وعدہ پر ہوتی ہے، یعنی معاملہ طے ہوتے وقت، جو ذمہ داریاں متعین ہوئی ہوں، ہر فریق اس کو پورا کرے۔

وعدہ پورا کرنا ہر حال میں واجب ہے، چاہے آپ کا وعدہ کسی مسلمان کے ساتھ ہو یا غیر مسلم کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (المائدۃ: ۱) ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ

وعدے پورا کیا کرو؛ کیوں کہ وعدہ کے بارے میں تم جوابدہ ہو: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا﴾ (الاسراء: ۳۴) آپ ﷺ نے جھوٹ، وعدہ خلافی، دھوکہ دہی اور بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔ (بخاری، عن عبداللہ بن عمرو، حدیث نمبر: ۲۴۵۹)

اس لئے جس حیثیت سے بھی آپ کا کوئی معاملہ کسی غیر مسلم بھائی سے طے ہو، اپنی ذمہ داری کو پورا کیجئے، وعدہ خلافی سے، جھوٹ سے اور دھوکہ سے بچئے، کسی مسلمان کے ساتھ جھوٹ اور دھوکہ وغیرہ کا جو گناہ ہے، غیر مسلم کے ساتھ ایسے برتاؤ کا بھی وہی گناہ ہے۔

(۱۳) مذہبی تصورات صحیح ہوں یا غلط اور عقل سے ہم آہنگ ہوں یا عقل کے خلاف، بہر صورت جو لوگ اس مذہب پر یقین رکھتے ہیں، ان کو اس سے جذباتی تعلق ہوتا ہے، اس لئے اگر ان کی مذہبی شخصیات کو برا بھلا کہا جائے تو یہ بڑی دل آزاری کا باعث ہوتا ہے اور پھر اس کا ردعمل بھی سامنے آتا ہے، اس لئے غیر مسلم بھائیوں کے مذہبی پیشواؤں پر اہانت آمیز ریمارک سے بچنا چاہئے، خود قرآن مجید میں اس سے منع فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (الانعام: ۱۰۸) اور یہ مصلحت بھی ہے کہ آپ کے اس عمل پر ردعمل پیدا ہوگا، اور لوگ اللہ تعالیٰ پر اور رسول اللہ ﷺ پر اہانت آمیز ریمارک کریں گے، اس طرح خود آپ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بے احترامی کا سبب بنیں گے؛ چنانچہ مشہور مفسر علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت کا حکم اُمت کے لئے ہر حال میں باقی و قائم ہے: ,,حكمها باق فی هذه الامة علی كل حال'' (تفسیر قرطبی: ۷/ ۶۲) — اس مسئلہ کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہئے کہ علمی تنقید تو مہذب الفاظ میں کی جاسکتی ہے؛ لیکن دل آزار اور اہانت آمیز تبصرے نہ جائز ہیں اور نہ مناسب۔

ان نکات کے مطابق اگر ہماری عملی زندگی ہوجائے تو بہت سی ان غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی گھٹائیں چاک ہوسکتی ہیں، جنھیں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پھیلایا گیا ہے۔

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ!

(غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ معاملت اور اخلاق)

اگر سورج کی چلچلاتی ہوئی دھوپ انسان کو بے چین کر رہی ہو تو اس وقت کوئی عقل مند آدمی ہیٹر نہیں چلا سکتا، وہ اے سی اور ایئر کولر ہی میں اپنے لئے سکون تلاش کرے گا، اگر کہیں آگ لگ گئی ہو تو اس کو بجھانے کے لئے مزید آگ کے انگارے نہیں پھینکے جاتے؛ بلکہ آگ پر پانی ڈالا جاتا ہے، اسی طرح اگر ماحول میں ہر طرف نفرت کی آگ سلگا دی گئی ہو تو اسے محبت کی شبنم ہی سے بجھانا پڑے گا، اگر نفرت کا جواب نفرت سے دیا جائے تو نفرت ہی بڑھتی جائے گی، موجودہ حالات میں اُمت کے لئے اس نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر بُرے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دوگے، تو دشمنی گہری دوستی میں تبدیل ہوجائے گی: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ (حم سجدہ: ۳۴)— دنیا کے موجودہ ماحول میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کی اس ہدایت کو پیش نظر رکھیں، اور اپنی عملی زندگی کو اس کا نمونہ بنائیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایمان کا رشتہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے، اور اس کو ایک ایسا آفاقی خاندان بنا دیتا ہے، جس کے تحت آنے والے افراد کی حیثیت ایک جسم کے مختلف اعضاء کی ہے، دنیا کے کسی کونے میں ایک مسلمان کسی مصیبت سے دوچار ہو تو ضروری ہے کہ دوسری انتہا پر بسنے والا مسلمان بھی اپنے دل میں اس کی ٹیس محسوس کرے، اگر ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور دوسرے مسلمان کی تکلیف اس کو رنجیدہ نہیں کرتی تو یہ اس کے ایمان میں نقص کی دلیل ہے؛ لیکن اسلامی اُخوت کے ساتھ ساتھ ایک اور رشتہ انسانی اُخوت اور بھائی چارہ کا بھی ہے، اس کا دائرہ اور بھی وسیع ہے اور پوری انسانیت کو شامل ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے کہ دنیا میں بسنے والے اور قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں، اس طرح

پوری انسانیت ایک کنبہ ہے، اور ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے، فکر وعقیدہ، رنگ وروپ، شکل و صورت اور طاقت وصلاحیت کے ہزار فرق کے باوجود ایک ہی خون ہے، جو ان سب کے وجود میں دوڑ رہا ہے، اس رشتہ کو بھی ہمیں ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

شریعت کے بعض احکام ایسے ضرور ہیں جو مسلمانوں سے متعلق ہیں، جیسے کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کا نکاح کسی غیر مسلم سے نہیں ہوسکتا، مشرک کا ذبیحہ مسلمانوں کے حق میں حلال نہیں ہے، اسلامی عبادات مسلمانوں سے متعلق ہیں، نماز، روزے مسلمانوں ہی پر فرض ہیں، کوئی غیر مسلم مسلمانوں کا امام نہیں ہوسکتا، زکوٰۃ مسلمانوں ہی سے لی جائے گی اور ان ہی پر خرچ کی جائے گی، حج کی عبادت مسلمانوں ہی پر فرض ہے؛ لیکن ان کے علاوہ بیشتر مسائل میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق نہیں کیا گیا ہے، تعلیم وتعلم، خرید وفروخت، ملازمت ومزدوری، کرایہ داری، سماجی تعلقات وغیرہ میں مسلمان اور غیر مسلم یکساں ہیں، اسلام نے ایسی بھی کوئی پابندی نہیں رکھی ہے کہ مسجد ومدرسہ میں کوئی غیر مسلم بھائی قدم نہ رکھے، عید وبقرعید کی خوشیوں میں ان کو تحفہ نہ پیش کیا جائے، اور افطار وولیمہ میں ان کو مدعو نہ کیا جائے۔

جو کچھ فرق ہے، وہ عبادات اور پرسنل لاء میں ہے، اخلاق ومعاملات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے، سماجی اور معاشی تعلقات کی بنیاد معاملات ہیں اور محبت و اُلفت کی بنیاد اخلاق، اور ان دونوں میں مسلمان اور غیر مسلم برابر ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان ہی دونوں راستوں سے اپنے دشمنوں کے دلوں کی فتح کیا، معاملات میں آپ ﷺ کی دیانت داری، پختگی، اور وفا شعاری کا حال یہ تھا کہ آپ اہل مکہ کے تنگ کرنے یہاں تک کہ جان کے درپے ہوجانے کی وجہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہورہے ہیں، اس مکان میں آرام فرما ہیں، جس کے چاروں طرف بے نیام تلواریں نکلنے والے کا سر قلم کرنے کے لئے تیار ہیں، جذبۂ عداوت سے ہر سینہ معمور ہے؛ لیکن جاتے جاتے ان ہی خوں آشام دشمنوں کی امانتیں حضرت علیؓ کے سپرد کی جاتی ہیں کہ مکہ کے کفار ومشرکین کو واپس کردیں، عین غزوۂ بدر کے موقع سے جب مسلمانوں کی تعداد اپنے دشمنوں کے مقابلہ بہت کم ہے، ایک ایک سپاہی کی اہمیت ہے، دشمن کی فوج کی پشت کی طرف سے حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور ایک اور صحابی آتے ہیں، اہل مکہ نے ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہوں گے، وہ وہاں سے بڑھ کر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، آرزومند ہیں کہ کفر واسلام کی اس پہلی

جنگ میں شرکت کی سعادت حاصل کریں، جبر و دباؤ کی بنیاد پر اہل مکہ سے کئے گئے وعدہ کو نظر انداز کردیں؛ لیکن ارشاد ہوا کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو، ہمارے لئے اللہ کی مدد کافی ہے، کیا معاملات کی صفائی کی ایسی بھی مثال مل سکتی ہے؟

حسنِ معاملات ہی کا ایک مظہر یہ ہے کہ فاقوں سے دو چار ہیں، پیٹ پر دو دو پتھر بندھے ہوئے ہیں، دو دو مہینہ اس طرح گزر جاتا ہے کہ گھر میں چولہا سلگنے اور کھانا پکانے کی نوبت نہیں آتی، جس وقت وفات ہوئی، اس وقت بھی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن ہے، یہ اس تاجدار نبوت کا حال ہے جس کی سلطنت جزیرۃ العرب کے حدود کو پار کررہی ہے، اور مدینہ میں بڑے صاحبِ ثروت یہودی اور کتنے ہی دولت مند مسلمان موجود ہیں، اگر آپ ﷺ کا ایک اشارہ ہوجاتا تو طوعاً یا کرھاً یہ ساری دولت آپ ﷺ کے قدموں میں ہوتی؛ لیکن آپ ﷺ نے کبھی انصاف کا دامن نہیں چھوڑا، اور اپنے معاملات کو ہر طرح کے جبر و دباؤ اور بے جا تصرف سے دور رکھا، کبھی کسی قرض دار نے مطالبہ کیا اور مطالبہ میں سختی برتی تو اس کو بھی سہا، اور اگر آپ ﷺ کے رفقاء کو اس پر ناگواری ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کو منع فرمایا اور کہا جو صاحب حق ہیں اس کو مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے: ''**ان لصاحب الحق مقالاً**'' صاحبِ حق کے مطالبہ کا جواب ناراض ہونا نہیں ہے؛ بلکہ اس کا حق ادا کرنا ہے۔ (ترمذی، کتاب البیوع، حدیث نمبر: ۱۳۱۷)

مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے معاملات میں اس اُسوۂ نبوی (ﷺ) کو پیش نظر رکھیں، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مسلمان کو ایک ایسا شخص سمجھا جائے جس سے معاملہ کرنے میں رغبت ہو، اور جس کو لوگ کاروباری شرکت میں ترجیح دیتے ہوں، لوگ مسلمانوں سے معاملہ کرنے میں خوف کھاتے ہیں، مالک مکان ہو، تو کسی مسلمان کو کرایہ دار بنانا نہیں چاہتا، ٹیکسی والے غیر مسلم بھائی مسلمان محلوں میں سواری کرنے سے گھبراتے ہیں، تاجر اُن سے سامان بیچنے میں گھبراتا ہے کہ یہ وقت پر پیسہ ادا نہیں کرتے، گاہک ہے تو اس کو ان سے مال لینے میں ڈر محسوس ہوتا ہے، پتہ نہیں کس بات میں دھوکہ دیدے؟ بینکوں کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمان محلہ کے لوگوں کو قرض دینے میں احتیاط کرتے ہیں، میری قیام گاہ کے قریب ایک مسلمان تاجر نے ٹاٹا کا شوروم کھولا، ان کا بیان ہے کہ ٹاٹا کے جتنے شوروم ہیں، سب فائدے میں ہیں، اور میں ہوں کہ غیر معمولی نقصان اُٹھا رہا ہوں؛ کیوں کہ

یہ مسلم علاقہ ہے، بینک اس میں فائنانس کرنے کو تیار نہیں ہوتا؛ کیوں کہ لوگ پیسہ ادا نہیں کرتے، اور پیسہ کے مطالبہ پر سختی برتی جائے تو غنڈہ گردی پر اُتر آتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ سودی فائنانس پر گاڑی لینی جائز نہیں ہے، یہ پہلو قابل غور ہے کہ برادرانِ وطن میں مسلمانوں سے متعلق عمومی تصور کیا ہے؟ اس طرح کی رایوں میں یقیناً پروپیگنڈوں کا بھی دخل ہوتا ہے؛ لیکن اس کے پیچھے ایک حد تک تجربات و واقعات بھی کارفرما ہوتے ہیں، جب تک ہم اپنے عمل کے ذریعہ اس تاثر کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہوں، ہم نفرت اور بے اعتمادی کی اس فضاء کو ختم نہیں کر سکتے، اس لئے مسلمان تاجروں، گاہکوں، مکان داروں، اور کرایہ داروں، ڈاکٹروں اور انجینئروں، مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور ہنر مندوں، نیز معلموں اور طالب علموں، تعلیمی ادارے چلانے والوں، گورنمنٹ ملازمین اور پرائیوٹ اداروں کے خدمت گاروں، سیاسی قائدین اور سماجی کارکنوں کو اپنا اپنا احتساب کرنا چاہئے کہ برادران وطن کے ساتھ ان کے معاملات کیسے ہیں؟ کہیں ان کی بدمعاملگی پوری اُمت کو رسوا کرنے اور اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ تو نہیں بن رہی ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے جب صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی نبوت کا اعلان کیا تو پہلے ان پر اپنی زندگی کو پیش فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان بچپن اور جوانی گزاری ہے اور چالیس سال بسر کئے ہیں، تم نے مجھ کو امانت دار پایا یا خیانت کرنے والا؟ اور سچا پایا یا جھوٹ بولنے والا؟ سبھوں کی زبان پر اس وقت ایک ہی جواب تھا کہ آپ سچے اور امانت دار ہیں، آپ نے ان کا مزید امتحان لیا اور دریافت فرمایا: اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کی ایک فوج کھڑی ہے جو تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم اس کا یقین کروگے؟ لوگوں نے جواب دیا؛ کیوں نہیں؟ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں کہا؛ حالاں کہ بظاہر حالات ایسے نہیں ہیں، مگر پھر بھی ہم آپ کی بات کو سچ ہی سمجھیں گے، (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۵۵) آج اسی بات کی ضرورت ہے کہ غیر مسلم محلہ میں رہنے والے اور غیر مسلم بھائیوں سے کاروباری تعلق رکھنے والے مسلمان یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ میری زندگی تمہارے درمیان گزری ہے، کیا تم نے مجھے جھوٹ بولتے اور دھوکہ دیتے ہوئے دیکھا ہے؟ اگر ہمارا کردار اس سطح پر آجائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم نفرت کی ان مصنوعی دیواروں کو ڈھانے میں کامیاب نہ ہوں جو کچھ لوگوں کی طرف سے تعمیر کی گئی ہے اور اسے مسلسل مضبوط اور اونچا کیا جارہا ہے۔

دوسرا قابل توجہ پہلو اخلاق کا ہے، یعنی سماجی زندگی میں ہمارا رویہ برادرانِ وطن کے ساتھ خلوص ومحبت، ہمدردی وبہی خواہی اور مروت ورواداری کا ہو، رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس کا شاہکار تھی، آپ ﷺ کو جب نبوت عطا فرمائی گئی تو آپ ﷺ گھبرائے ہوئے اپنے دولت کدہ تشریف لائے کہ اتنی بڑی ذمہ داری جو اللہ کی طرف سے آپ ﷺ پر ڈالی گئی ہے؛ کیوں کر اُٹھائی جاسکے گی؟ اس موقع پر آپ ﷺ کے سرد وگرم کی رفیق وفا شعار بیوی اُم المومنین حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے عرض کیا: خدا کی قسم! اللہ ہرگز آپ کو ضائع نہیں کرے گا؛ کیوں کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اُٹھا لیتے ہیں، آپ محتاجوں کو روزگار سے لگاتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد فرماتے ہیں، (بخاری: حدیث نمبر ۳) — یہ آپ ﷺ کے اخلاق کی بہترین تصویر ہے، جو خاندان کے ایک ایسے فرد کی زبان سے ہے، جنھوں نے دن کے اُجالے میں بھی آپ کو دیکھا تھا اور رات کے اندھیرے میں بھی، خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی، دُکھ میں بھی اور سکھ میں بھی، غربت وتنگ دستی میں بھی اور دولت وکشادگی میں بھی، حضرت خدیجہؓ نے یہاں آپ کے جس حسن سلوک کا ذکر فرمایا ہے، اس کا تعلق مسلمانوں سے نہیں غیر مسلموں سے ہے، نبوت کے بعد بھی غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ آپ کا یہی حسن سلوک باقی رہا، مکہ فتح ہوتا ہے، دس ہزار جاں نثار آپ ﷺ کے ساتھ ہیں اور آپ ﷺ کے ایک اشارہ پر وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں، جس کا آپ حکم دیں، وہ سارے لوگ دست بستہ سامنے کھڑے ہیں، جنھوں نے وطن سے نکالا تھا، آپ ﷺ کا اور آپ کے خاندان کا بائیکاٹ کیا تھا، آپ ﷺ کو جادوگر اور دیوانہ کہا تھا، قتل کے منصوبے بنائے تھے، آپ کے جاں نثاروں کو گرم ریت پر گھسیٹا، اور تپتی ہوئی دھوپ میں آگ کے انگاروں پر لٹایا تھا؛ لیکن آپ کی رحمت اللعالمینی دیکھئے کہ آپ نے ان زخموں کو کرید کر اہل مکہ کو شرمسار بھی نہیں کیا، نہ سب وشتم کے دو چار جملے کہہ کر انھیں عبرت دلائی، یہاں تک کہ نگاہ غضب سے ان کی طرف دیکھا تک نہیں، بس ایک ہی سوال فرمایا کہ تم میرے بارے میں کیا اُمید رکھتے ہو؟ لوگوں نے بیک زبان عرض کیا: آپ ﷺ ایک شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں: ''انت اخ کریم وابن اخ کریم'' یہ ان کی طرف سے آپ کی بلند اخلاقی اور رحمت بے پایاں کا اعتراف تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج میں تم سے وہی کہوں گا، جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم سب آزاد ہو، تم پر کوئی پکڑ

نہیں: ''انتم الطلقاء لا تثریب علیکم الیوم'' (السنن الکبریٰ، کتاب السیر، حدیث نمبر: ۱۸۷۳۹) کاش! آج مسلمانوں کا ایسا رویہ ہو کہ وہ جس آبادی یا زندگی کے جس شعبہ میں رہتے ہوں، اگر وہاں اس کے اخلاق کے بارے میں پوچھا جائے تو لوگ اس کے بارے میں کہیں کہ یہ ہم میں کا ایک شریف آدمی ہے اور اس کا رویہ بتاتا ہے کہ یہ مصنوعی طور پر شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوا نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک شریف خاندان اور ایک شریف قوم کا فرد ہے۔

قرآن مجید نے صاف طور پر کہا کہ جو غیر مسلم تم سے برسر جنگ نہیں ہیں اور جنھوں نے تم کو گھر سے بے گھر نہیں کیا ہے، تم کو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے اور انصاف برتنا چاہئے، (ممتحنہ:۸) ان کا خون ہمارے ہی خون کی طرح قابل احترام اور ان کا مال بھی ہمارے ہی مال کی طرح قابل تحفظ ہے: ''دمائهم کدمائنا و اموالهم کأموالنا'' (نصب الرایہ: ۶۹/۴، عن علیؓ) آپ ﷺ نے غیر مسلموں کو اپنے یہاں مدعو فرمایا ہے، ان سے آپ ﷺ نے دعوتِ ولیمہ میں شریک ہونے کی خواہش کی ہے، غیر مسلم بھائیوں کی دعوت قبول کی ہے، ان کو اپنا مہمان بنایا ہے، غیر مسلم حضرات سے تجارتی تعلقات رکھے ہیں، انھیں اپنے گھر ہی نہیں، مسجد نبوی میں بھی ٹھہرایا ہے، غیر مسلم رشتہ داروں کی آخری رسومات میں شرکت اور جلوس جنازہ میں جانے کی اجازت دی ہے، صرف دُعاء مغفرت سے منع کیا گیا ہے، فقہاء نے غیر مسلموں کی تعزیت کی اجازت دی ہے اور اس کے لئے دلداری کے مناسب الفاظ لکھے ہیں، آپ ﷺ نے غیر مسلموں کی عیادت فرمائی ہے، مختلف مواقع پر آپ ﷺ نے غیر مسلموں کی مالی مدد فرمائی ہے، جب مکہ میں قحط پڑا، تو آپ ﷺ نے ان کے لئے مدینہ میں ریلیف جمع فرمائی اور پانچ سو دینار ان کے لئے بھیجے، آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے حق میں نہ صرف ہدایت کی دُعا فرمائی؛ بلکہ اہل مکہ سے قحط کی مصیبت دور ہونے کی بھی دُعا فرمائی، اگر غیر مسلموں کے کسی گروہ کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوئی اور وہ آپ سے مدد کے طلب گار ہوئے تو آپ نے ان کی مدد سے دریغ نہیں کیا، اگر کسی مسلمان یا غیر مسلم کا مقدمہ آپ کے پاس آتا تو آپ پورے عدل کے ساتھ فیصلہ فرماتے؛ چنانچہ بعض مقدمات آپ ﷺ نے مسلمان فریق کے خلاف اور غیر مسلم فریق کے حق میں فیصل فرمایا، قرآن مجید نے غیر مسلم بھائیوں کے جذبات کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کا حکم دیا کہ ان کے مذہبی مقدسات کی بے حرمتی نہ کی جائے اور ان کی دیویوں دیوتاؤں کو برا بھلا نہ کہا جائے: ﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ

يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (الانعام:۱۰۸)

قرآن وحدیث میں جتنے اخلاقی احکام ہیں، جیسے: غریبوں کی مدد، بڑوں کا احترام، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک، عورتوں کی عزت وناموس کا احترام، استہزاء سے بچنا، یہ سارے احکام مسلمانوں اور غیر مسلموں سے یکساں طور سے متعلق ہیں، ان میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں، اسلام کے اس آفاقی اور بنیادی تصور کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

الخلق عيال الله فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله۔ (المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث نمبر: ۵۵۴۱، عن ابن مسعودؓ)

خدا کی مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔

ملک کے اور دنیا کے موجودہ حالات میں یہ بات ضروری ہے کہ مسلمان برادران وطن کے سامنے اپنی اخلاقی برتری ثابت کریں اور دلوں کو فتح کرنے کی کوشش کریں، ہمارے رسول ﷺ نے زر وزمین کو فتح کرنے کی کوشش نہیں کی؛ بلکہ دلوں کو جیتا اور دماغوں کو فتح کیا، ہمارے لئے بھی مشکلات سے نکلنے کا یہی راستہ ہے، اگر ہم برادرانِ وطن کے ساتھ اپنے معاملات کو درست کرلیں اور اپنے اخلاقی رویہ کو اُسوۂ نبوی کے ڈھانچے میں ڈھال لیں تو نا اُمیدی و نامرادی کی اس رات کی صبح ضرور ہوگی:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

(امت کا داعیانہ کردار)

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا فرمایا ہے، اسی وجہ سے اس کو ''خیر امت''، یعنی بہترین انسانی گروہ قرار دیا گیا ہے، اسلام نسلی برتری اور کہتری کا قائل نہیں، نہ اس کے نزدیک محض رنگ وروپ فضیلت وشرافت کی بنیاد ہے، نہ کوئی گروہ اس لئے افضل ہوسکتا ہے کہ وہ کسی خاص علاقہ میں پیدا ہوا ہے، نہ کسی جماعت کو اس لئے برتری حاصل ہوسکتی ہے کہ وہ کسی خاص زبان میں گفتگو کرتا ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے پہلے رنگ ونسل اور زبان ووطن کی بنیاد پر اونچ نیچ کی جو سرحدیں قائم کر لی گئی تھیں، اسلام کی عدل وحقیقت پسندی پر مبنی فکر نے اپنے قدم کی ٹھوکروں سے ان کو پاش پاش کر دیا اور آج دنیا میں انسانی مساوات کی حمایت اور نسلی تفریق کی مخالفت میں جو کچھ کہا جارہا ہے، چاہے لوگ اس سچائی کا اعتراف کریں یا نہ کریں، وہ اسلامی تعلیمات ہی کی بازگشت ہے۔

پھر سوال یہ ہے کہ اس امت کو ''خیر امت'' کیوں قرار دیا گیا؟ قرآن مجید نے اس سوال کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ یہ فضیلت اس کے کردار سے متعلق ہے اور وہ کردار ہے دعوت کا، یعنی لوگوں کو بھلائی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران ۱۱۰)— بہ ظاہر دعوت یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک دو لفظ معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ دشوار ترین کام ہے، جو چیزیں نظر آتی ہیں اور مادی طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں، ان کو بدلنا آسان ہوتا ہے، کچے گھر کو تھوڑی محنت سے پکا گھر بنایا جاسکتا ہے، ابھرے ہوئے پہاڑوں کو تراش کر مسطح زمین تیار کی جاسکتی ہے، دریاؤں کی متلاطم لہروں کو روک کر بند باندھے جاسکتے ہیں، خود انسان کے جسم میں بڑی بڑی تبدیلیاں میڈیکل سائنس کی ترقی کے ذریعہ آسان ہوگئی ہیں، ناکارہ آنکھوں کی جگہ نئی آنکھیں لگائی جاسکتی ہیں، ناکام گردہ کی جگہ نئے گردہ کی پیوندکاری ہوسکتی ہے، گنجے سر پر بالوں کی کھیتی ممکن ہوگئی

ہے، جسم کے نقوش کو خوبصورت بنانے کے لئے پلاسٹک سرجری اب کوئی دشوار کام نہیں رہا۔

لیکن جس چیز تک انسان کے ہاتھوں کی رسائی نہیں ہے، جس حقیقت کو آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہیں اور جس کے سامنے شمشیر وسنان ہی نہیں، آگ اور بارود بھی عاجز ہے، اس کو قابو میں کر لینا اور اسے بدل ڈالنا آسان نہیں اور یہی ہے اصل میں دعوت کا خلاصہ، دعوت کا مقصد انسان کی فکر کو، اس کے خیالات کو، اس کی آرزوؤں اور امنگوں کو، زندگی کے مقاصد اور اہداف کو اور دل و دماغ کو بدل ڈالنا، اسے گمراہی کے راستہ سے ہٹا کر ہدایت کے راستہ پر لے آنا اور اسے خود فریبی اور خوش خیالی کی پستی سے نکال کر سچائی کی بلندیوں پر پہنچانا، یہ کچھ آسان کام نہیں ہے، انسان کو اپنی سوچ اور اپنا عقیدہ جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے، انسان کا اپنے مذہب سے جذباتی تعلق ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کے لئے اپنی رگ جاں کا آخری قطرۂ خون بھی اس کے لئے بہا دینا آسان ہوتا ہے، داعی اسی سودائے خام کا خریدار ہوتا ہے، جس کو بہ زور قوت حاصل نہیں کیا جاسکتا، وہ چاہتا ہے کہ اس کے مخاطب نے جو پیتل کو سونا سمجھ رکھا ہے، اس پر اس کی حقیقت واضح کر دی جائے اور واقعی وہ حقیقی سونے کا مالک بن جائے۔

اس کام کے لئے اصل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا تھا، جس کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہو چکا ہے، ان پیغمبروں کی داستانِ حیات قرآن مجید میں تفصیل سے ذکر کی گئی ہیں، حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک کسی بھی ایسے پیغمبر کا ذکر نہیں ملتا، جن کے لئے ان کے مخاطب گروہ نے پھولوں کی سیج بچھائی ہو، گلاب کے ہاروں سے ان کا استقبال کیا گیا ہو، ان کے لئے استقبالیہ محفلیں سجائی گئی ہوں، تہنیتی جلسے منعقد کئے گئے ہوں اور زندہ باد اور خوش آمدید کے نعرے لگائے گئے ہوں؛ بلکہ جو بات ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان پر پتھروں کی بارش کی گئی، ان پر آوازیں کسی گئیں، ان کا بائیکاٹ کیا گیا، انہیں ترکِ وطن پر مجبور کیا گیا، ان کو اور ان کے ماننے والوں کو آگ میں ڈالا گیا، ان کے قبیلہ کے بچوں کا قتلِ عام کیا گیا اور وہ ساری ایذائیں پہنچائی گئیں، جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان دوسرے انسان کو پہنچا سکتا ہے اور جن کا تصور کرنا درندوں کے لئے بھی دشوار ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نیک بندے اور خاص کر انبیاء آزمائشوں سے دوچار کئے گئے اور سب سے زیادہ آزمائشوں سے مجھے گذارا گیا، غور کیجئے کہ اللہ کے رسولوں اور پیغمبروں سے لوگوں کو کیا شکایت

تھی؟ نہ وہ حکومت کے طلب گار، نہ وہ مال وزر کے خواست گار، بات صرف اتنی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کرتے تھے اور انہیں اندھیرے سے روشنی کی طرف بلاتے تھے۔

دوسری طرف قرآنِ مجید میں اس بات کو بھی پوری وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ اپنی قوم کے ظلم وجور اور ستم انگیزیوں کا جواب اللہ کے نبیوں نے کس طرح دیا؟ پورا قرآن مجید پڑھ جایئے، کہیں یہ بات نہیں ملے گی کہ انبیاء کرام نے اپنے ردِعمل میں یہ رویہ اختیار کیا ہو، جو ان کی قوم کا تھا، قوم نے انہیں مجنون کہا، جادوگر کہا، بیوقوف کہا، گمراہ کہا، ملک سے نکل جانے کو کہا، جان ومال اور عزت وآبرو پر حملہ کی دھمکی دی؛ لیکن کبھی اللہ کے نبیوں نے ان کے جواب میں ان باتوں کو دہرایا نہیں؛ بلکہ وہ ہمیشہ کلمۂ محبت پیش کرتے رہے، انہوں نے گالیوں کے جواب میں دعائیں دی، کانٹے بچھانے والوں پر پھول نچھاور کئے اور کمالِ محبت کے ساتھ انہیں سمجھاتے رہے کہ وہ ان کے خیرخواہ ہیں نہ کہ بدخواہ، ان کے دوست ہیں نہ کہ دشمن، اور وہ انہیں دوزخ سے بچا کر جنت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ ریکارڈ اسی لئے نقل کیا ہے کہ امتِ محمدیہ یہ داعیانہ کردار اور داعی کے لئے مطلوب اوصاف کو اچھی طرح سمجھ لے، اگر اس داعیانہ کردار کو جو انبیاء کا اپنے مخاطب کے ساتھ تھا، چند الفاظ میں ذکر کیا جائے تو وہ ہوگا، محبت، صبر اور حکمت۔

محبت دلوں میں درد پیدا کرتی ہے اور طبیعتوں کو بےقرار اور بےسکون بناتی ہے، جو ماں اپنی اولاد کیلئے بےقرار ہونا نہ جانتی ہو، جس باپ کو اپنی اولاد کی بےراہ روی تڑپاتی اور بےسکون نہ کرتی ہو، وہ ہرگز ایک اچھے ماں باپ کا کردار ادا نہیں کرسکتے، نبی کو اپنی قوم سے اس سے بھی زیادہ محبت ہوتی ہے، جو والدین کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، جیسے چھوٹے بچے اپنے والدین پر تھپڑ مارتے ہیں، اس پر اپنے پاؤں پھینکتے ہیں اور اس کی گود میں پیشاب پاخانہ کردیتے ہیں، مگر پھر بھی ماں باپ کی محبت میں کوئی فرق نہیں آتا، یہی نسبت داعی کی اس قوم سے ہے، جسے وہ دعوت دے، اس کا دل محبت سے کچھ اس طرح لبریز ہو کہ جب تک ہدایت کی امید ہو، ان کی زیادتیاں بھی داعی کو بدخواہی کے جذبہ سے دوچار نہ کردیں۔

دوسرا ضروری وصف صبر ہے، صبر کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں نوے سے زیادہ مقام پر صبر کا ذکر کیا گیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جسم میں جو مقام سر کا ہے،

ایمان میں وہی درجہ صبر کا ہے'' (دیکھئے: نضرۃ النعیم: ۶ / ۲۴۴۳) —قرآن نے صاف اعلان کردیا ہے کہ صبر ہی اللہ تعالیٰ کی معیت اور اس کی مدد کی کلید ہے: ﴿وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۴۹) —قرآن مجید نے خاص طور پر مسلمانوں سے کہا ہے کہ اگر کوئی گروہ تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو تمہارے لئے بھی اسی حد تک اس کا جواب دینے کی گنجائش ہے؛ لیکن معیاری اور افضل طریقہ یہ ہے کہ تم انتقام لینے کے بجائے صبر کا راستہ اختیار کرو: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (النحل: ۱۲۶)—صبر اصل میں محبت کے تقاضوں میں سے ہے اور تدبیر کے اعتبار سے یہ دشمن کے ہتھیار چھین لینے کے مترادف ہے؛ کیوں کہ تشدد کا جواب اس سے زیادہ تشدد سے دیا جاسکتا ہے؛ لیکن عدم تشدد کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا، زبان درازی کے جواب میں اس سے بڑھ کر زبان درازی کی جاسکتی ہے؛ لیکن خاموشی کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا؛ اسی لئے داعی کا کام یہ ہے کہ جو قوم اس کی مخاطب ہو، وہ اس کی اشتعال انگیز باتوں کے جواب میں اشتعال کا مظاہرہ نہ کرے، اگر وہ شان وشوکت کا اظہار کرے، نعرے لگائے اور اپنی سربلندی کے اظہار کے لئے ان ذرائع کو استعمال کرے، جو آج کی دنیا میں کئے جاتے ہیں، تو داعی گروہ کا کام یہ ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ ظاہری شان وشوکت کے اظہار کے بغیر اپنا کام کرتا رہے؛ یہاں تک کہ مخالفین کے پاس لوگوں کو جوش دلانے، گرمانے اور مشتعل کرنے کے لئے کوئی مواد ہی نہ مل سکے اور بالآخر لوگ آہستہ آہستہ ان کی مفسدانہ مہم سے دور ہوجائیں۔

تیسرا ضروری وصف ہے حکمت، جن چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایک ہی طریقہ کار متعین نہ ہو، ان میں نتائج کو خاطر میں لائے بغیر کسی ایک ہی طریقہ پر اڑ جانا حکمت کے خلاف ہے، اور یہ بہادری نہیں بیوقوفی ہے، حکمت کبھی آگے بڑھنے میں ہوتی ہے اور کبھی پیچھے ہٹنے میں، کبھی بولنا حکمت کا تقاضہ ہوتا ہے اور کبھی چپ رہنا، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اس کی بہترین مثال ہے، ہجرت کے بعد ۸ ہجری سے پہلے تک رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ جنگ سے گریز کا راستہ اختیار فرمایا؛ اسی لئے غزوۂ بدر ہو یا غزوۂ احد یا غزوۂ خندق، یہ سارے غزوات مدینہ کی سرحد پر ہوئے؛ کیوں کہ اس وقت حکمت کا تقاضہ یہی تھا کہ مسلمان اپنی دعوتی مہم کو تیز سے تیز تر کریں، ان کے اخلاقی اثرات پورے جزیرۃ العرب کے لئے ایک مثال بن جائیں اور اہل مکہ کا جوش آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ جائے، صلح

حدیبیہ کی دستاویز میں جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا گیا، تو اس کو بھی اہل مکہ نے برداشت نہیں کیا، صحابہ کو اس لفظ کا کاٹا جانا بالکل گوارا نہیں تھا؛ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بجائے ''محمد بن عبداللہ'' (عبداللہ کے بیٹے محمد) صلی اللہ علیہ وسلم لکھ لیا جائے، یہ داعیانہ حکمت تھی اور اسی حکمت کو اللہ تعالیٰ نے ''فتح مبین'' قرار دیا ہے۔

آج دنیا کی دوسری قومیں رنگوں اور روشنیوں کے ذریعہ اپنی بلندی اور سرفرازی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتی ہیں؛ کیوں کہ ان کے پاس سچائی کی روشنی اور انسانیت کے لئے کوئی پیغام محبت نہیں ہے، وہ فیضانِ سماوی سے محروم ہیں، ان کے پاس مغز نہیں ہے؛ اس لئے وہ چھلکوں پر رنگ و روغن ڈال کر اپنے جذبات کی تسکین کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن امتِ مسلمہ ایک داعی امت ہے، وہ خدا کے کلام کی امین ہے، اس کے پاس رسول رحمت ﷺ کا بہترین اسوہ ہے، اس کے پاس دل کی دوا اور دماغ کی غذا ہے، اسے اپنی سربلندی کے اظہار کے لئے رنگ اور روشنی کی ضرورت نہیں؛ اس لئے حکمت یہ ہے کہ ہم جوش وخروش کے ایسے مصنوعی طریقوں کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کریں کہ انسانیت تک رحمت اور نبی رحمت کا اصل پیغام پہنچ سکے، مثلاً ہم طے کریں کہ رمضان المبارک میں ہم اتنے لاکھ لوگوں تک اللہ کی کتاب کو پہنچائیں گے یا ہم ماہِ ربیع الاول میں اتنے افراد تک رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو پہنچائیں گے اور اس کے لئے ممکنہ وسائل کو استعمال کریں گے، یہ اظہار محبت اور اظہار مسرت کا ایسا طریقہ ہوگا کہ نہ معاندین کا جوش وخروش بڑھے گا اور نہ ان لوگوں کی سازشیں کامیاب ہوسکیں گی، جو نفرت کی آگ سلگانا اور امن وآشتی کو غارت کرنا چاہتے ہیں، جب تک مسلمان پوری دنیا میں اور خاص کر ان ممالک میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں، اس حقیقت کو نہ سمجھ لیں کہ وہ انبیاء کے قائم مقام اور ایک داعی امت ہیں اور ان کی عزت وسربلندی ان کے داعیانہ کردار سے وابستہ ہے، وہ ہرگز اس مقام کو حاصل نہیں کرسکیں گے، جو خیر امت ہونے کی حیثیت سے انہیں ملا ہے؛ کیوں کہ:

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی